

# تفسیر

بیان فرموده

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی  
مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام

جلد چہارم

سورة المائدة تا سورة الرعد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُهٗا وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهٖ الْکَرِیْمِ

و علی عبدہ المسیح الموعود

## عرض حال

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

”میں قرآن شریف کے حقائق معارف بیان کرنے کا نشان دیا گیا ہوں کوئی نہیں کہ جو

اس کا مقابلہ کر سکے۔“ (ضرورت الامام۔ روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۴۹۶)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ۲۰ جولائی ۱۹۰۰ء کو اپنے مخالفین کو قرآن کریم کی

تفسیر لکھنے کا چیلنج دیا مگر کوئی مد مقابل نہ آیا۔ حضور علیہ السلام نے شرائط کے مطابق تفسیر لکھ کر  
شائع فرمائی اور فرمایا۔

”میں نے اس تفسیر کو اپنی طاقت سے نہیں لکھا۔ میں تو ایک کمزور بندہ ہوں اور اسی

طرح میرا کلام بھی۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ اور اس کے الطاف کریمانہ ہیں کہ اس تفسیر

کے خزانوں کی چابیاں مجھے دی گئی ہیں اور پھر اسی جناب سے مجھے اس کے دفتینوں

کے اسرار عطا کئے گئے ہیں۔ میں نے اس میں طرح طرح کے معارف جمع کئے اور

انہیں ترتیب دیا ہے۔“ (اعجاز المسیح۔ روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۵۵، ۵۶۔ اردو ترجمہ)

قرآن کریم کے حقائق و معارف جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بیان فرمائے

آپ کی کتب و ملفوظات میں مذکور ہیں، ان کو یکجا کر کے تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نام

سے طبع اول کتابی صورت میں ۸ جلدوں میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

طبع دوم کی اشاعت کے وقت ۸ جلدوں کو ۴ جلدوں میں شائع کیا گیا۔ یہ جلدیں

کتابت سے پرنٹ ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ السلام

کے کمپیوٹرائزڈ ورژن کی اشاعت کی ہدایت و اجازت فرمائی ہے۔ نیز حضور کا منشائے مبارک

کہ چونکہ ۴ جلدوں کی صورت میں ہر کتاب بھاری ہو گئی ہے اور اس کو بسہولت ہاتھ میں سنبھال کر پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ کتاب مسلسل مطالعہ میں رہنے والی ہے، اس لئے اس کو ۸ جلدوں میں منقسم کر لیا جائے۔

۱۔ تمام اقتباسات کو حضرت مسیح موعودؑ کی کتب کے اوّل ایڈیشنز سے از سر نو تقابل کر کے متن کی صحت کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ حوالہ میں قبل ازیں کتاب کا نام اور صفحہ درج تھا۔ اب اس کے ساتھ روحانی خزائن اور ملفوظات کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اس عمل کے دوران بعض اور اقتباسات سامنے آئے ہیں، ان کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔  
حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

’حقیقی اور کامل نجات کی راہیں قرآن نے کھولیں اور باقی سب اس کے ظلّ

تھے۔ سو تم قرآن کو تدبر سے پڑھو اور اس سے بہت ہی پیار کرو۔ ایسا پیار کہ تم نے کسی

سے نہ کیا ہو کیونکہ جیسا کہ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اَلْخَيْرُ كُلُّهُ فِي الْقُرْآنِ کہ

تمام قسم کی بھلائیاں قرآن میں ہیں۔‘ (کشتی نوح۔ روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۷)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور علیہ السلام کی اس نصیحت کو حرزِ جان بنا کر اس پر عمل کرنے

اور مداومت اختیار کرنے اور معارفِ قرآنی اور انوارِ روحانی سے اپنے دلوں کو منور

کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ نیز اس اشاعت کی تیاری میں جن مریدانِ کرام نے جو حصہ پایا انہیں

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش لفظ

(طبع اول)

الْحَمْدُ لِلّٰهِ! حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیان فرمودہ تفسیر قرآن کریم کی آٹھویں جلد جو اس سلسلہ کی آخری جلد ہے طبع ہو گئی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جب ۲۰ جولائی ۱۹۰۰ء کو اپنے مخالفین کو تفسیر نویسی کا چیلنج دیا تو آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ

”قرآن شریف سے یہ ثابت ہے کہ جو لوگ درحقیقت خدا تعالیٰ کے راستباز بندے ہیں ان کے ساتھ تین طور سے خدا کی تائید ہوتی ہے۔

(ان میں سے ایک یہ ہے) کہ ان کو علمِ معارفِ قرآن دیا جاتا ہے اور غیر کو نہیں دیا جاتا جیسا کہ آیت لَا یَسْتَشِئُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ اس کی شاہد ہے۔“

معارفِ قرآن کا یہ علم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اُردو، عربی اور فارسی کی انسی سے زائد تصانیف اور ملفوظات میں جا بجا مذکور ہے۔ ۱۹۶۷ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث، مرزا ناصر احمد، رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام روح پرور قرآنی معارف اور تفسیری نکات کو یکجا جمع کرنے کا ارشاد فرمایا چنانچہ مولوی سلطان احمد صاحب فاضل (پیرکوٹی) نے بہت تھوڑے وقت میں انتہائی محنت اور عرقریزی کے ساتھ یہ کام مکمل کر کے جنوری ۱۹۶۸ء میں مسودہ حضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔

جون ۱۹۶۹ء میں اس سلسلہ کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی اور صد سالہ جشنِ تشکر کے موقع پر اس کی آخری جلد پیش ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ۷ مارچ ۱۹۸۰ء کو تحریک فرمائی تھی کہ ہر احمدی گھرانہ میں اس تفسیر کا سیٹ ضرور موجود ہونا چاہئے۔

## مختصر فہرست مضامین جلد چہارم

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲	اپنی قوم کی ہمدردی اور اعانت فقط نیکی کے کاموں میں کرنی چاہیے	۱
۴	خدا نے خنزیر کے نام میں ہی حرمت کی طرف اشارہ کیا ہے	۲
	میرا یہ مذہب نہیں ہے کہ قرآن ناقص ہے اور حدیث کا محتاج ہے بلکہ وہ	۳
۵	الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ کا تاج لازوال اپنے سر پر رکھتا ہے۔	۴
۶	الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ میں کمال تعلیم کا دعویٰ کمال کی تشریح	۵
	اللہ تعالیٰ نے آیات اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلْبَةً طَيِّبَةً	۶
۶	... الخ میں کلام پاک کا کمال تین باتوں پر موقوف قرار دیا ہے	۶
	اعتراض کا جواب کہ جب دین کمال کو پہنچ چکا ہے اور نعمت پوری ہو چکی تو	۶
۱۳	پھرنے کسی مجدد کی ضرورت ہے نہ کسی نبی کی	۶
	ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ ابن مریم آ کر قرآن کے بعض احکام کو منسوخ اور کچھ	۷
۱۵	زیادہ کرے گا تو قرآن کے ساتھ کمال دین ہونا فاسد ہو جاتا ہے	۷
	تکمیل ہدایت قرآنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہوئی اور تکمیل	۸
۱۷	اشاعت ہدایت کو ایک امتی کے ہاتھ سے پورا کیا۔	۸
۲۰	حضرت ابو بکرؓ کا فہم قرآن	۹

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۴	اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ کی آیت دو پہلو رکھتی ہے ایک یہ کہ تمہاری تطہیر کر چکا، دوئم کتاب مکمل کر چکا	۱۰
۲۶	اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ۔ اس تکمیل میں دو خوبیاں تھیں ایک تکمیل ہدایت اور دوسری تکمیل اشاعت ہدایت	۱۱
۲۷	اصل اشیاء میں حلت ہے حرمت جب تک نص قطعی سے ثابت نہ ہو تب تک نہیں ہوتی	۱۲
۲۷	ہندوؤں اور عیسائیوں کے کھانے کی نسبت خیال	۱۳
۲۸	ہمارے نزدیک نصاریٰ کا وہ طعام حلال ہے جس میں شبہ نہ ہو اور از روئے قرآن وہ حرام نہ ہو	۱۴
۲۸	طَعَامُ الَّذِينَ اٰتُوْا الْكِتٰبَ حَلٰلٌ لَّكُمْ مِثْرًا مِّمَّا كَرِهْتُمْ اہل کتاب سے غالباً مراد یہودی ہی ہیں	۱۵
۲۸	غَدِيْرٌ مُّسْفِحِيْنَ۔ مسافحت کی بدرسم کو قرآن نے حرام کر دیا ہے۔	۱۶
۲۸	مُحْصِنِيْنَ کے لفظ میں اشارہ کہ جو شادی نہیں کرتا وہ نہ صرف روحانی آفات بلکہ جسمانی آفات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے	۱۷
۲۹	قرآن سے شادی کے فائدے ثابت ہیں۔ ایک عفت، دوسری حفظ صحت، تیسری اولاد	۱۸
۲۹	نماز کا پڑھنا اور وضو کرنا فوائد بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے	۱۹
۳۰	تیمم کے مسائل	۲۰

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ اَلَّا تَعْدِلُوْاۗۗۙ اِعْدِلُوْا۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى	۲۱
۳۰	میں خدائے محبت کا ذکر نہیں کیا بلکہ معیار محبت کا ذکر کیا ہے	
۳۱	تنعم اور کھانے پینے میں بھی اعتدال کرنے کا نام ہی تقویٰ ہے	۲۲
	يُحٰۡرِفُوْنَ اَلْكَلِمَةَ عَنۡ مَّوٰۡضِعِهَاۙ وَهٖ لَوْ كُنَّ عَرَبًا لَّحَدَّثُوْا۟ سَمِعْتُمْ لَمَۡنَ سَمِعَ مِنْهُمْ كَمَثَلِ الْيَهُودِ لَمَّا سَمِعَتْ مِنْ نَّبِيِّ۟ٓ آٰتٰٓتْهُنَّ اٰیٰتِنَاۙ سَمِعْنَ مِنْهَا غَلٰٓظًا مِّنۡ غَلٰٓظِهَاۙ وَهٖ لَمِّنۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَلْاَعۡتٰۡبُ الْعَظِيْمُۙ	۲۳
۳۲	بھی کچھ ملادیا کرتے تھے	
	حضرت مسیح کے نزول کی علامت کہ تمام اہل کتاب اس پر ایمان لے آویں	۲۴
	گے صریح نص قرآن اور حدیث کے مخالف ہے	
۳۵	قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور رکھا ہے	۲۵
۳۶	یہود اور نصاریٰ کے دعویٰ نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآءُہٗۙ کی تردید	۲۶
	حضرت موسیٰ کو بہت محنت کرنے کی ضرورت نہ پڑی قوم غلامی میں گرفتار	۲۷
۳۹	تھی اور طیار تھی کہ کوئی آئے تو اسے قبول کر لیں	
	حضرت موسیٰ کی قوم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا معیار اطاعت	۲۸
۴۰	میں موازنہ	
۴۰	دعا کی راہ میں دو بڑے مشکل امر	۲۹
۴۲	ریاضتیں جو طریقہ نبوی سے باہر ہیں اللہ کے نزدیک مقبول نہیں	۳۰
	اگر کسی شخص نے اپنے بھائی کے ساتھ ہمدردی نہیں کی تو اس نے ساری	۳۱
۴۳	دنیا کے ساتھ ہمدردی نہیں کی	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۴۳	مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ كَسَاةٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ كَمَا ضَافَهُ کی حقیقت	۳۲
۴۴	اگر توحید کافی ہوتی تو یہود محض انکار اور مقابلہ رسول کی وجہ سے کیوں قابل سزا ٹھہرے	۳۳
۴۵	خدا کی راہیں نہایت دقیق ہیں وہ بجز وسیلہ نبی کریمؐ کے مل نہیں سکتیں	۳۴
۴۶	وَلِيُحْكُمَ أَهْلَ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ كَمَا أَصْلَ مَعْنَى - نيز فِيهِ نُورٌ وَهُدًى كَمَا أَصْلَ مَعْنَى اس بات کی دلیل نہیں کہ انجیل کوئی مستقل شریعت ہے	۳۵
۵۱	عیسائی دھوکہ کھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ عیسائی وغیرہ بے دین فرقوں سے محبت نہ کریں۔ اس کی حقیقت	۳۶
۵۳	ارتداد سے اسلام کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا کیجائی نظر سے دیکھنا چاہیے کہ اسلام ترقی کر رہا ہے یا تنزل	۳۷
۵۴	علماء کا بدی کو دیکھ کر خاموش رہنا بدی میں آپ شریک ہونا ہے	۳۸
۵۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کے ہاتھ سے قتل نہ کیا جانا ایک بڑا بھاری معجزہ ہے اور قرآن شریف کی صداقت کا ثبوت ہے	۳۹
۵۸	یہ خیال کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی ضرورت نہیں قرآن شریف کی آیت إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى الْخ كِي غلط فہمی ہے جو باعث کمی علم و تدبر کے ظہور میں آئی	۴۰
۶۴	یہ آیت كَانَا يَا كُفْرًا الطَّعَامَ صَرَخَ نَصِ حَضْرَتِ مَسِيحِ كِي مَوْتِ پَرِ هِي	۴۱

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۶۵	مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ میں ابطال الوہیت مسیح کے لیے دلیل استقرائی	۴۲
۶۷	آیت مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ الخ میں ابطال الوہیت مسیح کے تین دلائل	۴۳
۶۹	حضرت مسیح کی ماں مریم کی نسبت جو (صدیقہ) کا لفظ آیا ہے یہ رفع الزام کے لیے ہے	۴۴
۷۲	ہماری شریعت میں شراب کو قطعاً منع کیا گیا ہے اور اس کو رجس من عملی الشَّيْطَانِ کہا گیا ہے	۴۵
۷۲	قمار بازی میں اتلاف حقوق ہوتا ہے شراب نوشی کے ساتھ دوسرے گناہ لازمی پڑے ہوئے ہیں	۴۶
۷۲	ذرا ذرا سی بات پر سوال کرنا بھی مناسب نہیں لیکن اگر کوئی امراہم دل میں کھٹکے تو اسے ضرور پیش کر کے پوچھ لینا چاہیے	۴۷
۷۳	جو محض زبان سے کام لیتا ہے اور پہلے خود اصلاح نہیں کرتا ایسے مصلحوں سے سخت نقصان پہنچ رہا ہے	۴۸
۷۴	اپنی تبدیلی کے لیے تین باتیں ۱۔ نفس امارہ کے بالمقابل تدبیر ۲۔ دعاؤں سے کام لو ۳۔ سست اور کاہل نہ بنو	۴۹
۷۵	قَالُوا لَا عَلَمَ لَنَا بِهِ لَأَعْلَمِي انبياء کی ان کی اس امت کے بارے میں ہوتی ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوتی ہے	۵۰

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۷۶	عصمت سے مراد	۵۱
	صحابہ رسول اور حواریوں کے مابین قوی الایمان اطمینان قلوب کے لحاظ	۵۲
۷۷	سے موازنہ	
	قرآن شریف میں توفی کے معنی یہ ہیں کہ روح کو قبض کرنا اور جسم کو بیکار	۵۳
۷۸	چھوڑ دینا	
۷۸	قرآن شریف کے تیس مقام میں برابر توفی کے معنی امت اور قبض روح ہے	۵۴
	آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں جس توفی کا ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰ کے نزول	۵۵
۷۹	کے بعد واضح ہوگی کا جواب	
۸۱	بخاری اور مسلم میں توفی کے معنی وفات دینے کے ہیں	۵۶
	تَوَفَّيْتَنِي کے لفظ کی صحیح تفسیر وہی ہے جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	۵۷
۸۱	اشارہ فرماتے ہیں یعنی مار دیا اور وفات دے دی	
	امام بخاری بہ تقریب تفسیر فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي حضرت عیسیٰ کی وفات خاص	۵۸
۸۴	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت کر چکا ہے	
	آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں اسی وعدہ کے پورا ہونے کی طرف اشارہ ہے	۵۹
۸۴	جو آیت لِيُعِيْسَىٰ اِنِّي مُتَوَفِّيكَ میں کیا گیا تھا	
	اگر مسیح کا دوبارہ اس دنیا میں آنا مقدر ہوتا تو وہ اپنے مذکورہ بالا قول میں دو	۶۰
۸۵	شہادتوں کا ذکر کرتے اور یہ بھی کہتے کہ اَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّرَّةً اٰخْرٰی	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	یہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي دالالت کرتی ہے کہ نصاریٰ کا گمراہ ہونا اور ایک بندہ	۶۱
۸۷	کو خدا بنانا مسیح کی صفات سے مشروط ہے	
۹۲	صحیح بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ مُتَوَفِّيكَ مَهَيْتَكَ	۶۲
	آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں صریح ظاہر کیا گیا ہے کہ واقعہ وفات حضرت عیسیٰؑ	۶۳
۹۴	وقوع میں آ گیا ہے	
	یہ کہنا بے جا ہے کہ لفظ تَوَفَّيْتَنِي جو ماضی کے صیغہ میں آیا ہے دراصل اس	۶۴
۹۵	جگہ مضارع کے معنی دیتا ہے	
	وفات حیات کے جھگڑے میں بھی میں حَکَمَ ہوں میں امام مالک اور	۶۵
	ابن حزم اور معتزلہ کے قول کو مسیح کی وفات کے بارے میں صحیح قرار دیتا	
۹۶	ہوں اور دوسرے اہل سنت کو غلطی کا مرتکب سمجھتا ہوں۔	۶۶
	یہ حماقت ہے کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کو آنحضرتؐ کی طرف نسبت کر کے	
	آنجناب کی وفات مراد لی جائے اور اسی آیت کو حضرت عیسیٰؑ کی طرف	
۹۷	نسبت کر کے ان کی حیات مراد لی جائے	۶۷
	علم لغت میں یہ مسلم اور مقبول اور متفق علیہ مسئلہ ہے کہ جہاں خدا فاعل اور	
۱۰۱	انسان مفعول بہ ہے وہاں بجز مارنے کے اور کوئی معنی توفی کے نہیں آئے	۶۸
۱۱۱	آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي سے صریح طور پر دو باتیں ثابت ہوتی ہیں	
	اعتراض کا جواب کہ مسیح کا قول کہ میری وفات کے بعد لوگ بگڑ گئے صحیح	۶۹
	نہیں ہوگا بلکہ یہ کہنا چاہیے تھا کہ میرے کشمیر کے سفر کے بعد لوگ بگڑ	
۱۱۳	گئے ہیں کیونکہ وفات تو صلیب کے واقعہ سے ستاسی برس بعد ہوئی	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱۱۵	یہی لفظ توفی اور مقامات میں دوسرے انبیاء کے حق میں وارد ہے تو اس کے معنی بجز موت کے اور کچھ نہیں لیے جاتے	۷۰
۱۲۵	خدا تعالیٰ مفتخری علی اللہ کو ہرگز سلامت نہیں چھوڑتا اسی دنیا میں اس کو سزا دیتا ہے اور ہلاک کرتا ہے	۷۱
۱۲۶	فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ فِي ظُلْمٍ سے مراد اس جگہ کافر ہے	۷۲
۱۲۷	منہاج نبوت کے لیے جو معیار ہے اس پر میرے دعویٰ کو دیکھو	۷۳
۱۳۱	آنحضرت بہت جلد فیصلہ کفار کے حق میں چاہتے تھے مگر خدا تعالیٰ اپنے مصالح اور سنن کے لحاظ سے بڑے توقف اور حلم سے کام کرتا ہے	۷۴
۱۳۲	ہر چند میرا مذہب یہی ہے کہ قرآن اپنی تعلیم میں کامل ہے اور کوئی صداقت اس سے باہر نہیں	۷۵
۱۳۲	قرآن کریم کے تمام مسائل دینیہ کا استخراج و استنباط کرنا اور اس کی جملات کی تفصیل صحیحہ پر حسب منشاء الہی قادر ہونا ہر ایک مجتہد اور مولوی کا کام نہیں	۷۶
۱۳۵	مولوی غلام دستگیر قصوری نے میرے صدق و کذب کا فیصلہ آیت فَقَطِّعْ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا پر چھوڑا تھا چونکہ وہ خدا کی نظر میں ظالم تھا اس لیے اس کو مہلت نہ ملی	۷۷
۱۳۷	میں نے کئی بار اشتہار دیا ہے کہ کوئی ایسی سچائی پیش کرو جو ہم قرآن شریف سے نہ نکال سکیں	۷۸

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	غدیر خم پر رسول اللہ کی نصیحت میں تم میں دو نہایت گراں قدر چیزیں چھوڑ	۷۹
۱۳۴	رہا ہوں (۱) کتاب اللہ (۲) میرے اہل بیت	
	جیسے ایک داعی شرا انسان کے لیے مقرر ہے ایسا ہی ایک داعی خیر بھی ہر ایک	۸۰
۱۴۰	بشر کے لیے موکل ہے جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا	
	مسئلہ وجود ملائکہ اور شیاطین ان مسائل میں سے ہے جن کے لیے خدا تعالیٰ	۸۱
۱۴۳	نے قرآن کریم کے استنباط حقائق میں اس عاجز کو متفرد کیا ہے	
۱۴۴	قرآن شریف میں عذاب کے کئی اقسام بیان کیے ہیں	۸۲
	جب تک انسان پورے طور پر حنیف ہو کر اللہ تعالیٰ ہی سے سوال نہ کرے	۸۳
۱۴۴	وہ سچا مسلمان اور سچا مومن کہلانے کا مستحق نہیں	
	میرے الہام میں ہے کہ وہ طاعون سے محفوظ رہیں گے جو کہمَ یَلْبِسُوا	۸۴
۱۴۶	إِبْرَائِیمَ بِظُلْمِهِ کے مصداق ہیں	
	اجْتَبَيْنَاهُمْ وہ باعتبار اپنی فطرتی قوتوں کے دوسروں میں سے چیدہ اور	۸۵
۱۴۸	برگزیدہ تھے اس لیے قابل رسالت و نبوت ٹھہرے	
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک باعتبار اپنی صفات اور کمالات	۸۶
۱۴۹	کے مجموعہ انبیاء تھی	
	آیت لِنُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے	۸۷
۱۵۵	کہ عربی ام اللسنہ ہے	
۱۵۹	سوال کا جواب کہ کیا خدا آسمان پر ہے	۸۸

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ - لفظ کل کے ساتھ جو احاطہ تامہ کے لیے آتا ہے ہر ایک چیز کو جو اس کے سوا ہے مخلوق میں داخل کر دیا ہے	۸۹
۱۵۹	خدا کی کنہ میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ اسلم طریق یہی ہے کہ انسان لَا تُدْرِكُهُ الْبَصَارُ پر ایمان رکھے	۹۰
۱۶۱	نبی کبھی یہ نہیں کہے گا کہ جو نشان مجھ سے مانگو دکھانے کو طیار ہوں اس کے منہ سے یہی نکلے گا اِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ	۹۱
۱۶۲	فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَدِّينَ کے مخاطب آنحضرت نہیں بلکہ ایسے لوگ ہیں جو ہنوز یقین اور ایمان سے کم حصر رکھتے ہیں	۹۲
۱۶۳	اس سوال کا جواب کہ کیا کسی غریب سید کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے	۹۳
۱۶۵	صاحب الہام ہونے میں استعداد اور قابلیت شرط ہے یہ بات نہیں کہ ہر کس ونا کس خدائے تعالیٰ کا پیغمبر بن جائے	۹۴
۱۶۶	جھوٹے مذہب اور سچے مذہب میں امتیاز کرنے کا طریق	۹۵
۱۶۹	عیسائی نامہ نگاروں کا بیان کہ اگر انبیاء کی نسبت جرم کا لفظ نہیں آیا تو یہ ہود کی نسبت بھی نہیں آیا کا جواب	۹۶
۱۷۰	قُلْ اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي اِلٰحِ میں ان کا رد ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلت کلی ثابت نہیں	۹۷
۱۷۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نوع کی رہائی کے لیے جان کو وقف کر دیا	۹۸
۱۷۵	نِسْكَ کے معنی	۹۹
۱۷۶		

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱۷۸	ہو تب مسلمان کہلائے گا	۱۰۰
۱۷۹	نسک میں قربانی سے مراد روح کی قربانی ہے	۱۰۱
۱۷۹	قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي لِأَخِي أَخْضَرْتِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَقَرْبِ تَامِ كِي اِيك بڑی دليل ہے	۱۰۲
۱۸۰	آيت اور حديث ميں باهم تعارض واقع ہونے كى حالت ميں مفسرين و محدث كا اصول	۱۰۳
۱۸۰	لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ميں يسوع كے كفاره كى ترديد	۱۰۴
۱۸۱	گناہ كا علاج تين طور سے ۱۔ محبت ۲۔ استغفار ۳۔ توبہ	۱۰۵
۱۸۵	قرآن شريف پر حديث كو قاضى بنانا سخت غلطى ہے	۱۰۶
۱۸۷	اتَّبِعُوا مِمَّا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ اُول توجہ قرآن كى طرف ہونى چاہيے پھر اگر اس توجہ كے بعد كسى حديث يا قول من دونہ ميں داخل ديكيے تو اس سے منہ پھير ليوے	۱۰۷
۱۸۸	تكبر شيطان سے آيا ہے اور شيطان بنا ديتا ہے	۱۰۸
۱۸۹	اجبيح آگ كے شعلہ كو كہتے ہيں اور شيطان كے وجود كى بناوٹ بھى آگ سے ہے۔ اس ليے قوم يا جوج ما جوج سے اس كو ايك فطرتى مناسبت ہے	۱۰۹
۱۹۰	قرآن شريف اس شخص كو جس كا نام حديثوں ميں دجال ہے شيطان قرار ديتا ہے	۱۱۰

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	انسان ہر ایک قسم کے گناہوں سے استغفار کرتا رہے آج کل آدم کی دعا	۱۱۱
۱۹۱	پڑھنی چاہیے رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا لَخ	
	خدا اب آخری زمانہ میں بھی دعائی کے ذریعہ سے غلبہ اور تسلط عطا کرے	۱۱۲
۱۹۱	گانہ تلوار سے	
	تمہارے قرائ کی جگہ زمین ہی رہے گی پھر کیوں کر ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ	۱۱۳
۱۹۱	کی قرا گاہ صد ہا برس سے آسمان ہو	
	حضرت مسیح بر طبق آیت فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ زمین پر ہی اپنی	۱۱۴
۱۹۴	جسمانی زندگی کے دن بسر کر کے فوت ہو چکے ہیں	
	لفظ فِيهَا جو تَحْيَوْنَ پر مقدم ہے زمین پر ہی حیات کی تخصیص کرتا اور انسانی	۱۱۵
۱۹۶	زندگی کو زمین پر مقدم کرتا ہے	
۲۰۰	فتویٰ کی دو قسم ہیں ایک علم کے متعلق اور دوسرا عمل کے متعلق	۱۱۶
۲۰۱	اعمال کے لیے اخلاص شرط ہے جیسا کہ فرمایا مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ	۱۱۷
	سوال کا جواب کہ نماز میں کھڑے ہو کر اللہ جل شانہ کا کس طرح کا نقشہ	۱۱۸
۲۰۱	پیش نظر ہونا چاہیے	
۲۰۲	كُلُّوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کے حکم کی حکمت	۱۱۹
۲۰۳	کُلُّوْا ایک امر ہے جب مومن اس کو امر سمجھ کر بجلا دے تو اس کا ثواب ہوگا۔	۱۲۰
	خدا نے ظاہری اور اندرونی گناہ دونوں حرام کر دیئے۔ میں دعویٰ سے کہتا	۱۲۱
۲۰۳	ہوں کہ یہ عمدہ تعلیم بھی انجیل میں موجود نہیں	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	اگر ایک ایک خلق فرداً فرداً کسی میں ہو تو اسے متقی نہ کہیں جب تک بحیثیت	۱۲۲
۲۰۴	مجموعی اخلاقِ فاضلہ اس میں نہ ہوں	
۲۰۴	خدا پر افترا کرنے والا سب کافروں سے بڑھ کر کافر ہے	۱۲۳
۲۰۵	یہودیوں کا ہرگز یہ اعتقاد نہیں کہ جو شخص مع جسم عنصری آسمان پر نہ جاوے وہ مؤمن نہیں	۱۲۴
	لَا تُفْتَحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ - مُفْتَحَةً لَهُمُ الْآبْوَابُ - اب ان آیات	۱۲۵
	میں لہم کا لفظ اجسام کو چاہتا ہے تو کیا یہ سب اس جسم عنصری کے ساتھ	
۲۰۶	جاتے ہیں	
	شیعوں کے مذہب کے صحابہ کے درمیان آپس میں سخت دشمنی تھی کی نَزَعْنَا	۱۲۶
۲۰۷	مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ میں تردید	
	میرا مذہب فرقہ ضالہ نیچر یہ کی طرح یہ نہیں ہے کہ میں عقل کو مقدم رکھ کر	۱۲۷
۲۰۹	قال اللہ وقال الرسول پر کچھ نکتہ چینی کروں۔	
	قرآن کریم ہر ایک وجہ سے احادیث پر مقدم ہے اور احادیث کی	۱۲۸
	صحت و عدم صحت پر کھنے کے لیے وہ محکم ہے	
	عرش سے مراد خدا کی عظمت اور جبروت ہے اسی وجہ سے اس کو مخلوق چیزوں	۱۲۹
۲۰۹	میں داخل نہیں کیا	
۲۱۳	اعتراض کہ خدا عرش پر کرسی نشین ہے کا جواب	۱۳۰
	قیامت کے دن عرش کو اٹھ فرشتے اٹھائیں گے پر اعتراض کہ خدا تعالیٰ	۱۳۱
۲۱۶	اس بات سے پاک اور برتر ہے کہ کوئی اس کے عرش کو اٹھاوے، کا جواب	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۲۰	عرش کوئی ایسی چیز نہیں جس کو مخلوق کہہ سکیں وہ تو تقدس اور تنزہ کا ایک وراء الوراء مقام ہے	۱۳۲
۲۲۱	ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ میں قدامت کے لحاظ سے لفظ ثُمَّ پر اعتراض کا جواب	۱۳۳
۲۲۴	- اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاٰمْرُ بسطی چیز کا عدم محض سے پیدا کرنا عالم امر میں سے ہے اور مرکب چیز کو کسی شکل یا ہیئت خاص سے مشکل کرنا عالم خلق سے ہے	۱۳۴
۲۲۵	قرآن شریف نے انبیاء و رسل کی بعثت کی مثال مینہ سے دی ہے	۱۳۵
۲۲۸	جب با خدا آدمی پر بلائیں نازل ہوتی ہیں تو بلا کے اترنے سے اور آگے قدم رکھتا ہے	۱۳۶
۲۲۹	حکم خواتیم پر ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ	۱۳۷
۲۳۰	موسیٰ کے تین بڑے کھلے کھلے کام جس نبی سے ظہور میں آئے ہوں وہی نبی مثیل موسیٰ ہوگا۔ نیز حضرت عیسیٰ اور آنحضرتؐ کا ان کاموں میں موسیٰ سے مماثلت اور موازنہ	۱۳۸
۲۳۳	یہود اور مسلمان بادشاہوں کے واقعات میں مشابہت	۱۳۹
۲۳۵	وعدہ اور وعید کی تاریخ کا ٹلنا	۱۴۰
۲۳۷	لیکھرام کے متعلق پیشگوئی عَجَلًا جَسَدًا اَللّٰهُ خُوَارٌ اور لفظ خُوَارٌ کی تفسیر	۱۴۱
۲۴۰	چالاکی سے علوم القرآن نہیں آتے	۱۴۲

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا - میں جَمِيعًا کے دو	۱۴۳
۲۴۶	معنی ہیں	
۲۵۰	یہود کے مغضوب علیہم اور دائمی وعید محکومیت کی وجہ	۱۴۴
۲۵۲	ہستی باری تعالیٰ پر دلیل - اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ طَقَاؤَابِلِ	۱۴۵
	سوال کہ جب ایک شخص نے ایک بات تحصیل کی ہے تو دوبارہ اسی کے تحصیل	۱۴۶
۲۵۵	کرنے سے کیا حاصل ہے، کا جواب	
۲۵۶	جہنم کیا چیز ہے؟	۱۴۷
	نص جواول درجہ پر قطعی اور یقینی ہے قرآن کریم ہی ہے اکثر احادیث اگر	۱۴۸
۲۵۹	صحیح بھی ہوں تو مفید ظن ہیں	
۲۶۱	قیامت کی نشانیوں کی دو قسمیں ہیں ۱۔ امارات صغریٰ ۲۔ امارات کبریٰ	۱۴۹
۲۶۴	خدا تعالیٰ متقی اور مومن کی زندگی کا ذمہ دار ہوتا ہے وَ هُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ	۱۵۰
۲۶۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور نبوت و ولایت کا جلال	۱۵۱
۲۶۷	خدا کے مقربوں کو مخالفین کے مقابل پر وَاَعْرَضُ عَنِ الْجَاهِلِينَ کا خطاب	۱۵۲
	جنگ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خارق عادت معجزہ وَمَا رَمَيْتَ	۱۵۳
۲۷۰	اِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى	
۲۷۲	لِمَا يُحْيِيكُمْ سے مراد روحانی مردوں کا زندہ ہونا ہے	۱۵۴
۲۷۳	اِنَّهَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ - اَمْوَالُكُمْ میں عورتیں داخل ہیں	۱۵۵
۲۷۴	کامل مومنوں کو ہمیشہ کے لیے روح القدس دیا جاتا ہے	۱۵۶

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۷۶	اسلام کی لڑائیوں کا صحیح نقشہ	۱۵۷
۲۷۷	استغفار عذاب الہی اور مصائب شدیدہ کے لیے سپر کا کام دیتا ہے	۱۵۸
۲۷۷	تمام انبیاء کرام کا جماعی مسئلہ ہے کہ صدقہ و استغفار سے رد بلا ہوتا ہے	۱۵۹
۲۷۸	قَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَ يَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ سے یہاں جبر نکلتا ہے؟	۱۶۰
۲۸۰	وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا کے معنی ہیں اس قدر ذکر کرو کہ گویا اللہ تعالیٰ کا نام..... ہو جائے	۱۶۱
۲۸۲	کوئی احسن انتظام اسلام کی خدمت کے لیے سوچنا بدعت اور ضلالت میں داخل نہیں	۱۶۲
۲۸۲	وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُوْنَ میں رباط کے معنی اور تفسیر	۱۶۳
۲۸۸	مومن کو بھی تبلیغ دین میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے	۱۶۴
۲۸۹	آنحضرتؐ کے صحابہ کا مقام	۱۶۵
۲۹۱	اگر قرآن جبر کی تعلیم کرتا تو یہ حکم دیتا کہ جب کافر قابو میں آ جاوے تو وہیں اس کو مسلمان کر لو	۱۶۶
۲۹۳	اسلام کے کل جنگ اور مقابلے کفار مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر دفاعی رنگ میں حفاظت جان و مال کی غرض سے تھے	۱۶۷
۲۹۴	حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون جہاد کا موازنہ	۱۶۸

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	اس حکم کی وجہ کہ اہل کتاب سے تم لڑو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں	۱۶۹
۲۹۶		
۲۹۸	تشلیث کا عقیدہ ہندوؤں کے عقیدہ کے عقیدہ ترے مورتی کی نقل ہے	۱۷۰
۳۰۱	يُرِيدُونَ اَنْ يُطْفِئُوْا نُورَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْۗ فِيْ سُبُوْحٍ مِّنْ سَمَوٰتٍ سٰمِيٰۃٍۭ	۱۷۱
	حضرت ابوبکر کی خاص فضیلت کہ آپ کو سفر ہجرت کی مرافقت کے لیے خاص کیا گیا	۱۷۲
۳۰۴		
۳۰۵	حضرت ابوبکر اور حضرت مسیح کے شاگرد کی آزمائش کا موازنہ	۱۷۳
	رسول اللہ کے قول اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا اور حضرت موسیٰ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ کے قول۔	۱۷۴
۳۰۶	میں ایک برّ	
۳۰۷	مصر کے اخبار اللواء کا کشتی نوح پر ایک اعتراض کا جواب	۱۷۵
	خیرات اور صدقات وغیرہ کے مال میں یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ پہلے جس قدر محتاج ہیں ان کو دیا جاوے	۱۷۶
۳۰۸		
	اصل جنت خدا ہے۔ اس لیے بہشت کے اعظم ترین انعامات میں رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ہی رکھا ہے	۱۷۷
۳۰۹		
۳۱۱	مخالفین کے اعتراض کہ غلام دستگیر قصوری نے کب مباہلہ کیا؟ کا جواب	۱۷۸
۳۱۳	منافق کی نماز جنازہ کا جواز رکھنے کی وجہ	۱۷۹
	ہمارا ایمان ہے کہ شفاعت حق ہے اور اس پر نص صریح ہے وَصَلِّ عَلَیْہُمْ ۗ	۱۸۰
۳۱۴	اِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّہُمْ	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۳۱۵	حقائق اور معارف پر کبھی پوری اطلاع نہیں مل سکتی جب تک صادق کی صحبت اخلاص اور صدق سے اختیار نہ کی جاوے	۱۸۱
۳۳۱۵	رسم و عادت سے نجات اور سچا اخلاص اور ایمان حاصل کرنے کی راہ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ	۱۸۲
۳۱۷	اعتراض کہ ۲۷ دسمبر کو ایک تاریخ پر جلسہ کے لیے آنے میں بدعت ہے کا جواب	۱۸۳
۳۲۱	صادق سے مراد وہ شخص ہے جس کی ہر بات صداقت اور راستی ہونے کے علاوہ اس کے ہر حرکات و سکنات و قول سب صدق سے بھرے ہوئے ہوں	۱۸۴
۳۲۷	یہ کہنا کہ ہمارے لیے قرآن اور احادیث کافی ہیں اور صحبت صادقین کی ضرورت نہیں یہ خود مخالفت تعلیم قرآن ہے	۱۸۵
۳۳۰	لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ - اَنْفُسُ کے لفظ میں ایک قراءت زبر کے ساتھ ہے	۱۸۶
۳۳۰	آیت لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَیْهِ الْخ میں عزیز اور حرلیص کے الفاظ میں اشارہ	۱۸۷
۳۳۱	رب العرش سے مراد	۱۸۸
۳۳۴	آریہ کا اعتراض کہ یہ چھ دن کی کیوں تخصیص ہے، کا جواب	۱۸۹
۳۴۲	فاسق ہیبت الہی کو مشاہدہ کر کے اپنی فاسقانہ چال چلن کو بدلا لیتا ہے اور بلا سے خلاصی کے بعد اپنی پہلی عادات کی طرف رجوع کر لیتا ہے	۱۹۰

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۳۴۲	سلسلہ محمدیہ سلسلہ موسویہ سے ہر یک نیکی اور بدی میں مشابہت رکھتا ہے	۱۹۱
	انبیاء نے اپنی کامل راستبازی کی قوی حجت پیش کر کے اپنے دشمنوں کو بھی	۱۹۲
۱۹۱	الزام دیا	
۳۴۹	خوبی جو شرط کے طور پر مامورین کے لیے ہے وہ نیک چال چلن ہے	۱۹۳
	جسمانی نظام کی کل بھی صدق ہی ہے۔ فی الحقیقت کذب اختیار کرنے	۱۹۴
۳۵۰	سے سے انسان کا دل تاریک ہو جاتا ہے	
۳۵۳	وعید کی پیشگوئیوں میں تعین نہیں ہوتا	۱۹۵
۳۵۴	یہ امر بالکل غلط ہے کہ اسلام میں قسم کھانا منع ہے	۱۹۶
۳۵۶	خیر کثیر سے مراد اسلام ہے	۱۹۷
	یہ صفات تو اولیاء کے ہوتے ہیں ان کی آنکھ، ہاتھ، پاؤں غرض کوئی عضو ہو	۱۹۸
۳۵۷	منشاء الہی کے خلاف حرکت نہیں کرتے	
	مسلمانوں کا خاصہ ہے کہ بد نسبت منکرین اسلام و کفار کے ان کو بکثرت	۱۹۹
۳۵۸	سچچو ابیں آتی ہیں	
	قرآن شریف مکالمہ مخاطبہ الہیہ کے سلسلہ کو بند نہیں کرتا جیسا کہ خود فرماتا	۲۰۰
۳۵۹	ہے لَهُمُ الْبَشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	
۳۶۲	جو امن کی حالت میں ڈرتا ہے وہ خوف کی حالت میں بچایا جاتا ہے	۲۰۱
	اَمْذَنْتُمْ لَآ اِلٰهَ اِلْحٰدِثِ سِوَا فِرْعَوْنَ كَوْصَرَفِ اَتِنَا فَاَنْدَهْ هُوَا كِهْ خَدَا نِي فَرْمَا يَا	۲۰۲
۳۶۲	تیرا بدن تو ہم بچائیں گے مگر تیری جان کو اب نہیں بچائیں گے	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۳۶۳	یونسؑ کا قصہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی عذاب شرط کے بغیر بھی تاخیر میں ڈال جاتا ہے	۲۰۳
۳۶۵	الذّر۔ الف سے مراد اللہ، ل سے مراد جبرائیل اور راء سے مراد رسل ہیں	۲۰۴
۳۶۵	قرآن کریم کی تعلیم کا استحکام (وجوہات احکام آیات قرآن)	۲۰۵
۳۶۸	انسان کی پیدائش کی علت غائی یہی عبادت ہے	۲۰۶
۳۷۰	دو چیزیں اس امت کو عطا فرمائی گئی ہیں ایک قوت حاصل کرنے کے واسطے دوسری حاصل کردہ قوت کو عملی طور پر دکھانے کے لیے	۲۰۷
۳۷۱	توبہ کی توفیق استغفار کے بعد ملتی ہے	۲۰۸
۳۷۲	كَانَ عَرَشُهُ عَلَى الْمَاءِ۔ خدا معلوم کہ اس کے نزدیک ماء کے کیا معنی ہیں۔ اس کی کنہ خدا کو معلوم ہے	۲۰۹
۳۷۳	قرآن شریف کامل اور بے مثل ہے جس کے مقابلہ کرنے سے کفار عاجز رہے	۲۱۰
۳۷۱	فَالَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّهُمْ أَنْزَلَ بِعِلْمِ اللَّهِ فِي بَرهَانِ انی کی طرز پر اثر کے وجود کو مؤثر کے وجود کی دلیل ٹھہرائی ہے	۲۱۱
۳۷۶	آیت اَسْتَوْتُ عَلَى الْجُودِيّ میں جودی کے معنی	۲۱۲
۳۷۶	سید صاحب کے قول کہ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے تمام دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے حالانکہ تمام دعائیں قبول نہیں ہوتیں کا جواب	۲۱۳
۳۷۷	حلیم وہ ہے جو يَبْلُغُوا الْحُلُمَ کا مصداق ہو اور حلم کے زمانہ تک پہنچے	۲۱۴
۳۷۸	فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ خدا نے مخلوقات کو سعادت اور شقاوت کے دو حصوں پر تقسیم کیا حسن اور قبح کو دو حصوں پر تقسیم نہ کیا اس کی حکمت	۲۱۵

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۳۸۰	کیا جہنمی نجات پائیں گے یا انہیں ہمیشہ عذاب میں چھوڑ دیا جائے گا	۲۱۶
	دوزخی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے لیکن نہ وہ ہمیشگی جو خدا کو ہے بلکہ دور دراز	۲۱۷
۳۸۲	مدت کے لحاظ سے	
	بہشت کے متعلق فرمایا کہ عطاء غیر محدود ایک ایسی نعمت جس کا انقطاع نہیں۔	۲۱۸
۳۸۶	لیکن برخلاف اس کے دوزخ کے متعلق ایسا نہیں	
	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ایک حکم نے کہ فَاسْتَقِمَّ كَمَا أُمِرْتَ	۲۱۹
۲۱۸	نے ہی بوڑھا کر دیا	
	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی ایک فعل کتاب ہے جو گو یا قرآن کریم	۲۲۰
۳۸۶	کی شرح اور تفسیر ہے	
۳۸۹	بعض لوگ باوجود نماز پڑھنے کے پھر بدیا کرتے ہیں اس کا جواب	۲۲۱
	إِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس سے انسان کی مجبوری لازم	۲۲۲
۳۹۰	آتی ہے غلط فہمی ہے	
	خدا تعالیٰ کسی کے منشا کے ماتحت نہیں چلتا ہے بلکہ وہ خدا ہے اور غَالِبٌ	۲۲۳
۳۹۳	عَلَىٰ أَمْرِهِ ہے	
	وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ میں أَشُدَّهُ سے مراد نبوت نہیں ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ	۲۲۴
۳۹۴	جب ہوش میں آیا	
۳۹۴	فطرۃ انسان کو شہوات نفسانیہ کا تعلق بہ نسبت مال کے تعلق بہت پیارا ہوتا ہے	۲۲۵
	رَبِّ السَّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ سے حضرت یوسف کی پاک	۲۲۶
۳۹۶	فطرت اور غیرت نبوت کا پتہ لگتا ہے	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	مصر کے بادشاہ نے حضرت یوسف کی پاک باطنی کو دیکھ کر کہہ باراں برس جیل خانہ	۲۲۷
۳۹۷	منظور کیا مگر بدکاری کی درخواست کو نہ مانا ان کو صدیق کو خطاب دیا	
۳۹۸	نفس کی تین قسمیں ہیں امارہ۔ لوائمہ۔ مطمئنہ	۲۲۸
۴۰۴	امارہ مبالغہ کا صیغہ ہے امارہ کہتے ہیں بہت بدی کا حکم کرنے والا	۲۲۹
	حضرت خاتم الانبیاء نے مکہ والوں پر بگلی فتح پا کر سب کو لا تَنْزِيْبَ عَلَيْكُمْ	۲۳۰
۴۰۵	الْيَوْمَ کہہ کر معاف کر دیا	
۴۰۸	حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کے فراق میں چالیس سال تک روتے رہے	۲۳۱
	تمام تر تلاش کے ایک ایسی حدیث مجھے نہ ملی جس میں توفی کے فعل کا خدا	۲۳۲
۴۱۰	فاعل ہو اور مفعول بہ علم ہو اور اس جگہ بجز مارنے کے کوئی اور معنی ہوں	
۴۱۱	قرآن ایسی کتاب نہیں کہ انسان اس کو بنا سکے بلکہ اس کے آثار صدق ظاہر ہیں	۲۳۳
	خدا سب کچھ پیدا کر کے پھر مخلوق کا عین نہیں ہے بلکہ سب سے الگ اور	۲۳۴
۴۱۳	وراء الوراہ مقام پر ہے	
	جو شخص چاہتا ہے کہ آسمان میں اس کے لیے تبدیلی ہو اس کا پہلا فرض یہ	۲۳۵
۴۱۶	ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی کرے۔	
۴۱۷	خدا تعالیٰ کی خالقیت اور وحدانیت کی دلیل	۲۳۶
	اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو درازی عمر کا وعدہ فرمایا ہے جو دوسرے لوگوں	۲۳۷
۴۲۱	کے لیے مفید ہیں	
	جو شخص دنیا کے لیے نفع رساں ہو اس کی عمر درازی کی جاتی ہے۔ اس پر جو یہ	۲۳۸
۴۲۱	اعتراض کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ کی عمر چھوٹی تھی۔ اس کا جواب	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۲۲	اعتراض کہ بعض مخالف اسلام بھی لمبی عمر حاصل کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے	۲۳۹
	احادیث میں جو آیا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں عمریں لمبی ہو جائیں گی	۲۴۰
۲۲۲	اس سے مراد	
۲۲۶	أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ کے عام معنی، اور اس کی حقیقت اور فلسفہ	۲۴۱
۲۲۹	بہشت کی لذات کی حقیقت	۲۴۲
۲۳۰	اللہ تعالیٰ کی ہستی بڑی بھاری شہادت ہے کہ محو اثبات اس کے ہاتھ میں ہے	۲۴۳
۲۳۱	سنت اللہ یہی ہے کہ ائمۃ الکفرانیر میں پکڑے جایا کرتے ہیں	۲۴۴
۲۳۱	پہلی کتابوں سے اجتہاد کرنا حرام نہیں ہے	۲۴۵

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## فہرست آیات جن کی تفسیر بیان ہوئی ہے

نمبر	آیت	صفحہ	نمبر	آیت	صفحہ
۵۱	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا...	۵۱	۵۲	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا...	۵۲
۵۲	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَكِبْ...	۵۲	۵۵	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَكِبْ...	۵۵
۵۳	قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرِّ مِنْ ذَلِكَ...	۵۳	۶۱	قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرِّ مِنْ ذَلِكَ...	۶۱
۵۴	وَتَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي...	۵۴	۶۳، ۶۴	وَتَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي...	۶۳، ۶۴
۵۴	وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَا اللَّهُ مَعْلُومَةٌ...	۵۴	۶۵	وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَا اللَّهُ مَعْلُومَةٌ...	۶۵
۵۶	يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ...	۵۶	۶۸	يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ...	۶۸
۵۷	قُلْ يَا هَلْ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ...	۵۷	۶۹	قُلْ يَا هَلْ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ...	۶۹
۵۸	لِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا...	۵۸	۷۰	لِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا...	۷۰
۶۳	مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ...	۶۳	۷۶	مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ...	۷۶
۷۰	لَتَجِدَنَّ أَشْدَّ مِنَ الْتَائِبِينَ عَدَاوَةً...	۷۰	۸۳	لَتَجِدَنَّ أَشْدَّ مِنَ الْتَائِبِينَ عَدَاوَةً...	۸۳
۷۰	وَإِذْ أَسْبَعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ...	۷۰	۸۴	وَإِذْ أَسْبَعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ...	۸۴
۷۱	وَمَا نَكُنَا لِنُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا...	۷۱	۸۵	وَمَا نَكُنَا لِنُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا...	۸۵
۷۱	لَا يُوَاقِدُكُمْ اللَّهُ بِاللُّغُوفِ فِي...	۷۱	۹۰	لَا يُوَاقِدُكُمْ اللَّهُ بِاللُّغُوفِ فِي...	۹۰
۷۱	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ...	۷۱	۹۱	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ...	۹۱
۷۲	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَن...	۷۲	۱۰۲	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَن...	۱۰۲
۷۳	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ...	۷۳	۱۰۶	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ...	۱۰۶
۷۵	يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ...	۷۵	۱۱۰	يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ...	۱۱۰
۷۶	إِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعْقِبِي ابْنَ مَرْيَمَ...	۷۶	۱۱۱	إِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعْقِبِي ابْنَ مَرْيَمَ...	۱۱۱
۷۶	قَالُوا بُرِيدٌ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا...	۷۶	۱۱۴	قَالُوا بُرِيدٌ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا...	۱۱۴
۷۷	قَالَ اللَّهُ إِنِّي مَنِّتُ عَلَيْكُمْ فَبِمَنْ...	۷۷	۱۱۶	قَالَ اللَّهُ إِنِّي مَنِّتُ عَلَيْكُمْ فَبِمَنْ...	۱۱۶
۷۸	وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعْقِبِي ابْنَ مَرْيَمَ...	۷۸	۱۱۷، ۱۱۸	وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعْقِبِي ابْنَ مَرْيَمَ...	۱۱۷، ۱۱۸
۱۲۰	قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ...	۱۲۰	۱۲۰	قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ...	۱۲۰
				<b>سورة المائدة</b>	
				يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِبُّوا شِعَارَ...	۳
				حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةُ وَالذَّمُّ...	۴
				يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أَحَلَّ لَهُمْ قُلْ...	۵
				الْيَوْمَ أَحَلَّ لَكُمْ الظَّيْبُ...	۶
				يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى...	۷
				يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَوْ تَوَلَّوْا قُلُوبَكُمْ...	۹
				فِيمَا نَقُضَهُمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ...	۱۴
				وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرَى أَخَذْنَا...	۱۵
				يَا هَلْ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا...	۱۶
				وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصْرَى نَحْنُ...	۱۹
				يَا هَلْ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا...	۲۰
				قَالُوا يَبُوسَى إِنَّا لَنَرُّكَ خَلْفَهَا أَدْبَارًا...	۲۵
				وَأَتَىٰ عَلَيْهِمْ نَبَأُ ابْنِي آدَمَ بِالْحَقِّ...	۲۸
				مِنَ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى...	۳۳
				إِنَّمَا أَجْرُ وَالَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ...	۳۴
				يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا...	۳۶
				وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ انْتَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ...	۴۷
				وَلِيُحْمَلَ أَهْلَ الْأَجْيَالِ بِمَا أُنزِلَ...	۴۸
				وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ...	۴۹

نمبر	آیت	صفحہ	نمبر	آیت	صفحہ
۶۴	قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتٍ.....	۱۴۳	<u>سورة الانعام</u>		
۶۶	قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ اَنْ يَّبْعَثَ.....	۱۴۳	۶	فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ.....	۱۴۳
۷۲	قُلْ اَدْعُو مِن دُونِ اللّٰهِ مَا.....	۱۴۴	۱۱	وَلَقَدْ اَسْتَهْزَيْتُمْ بِرُسُلِ مِّنْ قَبْلِكَ....	۱۴۳
۸۰	اِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ.....	۱۴۴	۱۲	قُلْ سِيرُوا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ اَنْظُرُوا.....	۱۴۳
۸۳	الَّذِينَ اٰمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ... ..	۱۴۶	۱۸	وَ اِنْ يَسْئَلْكُمُ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَاَكْفُرُوْا.....	۱۴۴
۸۸	وَمِنْ اٰبَائِهِمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ وَاخوانِهِمْ... ..	۱۴۸	۱۹	وَهُوَ الْفَاْهَرُ هُوَ قَوْقُبٌ عِبَادِهِ ۝ وَهُوَ.....	۱۴۴
۹۱	اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰى اللّٰهُ فَيَهْدِيْهِمْ.....	۱۴۹	۲۰	قُلْ اَتَىٰ شَيْءٌ اَكْبَرُ شَهَادَةً.....	۱۴۴
۹۲	وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِذْ.....	۱۵۱	۲۱	الَّذِيْنَ اٰتَيْنَهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهُ.....	۱۴۴
۹۳	وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبْرَكًا مُّصَدِّقًا... ..	۱۵۳	۲۲	وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ.....	۱۴۵
۱۰۱	وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنِّ وَخَلَقَهُمْ... ..	۱۵۸	۲۶	وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ.....	۱۴۹
۱۰۲	بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ اٰتٰى.....	۱۵۹	۲۸	وَلَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوا عَلَى الْبٰرِ فَقَالُوْا.....	۱۳۰
۱۰۴	لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۝ وَهُوَ يُدْرِكُ.....	۱۵۹	۳۱	وَلَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوا عَلَى رَبِّهِمْ.....	۱۳۰
۱۰۵	قَدْ جَاءَكُمْ بَصٰٓئِرٌ مِّنْ رَبِّكُمْ.....	۱۶۱	۳۵	وَلَقَدْ كَذَّبْتُمْ رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ.....	۱۳۰
۱۰۹	وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُونِ... ..	۱۶۲	۳۶	وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ.....	۱۳۱
۱۱۰	وَ اٰقْسُوا بِاِلٰهِكُمْ جِهَدًا اِيْمَانَهُمْ.....	۱۶۲	۳۸	وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ.....	۱۳۱
۱۱۱	وَ تَقَلَّبَ اِثْمُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ.....	۱۶۳	۳۹	وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طَيْرٍ.....	۱۳۲
۱۱۵	اَفَعَبَّرَ اللّٰهُ اَلْبَتَغٰى حِكْمًا وَهُوَ.....	۱۶۳	۴۲	بَلْ اِيَّاہُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا.....	۱۳۴
۱۱۷	وَ اِنْ تَطَّعْ اَكْثَرُ مَنْ فِي الْاَرْضِ.....	۱۶۵	۴۵	فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوْا بِهِ فَتَخَنَّا عَلَيْهِمْ... ..	۱۳۵
۱۱۸	وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْتُوْا مِمَّا ذُكِّرَ.....	۱۶۵	۴۶	فَقَطَّعَ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا.....	۱۳۵
۱۱۹	اَوْ مَنْ كَانَ مِيْتًا فَاحْيَيْنٰهُ.....	۱۶۵	۵۱	قُلْ لَّا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خِزٰٓئِيْنَ.....	۱۳۵
۱۲۰	وَ اِذَا جَاءَهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ.....	۱۶۵	۵۵	وَ اِذَا جَاءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ.....	۱۳۶
۱۲۱	اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَآتٍ ۝ وَ مَا.....	۱۶۸	۵۶	وَ كَذٰلِكَ نَقُصِّلُ الْاٰلِيَةَ.....	۱۳۶
۱۲۲	قُلْ يَقُوْمِ اَعْمَالُوْا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ.....	۱۶۹	۵۸	قُلْ اِنِّيْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّيْ.....	۱۳۷
۱۲۳	قُلْ لَّا اَجِدُ فِيْ مَا وُجِّدَ لِيْ.....	۱۶۹	۶۰	وَ عِنْدَهُ مَفَاتِيْحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا.....	۱۳۷
۱۲۴	وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادَوْا حَزْمًا كَثِيْرًا.....	۱۷۰	۶۱	وَ هُوَ الَّذِيْ يَوْمُ قُلُومِكُمْ بِاَنْبِيٰئِ.....	۱۳۷
۱۲۵	فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ.....	۱۷۱	۶۲	وَ هُوَ الْفَاْهَرُ هُوَ قَوْقُبٌ عِبَادِهِ.....	۱۳۹
۱۲۶	قُلْ تَعَالَوْا اَنْتُمْ مَّا حَرَمَ رَبُّكُمْ.....	۱۷۱			

نمبر	آیت	صفحہ	نمبر	آیت	صفحہ
۱۵۳	وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالْحَقِّ ....	۱۷۲	۵۹	وَالْبَدَلُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ ....	۲۲۵
۱۵۴	وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ ...	۱۷۲	۸۳	وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ ....	۲۲۶
۱۵۹	هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ .....	۱۷۲	۸۶	وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا .....	۲۲۶
۱۶۳	قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ ....	۱۷۲	۹۰	قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا ...	۲۲۶
۱۶۴	لَا شَرِيكَ لَكَ ۚ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ .....	۱۸۰	۹۵	وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرِيظٍ مِنْ نَبِيِّ .....	۲۲۷
۱۶۵	قُلْ أَغْيَبَ اللَّهُ آيَاتِي رَجَاءٌ وَرُبٌّ ...	۱۸۰	۱۰۲	تِلْكَ الْقُرَى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ .....	۲۲۷
۲	إِنِّي عَوَّامًا أَنْزِلُ الْبَيْكُمُ مِنْ رَبِّكُمْ ...	۱۸۷	۱۲۷	وَمَا تَنْقِمُهُمْ مِمَّا إِلَّا أَنْ أَمَّنَّا بِآيَاتِ ...	۲۲۷
۹	وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ ...	۱۸۷	۱۲۸	وَقَالَ الْمَلَكُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ .....	۲۲۸
	<b>سورة الاعراف</b>				
۱۳	قَالَ مَا مَنَعَكَ إِلَّا تَسْجُدَ لِمَا ...	۱۸۷	۱۲۹	قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اسْتَعْبُدُوا .....	۲۲۸
۱۶، ۱۵	قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ...	۱۹۰	۱۳۰	قَالُوا أَوْ ذِيْنَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا .....	۲۳۰
۲۴	فَلِلَّهِمَا بَعْرُورٌ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ ...	۱۹۰	۱۳۲	فَإِذَا جَاءَهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا .....	۲۳۲
۲۵	قَالَ اهْبُطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ...	۱۹۱	۱۳۳	وَوَعَدْنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً .....	۲۳۵
۲۶	قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ ...	۱۹۲	۱۳۴	وَلَمَّا جَاءَهُ مُوسَى لِمِيقَاتِنَا .....	۲۳۵
۲۷	يَدْبِقِي أَدَمَ ۚ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا ...	۱۹۸	۱۳۹	وَإِخْتَدَّ قَوْمٌ مِّنْ مُّوسَى مِنْ بَعْدِهِ مِنْ ...	۲۳۶
۳۰	قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۚ وَأَقِيمُوا ...	۲۰۰	۱۵۳	إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سِينًا لَهُمْ ...	۲۳۸
۳۲	يَدْبِقِي أَدَمَ ۚ حُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ ...	۲۰۱	۱۵۷	وَأَنْتَبْنَا لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً ...	۲۳۹
۳۴	قُلْ إِنَّهَا حَرَمٌ رَبِّي الْفَوَاحِشُ مَا ...	۲۰۳	۱۵۸	الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ ...	۲۴۰
۳۶	يَدْبِقِي أَدَمَ ۚ إِنَّمَا يَنْتَبِهَكُمْ رَسُولٌ ...	۲۰۳	۱۵۹	قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ ...	۲۴۲
۳۸	فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَى عَلَى ...	۲۰۴	۱۶۸	وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيُبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ ...	۲۵۰
۴۱	إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا ...	۲۰۵	۱۷۱	وَالَّذِينَ يَهْتَكُونَ بِلِكْنِبِ وَأَقَامُوا ...	۲۵۱
۴۴	وَنَرَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَيْلٍ ...	۲۰۷	۱۷۳	وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ .....	۲۵۱
۵۳	وَلَقَدْ جَنَّبَهُمْ بِكَتَابِ فَضْلِنَا عَلَى ...	۲۰۹	۱۷۷	وَكُوشِنًا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهَا ...	۲۵۵
۵۵	إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ ...	۲۰۹	۱۸۰	وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا ...	۲۵۶
۵۷	وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ .....	۲۲۲	۱۸۱	وَاللَّهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ .....	۲۵۸
۵۸	وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا ...	۲۲۲	۱۸۶	أَوْ لَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ ...	۲۵۹
			۱۸۸	يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ .....	۲۶۱
			۱۹۶	أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ...	۲۶۲

نمبر	آیت	صفحہ	نمبر	آیت	صفحہ
۱۹۷	إِنَّ رَبِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ	۲۶۳	۵۳	كَذَٰبٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَآلِهِ مِنْ	۲۸۱
۱۹۸	وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ	۲۶۶	۵۹	وَأَمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً	۲۸۱
۱۹۹	وَأَنَّ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى	۲۶۶	۶۱	وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ	۲۸۱
۲۰۰	خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ	۲۶۷	۶۲	وَأِنَّ جَحْشَاقِ السَّلِيمِ فَاجْتَنِّحْ	۲۸۷
۲۰۴	وَإِذَا لَمْ تَأْتَهُمْ بِأَيَّةٍ قَالُوا	۲۶۸	۶۳	وَأِنَّ يُرِيدُونَ أَن يُخَدِّعُواكَ	۲۸۸
۲	يَسْتَعْتُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ	۲۶۹	۶۴	وَأَلْفَ بَيْتٍ قَوْمِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ	۲۸۸
۸	وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى	۲۶۹	۲	فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ	۲۹۱
۹	لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ	۲۷۰	۶	وَأَنَّ أَحَدًا مِنَ الْمُشْرِكِينَ	۲۹۱
۱۳	إِذْ يُوجِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلِكَةِ	۲۷۰	۷	كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ	۲۹۲
			۱۰	لَا يُرْفَعُونَ فِي مَوْتِهِمْ إِلَّا وَلَا	۲۹۲
			۱۳، ۱۲	وَأَنَّ تَكْفُرًا أَيَّامًا نَهْمٌ مِنْ بَعْدِ	۲۹۲
<b>سورة الانفال</b>					
۱۸	فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ	۲۷۰			
۱۹	ذَلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنٌ كَرِيمٌ	۲۷۱			
۲۴	وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا	۲۷۱	۲۴	قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ	
۲۵	يَأْتِيهِمُ الَّذِينَ آمَنُوا	۲۷۲	۲۹	قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	۲۹۶
۲۹	وَأَعْلَمُوا أَنبَاءَ أَمْوَالِكُمْ	۲۷۲	۳۰	وَقَالَتِ الْيَهُودُ عِزِّي بِأَنَّ اللَّهَ	۲۹۸
۳۰	أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا	۲۷۳	۳۱	إِتَّخَذَ وَالْأَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	۳۰۰
۳۱	وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا	۲۷۵	۳۲	يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ	۳۰۱
۳۲	وَإِذْ اتَّخَذْتُمْ عَلَيْهِمْ إِيْتِنَانًا	۲۷۶	۳۳	هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى	۳۰۱
۳۴	وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ	۲۷۷	۳۴	يَأْتِيهِمُ الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ كُنْتُمْ	۳۰۳
۳۵	وَمَا لَهُمْ آلٌ يَعْتَبِرُهُمْ	۲۷۷	۴۰	إِلَّا تَنْصَرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ	۳۰۴
۳۷	إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ	۲۷۸	۴۱	إِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا	۳۰۷
۴۰	وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ	۲۷۸	۵۱	قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ	۳۰۷
۴۳	إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدَّةِ الدُّنْيَا	۲۷۹	۵۴	وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ	۳۰۸
۴۶	يَأْتِيهِمُ الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا	۲۷۹	۶۰	إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ	۳۰۸
۴۷	وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ	۲۸۰	۶۳	الَّذِينَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مَنْ يُحَادِدِ	۳۰۹
۴۸	وَلَا تَتَّبِعُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا	۲۸۰	۷۲	وَعَدَّ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ	۳۰۹

**سورة التوبة**

نمبر	آیت	صفحہ	نمبر	آیت	صفحہ
۷۳	يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ .....	۳۰۹	۲۵	إِنَّمَا مَثَلُ الْحُبُوبِ الدُّنْيَا كَمَاءٌ .....	۳۵۲
۸۱	فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ .....	۳۱۰	۲۷	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا احْسِنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ .....	۳۵۲
۸۲	فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلَا تَبْكُوا كَثِيرًا .....	۳۱۱	۲۸	وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ .....	۳۵۲
۹۸	وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا .....	۳۱۱	۳۷	وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظُلْمًا .....	۳۵۳
۱۰۰	وَالشَّيْقُونَ الْأَوْلُونَ مِنْ .....	۳۱۳	۵۰، ۴۹	وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِنْ .....	۳۵۳
۱۰۳	خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ .....	۳۱۳	۵۴	وَيَسْتَدْعُونَكَ أَحَقُّ هُوَ قُلْ إِنْ .....	۳۵۴
۱۱۲	الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ الْعَهْدَ وَالْحَدِيثَ .....	۳۱۴	۵۸	يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَ تَكْوِينُ مَوْعِدَةٍ .....	۳۵۵
۱۱۶	إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ .....	۳۱۴	۵۹	قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ .....	۳۵۶
۱۱۹	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ .....	۳۱۵	۶۳	إِلَّا إِنْ أَوْلِيَاءُ اللَّهِ لَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ .....	۳۵۶
۱۲۰	مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ .....	۳۲۸	۶۵، ۶۴	الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ .....	۳۵۸
۱۲۲	وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا .....	۳۲۹	۶۹	قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَكَدًّا سُبْحَانَهُ .....	۳۶۲
۱۲۸	لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ .....	۳۲۹	۹۱	وَجُوزَانًا بِبَيْتِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ .....	۳۶۲
۱۲۹	فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ .....	۳۳۱	۹۹	فَقُلْ لَا كَانَتْ قَرِيبَةً أَمَنْتُ فَنَفَعَهَا .....	۳۶۲
۲	الرَّحْمَنُ الَّذِي آتَى الْكُتُبَ الْحَكِيمَ .....	۳۳۳	۱۰۰	وَكُوَيْشَاءَ رَبِّكَ لِأَمَنٍ مَنْ فِي .....	۳۶۳
۳	أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا .....	۳۳۳	۲	الرَّحْمَنُ الَّذِي كَتَبَ الْحِكْمَةَ آيَاتِهِ ثُمَّ .....	۳۶۵
۴	إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ .....	۳۳۴	۳	إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ الرَّحْمَنَ الرَّحِيمَ .....	۳۶۸
۱۳	وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا .....	۳۴۲	۴	وَإِنْ اسْتَعْفَرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تَوَلَّوْا .....	۳۷۰
۱۵	ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ .....	۳۴۳	۷	وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى .....	۳۷۱
			۸	وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ .....	۳۷۲
			۱۵	قَالَهُمْ يُسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَأَعْلَمُوا .....	۳۷۲
<b>سورة يونس</b>					
۱۶	وَإِذْ أَثَرْنَا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا كَالْبَحْنِ .....	۳۴۵			
۱۷	قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُمْ عَلَيْكُمْ .....	۳۴۵			
۱۸	فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ .....	۳۵۰	۳۸	وَأَصْنَعُ الْفُلَكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا .....	۳۷۴
۲۱	وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا آيَةٌ .....	۳۵۱	۴۲	وَقَالَ ادْكُوبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ .....	۳۷۵
۲۳	هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ .....	۳۵۱	۴۴	قَالَ سَأُوْتَىٰ إِلَىٰ جَنبِ يَعْصِمُنِي .....	۳۷۵
۲۴	فَلَمَّا أَجَّهُمْ إِذَا هُمْ يُبْعَثُونَ .....	۳۵۱	۴۵	وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ .....	۳۷۵
<b>سورة هود</b>					

صفحہ	آیت	نمبر	صفحہ	آیت	نمبر
۴۰۵	قَالُوا لَئِن لَّمْ يَكُن لَّهُ آيَاتٌ...	۹۱	۳۷۶	قَالَ يٰمُوحِ اِنَّكَ لَكَيِّسٌ مِّنْ اٰهْلِكَ ...	۴۷
۴۰۵	قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ ...	۹۳	۳۷۷	مِنْ دُوْنِهِ فَكَيْدٌ وَّفِيْ جَبِيْعًا ثُمَّ ...	۵۶
۴۰۷	وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اٰبُوْهُمُ ...	۹۵	۳۷۷	قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصْلُوْنَاكَ تَاْمُرُكَ ...	۸۸
۴۰۹	قَالُوْا تَاْلَهُ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْرِ ...	۹۶	۳۷۷	وَيَقُوْمُوْا اَعْمٰلُوْا عَلٰی مَكَاتِبِكُمْ ...	۹۴
۴۰۹	رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمَلِكِ ...	۱۰۲	۳۷۸	يَوْمَ يٰاَيُّهَا لَوْ كُنَّا كَمَنْ نَفْسٌ اِلَّا ...	۱۰۶
۴۱۰	قُلْ هٰذِهِ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ ...	۱۰۹	۳۸۰	خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ ...	۱۰۸
۴۱۰	حَتّٰى اِذَا سُئِلَسِ الرَّسُوْلُ وَطَلُوْا ...	۱۱۱	۳۸۵	وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُوْعُوْا فِى الْجَنَّةِ ...	۱۰۹
۴۱۱	لَقَدْ كَانَ فِى قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ ...	۱۱۲	۳۸۶	فَاَسْتَفِيْهُمُ كَمَا اَمَرْتُ وَمَنْ ...	۱۱۳
۴۱۳	اللّٰهُ الَّذِى رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ ...	۳	۳۸۷	وَاَفْوَجِ السَّلٰوَةَ طَرَفِى النَّهَارِ ...	۱۱۵
۴۱۴	لَهُ مُعْجِبٰتٌ مِّنْ بَلَدِ يَدٰىهِ ...	۱۲	۳۸۹	وَاَصْدِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ ...	۱۱۶
۴۱۶	لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ ...	۱۵	۳۹۰	اِلَّا مَن رَّجِمَ رَبُّكَ لِوَالِدَيْكَ ...	۱۲۰
۴۱۷	قُلْ مَن رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...	۱۷	۳۹۰	وَاللّٰهُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...	۱۲۴
۴۱۹	اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسَالَتْ ...	۱۸	۳۹۳	وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰهُ مِنْ مُّجْرَمٍ ...	۲۲
۴۲۵	وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ ...	۲۲	۳۹۴	وَلَمَّا بَلَغَ اَشْدَآءُ اٰتِيْنَهُ حٰكِمًا ...	۲۳
	<b>سورة الرعد</b>		۳۹۴	وَلَقَدْ هَمَمْتُ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لُوْ ...	۲۵
			۳۹۴	قَالَ هِيَ رَاوَدْتَنِيْ عَن نَّفْسِيْ ...	۲۷
۴۲۵	وَالَّذِيْنَ صَبَرُوْا بِتَبٰعٍ وَّجْهٍ ...	۲۳	۳۹۵	فَلَمَّا رَاَوْفِيْصَةً قُلٌّ مِّنْ دُوْرِ ...	۲۹
۴۲۵	الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكُتِبَ عَلَيْهِمْ قُلُوْبُهُمْ ...	۲۹	۳۹۵	فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ ...	۳۲
۴۲۶	وَلَوْ اَن قُرْاٰنًا سُوِّرَتْ بِهٖ ...	۳۲			
۴۲۸	وَلَقَدْ اَسْتَهْيٰى بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ ...	۳۳			
۴۲۸	اَلَمَنْ هُوَ قَابِئُكُمْ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ ...	۳۴	۳۹۶	قَالَ رَبِّ الْمِتْسُوْنَ اَحَبُّ اِلَىَّ ...	۳۴
۴۲۹	مِثْلَ الْجُمَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُشْكُوْنَ ...	۳۶	۳۹۷	يُوْسُفُ اِيَّهَا الصِّدِّيْقُ اَقْرَبْنَا فِيْ ...	۴۷
۴۳۰	يَمْحُوْهُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُعْذِبُ ...	۴۰	۳۹۷	وَمَا اَبْرِئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ ...	۵۴
۴۳۰	وَاِن مَّا تَرٰكَ يَكْفِيْكَ بَعْضُ الَّذِى ...	۴۱	۴۰۴	وَقَالَ الْمَلِكُ اِنُّوْفِيْ بِهٖ ...	۵۵
۴۳۰	اَوْ لَمَّا يَبْرُوْا اَنَّا نَا تِى الْاَرْضِ ...	۴۲	۴۰۴	فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلٰى اٰبِيْهِمْ قَالُوْا ...	۶۴
۴۳۱	وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ ...	۴۴	۴۰۵	يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِّنْ ...	۸۸

## سورة يوسف

قَالَ رَبِّ الْمِتْسُوْنَ اَحَبُّ اِلَىَّ

يُوْسُفُ اِيَّهَا الصِّدِّيْقُ اَقْرَبْنَا فِيْ

وَمَا اَبْرِئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنُّوْفِيْ بِهٖ

فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلٰى اٰبِيْهِمْ قَالُوْا

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِّنْ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

# تفسیر سورة المائدة

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَلُّوْا شَعَائِرَ اللّٰهِ وَلَا الشُّهُرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهُدٰى وَلَا  
الْقَلَائِدَ وَلَا اَمْمِيْنَ الْبَيْتِ الْحَرَامِ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۗ وَاِذَا  
حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۗ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ  
اَنْ تَعْتَدُوْا ۗ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۗ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدُوَانِ ۗ وَ  
اتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٥﴾

منجملہ انسان کے طبعی امور کے جو اس کی طبیعت کے لازم حال ہیں۔ ہمدردی خلق کا ایک جوش ہے۔ قومی  
حمایت کا جوش بالطبع ہر ایک مذہب کے لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اکثر لوگ طبعی جوش سے اپنی قوم کی  
ہمدردی کے لئے دوسروں پر ظلم کر دیتے ہیں۔ گویا انہیں انسان نہیں سمجھتے۔ سو اس حالت کو خلق نہیں کہہ سکتے۔  
یہ فقط ایک طبعی جوش ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حالت طبعی کوؤں وغیرہ پرندوں میں بھی پائی جاتی ہے  
کہ ایک کوئے کے مرنے پر ہزار ہا کوئے جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ عادت انسانی اخلاق میں اُس وقت داخل  
ہوگی جب کہ یہ ہمدردی انصاف اور عدل کی رعایت سے محل اور موقع پر ہو۔ اُس وقت یہ ایک عظیم الشان خلق  
ہوگا جس کا نام عربی میں مواسات اور فارسی میں ہمدردی ہے۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہ قرآن شریف میں

اشارہ فرماتا ہے: تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ..... یعنی اپنی قوم کی ہمدردی اور اعانت فقط نیکی کے کاموں میں کرنی چاہئے اور ظلم اور زیادتی کے کاموں میں ان کی اعانت ہرگز نہیں کرنی چاہئے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۳)

انسان کی ظاہری بناوٹ اس کے دو ہاتھ، دو پاؤں کی ساخت ایک دوسرے کی امداد کا ایک قدرتی راہ نما ہے۔ جب یہ نظارہ خود انسان میں موجود ہے پھر کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ وہ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوَىٰ کے معنی سمجھنے میں مشکلات کو دیکھے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲/۱۲ پر اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۶)

یہ دستور ہونا چاہیے کہ کمزور بھائیوں کی مدد کی جاوے اور ان کو طاقت دی جاوے یہ کس قدر نامناسب بات ہے کہ دو بھائی ہیں ایک تیرنا جانتا ہے اور دوسرا نہیں تو کیا پہلے کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے کو ڈوبنے سے بچاوے یا اس کو ڈوبنے دے؟ اس کا فرض ہے کہ اس کو غرق ہونے سے بچائے اسی لیے قرآن شریف میں آیا ہے: تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوَىٰ - کمزور بھائیوں کا بار اٹھاؤ۔ عملی، ایمانی اور مالی کمزوریوں میں بھی شریک ہو جاؤ۔ بدنی کمزوریوں کا بھی علاج کرو، کوئی جماعت جماعت نہیں ہو سکتی جب تک کمزوروں کو طاقت والے سہارا نہیں دیتے اور اس کی یہی صورت ہے کہ ان کی پردہ پوشی کی جاوے۔ صحابہ کو یہی تعلیم ہوئی کہ نئے مسلمانوں کی کمزوریاں دیکھ کر نہ چڑو کیونکہ تم بھی ایسے ہی کمزور تھے۔ اسی طرح یہ ضرور ہے کہ بڑا چھوٹے کی خدمت کرے اور محبت ملائمت کے ساتھ برتاؤ کرے۔

دیکھو! وہ جماعت جماعت نہیں ہو سکتی جو ایک دوسرے کو کھائے اور جب چار مل کر بیٹھیں تو ایک اپنے غریب بھائی کا گلہ کریں اور نکتہ چینیاں کرتے رہیں اور کمزوروں اور غریبوں کی حقارت کریں اور ان کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھیں ایسا ہرگز نہیں چاہیے بلکہ اجماع میں چاہیے کہ قوت آ جاوے اور وحدت پیدا ہو جاوے جس سے محبت آتی ہے اور برکات پیدا ہوتے ہیں.... کیوں نہیں کیا جاتا ہے کہ اخلاقی قوتوں کو وسیع کیا جاوے اور یہ تب ہوتا ہے کہ جب ہمدردی، محبت اور عفو اور کرم کو عام کیا جاوے اور تمام عادتوں پر رحم اور ہمدردی، پردہ پوشی کو مقدم کر لیا جاوے۔ ذرا ذرا سی بات پر ایسی سخت گرفتیں نہیں ہونی چاہیے جو دل شکنی اور رنج کا موجب ہوتی ہیں۔..... جماعت تب بنتی ہے کہ بعض بعض کی ہمدردی کرے، پردہ پوشی کی جاوے۔ جب یہ حالت پیدا ہو تب ایک وجود ہو کر ایک دوسرے کے جوارح ہو جاتے ہیں اور اپنے تئیں حقیقی بھائی سے بڑھ کر سمجھتے ہیں.... خدا تعالیٰ نے صحابہ کو بھی یہی طریق و نعمت اخوت یاد دلائی

ہے۔ اگر وہ سونے کے پہاڑ بھی خرچ کرتے تو وہ اخوت ان کو نہ ملتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کو ملی۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور اسی قسم کی اخوت وہ یہاں قائم کرے گا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۰۲ صفحہ ۲، ۳)

انسان کی کمزوریاں جو ہمیشہ اس کی فطرت کے ساتھ لگی ہوئی ہیں ہمیشہ اس کو تمدن اور تعاون کا محتاج رکھتی ہیں اور یہ حاجت تمدن اور تعاون کی ایک ایسا بدیہی امر ہے کہ جس میں کسی عاقل کو کلام نہیں خود ہمارے وجود کی ہی ترکیب ایسی ہے کہ جو تعاون کی ضرورت پر اوّل ثبوت ہے۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں اور کان اور ناک اور آنکھ وغیرہ اعضاء اور ہماری سب اندرونی اور بیرونی طاقتیں ایسی طرز پر واقع ہیں کہ جب تک وہ باہم مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں تب تک افعال ہمارے وجود کے علی مجری الصحت ہرگز جاری نہیں ہو سکتے اور انسانیت کی کل ہی معطل پڑی رہتی ہے۔ جو کام دو ہاتھ کے ملنے سے ہونا چاہیے وہ محض ایک ہی ہاتھ سے انجام نہیں ہو سکتا اور جس راہ کو دو پاؤں مل کر طے کرتے ہیں وہ فقط ایک ہی پاؤں سے طے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تمام کام میانی ہماری معاشرت اور آخرت کے تعاون پر ہی موقوف ہو رہی ہے۔ کیا کوئی اکیلا انسان کسی کام دین یا دنیا کو انجام دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کوئی کام دینی ہو یا دنیوی بغیر معاونت باہمی کے چل ہی نہیں سکتا۔ ہر ایک گروہ کہ جس کا مدعا اور مقصد ایک ہی مثل اعضاء کے یک دیگر ہے اور ممکن نہیں جو کوئی فعل جو متعلق غرض مشترک اس گروہ کے ہے بغیر معاونت باہمی ان کی کے بخوبی و خوش اسلوبی ہو سکے۔ بالخصوص جس قدر جلیل القدر کام ہیں اور جن کی علت غائی کوئی فائدہ عظیمہ جمہوری ہے وہ تو بجز جمہوری اعانت کے کسی طور پر انجام پذیر ہی نہیں ہو سکتے اور صرف ایک ہی شخص ان کا متحمل ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی ہوا۔ انبیاء علیہم السلام جو توکل اور تفویض اور تحمل اور مجاہدات افعال خیر میں سب سے بڑھ کر ہیں ان کو بھی بہ رعایت اسباب ظاہری مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ (ال عمران: ۱۵۳ اور الصف: ۱۵) کہنا پڑا۔ خدا نے بھی اپنے قانون تشریحی میں بہ تصدیق اپنے قانون قدرت کے تَعَاوَنًا عَلَى الْيُوبَىٰ وَالتَّقْوَىٰ کا حکم فرمایا۔

(مجموعہ اشتہارات جلد اول صفحہ ۵۱)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهْلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَ  
الْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَيْتُمْ

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النَّصِيبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِبُوا بِالْأَزْلَامِ ۗ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ الْيَوْمَ يَكْسِبُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنَ ۗ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۗ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْصَصَةٍ غَيْرٍ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمِهِ ۗ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۶﴾

مردار مت کھاؤ۔ خنزیر کا گوشت مت کھاؤ۔ بتوں کے چڑھاوے مت کھاؤ۔ لالچی سے مارا ہوا مت کھاؤ۔  
 گر کے مرا ہوا مت کھاؤ۔ سینگ لگنے سے مرا ہوا مت کھاؤ۔ درندہ کا پھاڑا ہوا مت کھاؤ۔ بت پر چڑھایا ہوا  
 مت کھاؤ کیونکہ یہ سب مردار کا حکم رکھتے ہیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳۶)

ایک نکتہ اس جگہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ خنزیر جو حرام کیا گیا ہے۔ خدا نے ابتدا سے اس  
 کے نام میں ہی حرمت کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ خنزیر کا لفظ خنز اور آر سے مرکب ہے جس کے یہ معنی  
 ہیں کہ میں اس کو بہت فاسد اور خراب دیکھتا ہوں۔ خنز کے معنی بہت فاسد اور ار کے معنی دیکھتا ہوں۔  
 پس اس جانور کا نام جو ابتداء سے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے وہی اس کی پلیدی پر دلالت کرتا ہے اور  
 عجیب اتفاق یہ ہے کہ ہندی میں اس جانور کو سور کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی سوء اور آر سے مرکب ہے جس کے  
 معنی یہ ہیں کہ میں اس کو بہت برا دیکھتا ہوں۔ اس سے تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ سوء کا لفظ عربی کیوں کر ہو سکتا  
 ہے۔ کیونکہ ہم نے اپنی کتاب من الرحمن میں ثابت کیا ہے کہ تمام زبانوں کی ماں عربی زبان ہے اور عربی کے  
 لفظ ہر ایک زبان میں نہ ایک دو بلکہ ہزاروں ملے ہوئے ہیں۔ سو سوء عربی لفظ ہے۔ اسی لئے ہندی میں  
 سوء کا ترجمہ ”بد“ ہے۔ پس اس جانور کو بد بھی کہتے ہیں۔ اس میں کچھ بھی شک معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اس  
 زمانہ میں جبکہ تمام دنیا کی زبان عربی تھی۔ اس ملک میں یہ نام اس جانور کا عربی میں مشہور تھا جو خنزیر کے نام  
 کے ہم معنی ہے پھر اب تک یادگار باقی رہ گیا۔ ہاں! یہ ممکن ہے کہ شاستری میں اس کے قریب قریب یہی لفظ  
 متغیر ہو کر اور کچھ بن گیا ہو۔ مگر صحیح لفظ یہی ہے کیونکہ اپنی وجہ تسمیہ ساتھ رکھتا ہے۔ جس پر لفظ خنزیر گواہ ناطق  
 ہے اور یہ معنی جو اس لفظ کے ہیں یعنی بہت فاسد۔ اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ اس بات کا کس کو علم نہیں کہ  
 یہ جانور اول درجہ کا نجاست خور اور نیز بے غیرت اور دیوث ہے۔ اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے  
 کہ قانون قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بھی بدن اور روح پر بھی پلید ہی ہو

کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ غذاؤں کا بھی انسان کی روح پر ضرور اثر ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بدکا اثر بھی بد ہی پڑے گا۔ جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصیت حیا کی قوت کو کم کرتا ہے اور دیوثی کو بڑھاتا ہے اور مردار کا کھانا بھی اسی لئے اس شریعت میں منع ہے کہ مردار بھی کھانے والے کو اپنے رنگ میں لاتا ہے اور نیز ظاہری صحت کیلئے بھی مضر ہے اور جن جانوروں کا خون اندر ہی رہتا ہے جیسے گلا گھونٹا ہوا یا لٹھی سے مارا ہوا۔ یہ تمام جانور درحقیقت مردار کے حکم میں ہی ہیں۔ کیا مردہ کا خون اندر رہنے سے اپنی حالت پر رہ سکتا ہے؟ نہیں! بلکہ وہ بوجہ مرطوب ہونے کے بہت جلد گندہ ہوگا اور اپنی عفونت سے تمام گوشت کو خراب کرے گا اور نیز خون کے کیڑے جو حال کی تحقیقات سے بھی ثابت ہوئے ہیں مرکز ایک زہرناک عفونت بدن میں پھیلا دیں گے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳۸، ۳۳۹)

الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا آجَ كَافِرِيكُنَا اميد ہوگئی گویا آپ کو کامیابی کے اس اعلیٰ نقطہ تک پہنچا دیا کہ کافر نامراد ہو گئے کیا انجیل میں اس کے مقابل کوئی آیت ہے؟ ہرگز نہیں!

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (الجزء نمبر ۶) یعنی آج میں نے اس کتاب کے نازل کرنے سے علم دین کو مرتبہ کمال تک پہنچا دیا اور اپنی تمام نعمتیں ایمانداروں پر پوری کر دیں۔  
(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

آج میں نے علم دین کو مرتبہ کمال تک پہنچا دیا اور اپنی نعمت کو امت محمدیہ پر پورا کیا۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۴۳۵، ۴۳۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

میرا یہ مذہب نہیں ہے کہ قرآن ناقص ہے اور حدیث کا محتاج ہے بلکہ وہ الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ کا تاج لازوال اپنے سر پر رکھتا ہے اور تَبْيِئَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل: ۹۰) کے وسیع اور مرصع تخت پر جلوہ افروز ہے قرآن میں نقصان ہرگز نہیں اور وہ داغ نام تمام اور ناقص ہونے سے پاک ہے۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۰۶)

آج میں نے تمہارے لیے دین تمہارا کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو پسندیدہ کر لیا۔  
(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۸۶)

قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ میں کامل کتاب ہوں جیسا کہ فرماتا ہے: الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ

وَ اتَّيَمَّمْتُمْ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي... آج میں نے دین تمہارا تمہارے لئے کامل کیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کیا۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۹۸)

اللہ جل شانہ نے قرآن کریم میں اپنی کمال تعلیم کا آپ دعویٰ فرمایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے: الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اتَّيَمَّمْتُمْ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي الخ کہ آج میں نے تمہارے لئے دین تمہارا کامل کیا اور اپنی نعمت یعنی تعلیم قرآنی کو تم پر پورا کیا اور ایک دوسرے محل میں اس اکمال کی تشریح کے لئے کہ اکمال کس کو کہتے ہیں فرماتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُوْتِيْ اُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۝ وَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ اِجْتَثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝ يَثْبُتُ اللَّهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۝ وَ يُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِيْنَ ۝ (ابراہیم: ۲۸۲-۲۵) (س ۱۳-۱۲)

کیا تو نے نہیں دیکھا کیوں کہ بیان کی اللہ نے مثال یعنی مثال دین کامل کی کہ بات پاکیزہ درخت پاکیزہ کی مانند ہے جس کی جڑ ثابت ہو اور شاخیں اس کی آسمان میں ہوں اور وہ ہر ایک وقت اپنا پھل اپنے پروردگار کے حکم سے دیتا ہو اور یہ مثالیں اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تا لوگ ان کو یاد کر لیں اور نصیحت پکڑ لیں اور ناپاک کلمہ کی مثال اس ناپاک درخت کی ہے جو زمین پر سے اُکھڑا ہوا ہے اور اس کو قرار و ثبات نہیں۔ سو اللہ تعالیٰ مومنوں کو قول ثابت کے ساتھ یعنی جو قول ثابت شدہ اور مدلل ہے اس دنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم کرتا ہے اور جو لوگ ظلم اختیار کرتے ہیں ان کو گمراہ کرتا ہے یعنی ظالم خدا تعالیٰ سے ہدایت کی مدد نہیں پاتا جب تک ہدایت کا طالب نہ ہو۔... کسی آیت کے وہ معنی کرنے چاہئے کہ الہامی کتاب آپ کرے اور الہامی کتاب کی شرح دوسری شرحوں پر مقدم ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ان آیات میں کلام پاک اور مقدس کا کمال تین باتوں پر موقوف قرار دیتا ہے؛ اول یہ کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ یعنی اصول ایمانیہ اس کے ثابت اور محقق ہوں اور فی حِدِّ ذَاتِهِ یَقِيْنُ کَامِلٌ کے درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں اور فطرت انسانی اس کو قبول کرے کیونکہ ارض کے لفظ سے اس جگہ فطرت انسانی مراد ہے جیسا کہ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ کا لفظ صاف بیان کر رہا ہے..... خلاصہ یہ کہ اصول ایمانیہ ایسے چاہئیں کہ ثابت شدہ اور انسانی فطرت کے موافق ہوں۔ پھر دوسری نشانی کمال کی یہ فرماتا ہے کہ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ یعنی اس کی شاخیں آسمان پر ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں یعنی صحیفہ قدرت کو غور کی نگاہ سے مطالعہ کریں تو اس کی

صداقت ان پر کھل جائے اور دوسری یہ کہ وہ تعلیم یعنی فروعات اس تعلیم کے جیسے اعمال کا بیان، احکام کا بیان، اخلاق کا بیان، یہ کمال درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں جس پر کوئی زیادہ متصور نہ ہو جیسا کہ ایک چیز جب زمین سے شروع ہو کر آسمان تک پہنچ جائے تو اس پر کوئی زیادہ متصور نہیں۔

پھر تیسری نشانی کمال کی یہ فرمائی کہ **تُوْتِيْ اُكْلَهَا كَلَّ جَبِيْنٍ** ہر ایک وقت اور ہمیشہ کے لئے وہ اپنا پھل دیتا رہے ایسا نہ ہو کہ کسی وقت خشک درخت کی طرح ہو جاوے جو پھل پھول سے بالکل خالی ہے۔ اب صاحبو! دیکھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمودہ **اَللّٰهُمَّ اَكْمَلْتُ كِي تَشْرَحْ** آپ ہی فرمادی کہ اس میں تین نشانوں کا ہونا از بس ضروری ہے۔ سو جیسا کہ اس نے یہ تین نشانیاں بیان فرمائی ہیں اسی طرح پر اس نے ان کو ثابت کر کے بھی دکھلایا ہے اور اصول ایمانیہ جو پہلی نشانی ہے جس سے مراد کلمہ **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** ہے اس کو اس قدر بسط سے قرآن شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ اگر میں تمام دلائل لکھوں تو پھر چند جزو میں بھی ختم نہ ہوں گے مگر تھوڑا سا ان میں سے بطور نمونہ کے ذیل میں لکھتا ہوں جیسا کہ ایک جگہ یعنی سپارہ دوسرے، سورة البقرہ میں فرماتا ہے: **اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالثَّمَرٰتِ وَالْغُلُوْغِ الَّذِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْيَا بِهٖ الْاَرْضَۢ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۗ وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ** (البقرہ: ۱۶۵) یعنی تحقیق آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے اختلاف اور ان کشتیوں کے چلنے میں جو دریا میں لوگوں کے نفع کے لئے چلتی ہیں اور جو کچھ خدا نے آسمان سے پانی اتارا اور اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کیا اور زمین میں ہر ایک قسم کے جانور بکھیر دیئے اور ہواؤں کو پھیرا اور بادلوں کو آسمان اور زمین میں مسخر کیا۔ یہ سب خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید اور اس کے الہام اور اس کے مدبر بالارادہ ہونے پر نشانات ہیں۔ اب دیکھئے اس آیت میں اللہ جل شانہ نے اپنے اس اصول ایمانی پر کیسا استدلال اپنے اس قانون قدرت سے کیا یعنی اپنی ان مصنوعات سے جو زمین و آسمان میں پائی جاتی ہیں جن کے دیکھنے سے مطابق منشاء اس آیت کریمہ کے صاف صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بیشک اس عالم کا ایک صالح قدیم اور کامل اور وحدہ لا شریک اور مدبر بالارادہ اور اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجنے والا ہے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کی تمام یہ مصنوعات اور یہ سلسلہ نظام عالم کا جو ہماری نظر کے سامنے موجود ہے۔ یہ صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ یہ عالم خود بخود نہیں بلکہ اس کا ایک موجد اور صانع ہے جس کے لئے یہ ضروری صفات ہیں کہ وہ رحمان بھی ہو

اور رحیم بھی ہو اور قادر مطلق بھی ہو اور واحد لا شریک بھی ہو اور ازلی ابدی بھی ہو اور مدبر بالا رادہ بھی ہو اور مستجمع جمیع صفات کاملہ بھی ہو اور وحی کو نازل کرنے والا بھی ہو۔

دوسری نشانی یعنی فَرَعَهَا فِي السَّمَاءِ جس کے معنی یہ ہیں کہ آسمان تک اس کی شاخیں پہنچی ہوئی ہیں اور آسمان پر نظر ڈالنے والے یعنی قانون قدرت کے مشاہدہ کرنے والے اس کو دیکھ سکیں اور نیز وہ انتہائی درجہ کی تعلیم ثابت ہو۔ اس کے ثبوت کا ایک حصہ تو اسی آیت موصوفہ بالا سے پیدا ہوتا ہے، کس لئے کہ جیسا کہ اللہ جل شانہ نے مثلاً قرآن کریم میں یہ تعلیم بیان فرمائی ہے کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ (الفاتحہ: ۲ تا ۴) جس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ جل شانہ تمام عالموں کا رب ہے یعنی علت العلل ہر ایک ربوبیت کا وہی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ رحمان بھی ہے یعنی بغیر ضرورت کسی عمل کے اپنی طرف سے طرح طرح کے آلاء اور نعماء شامل حال اپنی مخلوق کے رکھتا ہے اور رحیم بھی ہے کہ اعمال صالحہ کے بجالانے والوں کا مددگار ہوتا ہے اور ان کے مقاصد کو کمال تک پہنچاتا ہے اور مالک یوم الدین بھی ہے کہ ہر ایک جزا سزا اس کے ہاتھ میں ہے جس طرح پرچا ہے اپنے بندہ سے معاملہ کرے۔ چاہے تو اس کو ایک عمل بد کے عوض میں وہ سزا دیوے جو اس عمل بد کے مناسب حال ہے اور چاہے تو اس کے لئے مغفرت کے سامان میسر کرے اور یہ تمام امور اللہ جل شانہ کے اس نظام کو دیکھ کر صاف ثابت ہوتے ہیں۔

پھر تیسری نشانی جو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی: تُوِّیَ اٰکُلَهَا کُلَّ حَیْنٍ یعنی کمال کتاب کی ایک یہ بھی نشانی ہے کہ جس پھل کا وہ وعدہ کرتی ہے وہ صرف وعدہ ہی وعدہ نہ ہو بلکہ وہ پھل ہمیشہ اور ہر وقت میں دیتی رہے اور پھل سے مراد اللہ جل شانہ نے اپنا القامعہ اس کے تمام لوازم کے جو برکات سماوی اور مکالمات الہیہ اور ہر ایک قسم کی قبولیتیں اور خوارق ہیں رکھی ہیں جیسا کہ خود فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَا لَا تَحْزَنُوْا وَا ابْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْ لِیْوُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَا فِی الْاٰخِرَةِ ۝ وَا لَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهٰی اَنْفُسُکُمْ وَا لَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَعُوْنَ ۝ نَزَّلًا مِّنْ غَافِرٍ ۝ (حم السجدة: ۳۱ تا ۳۳) (س ۱۸۲۲) وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر انہوں نے استقامت اختیار کی یعنی اپنی بات سے نہ پھرے اور طرح طرح کے زلازل ان پر آئے مگر انہوں نے ثابت قدمی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ ان پر فرشتے اترتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم کچھ خوف نہ کرو اور نہ کچھ حزن اور اس بہشت سے خوش ہو جس کا تم وعدہ دیئے گئے تھے یعنی اب وہ بہشت تمہیں مل گیا اور بہشتی

زندگی اب شروع ہوگئی۔ کس طرح شروع ہوگی؟ نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمُ الْخِ اس طرح کہ ہم تمہارے متولیٰ اور متکفل ہو گئے اس دنیا میں اور آخرت میں اور تمہارے لئے اس بہشتی زندگی میں جو کچھ تم مانگو وہی موجود ہے یہ غفور رحیم کی طرف سے مہمانی ہے۔ مہمانی کے لفظ سے اس پھل کی طرف اشارہ کیا ہے جو آیت: تُوْتِيْ اٰكْلَهَا كُلَّ حِيْنٍ میں فرمایا گیا تھا اور آیت فَرَعَهَا فِي السَّمَاۗءِ کے متعلق ایک بات ذکر کرنے سے رہ گئی کہ کمال اس تعلیم کا باعتبار اس کے انتہائی درجہ ترقی کے کیوں کر ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن شریف سے پہلے جس قدر تعلیمیں آئیں درحقیقت وہ ایک قانون مختص القوم یا مختلف الزمان کی طرح تھیں اور عام افادہ کی قوت ان میں نہیں پائی جاتی تھی لیکن قرآن کریم تمام قوموں اور تمام زمانوں کی تعلیم اور تکمیل کے لئے آیا ہے مثلاً نظیر کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی تعلیم میں بڑا زور سزا دہی اور انتقام میں پایا جاتا ہے جیسا کہ دانت کے عوض دانت اور آنکھ کے عوض آنکھ کے فقروں سے معلوم ہوتا ہے اور حضرت مسیحؑ کی تعلیم میں بڑا زور عفو اور درگزر پر پایا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں تعلیمیں ناقص ہیں نہ ہمیشہ انتقام سے کام چلتا ہے اور نہ ہمیشہ عفو سے بلکہ اپنے اپنے موقعہ پر نرمی اور درشتی کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے:

جَزَآءٌ وَّاسِيۡةً سَبِيۡةً مِّثْلُهَاۗءَ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاجْرۡءُ عَلٰی اللّٰهِ (الشوریٰ: ۴۱) (س ۲۵-۵) یعنی اصل بات تو یہ ہے کہ بدی کا عوض تو اسی قدر بدی ہے جو پہنچ گئی ہے لیکن جو شخص عفو کرے اور عفو کا نتیجہ کوئی اصلاح ہونہ کہ کوئی فساد۔ یعنی عفو اپنے محل پر ہونہ غیر محل پر۔ پس اجر اس کا اللہ پر ہے یعنی یہ نہایت احسن طریق ہے۔

اب دیکھئے اس سے بہتر اور کون سی تعلیم ہوگی کہ عفو کو عفو کی جگہ اور انتقام کو انتقام کی جگہ رکھا اور پھر فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَآمُرُ بِالْعَدْلِ وَاِلْحْسَانٍ وَاِتِيۡنَاۡمِ ذِي الْقُرْبٰى (النحل: ۹۱) (س ۱۳-۱۹) یعنی اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے کہ تم عدل کرو اور عدل سے بڑھ کر یہ ہے کہ باوجود رعایت عدل کے احسان کرو اور احسان سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم ایسے طور سے لوگوں سے مروت کرو کہ جیسے کہ گویا وہ تمہارے پیارے اور ذوی القربیٰ ہیں۔ اب سوچنا چاہیے کہ مراتب تین ہی ہیں؛ اول انسان عدل کرتا ہے یعنی حق کے مقابل حق کی درخواست کرتا ہے۔ پھر اگر اس سے بڑھے تو مرتبہ احسان ہے اور اگر اس سے بڑھے تو احسان کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے اور ایسی محبت سے لوگوں کی ہمدردی کرتا ہے جیسے ماں اپنے بچہ کی ہمدردی کرتی ہے یعنی ایک طبعی جوش سے نہ کہ احسان کے ارادہ سے۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۷)

جس قدر انسان کو قوتیں دی گئی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے اپنے محل پر خرچ کرنا اور ہر ایک قوت کا خدا تعالیٰ کی مرضی اور رضا کے راہ میں جنبش اور سکون کرنا بھی وہ حالت ہے جس کا قرآن شریف کی رو سے اسلام نام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اسلام کی یہ تعریف فرماتا ہے: بَلَىٰ مَن سَلَكَ وَجْهَهُ لِلدَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (البقرة: ۱۱۳) یعنی انسان کا اپنی ذات کو اپنے تمام قوتوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دینا اور پھر اپنی معرفت کو احسان کی حد تک پہنچا دینا یعنی ایسا پردہ غفلت درمیان سے اٹھانا کہ گویا خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے یہی اسلام ہے۔ پس ایک شخص کو مسلمان اس وقت کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ تمام قوتیں اس کی خدا تعالیٰ کے راہ میں لگ جائیں اور اس کے زیر حکم واجب طور پر اپنے اپنے محل پر مستعمل ہوں اور کوئی قوت بھی اپنی خود روی سے نہ چلے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نئی زندگی کا بل تبدیل سے ملتی ہے اور کامل تبدیلی ہرگز ممکن نہیں جب تک انسان کی تمام قوتیں جو اس کی انسانیت کا نچوڑ اور لب لباب ہیں اطاعت الہی کے نیچے نہ آجائیں اور جب تمام قوتیں اطاعت الہی کے نیچے آگئیں اور اپنے نچرل خواص کے ساتھ خط استقامت پر چلنے لگیں تو ایسے شخص کا نام مسلمان ہوگا لیکن ان تمام قوتوں کا اپنے اپنے مطالب میں پورے پورے طور پر کامیاب ہو جانا اور رضائے الہی کے نیچے گم ہو کر اعتدال مطلوب کو حاصل کرنا بجز تعلیم الہی اور تائید الہی غیر ممکن اور محال ہے اور ضرور تھا کہ کوئی کتاب دنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسی نازل ہوتی کہ جو اسلام کا طریق خدا کے بندوں کو سکھاتی کیونکہ جس طرح ہم اپنے ماتحت جانوروں، گھوڑوں، گدھوں، بیلوں وغیرہ کو تربیت کرتے ہیں تا ان کی مخفی استعدادیں ظاہر کریں اور اپنی مرضی کے موافق ان کو چلاویں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ پاک فطرت انسانوں کی فطرتی قوتیں ظاہر کرنے کیلئے ان کی طرف توجہ فرماتا ہے اور کسی کامل الفطرت پر وحی نازل کر کے دوسروں کی اس کے ذریعہ سے اصلاح کرتا ہے تا وہ اس کی اطاعت میں محو ہو جائیں۔ یہی قدیم سے سنت اللہ ہے اور ہمیشہ خدا تعالیٰ ہر ایک زمانہ کی استعداد کے موافق اسلام کا طریق اس زمانہ کو سکھلاتا رہا ہے۔

وَجْهٌ کے اصل معنی لغت کی رو سے منہ کے ہیں چونکہ انسان منہ سے شناخت کیا جاتا ہے اور کروڑھا انسانوں میں ماہ الامتیاز منہ سے قائم ہوتا ہے اس لئے اس آیت میں منہ سے مراد استعارہ کے طور پر انسان کی ذات اور اس کی قوتیں ہیں جن کی رو سے وہ دوسرے جانوروں سے امتیاز رکھتا ہے گویا وہ قوتیں اس کی انسانیت کا منہ ہے۔

اور چونکہ پہلے نبی ایک خاص قوم اور خاص ملک کیلئے آیا کرتے تھے اس لئے ان کی تعلیم جو ابھی ابتدائی تھی مجمل اور ناقص رہتی تھی کیونکہ بوجہ کمی قوم اصلاح کی حاجت کم پڑتی تھی اور چونکہ انسانیت کے پودہ نے ابھی پورا نشوونما بھی نہیں کیا تھا اسلئے استعدادیں بھی کم درجہ پر تھیں اور اعلیٰ تعلیم کی برداشت نہیں کر سکتی تھیں پھر ایسا زمانہ آیا کہ استعدادیں تو بڑھ گئیں مگر زمین گناہ اور بدکاری اور مخلوق پرستی سے بھر گئی اور سچی توحید اور سچی راستبازی نہ ہندوستان میں باقی رہی اور نہ مجوسیوں میں اور نہ یہودیوں میں اور نہ عیسائیوں میں اور تمام قوتیں ضلالت اور نفسانی جذبات کے نیچے دب گئیں اس وقت خدا نے قرآن شریف کو اپنے پاک نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کر کے دنیا کو کامل اسلام سکھایا اور پہلے نبی ایک ایک قوم کیلئے آیا کرتے اور اسی قدر سکھلاتے تھے جو اسی قوم کی استعداد کے اندازہ کے موافق ہو اور جن تعلیموں کی وہ لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ تعلیمیں اسلام کی ان کو نہیں بتلاتے تھے اسلئے ان لوگوں کا اسلام ناقص رہتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان دینوں میں سے کسی دین کا نام اسلام نہیں رکھا گیا۔ مگر یہ دین جو ہمارے پاک نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت دنیا میں آیا اس میں تمام دنیا کی اصلاح منظور تھی اور تمام استعدادوں کے موافق تعلیم دینا مد نظر تھا اس لئے یہ دین تمام دنیا کے دینوں کی نسبت اکمل اور اتم ہوا اور اسی کا نام بالخصوصیت اسلام رکھا گیا اور اسی دین کو خدا نے کامل کہا جیسا کہ قرآن شریف میں ہے: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا** یعنی آج میں نے دین کو کامل کیا اور اپنی نعمت کو پورا کیا اور میں راضی ہوا جو تمہارا دین اسلام ہو۔ چونکہ پہلے دین کامل نہیں تھے اور ان قوانین کی طرح تھے جو مختص القوم یا مختص الزمان ہوتے ہیں اس لئے خدا نے ان دینوں کا نام اسلام نہ رکھا اور ضرور تھا کہ ایسا ہوتا کیونکہ وہ انبیاء تمام قوموں کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ اپنی اپنی قوم کیلئے آتے تھے اور اسی خرابی کی طرف ان کی توجہ ہوتی تھی جو ان کی قوم میں پھیلی ہوئی ہوتی تھی اور انسانیت کی تمام شاخوں کی اصلاح کرنا ان کا کام نہیں تھا کیونکہ ان کے زیر علاج ایک خاص قوم تھی جو خاص آفتوں اور بیماریوں میں مبتلا تھی اور ان کی استعدادیں بھی ناقص تھیں اسی لئے وہ کتابیں ناقص رہیں کیونکہ تعلیم کی اغراض خاص خاص قوم تک محدود تھے مگر اسلام تمام دنیا اور تمام استعدادوں کیلئے آیا اور قرآن کو تمام دنیا کی کامل اصلاح مد نظر تھی جن میں عوام بھی تھے اور خواص بھی تھے اور حکماء اور فلاسفر بھی، اس لئے انسانیت کے تمام قومی پر قرآن نے بحث کی اور یہ چاہا کہ انسان کی ساری قوتیں خدا تعالیٰ کی راہ میں فدا ہوں اور یہ اس لئے ہوا کہ قرآن کا مد نظر انسان کی تمام استعدادیں تھیں اور

ہر ایک استعداد کی اصلاح منظور تھی اور اسی وجہ سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ٹھہرے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر وہ تمام کام پورا ہو گیا جو پہلے اس سے کسی نبی کے ہاتھ پر پورا نہیں ہوا تھا۔ چونکہ قرآن کو نوع انسان کی تمام استعدادوں سے کام پڑتا تھا اور وہ دنیا کی عام اصلاح کیلئے نازل کیا گیا تھا اس لئے تمام اصلاح اس میں رکھی گئی اور اسی لئے قرآنی تعلیم کا دین اسلام کہلا یا اور اسلام کا لقب کسی دوسرے دین کو نہ مل سکا کیونکہ وہ تمام ادیان ناقص اور محدود تھے غرض جبکہ اسلام کی حقیقت یہ ہے تو کوئی عقلمند مسلمان کہلانے سے عار نہیں کر سکتا۔ ہاں! اسلام کا دعویٰ اسی قرآنی دین نے کیا ہے اور اسی نے اس عظیم الشان دعویٰ کے دلائل بھی پیش کئے ہیں اور یہ بات کہنا کہ میں مسلمان نہیں ہوں یہ اس قول کے مساوی ہے کہ میرا دین ناقص ہے۔

(ست پنچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۷۱ تا ۲۷۲)

ایسی کامل کتاب کے بعد کس کتاب کا انتظار کریں جس نے سارا کام انسانی اصلاح کا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پہلی کتابوں کی طرح صرف ایک قوم سے واسطہ نہیں رکھا بلکہ تمام قوموں کی اصلاح چاہی اور انسانی تربیت کے تمام مراتب بیان فرمائے۔ وحشیوں کو انسانیت کے آداب سکھائے پھر انسانی صورت بنانے کے بعد اخلاق فاضلہ کا سبق دیا۔ یہ قرآن نے ہی دنیا پر احسان کیا کہ طبعی حالتوں اور اخلاق فاضلہ میں فرق کر کے دکھلایا اور جب طبعی حالتوں سے نکال کر اخلاق فاضلہ کے محل عالی تک پہنچا یا تو فقط اسی پر کفایت نہ کی بلکہ اور مرحلہ جو باقی تھا یعنی روحانی حالتوں کا مقام۔ اس تک پہنچنے کے لئے پاک معرفت کے دروازے کھول دیئے اور نہ صرف کھول دیئے بلکہ لاکھوں انسانوں کو اس تک پہنچا بھی دیا اور اس طرح پر تینوں قسم کی تعلیم جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کمال خوبی سے بیان فرمائی۔ پس چونکہ وہ تمام تعلیموں کا جن پر دینی تربیت کی ضرورتوں کا مدار ہے کامل طور پر جامع ہے۔ اس لئے یہ دعویٰ اس نے کیا کہ میں نے دائرہ دینی تعلیم کو کمال تک پہنچایا۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا** یعنی آج میں نے دین تمہارا کامل کیا اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا اور میں تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر خوش ہوا۔ یعنی دین کا انتہائی مرتبہ وہ امر ہے جو اسلام کے مفہوم میں پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ محض خدا کے لئے ہو جانا اور اپنی نجات اپنے وجود کی قربانی سے چاہنا، نہ اور طریق سے، اور اس نیت اور اس ارادہ کو عملی طور پر دکھلانا۔ یہ وہ نکتہ ہے جس پر تمام کمالات ختم ہوتے ہیں۔

معترض صاحب نے..... اعتراض کیا ہے کہ جب کہ دین کمال کو پہنچ چکا ہے اور نعمت پوری ہو چکی تو پھر نہ کسی مجدد کی ضرورت ہے نہ کسی نبی کی مگر افسوس کہ معترض نے ایسا خیال کر کے خود قرآن کریم پر اعتراض کیا ہے کیونکہ قرآن کریم نے اس امت میں خلیفوں کے پیدا ہونے کا وعدہ کیا ہے جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کے وقتوں میں دین استحکام پکڑے گا اور تزلزل اور تذبذب دور ہوگا اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا پھر اگر تکمیل دین کے بعد کوئی بھی کارروائی درست نہیں تو بقول معترض کے جو تیس سال کی خلافت ہے وہ بھی باطل ٹھہرتی ہے کیونکہ جب دین کامل ہو چکا تو پھر کسی دوسرے کی ضرورت نہیں لیکن افسوس کہ معترض بے خبر نے ناسخ آیت: **الْبَيِّنَاتُ كَلَّمَكَ لَكَمْ دِينًا كَرِيمًا** کو پیش کر دیا۔ ہم کب کہتے ہیں کہ مجدد اور محدث دنیا میں آ کر دین میں سے کچھ کم کرتے ہیں یا زیادہ کرتے ہیں؟ بلکہ ہمارا تو یہ قول ہے کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد جب پاک تعلیم پر خیالات فاسدہ کا ایک غبار پڑ جاتا ہے اور حق خالص کا چہرہ چھپ جاتا ہے۔ تب اس خوبصورت چہرہ کو دکھانے کے لئے مجدد اور محدث اور روحانی خلیفے آتے ہیں نہ معلوم کہ بے چارہ معترض نے کہاں سے اور کس سے سن لیا کہ مجدد اور روحانی خلیفے دنیا میں آ کر دین کی کچھ ترمیم و ترمیم کرتے ہیں۔ نہیں وہ دین کو منسوخ کرنے نہیں آتے بلکہ دین کی چمک اور روشنی دکھانے کو آتے ہیں اور معترض کا یہ خیال کہ ان کی ضرورت ہی کیا ہے صرف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ معترض کو اپنے دین کی پرواہ نہیں اور کبھی اس نے غور نہیں کیا کہ اسلام کیا چیز ہے اور اسلام کی ترقی کس کو کہتے ہیں اور حقیقی ترقی کیوں کر اور کن راہوں سے ہو سکتی ہے اور کس حالت میں کسی کو کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر مسلمان ہے؟ یہی وجہ ہے کہ معترض صاحب اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ قرآن موجود ہے اور علماء موجود ہیں اور خود بخود اکثر لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف حرکت ہے پھر کسی مجدد کی کیا ضرورت ہے لیکن افسوس کہ معترض کو یہ سمجھ نہیں کہ مجددوں اور روحانی خلیفوں کی اس امت میں ایسے ہی طور سے ضرورت ہے جیسا کہ قدیم سے انبیاء کی ضرورت پیش آتی رہی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی مرسل تھے اور ان کی توریت بنی اسرائیل کی تعلیم کے لئے کامل تھی اور جس طرح قرآن کریم میں آیت **الْبَيِّنَاتُ كَلَّمَكَ** ہے اسی طرح توریت میں بھی آیات ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ایک کامل اور جلالی کتاب دی گئی ہے جس کا نام توریت ہے چنانچہ قرآن کریم میں بھی توریت کی یہی تعریف ہے لیکن باوجود اس کے بعد توریت کے صدہا ایسے نبی بنی اسرائیل میں سے آئے کہ کوئی نئی کتاب ان کے ساتھ نہیں تھی بلکہ ان انبیاء کے ظہور کے

مطالب یہ ہوتے تھے کہ تا ان کے موجودہ زمانہ میں جو لوگ تعلیم توریت سے دور پڑ گئے ہوں پھر ان کو توریت کے اصلی منشاء کی طرف کھینچیں اور جن کے دلوں میں کچھ شکوک اور دہریت اور بے ایمانی ہوگئی ہو ان کو پھر زندہ ایمان بخشیں چنانچہ اللہ جل شانہ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے: **وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَفَقَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ (البقرة: ۸۸)** یعنی موسیٰ کو ہم نے توریت دی اور پھر اس کتاب کے بعد ہم نے کئی پیغمبر بھیجے تا توریت کی تعلیم کی تائید اور تصدیق کریں اسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے: **ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا (المؤمنون: ۲۵)** یعنی پھر پیچھے سے ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے۔ پس ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب بھیج کر پھر اس کی تائید اور تصدیق کے لئے ضرور انبیاء بھیجا کرتا ہے چنانچہ توریت کی تائید کے لئے ایک ایک وقت میں چار چار سو نبی بھی آیا جن کے آنے پر اب تک بائبل شہادت دے رہی ہے۔

(شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۳۹ تا ۳۴۱)

اور جو عیسیٰ بن مریم کے نزول کا ذکر ہے پس کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ حدیث میں اس نام کو ظاہر پر محمول کرے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے اس قول کے خلاف ہے کہ ہم نے محمدؐ کو کسی مرد کا باپ نہیں بنایا۔ ہاں! وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اس محسن رب نے ہمارے نبی کا نام خاتم الانبیاء رکھا ہے اور کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا اور آنحضرتؐ نے طالبوں کے لیے بیان واضح سے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اور اگر ہم آنحضرتؐ کے بعد کسی نبی کا ظہور جائز رکھیں تو لازم آتا ہے کہ وحی نبوت کے دروازہ کا افتتاح بھی بند ہونے کے بعد جائز خیال کریں اور یہ باطل ہے جیسا کہ

وَأَمَّا ذِكْرُ نُزُولِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ فَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَخْتَلِفَ هَذَا الْأِسْمَ الْمَذْكُورَ فِي الْأَحَادِيثِ عَلَى ظَاهِرِ مَعْنَاهُ، لِأَنَّهُ يُخَالِفُ قَوْلَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ جِبَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ أَلَا تَعْلَمُ أَنَّ الرَّبَّ الرَّحِيمَ الْمُتَفَضِّلَ سَمَّى نَبِيَّنَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمَ الْأَنْبِيَاءِ بِغَيْرِ اسْتِثْنَاءٍ، وَفَسَّرَهُ نَبِيَّنَا فِي قَوْلِهِ لَا نَبِيَّ بَعْدِي بِبَيَانٍ وَاضِحٍ لِلطَّلَائِبِينَ وَأَلَوْ جَوَّزْنَا ظُهُورَ نَبِيِّ بَعْدِ نَبِيِّنَا لَجَوَّزْنَا انْفِتَاحَ بَابِ وَحْيِ النَّبُوءَةِ بَعْدَ تَغْلِيْقِهَا، وَهَذَا خُلْفٌ

مسلمانوں پر پوشیدہ نہیں اور آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی کیوں کر آوے حالانکہ آپ کی وفات کے بعد وحی نبوت منقطع ہو گئی ہے اور آپ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا ہے۔ کیا ہم اعتقاد کر لیں کہ ہمارے نبی خاتم الانبیاء نہیں بلکہ عیسیٰ جو صاحب انجیل ہے وہ خاتم الانبیاء ہے یا ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ ابن مریم آکر قرآن کے بعض احکام کو منسوخ اور کچھ زیادہ کرے گا اور نہ جزیہ لے گا اور نہ جنگ چھوڑے گا حالانکہ اللہ کا ارشاد ہے کہ جزیہ لے لو اور جزیہ لینے کے بعد جنگ چھوڑ دو۔ کیا تو یہ آیت نہیں پڑھتا کہ ذلت کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیویں۔ پس قرآن کے محکمات کو کیوں کر مسیح منسوخ کرے گا اور کتاب عزیز میں کیوں کر تصرف کر کے کچھ احکام کو تکمیل کے بعد مٹا دے گا؟ میں تعجب کرتا ہوں کہ وہ فرقان کے بعض احکام کا مسیح کو ناسخ بناتے ہیں اور اس آیت کو نہیں دیکھتے کہ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا ہے اور وہ فکر نہیں کرتے اگر دین اسلام کی تکمیل کے لیے کوئی حالت منتظرہ ہوتی جو کئی ہزار سال گزرنے کے بعد اس کے ظہور کی امید ہو سکتی تو قرآن کے ساتھ اکمال دین ہونا فاسد ہو جاتا اور خدا کا یہ کہنا کہ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا ہے جھوٹ اور خلاف واقع ہو جاتا بلکہ اس صورت میں تو واجب تھا

كَمَا لَا يَخْفَى عَلَى الْمُسْلِمِينَ. وَكَيْفَ يَجِيءُ نَبِيٌّ بَعْدَ رَسُولِنَا صَلَاحًا وَقَدْ انْقَطَعَ الْوَحْيُ بَعْدَ وَفَاتِهِ وَخَتَمَ اللَّهُ بِهِ النَّبِيِّينَ. أَنْعَتَقْدُ بِأَنَّ عَيْسَى الَّذِي أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْإِنْجِيلُ هُوَ خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ، لَا رَسُولًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْعَتَقْدُ أَنَّ ابْنَ مَرْيَمَ يَأْتِي وَيَنْسَخُ بَعْضَ أَحْكَامِ الْقُرْآنِ وَيَزِيدُ بَعْضًا، فَلَا يَقْبَلُ الْحُزْبِيَّةَ وَلَا يَضَعُ الْحَرْبَ. وَقَدْ أَمَرَ اللَّهُ بِأَخْذِهَا وَأَمَرَ بِوَضْعِ الْحَرْبِ بَعْدَ أَخْذِ الْحُزْبِيَّةِ؛ أَلَا تَفْرَأُ آيَةَ يُعْطُوا الْحُزْبِيَّةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صُغُرُونَ<sup>۱</sup> فَكَيْفَ يَنْسَخُ الْمَسِيحُ مُحْكَمَاتِ الْفُرْقَانِ؟ وَكَيْفَ يَتَصَرَّفُ فِي الْكِتَابِ الْعَزِيزِ وَيَطْبَسُ بَعْضَ أَحْكَامِهِ بَعْدَ تَكْمِيلِهَا؟ فَأَعْجَبَنِي أَنَّهُمْ يَجْعَلُونَ الْمَسِيحَ نَاسِخَ بَعْضِ أَحْكَامِ الْفُرْقَانِ وَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى آيَةِ الْيَوْمِ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَلَا يَتَفَكَّرُونَ أَنَّهُ لَوْ كَانَتْ لِتَكْمِيلِ دِينِ الْإِسْلَامِ حَالَةٌ مُنْتَظَرَةٌ يُرْجَى ظُهُورُهَا بَعْدَ انْقِضَاءِ الْوَفِّ مِنَ السَّنَوَاتِ، لَفَسَدَ مَعْنَى إِكْمَالِ الدِّينِ وَالْفَرَاعِ مِنْ كَمَالِهِ بِإِنْزَالِ الْقُرْآنِ، وَلَكَانَ قَوْلُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ مِنْ تَوَعُّدِ الْكُذِبِ وَخِلَافِ

الْوَاقِعَةِ. بَلْ كَانَ الْوَاجِبُ فِي هَذِهِ الصُّورَةِ أَنْ يَقُولَ  
السَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالَى إِنِّي مَا أَنْزَلْتُ هَذَا الْقُرْآنَ  
كَامِلًا عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ سَأُنزِلُ  
بَعْضَ آيَاتِهِ عَلَى عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ فِي آخِرِ الزَّمَانِ  
فَيُؤَمِّدُنِي بِكَمُلِ الْقُرْآنِ وَمَا كَمَلُ إِلَى هَذَا الْحَيِّ.

(حمامة البشرى، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے وقت میں دنیا سے اپنے مولیٰ کی طرف بلائے گئے جبکہ وہ اپنے کام کو پورے طور پر انجام دے چکے اور یہ امر قرآن شریف سے بخوبی ثابت ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضَيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا لِعَنِي آج میں نے قرآن شریف کے اتارنے اور تکمیل نفوس سے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کر لیا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید جس قدر نازل ہونا تھا نازل ہو چکا اور مستعد دلوں میں نہایت عجیب اور حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کر چکا اور تربیت کو کمال تک پہنچا دیا اور اپنی نعمت کو ان پر پورا کر دیا اور یہی دور کن ضروری ہیں جو ایک نبی کے آنے کی علت غائی ہوتے ہیں۔ اب دیکھو! یہ آیت کس زور شور سے بتلا رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز اس دنیا سے کوچ نہ کیا جب تک کہ دین اسلام کو تنزیل قرآن اور تکمیل نفوس سے کامل نہ کیا گیا ★ اور یہی ایک خاص علامت منجانب اللہ ہونے کی ہے جو کاذب کو ہرگز نہیں دی جاتی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی صادق نبی نے بھی اس اعلیٰ شان کے کمال کا نمونہ نہیں دکھلایا کہ ایک طرف کتاب اللہ بھی آرام اور امن کے ساتھ پوری ہو جائے اور دوسری طرف تکمیل نفوس بھی ہو اور بائیں ہمہ کفر کو ہریک پہلو سے شکست اور اسلام کو ہریک پہلو سے فتح ہو۔

(نور القرآن نمبر ۱، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۳۲۲ تا ۳۵۴)

★ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں صحابہ کو مخاطب کیا کہ میں نے تمہارے دین کو کامل کیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کی اور آیت کو اس طور سے نہ فرمایا کہ اے نبی! آج میں نے قرآن کو کامل کر دیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ تا ظاہر ہو کہ صرف قرآن کی تکمیل نہیں ہوئی بلکہ ان کی تکمیل بھی ہو گئی کہ جن کو قرآن پہنچایا گیا اور رسالت کی علت غائی کمال تک پہنچ گئی۔ منہ

خدا تعالیٰ نے چاہا کہ جیسا کہ اُس نے حضور نبوی کی مشابہت حضرت آدم سے مکمل کرنے کیلئے تکمیل ہدایت قرآنی کا چھٹا دن مقرر کیا یعنی روز جمعہ۔ اور اسی دن یہ آیت نازل ہوئی کہ: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي** ایسا ہی تکمیل اشاعت ہدایت کے لئے الف سادس یعنی چھٹا دن مقرر فرمایا جو حسب تصریح آیات قرآنی بمنزلہ روز ششم ہے۔

اب میں دوبارہ یاد دلاتا ہوں کہ تکمیل ہدایت کے دن میں تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں موجود تھے اور وہ روز یعنی جمعہ کا دن جو دنوں میں سے چھٹا دن تھا مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کا دن تھا جب آیت: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي** نازل ہوئی اور قرآن جو تمام آسمانی کتابوں کا آدم اور جمیع معارف صحف سابقہ کا جامع تھا اور مظہر جمیع صفات الہیہ تھا اُس نے آدم کی طرح چھٹے دن یعنی جمعہ کے دن اپنے وجود باوجود کو اتم اور اکمل طور پر ظاہر فرمایا۔ یہ تو تکمیل ہدایت کا دن تھا مگر تکمیل اشاعت کا دن اس دن کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ابھی وہ وسائل پیدا نہیں ہوئے تھے جو تمام دنیا کے تعلقات کو باہم ملا دیتے اور بڑی اور بحری سفروں کو مسافروں کے لئے سہل کر دیتے اور دینی کتابوں کی ایک کثیر مقدار قلمبند کرنے کے لئے جو تمام دنیا کے حصہ میں آسکے آلات زود نو لہی کے مہیا کر دیتے اور نہ مختلف زبانوں کا علم نوع انسان کو حاصل ہوا تھا اور نہ تمام مذاہب ایک دوسرے کے مقابل پر آشکارا طور پر ایک جگہ موجود تھے۔ اس لئے وہ حقیقی اشاعت جو اتمام حجت کے ساتھ ہر ایک قوم پر ہو سکتی ہے اور ہر ایک ملک تک پہنچ سکتی ہے نہ اس کا وجود تھا اور نہ معمولی اشاعت کے وسائل موجود تھے۔ لہذا تکمیل اشاعت کے لئے ایک اور زمانہ علم الہی نے مقرر فرمایا۔ جس میں کامل تبلیغ کے لئے کامل وسائل موجود تھے اور ضرور تھا کہ جیسا کہ تکمیل ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ہوئی ایسا ہی تکمیل اشاعت ہدایت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہو کیونکہ یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبی کام تھے لیکن سنت اللہ کے لحاظ سے اس قدر خلود آپ کے لئے غیر ممکن تھا کہ آپ اُس آخری زمانہ کو پاتے اور نیز ایسا خلود شرک کے پھیلنے کا ایک ذریعہ تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خدمت منصبی کو ایک ایسے امتی کے ہاتھ سے پورا کیا کہ جو اپنی خواہر روحانیت کے رُو سے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کا ایک ٹکڑا تھا یا یوں کہو کہ وہی تھا اور آسمان پر ظلی طور پر آپ کے نام کا شریک تھا۔

قرآن شریف نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ انجیل یا توریت سے صلح کرے گا بلکہ ان کتابوں کو محرف و مبدل اور ناقص اور نامتوم قرار دیا ہے اور تاج خاص اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ کا اپنے لئے رکھا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہ سب کتابیں انجیل، توریت قرآن شریف کے مقابل پر کچھ بھی نہیں اور ناقص اور محرف اور مبدل ہیں اور تمام بھلائی قرآن میں ہے۔ (دافع البلاء، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۳۹)

یہ امر ثابت شدہ ہے کہ قرآن شریف نے دین کے کامل کرنے کا حق ادا کر دیا ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے: الْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا لِعَنِي آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے اور میں اسلام کو تمہارا دین مقرر کر کے خوش ہوا۔ سو قرآن شریف کے بعد کسی کتاب کو قدم رکھنے کی جگہ نہیں کیونکہ جس قدر انسان کی حاجت تھی وہ سب کچھ قرآن شریف بیان کر چکا اب صرف مکالمات الہیہ کا دروازہ کھلا ہے اور وہ بھی خود بخود نہیں بلکہ سچے اور پاک مکالمات جو صریح اور کھلے طور پر نصرت الہی کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں اور بہت سے امور غیبیہ پر مشتمل ہوتے ہیں وہ بعد تزکیہ نفس محض پیروی قرآن شریف اور اتباع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوتے ہیں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۸۰)

یہ بات ہر ایک عقل سلیم قبول کر لے گی کہ کمال اصلاح کی نوبت کمال فساد کے بعد آتی ہے۔ طیب کا یہ کام نہیں کہ وہ چنگے بھلے لوگوں کو وہ دوائیں دے جو عین بیماری کے غلبہ کے وقت دینی چاہئیں۔ اسی لئے قرآن شریف نے پہلے یہ بیان کر دیا کہ: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَيْرِ وَالْبَحْرِ (الزومہ: ۱۲) یعنی تمام دنیا میں فساد پھیل گیا اور ہر ایک قسم کے گناہ اور معاصی کا طوفان برپا ہو گیا اور پھر ہر ایک بد عقیدگی اور بد عملی کے بارے میں مکمل ہدایتیں پیش کر کے فرمایا کہ: الْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ یعنی آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا مگر کسی پہلے زمانہ میں جس میں ابھی طوفان ضلالت بھی جوش میں نہیں آیا تھا مکمل کتاب کیوں کر انسانوں کو مل سکتی ہے؟ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۲، ۱۳۸)

یاد رہے کہ کسی مذہب کی سچائی ثابت کرنے کے لئے یعنی اس بات کے ثبوت کے لئے کہ وہ مذہب منجانب اللہ ہے دو قسم کی فتح کا اس میں پایا جانا ضروری ہے؛

اول یہ کہ وہ مذہب اپنے عقائد اور اپنی تعلیم اور اپنے احکام کی رُو سے ایسا جامع اور مکمل اور اتم اور نقص

سے دُور ہو کہ اس سے بڑھ کر عقل تجویز نہ کر سکے اور کوئی نقص اور کمی اُس میں دکھلائی نہ دے اور اس کمال میں وہ ہر ایک مذہب کو فتح کرنے والا ہو یعنی ان خوبیوں میں کوئی مذہب اُس کے برابر نہ ہو۔ جیسا کہ یہ دعویٰ قرآن شریف نے آپ کیا ہے کہ: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا** یعنی آج میں نے تمہارے لئے اپنا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کیا اور میں نے پسند کیا کہ اسلام تمہارا مذہب ہو۔ یعنی وہ حقیقت جو اسلام کے لفظ میں پائی جاتی ہے جس کی تشریح خود خدا تعالیٰ نے اسلام کے لفظ کے بارہ میں بیان کی ہے اس حقیقت پر تم قائم ہو جاؤ۔ اس آیت میں صریح یہ بیان ہے کہ قرآن شریف نے ہی کامل تعلیم عطا کی ہے اور قرآن شریف کا ہی ایسا زمانہ تھا جس میں کامل تعلیم عطا کی جاتی۔ پس یہ دعویٰ کامل تعلیم کا جو قرآن شریف نے کیا یہ اسی کا حق تھا اس کے سوا کسی آسمانی کتاب نے ایسا دعویٰ نہیں کیا جیسا کہ دیکھنے والوں پر ظاہر ہے کہ توریت اور انجیل دونوں اس دعوے سے دست بردار ہیں کیونکہ توریت میں خدا تعالیٰ کا یہ قول موجود ہے کہ میں تمہارے بھائیوں میں سے ایک نبی قائم کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو شخص اس کے کلام کو نہ سنے گا میں اس سے مطالبہ کروں گا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اگر آئندہ زمانہ کی ضرورتوں کی رُو سے توریت کا سننا کافی ہوتا تو کچھ ضرورت نہ تھی کہ کوئی اور نبی آتا اور مواخذہ الہیہ سے مخلصی پانا اُس کلام کے سننے پر موقوف ہوتا جو اُس پر نازل ہوتا۔ ایسا ہی انجیل نے کسی مقام میں دعویٰ نہیں کیا کہ انجیل کی تعلیم کامل اور جامع ہے بلکہ صاف اور کھلا اقرار کیا ہے کہ اور بہت سی باتیں قابل بیان تھیں مگر تم برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب فارقلیط آئے گا تو وہ سب کچھ بیان کرے گا۔ اب دیکھنا چاہئے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی توریت کو ناقص تسلیم کر کے آنے والے نبی کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی ایسا ہی حضرت عیسیٰ نے بھی اپنی تعلیم کا نامکمل ہونا قبول کر کے یہ عذر پیش کر دیا کہ ابھی کامل تعلیم بیان کرنے کا وقت نہیں ہے لیکن جب فارقلیط آئے گا تو وہ کامل تعلیم بیان کر دے گا مگر قرآن شریف نے توریت اور انجیل کی طرح کسی دوسرے کا حوالہ نہیں دیا بلکہ اپنی کامل تعلیم کا تمام دنیا میں اعلان کر دیا اور فرمایا کہ: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا**۔ اس سے ظاہر ہے کہ کامل تعلیم کا دعویٰ کرنے والا صرف قرآن شریف ہی ہے اور ہم اپنے موقعہ پر بیان کریں گے کہ جیسا کہ قرآن شریف نے دعویٰ کیا ہے ویسا ہی اُس نے اس دعویٰ کو پورا کر کے دکھلا بھی دیا ہے اور اُس نے ایک ایسی کامل تعلیم پیش کی ہے جس کو نہ توریت پیش کر سکی اور نہ انجیل بیان کر سکی۔ پس اسلام کی سچائی ثابت کرنے کے

لئے یہ ایک بڑی دلیل ہے کہ وہ تعلیم کی رُو سے ہر ایک مذہب کو فتح کرنے والا ہے اور کامل تعلیم کے لحاظ سے کوئی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (برائین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۵۳ تا ۵۴)

ختم نبوت کے متعلق میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ خاتم النبیین کے بڑے معنی یہی ہیں کہ نبوت کے امور کو آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا۔ یہ تو موٹے اور ظاہر معنی ہیں دوسرے یہ معنی ہیں کہ کمالات نبوت کا دائرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ قرآن نے ناقص باتوں کا کمال کیا اور نبوت ختم ہو گئی اس لیے **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** کا مصداق اسلام ہو گیا۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۸، ۹)

حضرت ابوبکرؓ جن کو قرآن شریف کا یہ فہم ملا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** وَاَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي پڑھی تو حضرت ابوبکرؓ رو پڑے کسی نے پوچھا کہ یہ بڑھا کیوں روتا ہے تو آپ نے کہا کہ مجھے اس آیت سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بو آتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام بطور حکام کے ہوتے ہیں جیسے بند و بست کا ملازم جب اپنا کام کر چکتا ہے تو وہاں سے چل دیتا ہے اسی طرح پر انبیاء علیہم السلام جس کام کے واسطے دنیا میں آتے ہیں جب اس کو کر لیتے ہیں تو پھر وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ بس جب: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** کی صدا بپنٹی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ یہ آخری صدا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا فہم بہت بڑھا ہوا تھا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک اور کامیاب زندگی کی تصویر یہ ہے کہ آپ ایک کام کے لیے آئے اور اسے پورا کر کے اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے جس طرح بند و بست والے پورے کاغذات پانچ برس میں مرتب کر کے آخری رپورٹ کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں اسی طرح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتا ہے اس دن سے لے کر جب **فَمَنْ قَانَدِرُ (الهدى: ۳)** کی آواز آئی پھر اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ (النصر: ۲) اور **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** کے دن تک نظر کریں تو آپ کی لائظیر کامیابی کا پتہ ملتا ہے ان آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاص طور پر مامور تھے... ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیسا پکا کام ہے اس وقت سے جب سے کہا کہ میں ایک کام کرنے کے لیے آیا ہوں جب تک یہ نہ سن لیا کہ **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** آپ دنیا سے نہ اُٹھے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷، ۸)

آپ کی صدق نبوت پر آپ کی زندگی سب سے بڑا نشان ہے، کوئی ہے جو اس پر نظر کرے! آپ کو دنیا میں ایسے وقت پر بھیجا کہ دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس وقت تک زندہ رکھا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي كِي آواز آپ کو نہ آگئی اور فوجوں کی فوجیں اسلام میں داخل ہوتی ہوئیں آپ نے نہ دیکھ لیں۔ غرض اسی قسم کی بہت سی وجوہ ہیں جن سے آپ کا نام محمد رکھا گیا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳، ۴)

میں ان مخالفوں سے جو بڑے بڑے مشائخ اور گدی نشین اور صاحب سلسلہ ہیں پوچھتا ہوں کہ کیا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے ورد و وظائف اور چلہ کشیاں، اُلٹے سیدھے لکنا بھول گئے تھے اگر معرفت اور حقیقت شناسی کا یہی ذریعہ اصل تھے۔ مجھے بہت ہی تعجب آتا ہے کہ ایک طرف قرآن شریف میں یہ پڑھتے ہیں: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي اور دوسری طرف اپنی ایجادوں اور بدعتوں سے اس تکمیل کو توڑ کر ناقص ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

جس شخص کو خدا تعالیٰ سے تعلقات قوی اور شدید ہوتے ہیں اور فانی اللہ کے درجہ پر ہوتا ہے تو اس سے بسا اوقات خارق عادت معجزات صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر ایک قسم کی اقتداری قوت کا نمونہ رکھتے ہیں لوگ اپنی غلط فہمی اور کمزوری سے یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ شاید یہ خدا ہو۔ شہودی حالت میں اکثر امور ان کی مرضی کے موافق ہو جاتے ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعلوں کو خدا تعالیٰ نے اپنا فعل قرار دیا ہے اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ اور اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ (النصر: ۲) کی صدا آپ کو آگئی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

مباحثہ میں بھی اصول رکھا جاوے کہ قرآن شریف مقدم ہے یہ منوا کر ان سے کہا جاوے کہ تقدیم قرآن تو اب مقبولہ فریقین ہے باقی امور اسی سے فیصلہ کر لو۔ اگر حدیثوں پر سارا مدار ہے تو قرآن کی کیا ضرورت ہے جو کہتا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ۔

اسلام وہ مذہب ہے جس نے اپنے اقبال کے ساتھ تمام مذاہب کو اپنے پیروں میں لے لیا ہوا ہے۔ اسلام ایسے ملک سے شروع ہوا جہاں لوگ درندوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور طرح طرح کی بد اعمالیوں میں مبتلا تھے ان کو حیوانیت سے انسانیت میں اسلام ہی لایا۔ ہر طرف اس کی مخالفت ہوئی لوگوں نے دشمنی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا پھر بھی وہ تمام کام پورے ہو کر رہے جو کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے

فرمائے تھے اور کوئی فرد بشر بھی اس کا بال نہ بگاڑ سکا حتیٰ کہ ندا آگئی: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** (وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي) وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۲)

ہم اعجازی احیاء کے قائل ہیں مگر یہ بات بالکل ٹھیک نہیں ہے کہ ایک مردہ اس طرح زندہ ہوا ہو کہ وہ پھر اپنے گھر میں آیا اور ہا اور ایک اور عمر اس نے بسر کی اگر ایسا ہوتا تو قرآن ناقص ٹھہرتا ہے کہ اس نے ایسے شخص کی وراثت کے بارے میں کوئی ذکر نہ کیا اور **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** کیا ہوا؟

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں مبعوث ہوئے، کیا ان کی نسبت اہل الرائے کی یہ رائے تھی۔ کون تھا جو یقین کرتا کہ ایک غریب (آنحضرت صلعم) کے پاس نہ قوت، نہ شوکت، نہ فوج، نہ مال ہے اور ہر طرف مخالفت ہے وہ کامیاب ہو کر رہے گا اور جو وعدے فتح اور نصرت اور اقبال مندی کے وہ دیتا ہے پورے ہو کر رہیں گے؟ مگر باوجود اس ناامیدی کے پھر کبھی امید بندھ گئی اور تمام وعدے پورے ہو گئے **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** کی گواہی مل گئی۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

صحابہ کرام سارے ہی باخدا اور عاقل تھے مگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے بڑھ کر ایسے وفادار تھے کہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے آپ کو سانپوں اور درندوں اور خاردار کانٹوں والا جنگل، اس کے درندے، حیوانات انسانی شکل میں دکھلائے گئے پھر ملک بھی ایسا اس کے سپرد کیا کہ جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی شریرا نفس نہ تھا۔ پھر آئے ایسے وقت پر کہ تمام مردہ اور فساد کی جڑ تھے جیسے فرمایا: **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (الزوم: ۴۲)** اور گئے ایسے وقت پر کہ فرمایا: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي الْآيَةَ۔ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَ الْفَتْحُ الْآيَةَ (النصر: ۲)**۔ اس کو معجزہ کہتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنی محبت الہی اور قوت جاذبہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اندر تھی۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۹، ۳۸ مورخہ ۱۰ تا ۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

اسلام کے ثمرات اب بھی ایسے ہی ہیں اگر کوئی ان پھلوں کو نہیں کھاتا تو اسلام کا کیا تصور؟ طیب اگر ایک نسخہ بتا دے اور کوئی اسے استعمال نہ کرے تو اس میں طیب کا تو کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام میں یہ ایسی نعمت ہے جو کسی اور دین میں نہیں مل سکتی۔ اسی کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي** لیکن یہ نعمت نہیں مل سکتی جب تک اس طرف قدم نہ اٹھاوے اور

افسوس کہ ہمارے مخالف اس نعمت کی طرف متوجہ نہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

اگر دن تھوڑے بھی ہوں اور اللہ تعالیٰ کی رضا میں بسر ہوں تو غنیمت ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس ملک میں رہے تھے وہاں کی زندگی صرف ساڑھے تین سال کی ہی رسالت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ رسالت ۲۳ سال تھا مگر میں جانتا ہوں کہ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش قسمتی ثابت ہوتی ہے اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں۔ امور رسالت میں یہ کامیابی اور سعادت کسی اور کو نہیں ملی۔ آپ کی آمد کا وہ وقت تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے خود ظہر الفساد فی البدر و البصر (الزوم: ۴۲) سے بیان کیا ہے یعنی نہ خشکی میں امن تھا نہ تری میں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب بگڑ چکے تھے اور قسم قسم کے فساد اور خرابیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں گویا زمانہ کی حالت بالطبع تقاضا کرتی تھی کہ اس وقت ایک زبردست ہادی اور مصلح پیدا ہو، ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا اور پھر آپ ایسے وقت دنیا سے رخصت ہوئے جب آپ کو یہ آواز آگئی: الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَنْتُمْ عَلَيكُمْ بِعَهْتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا۔ یہ آواز کسی اور نبی اور رسول کو نہیں آئی۔ کہتے ہیں جب یہ آیت اتری اور پڑھی گئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس آیت کو سن کر رو پڑے۔ ایک صحابی نے کہا کہ اے بڑھے آدمی! تجھے کیا ہو گیا آج تو خوشی کا دن ہے تو کیوں رو پڑا؟ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ تو نہیں جانتا۔ مجھے اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بو آتی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کی فراست بہت تیز تھی انہوں نے سمجھ لیا کہ جب کام ہو چکا تو پھر یہاں کیا کام؟ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی بندوبست کا افسر کسی ضلع کا بندوبست کرنے کو بھیجا جاتا ہے وہ اس وقت تک وہاں رہتا ہے جب تک وہ کام ختم نہ ہو لے جب کام ختم ہو جاتا ہے تو پھر کسی اور جگہ بھیجا جاتا ہے اسی طرح پر مرسلین کے متعلق بھی یہی سنت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب یہ امر دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا ابو بکرؓ کہتا ہے اور پھر یہ بھی فرمایا کہ اگر میں کسی کو دنیا میں دوست رکھتا تو ابو بکرؓ کو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ضرورت ایسی واضح اور روشن ہے کہ کسی دوسرے نبی کا زمانہ ایسی نظر نہیں رکھتا۔ اب دوسرا حصہ دیکھو کہ آپ فوت نہیں ہوئے جب تک الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ کی آواز نہیں سنی اور اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَ رَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (النصر: ۲) کا

نظارہ آپ نے نہیں دیکھ لیا۔ یہ آیت نہ تو ریت میں ہے نہ انجیل میں۔ تو ریت کا تو یہ حال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام راستہ ہی میں فوت ہو گئے اور قوم کو وعدہ کی سرزمین میں داخل نہ کر سکے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود کہتے ہیں کہ بہت ہی باتیں بیان کرنے کی تھیں۔ کیا قرآن شریف میں بھی ایسا لکھا ہے؟ وہاں تو اَكْمَلْتُ لَكُمْ ہے۔ رہی ان کی تکمیل! صحابہ کی جو تکمیل آحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کی نسبت فرماتا ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ قُضِيَ لَهٗ نَصَبُهُ (الآیة) (الاحزاب: ۲۴) اور پھر ان کی نسبت رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (التوبة: ۱۰۰) فرمایا لیکن انجیل میں مسیح کے حواریوں کی جو تعریف کی گئی ہے وہ سب کو معلوم ہے کہ جا بجا ان کو لالچی اور کم ایمان کہا گیا ہے اور عملی رنگ ان کا یہ ہے کہ ان میں سے ایک نے تیس روپیہ لے کر پکڑوادیا اور پھر اس نے سامنے لعنت کی۔ انصاف کر کے کہو کہ یہ کیسی تکمیل ہے۔ اس کے بالمقابل قرآن شریف صحابہ کی تعریف سے بھرا پڑا ہے اور ان کی ایسی تکمیل ہوئی کہ دوسری کوئی قوم ان کی نظیر نہیں رکھتی پھر ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جزا بھی بڑی دی یہاں تک کہ اگر باہم کوئی رنجش بھی ہو گئی تو اس کے لیے فرمایا: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غَلِّ الْآیة (الاعراف: ۴۴)۔ حضرت عیسیٰ نے بھی حواریوں کو تختوں کا وعدہ دیا تھا مگر وہ ٹوٹ گیا کیونکہ بارہ تختوں کا وعدہ تھا مگر یہود اسکر یوٹی کا ٹوٹ گیا جب وہ قائم نہ رہا تو اوروں کا کیا بھروسہ کریں۔ مگر صحابہ کے تخت قائم رہے دنیا میں بھی رہے اور آخرت میں بھی۔ غرض یہ آیت: الْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ مسلمانوں کے لیے کیسے فخر کی بات ہے..... اکمال سے یہی مطلب نہیں کہ سورتیں اتار دیں بلکہ تکمیل نفس اور تطہیر قلب کی، وحشیوں سے انسان پھر اس کے بعد عقل مند اور بااخلاق انسان اور پھر باخدا انسان بنا دیا اور تطہیر نفس، تکمیل اور تہذیب نفس کے مدارج طے کرادیئے اور اسی طرح پر کتاب اللہ کو بھی پورا اور کامل کر دیا یہاں تک کہ کوئی سچائی اور صداقت نہیں جو قرآن شریف میں نہ ہو۔ میں نے اگنی ہوتری کو بارہا کہا کہ کوئی ایسی سچائی بناؤ جو قرآن شریف میں نہ ہو مگر وہ نہ بتا سکا۔ ایسا ہی ایک زمانہ مجھ پر گزرا ہے کہ میں نے بائبل کو سامنے رکھ کر دیکھا جن باتوں پر عیسائی ناز کرتے ہیں وہ تمام سچائیاں مستقل طور پر اور نہایت ہی اکمل طور پر قرآن مجید میں موجود ہیں مگر فسوس ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف توجہ نہیں وہ قرآن شریف پر تدبر ہی نہیں کرتے اور نہ ان کے دل میں کچھ عظمت ہے ورنہ یہ تو ایسا فخر کا مقام ہے کہ اس کی نظیر دوسروں میں ہے ہی نہیں۔

غرض الْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ کی آیت دو پہلو رکھتی ہے؛ ایک یہ کہ تمہاری تطہیر کر چکا، دوئم کتاب مکمل کر چکا،

کہتے ہیں جب یہ آیت اتری وہ جمعہ کا دن تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کسی یہودی نے کہا کہ اس آیت کے نزول کے دن عید کر لیتے حضرت عمرؓ نے کہا کہ جمعہ عید ہی ہے مگر بہت سے لوگ اس عید سے بے خبر ہیں دوسری عیدوں کو کپڑے بدلتے ہیں لیکن اس عید کی پروا نہیں کرتے اور میلے کھیلے کپڑوں کے ساتھ آتے ہیں، میرے نزدیک یہ عید دوسری عیدوں سے افضل ہے اسی عید کے لیے سورة جمعہ ہے اور اسی کے لیے قصر نماز ہے اور جمعہ وہ ہے جس میں عصر کے وقت آدم پیدا ہوئے اور یہ عید اس زمانہ پر بھی دلالت کرتی ہے کہ پہلا انسان اس عید کو پیدا ہوا۔ قرآن شریف کا خاتمہ اس پر ہوا۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴، ۵)

شریعت وہی ہے جو آنحضرتؐ لائے اور جو قرآن شریف نے دنیا کو سکھائی۔ ایک نقطہ نہ گھٹایا گیا نہ بڑھایا گیا ہے۔ خدا جس طرح پہلے دیکھتا تھا اب بھی دیکھتا ہے، اس طرح جس طرح پہلے کلام کرتا تھا اسی طرح اب بھی صفت تکلم اس میں موجود ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اب خدا کلام نہیں کرتا۔ کیا خیال کیا جاسکتا ہے کہ پہلے تو خدا سنتا تھا مگر اب نہیں سنتا؟ پس اللہ تعالیٰ کے تمام صفات جو پہلے موجود تھے اب بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ خدا میں تغیر نہیں۔ شریعت چونکہ تکمیل پا چکی ہے۔ لہذا اب کسی نئی شریعت کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ پس اکمال دین کے بعد اور کسی نئی شریعت کی حاجت نہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۱ مورخہ ۶ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

مسیح کی قسمت میں بہت سے اجتماع رکھے ہیں کسوف و خسوف کا اجتماع ہوا۔ یہ بھی میرا ہی نشان تھا اور وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (التکویر: ۸) بھی میرے ہی لیے ہیں اور وَآخِرِينَ مِنْهُمْ لَبَّأً يَلْعَقُونَ بِيَهُمُ (الجمعة: ۴) بھی ایک جمع ہی ہے کیونکہ اول اور آخر کو ملا یا گیا ہے اور یہ عظیم الشان جمع ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات اور فیوض کی زندگی پر دلیل اور گواہ ہے اور پھر یہ بھی جمع ہے کہ خدا تعالیٰ نے تبلیغ کے سارے سامان جمع کر دیئے ہیں چنانچہ مطبخ کے سامان، کاغذ کی کثرت، ڈاک خانوں، تار، ریل اور دخانی جہازوں کے ذریعہ کل دنیا ایک شہر کا حکم رکھتی ہے اور پھر نئی ایجادیں اس جمع کو اور بھی بڑھا رہی ہیں کیونکہ اسباب تبلیغ جمع ہو رہے ہیں۔ اب فونوگراف سے بھی تبلیغ کا کام لے سکتے ہیں اور اس سے بہت عجیب کام نکلتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں کا اجراء غرض اس قدر سامان تبلیغ کے جمع ہوئے ہیں کہ اس کی نظیر کسی پہلے زمانہ میں ہم کو نہیں ملتی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اغراض میں سے ایک تکمیل دین بھی

تھی جس کے فرمایا گیا تھا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي اب اس تکمیل میں دو خوبیاں تھیں ایک تکمیل ہدایت اور دوسری تکمیل اشاعت ہدایت۔ تکمیل ہدایت کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا پہلا زمانہ تھا اور تکمیل اشاعت ہدایت کا زمانہ آپ کا دوسرا زمانہ ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۳ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۱، ۲۲)

میں جانتا ہوں کہ جن لوگوں نے ان ارکان کو چھوڑ کر اور بدعتیں تراشی ہیں یہ ان کی اپنی شامت اعمال ہے ورنہ قرآن شریف تو کہہ چکا تھا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ۔ اکمال دین ہو چکا تھا اور اتمام نعمت بھی۔ خدا کے حضور پسندیدہ دین اسلام ٹھہر چکا تھا۔ اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال خیر کی راہ چھوڑ کر اپنے طریقے ایجاد کرنا اور قرآن شریف کی بجائے اور وظائف اور کافیاں پڑھنا یا اعمالِ صالحہ کے بجائے قسم قسم کے ذکر اذکار نکال لینا یہ لذتِ روح کے لیے نہیں ہے بلکہ لذتِ نفس کی خاطر ہے۔ لوگوں نے لذتِ نفس اور لذتِ روح میں فرق نہیں کیا اور دونوں کو ایک ہی چیز قرار دیا ہے حالانکہ وہ دو مختلف چیزیں ہیں اگر لذتِ نفس اور لذتِ روح ایک ہی چیز ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ ایک بدکار عورت کے گانے سے بد معاشوں کو زیادہ لذت آتی ہے، کیا وہ اس لذتِ نفس کی وجہ سے عارف باللہ اور کامل انسان مانے جائیں گے؟ ہرگز نہیں! جن لوگوں نے خلاف شرع اور خلاف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم راہیں نکالی ہیں ان کو یہی دھوکا لگا ہے کہ وہ نفس اور روح کی لذت میں کوئی فرق نہیں کر سکتے ورنہ وہ ان بیہودگیوں میں روح کی لذت اور اطمینان نہ پاتے۔ ان میں نفسِ مطمئنہ نہیں ہے جو بلبے شاہ کی کافیاں میں لذت کے جویاں ہیں، روح کی لذت قرآن شریف سے آتی ہے۔

اپنی شامتِ اعمال کو نہیں سوچا ان اعمالِ خیر کو جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تھے، ترک کر دیا اور ان کی بجائے خود تراشیدہ درود وظائف داخل کر لیے اور چند کافیاں کا حفظ کر لینا کافی سمجھا گیا۔ بلبے شاہ کی کافیاں پر وجد میں آجاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کا جہاں وعظ ہو رہا ہو وہاں بہت ہی کم لوگ جمع ہوتے ہیں لیکن جہاں اس قسم کے مجمع ہوں وہاں ایک گروہ کثیر جمع ہو جاتا ہے۔ نیکیوں کی طرف سے یہ کم رغبتی اور نفسانی اور شہوانی امور کی طرف توجہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ لذتِ روح اور لذتِ نفس میں ان لوگوں نے کوئی فرق نہیں سمجھا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸۰)

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أَحَلَّ لَهُمْ ۗ قُلْ أَحَلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ ۗ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ  
مُكَلِّبِينَ يُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ ۗ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكَنَّ عَلَيْكُمْ ۗ وَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ  
عَلَيْهِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝

اگر یہ لوگ پوچھیں کہ پھر کھائیں کیا تو جواب یہ دے کہ دنیا کی تمام پاک چیزیں کھاؤ صرف مردار اور  
مردار کے مشابہ اور پلید چیزیں مت کھاؤ۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳۶)

اصل اشیاء میں حلت ہے، حرمت جب تک نص قطعی سے ثابت نہ ہو تب تک نہیں ہوتی۔

(الہدیر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۹)

الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ ۗ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَلْلٌ لَّكُمْ ۗ وَطَعَامُكُمْ  
حَلْلٌ لَهُمْ ۗ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ  
قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْفِحِينَ ۗ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ ۗ  
وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ ۗ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ ۝

(طَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَلْلٌ لَّكُمْ) تمدن کے طور پر ہندوؤں کی چیز بھی کھا لیتے ہیں اسی طرح  
عیسائیوں کا کھانا بھی درست ہے مگر بائیں ہمہ یہ خیال ضروری ہے کہ برتن پاک ہوں کوئی ناپاک چیز نہ ہو۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

چونکہ نصاریٰ اس وقت ایک ایسی قوم ہو گئی ہے جس نے دین کی حدود اور اس کے حلال و حرام کی کوئی پروا  
نہیں رکھی اور کثرت سے سور کا گوشت ان میں استعمال ہوتا ہے اور جو ذبح کرتے ہیں اس پر بھی خدا کا نام  
ہرگز نہیں لیتے بلکہ جھٹکے کی طرح جانوروں کے سر جیسا کہ سنا گیا ہے علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لیے شبہ پڑ  
سکتا ہے کہ بسکٹ اور دودھ وغیرہ جو ان کے کارخانوں کے بنے ہوئے ہوں ان میں سور کی چربی اور سور کے  
دودھ کی آمیزش ہو اس لیے ہمارے نزدیک ولایتی بسکٹ اور اس قسم کے دودھ اور شوربے وغیرہ استعمال  
کرنے بالکل خلاف تقویٰ اور ناجائز ہیں۔ جس حالت میں کہ سور کے پالنے اور کھانے کا عام رواج ان

لوگوں میں ولایت میں ہے تو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ دوسری اشیائے خوردنی جو کہ یہ لوگ طیار کر کے ارسال کرتے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی حصہ اس کا نہ ہوتا ہو..... ہمارے نزدیک نصاریٰ کا وہ طعام حلال ہے جس میں شبہ نہ ہو اور از روئے قرآن مجید کے وہ حرام نہ ہو ورنہ اس کے یہی معنی ہوں گے کہ بعض اشیاء کو حرام جان کر گھر میں تو نہ کھایا مگر باہر نصاریٰ کے ہاتھ سے کھا لیا اور نصاریٰ پر ہی کیا منحصر ہے اگر ایک مسلمان بھی مشکوک الحال ہو تو اس کا کھانا بھی نہیں کھا سکتے مثلاً ایک مسلمان دیوانہ ہے اور اسے حرام و حلال کی خبر نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس کے طعام یا طیار کردہ چیزوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اسی لیے ہم گھر میں ولایتی بسکٹ نہیں استعمال کرنے دیتے بلکہ ہندوستان کی ہندو کمپنی کے منگوا یا کرتے ہیں۔

عیسائیوں کی نسبت ہندوؤں کی حالت اضطراری ہے کیونکہ یہ کثرت سے ہم لوگوں میں مل جل گئے ہیں اور ہر جگہ انہیں کی دوکانیں ہوتی ہیں اگر مسلمانوں کی دوکانیں موجود ہوں اور سب شے وہاں ہی سے مل جاوے تو پھر البتہ ان سے خوردنی اشیاء نہ خریدنی چاہئیں۔

علاوہ ازیں میرے نزدیک اہل کتاب سے غالباً مراد یہودی ہی ہیں کیونکہ وہ کثرت سے اس وقت عرب میں آباد تھے اور قرآن شریف میں بار بار خطاب بھی انہیں کو ہے اور صرف توریت ہی کتاب اس وقت تھی جو کہ حلت اور حرمت کے مسئلے بیان کر سکتی تھی اور یہود کا اس پر اس امر میں جیسے عمل درآمد اس وقت تھا ویسے ہی اب بھی ہے انجیل کوئی کتاب نہیں ہے۔ (البدرد جلد ۳ نمبر ۲۷ مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

(وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ ..... وَلَا مُتَّخِذَاتُ أَخْدَانٍ) پاک دامن عورتیں تم میں سے یا پہلے اہل کتاب میں سے تمہارے لیے حلال ہیں کہ ان سے شادی کرو لیکن جب مہر قرار پا کر نکاح ہو جائے، بد کاری جائز نہیں اور نہ چھپا ہوا یا رانہ۔ عرب کے جاہلوں میں جس شخص کے اولاد نہ ہوتی تھی بعض میں یہ رسم تھی کہ ان کی بیوی اولاد کے لیے دوسرے سے آشنائی کرتی۔ قرآن شریف نے اس صورت کو حرام کر دیا۔ مسافت اسی بدرسم کا نام ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳۶)

قرآن نے تو یہ تعلیم دی ہے کہ پرہیزگار رہنے کی غرض سے نکاح کرو اور اولاد صالح طلب کرنے کے لیے دعا کرو جیسا کہ وہ اپنی پاک کلام میں فرماتا ہے: مُحْصِنَاتٍ عَدِيدٍ مُسْفِحِينَ الْجَزْءِ ۵ یعنی چاہیے کہ تمہارا نکاح اس نیت سے ہو کہ تا تم تقویٰ اور پرہیزگاری کے قلعہ میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ حیوانات کی طرح محض نطفہ نکالنا ہی تمہارا مطلب ہو اور مُحْصِنَاتٍ کے لفظ سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جو شادی نہیں کرتا وہ نہ

صرف روحانی آفات میں گرتا ہے بلکہ جسمانی آفات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے سو قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے تین فائدے ہیں؛ ایک عفت اور پرہیزگاری، دوسری حفظ صحت، تیسری اولاد۔

(آریہ دھرم، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲)

واضح ہو کہ احسان کا لفظ حصن سے مشتق ہے اور حصن قلعہ کو کہتے ہیں اور نکاح کرنے کا نام احسان اس واسطے رکھا گیا کہ اس کے ذریعہ سے انسان عفت کے قلعہ میں داخل ہو جاتا ہے اور بدکاری اور بد نظری سے بچ سکتا ہے اور نیز اولاد ہو کر خاندان بھی ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے اور جسم بھی بے اعتدالی سے بچا رہتا ہے پس گویا نکاح ہر ایک پہلو سے قلعہ کا حکم رکھتا ہے۔ (آریہ دھرم، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲ حاشیہ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَسْتُمْ مِنَ النِّسَاءِ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَليُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥﴾

نماز کا پڑھنا اور وضو کا کرنا طبی فوائد بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ اگر کوئی ہر روز منہ نہ دھوئے تو آنکھ آجاتی ہے اور یہ نزل الماء کا مقدمہ ہے اور بہت سی بیماریاں اس سے پیدا ہوتی ہیں پھر بتلاؤ کہ وضو کرتے ہوئے کیوں موت آتی ہے؟ بظاہر کیسی عمدہ بات ہے منہ میں پانی ڈال کر کلی کرنا ہوتا ہے، مسواک کرنے سے منہ کی بدبودور ہوتی ہے، دانت مضبوط ہو جاتے ہیں اور دانتوں کی مضبوطی غذا کے عمدہ طور پر چبانے اور جلد ہضم ہو جانے کا باعث ہوتی ہے پھر ناک صاف کرنا ہوتا ہے ناک میں کوئی بدبودار داخل ہو تو دماغ کو پرانگندہ کر دیتی ہے۔ اب بتلاؤ! اس میں برائی کیا ہے؟ اس کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی حاجات لے جاتا ہے اور اس کو اپنے مطالب عرض کرنے کا موقع ملتا ہے۔ دعا کرنے کے لیے فرصت ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ ..... فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا یعنی اگر تم مریض ہو یا سفر پر یا پاخانہ سے آویا

عورتوں سے مباشرت کرو اور پانی نہ ملے تو ان سب صورتوں میں پاک مٹی سے تیمم کرو۔

(شہادت القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۳۱، ۳۳۲)

(وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا) جنابت کی حالت میں غسل کر لیا کرو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۷۳۳)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوْمِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ  
قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۗ اِعْدِلُوا ۗ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا  
تَعْمَلُونَ ﴿۹﴾

حق اور انصاف پر قائم ہو جاؤ اور چاہیے کہ ہر ایک گواہی تمہاری خدا کے لئے ہو۔..... اور چاہیے کہ  
کسی قوم کی دشمنی تمہیں سچی گواہی سے نہ روکے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۱)

خدا تعالیٰ نے عدل کے بارے میں جو بغیر سچائی پر پورا قدم مارنے کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ فرمایا ہے: لَا  
يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۗ اِعْدِلُوا ۗ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ یعنی دشمن قوموں کی دشمنی تمہیں  
انصاف سے مانع نہ ہو۔ انصاف پر قائم رہو کہ تقویٰ اسی میں ہے۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ جو قومیں ناحق  
ستاویں اور دکھ دیویں اور خونریزیاں کریں اور تعاقب کریں اور بچوں اور عورتوں کو قتل کریں جیسا کہ مکہ والے  
کافروں نے کیا تھا اور پھر لڑائیوں سے باز نہ آویں ایسے لوگوں کے ساتھ معاملات میں انصاف کے ساتھ  
برتاؤ کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے مگر قرآنی تعلیم نے ایسے جانی دشمنوں کے حقوق کو بھی ضائع نہیں کیا اور  
انصاف اور راستی کے لئے وصیت کی..... میں سچ سچ کہتا ہوں کہ دشمن سے مدارات سے پیش آنا آسان  
ہے مگر دشمن کے حقوق کی حفاظت کرنا اور مقدمات میں عدل اور انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا یہ بہت مشکل اور  
فقط جو نامردوں کا کام ہے، اکثر لوگ اپنے شریک دشمنوں سے محبت تو کرتے ہیں اور میٹھی میٹھی باتوں سے  
پیش آتے ہیں مگر ان کے حقوق دبا لیتے ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی سے محبت کرتا ہے اور محبت کے پردہ  
میں دھوکا دے کر اس کے حقوق دبا لیتا ہے مثلاً اگر زمیندار ہے تو چالاک سے اس کا نام کاغذات بندوبست  
میں نہیں لکھواتا اور یوں اتنی محبت کہ اس پر قربان ہوا جاتا ہے پس خدا تعالیٰ نے اس آیت میں محبت کا ذکر نہ کیا  
بلکہ میعار محبت کا ذکر کیا کیونکہ جو شخص اپنے جانی دشمن سے عدل کرے گا اور سچائی اور انصاف سے درگزر نہیں

کرے گا وہی ہے جو سچی محبت بھی کرتا ہے۔ (نور القرآن نمبر ۲، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۴۰۹، ۴۱۰)

نیکی کی جڑ یہ بھی ہے کہ دنیا کی لذات اور شہوات جو کہ جائز ہیں ان کو بھی حد اعتدال سے زیادہ نہ لیوے جیسا کہ کھانا پینا اللہ تعالیٰ نے حرام تو نہیں کیا مگر اب اسی کھانے پینے کو ایک شخص نے رات دن کا شغل بنا لیا ہے اس کا نام دین پر بڑھانا ہے ورنہ یہ لذات دنیا کی اس واسطے ہیں کہ اس کے ذریعہ نفس کا گھوڑا جو کہ دنیا کی راہ میں ہے کمزور نہ ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے یکہ والے جب لمبا سفر کرتے ہیں تو ۷ یا ۸ کوس کے بعد وہ گھوڑے کی کمزوری کو محسوس کر کے اسے دم دیتے ہیں اور نہاری وغیرہ کھلاتے ہیں تاکہ اس کا پچھلا تکان رفع ہو جاوے تو انبیاء نے جو حظ دنیا کا لیا ہے وہ اسی طرح ہے کیونکہ ایک بڑا کام دنیا کی اصلاح کا ان کے سپرد تھا۔ اگر خدا کا فضل ان کی دستگیری نہ کرتا تو ہلاک ہو جاتے۔ اس واسطے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی وقت (حضرت) عائشہؓ کے زانو پر ہاتھ مار کر فرماتے کہ اے عائشہ! راحت پہنچا۔ مگر انبیاء کا یہ دستور نہ تھا کہ اس میں ہی منہمک ہو جاتے۔ انہماک بیشک ایک زہر ہے۔ ایک بد معاش آدمی جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کھاتا ہے اسی طرح اگر ایک صالح بھی کرے تو خدا کی راہیں اس پر نہیں کھلتی، جو خدا کے لیے قدم اٹھاتا ہے خدا کو اس کا ضرور پاس ہوتا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: اَعْدِلُوا ۗ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ - تنعم اور کھانے پینے میں بھی اعتدال کرنے کا نام ہی تقویٰ ہے صرف یہی گناہ نہیں ہے کہ انسان زنا نہ کرے، چوری نہ کرے بلکہ جائز امور میں بھی حد اعتدال سے نہ بڑھے۔ (البدل جلد ۲ نمبر ۳ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸)

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعْنَهُمْ ۖ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَسِيَةً ۙ يُحَدِّثُونَ كَلِمًا  
عَنْ مَوَاضِعِهِ ۚ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۗ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا  
قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَجِبُ الْمَحْسِنِينَ ﴿١٥﴾

(ایک شخص نے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام سے سوال کیا کہ)

سوال :- براہین احمدیہ میں آپ نے کلام الہی کی ایک نشانی یہ بھی لکھی ہے کہ وہ ہر ایک پہلو میں دوسری کلاموں سے افضل ہوتا ہے۔ تو ریت انجیل بھی تو خدا تعالیٰ کا کلام ہیں کیا ان میں بھی یہ وصف پایا جاتا ہے؟

(حضرت اقدس نے فرمایا کہ)

ان کتابوں کی نسبت قرآن مجید میں يُحَذِرُونَ الْكَلِمَةَ عَنْ مَوَاضِعِهِ (المائدة: ۱۴) لکھا ہے وہ لوگ شرح کے طور پر اپنی طرف سے بھی کچھ ملا دیا کرتے تھے۔ اس لیے جو کتابیں محرف مبدل ہو چکی ہیں ان میں یہ نشانی کب مل سکتی ہے؟

(اس پر حضرت حکیم الامت نے عرض کی کہ حضور تو ریت میں لکھا ہے ”پھر موسیٰ خدا کا بندہ مر گیا اور موسیٰ جیسا نہ کوئی پیدا ہوا نہ ہوگا اور اس کی قبر بھی آج تک کوئی نہیں جانتا“ تو یہ کلام حضرت موسیٰ کی ہو ہی کس طرح سکتی ہے؟ اور انجیل کی نسبت تو عیسائی خود قائل ہیں کہ وہ اصلی جو عیسیٰ کی انجیل تھی نہیں ملتی۔ یہ سب تراجم در تراجم ہیں اور ترجمے مترجم کے اپنے خیالات کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔ اور ان میں بہت سا حصہ اس قسم کا پایا جاتا ہے جو دوسروں کا بیان ہے جیسے صلیب کا واقعہ وغیرہ اس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ)

یہ ٹھیک بات ہے اگر تمام دنیا میں تلاش کریں تو قرآن مجید کی طرح خالص اور محفوظ کلام الہی کبھی نہیں مل سکتا، بالکل محفوظ اور دوسروں کی دست برد سے پاک کلام تو صرف قرآن مجید ہی ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۖ  
فَاغْرَبْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۗ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا  
كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿۱۵﴾

فَاغْرَبْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ یعنی ہم نے یہود اور نصاریٰ میں قیامت کے دن تک عداوت اور بغض ڈال دیا ہے۔ اس آیت سے بھی صاف طور پر ثابت ہے کہ یہودی قیامت کے دن تک رہیں گے کیونکہ اگر وہ پہلے ہی حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئیں گے تو پھر سلسلہ عداوت اور بغض کا قیامت تک کیوں کر منہد ہوگا؟ لہذا ماننا پڑا کہ ایسا خیال کہ حضرت مسیح کے نزول کی یہ علامت ہے کہ تمام اہل کتاب اُس پر ایمان لے آویں گے صریح نص قرآن اور حدیث سے مخالف ہے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۹۸)

اور جو کہتے ہیں کہ مسیح کے زمانہ میں یا جوج و ماجوج نکلیں گے اور ہر ایک بلندی سے اتریں گے اور تمام زمین کے مالک ہو جائیں گے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے پس یہ حق ہے ہم اس میں ان کی مخالفت نہیں کرتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ مسیح ان سے لڑے گا، نہیں! بلکہ ان پر بددعا کرے گا اور اس سے ان کے گلے میں کیڑا پیدا ہوگا جس سے وہ سب مرجائیں گے یہ بھی حق ہے ہم اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن انہوں نے اس میں غلطی کی ہے کہ یا جوج و ماجوج سب کے سب مرجائیں گے۔ کیونکہ یا جوج و ماجوج سے مراد وہ نصاریٰ ہیں جو روس اور برطانیہ قوموں سے ہیں اور خدا تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہود اور نصاریٰ قیامت تک رہیں گے چنانچہ فرمایا کہ ہم نے قیامت تک ان میں مخالفت ڈال دی ہے پس قیامت سے پہلے سب کے سب کس طرح مر سکتے ہیں؟ پس اگر موت سے جسمانی موت مراد ہو تو حدیث قرآن کے معارض ہو جاتی ہے کیونکہ قرآن تو بتاتا ہے کہ وہ قیامت تک باقی رہیں گے بلکہ قرآن تو اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ آسمان انہیں پرٹوٹیں گے اور قیامت انہیں شریروں پر قائم ہوگی۔

(ترجمہ از مرتب)

قرآن کریم واضح طور پر یہ بتا رہا ہے اور بلند

وَيَقُولُونَ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ يَخْرُجُونَ فِي زَمَنِ الْمَسِيحِ، وَيَنْسِلُونَ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ، وَيَمْلِكُونَ الْأَرْضَ كُلَّهَا كَمَا وَرَدَ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ، فَهَذَا حَقٌّ لَا نُجَادِلُهُمْ فِيهِ. وَيَقُولُونَ إِنَّ الْمَسِيحَ لَا يَخَارِبُهُمْ بَلْ يَدْعُو عَلَيْهِمْ، فَيَمُوتُونَ كُلُّهُمْ بِدُعَائِهِ بِدُودٍ تَتَوَلَّدُ فِي رِقَابِهِمْ، وَهَذَا أَيْضًا حَقٌّ وَوَلَيْسَ عِنْدَنَا إِلَّا التَّسْلِيمُ. وَلَكِنَّهُمْ أَخْطَأُوا قِيمًا قَالُوا إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ يَمُوتُونَ فِي زَمَنِ عَيْسَى كُلُّهُمْ، فَإِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ هُمُ النَّصَارَى مِنَ الرُّومِ وَالْأَقْوَامِ الْبَرْطَانِيَّةِ وَقَدْ أَخْبَرَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْ وُجُودِ النَّصَارَى وَالْيَهُودِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَقَالَ: فَأَعْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَكَيْفَ يَمُوتُونَ كُلُّهُمْ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ؟ فَلَوْ أَرَدْنَا مِنَ الْإِمَامَةِ الْإِمَامَةَ الْحَسَبَانِيَّةِ لَخَالَفَ الْحَدِيثَ الْقُرْآنَ وَعَارِضَهُ، فَإِنَّ الْقُرْآنَ يُخْبِرُنَا عَنْ بَقَائِهِمْ وَبَقَاءِ نَسْلِهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، بَلْ يُشِيرُ إِلَى أَنَّ السَّمَاوَاتِ يَتَفَطَّرْنَ عَلَيْهِمْ وَتَقُومُ الْقِيَامَةُ عَلَى أَشْرَارِهِمُ الْبَاقِينَ.

(حسامۃ البشری، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۰۹، ۲۱۰ حاشیہ)

فَإِنَّ الْقُرْآنَ يُعَلِّمُ بِتَعْلِيمِهِ وَاصْحَحْ

آواز سے یہ گواہی دے رہا ہے کہ یہود اور نصاریٰ قیامت تک موجود رہیں گے جیسا کہ اللہ عزّ وجل فرماتا ہے: فَاعْرَبْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اور ظاہر ہے کہ دشمنی اور بغض کا وجود دشمنوں اور بغض رکھنے والوں کے وجود ہی کی فرع ہے جو ان کے موجود ہونے کے بغیر تحقق نہیں ہو سکتی اور ہم یہ بات متواتر اور بار بار بیان کر آئے ہیں تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں اور اپنے انجام سے ڈریں۔ پس اس بات پر ہم کس طرح ایمان لا سکتے ہیں کہ جملہ مذاہب کے پیروکار کسی وقت تمام کے تمام ہلاک ہو جائیں گے؟ کیا ہم قرآن مبین کی آیات کا انکار کر دیں؟ (ترجمہ از مرتب)

وَيَشْهَدُ بِصَوْتٍ عَالٍ أَنَّ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى يَنْقُونَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَمَا قَالَ عَزَّ وَجَلَّ: فَاعْرَبْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَعْلُومٌ أَنَّ وُجُودَ الْعَدَاوَةِ وَالْبَغْضَاءِ فَرَعٌ لِّوُجُودِ الْمُعَادِيَتَيْنِ وَالْمُبَاغِضَتَيْنِ، وَلَا يَتَحَقَّقُ إِلَّا بَعْدَ وُجُودِهِمْ۔ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ وَقُلْنَا غَيْرَ مَرَّةٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ أَوْ يَكُونُونَ مِنَ الْخَائِفِينَ. فَكَيْفَ نُؤْمِنُ بِأَنَّ أَهْلَ الْبَلَدِ كُلَّهَا يَهْلِكُ فِي وَقْتٍ مِّنَ الْأَوْقَاتِ أَنْ كُفِّرَ بِآيَاتِ كِتَابِ مُّبِينٍ۔  
(حمامة المشري، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۳۹)

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے: فَاعْرَبْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے: وَالْقِيَامَةَ بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (المائدة: ۶۵)۔ ان آیتوں کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے قیامت تک یہود اور نصاریٰ میں دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے پس اگر آیت ممدوحہ بلا کے یہ معنی ہیں کہ قیامت سے پہلے تمام یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے تو اس سے لازم آتا ہے کہ کسی وقت یہود و نصاریٰ کا بغض باہمی دور بھی ہو جائے گا اور یہودی مذہب کا تخم زمین پر نہیں رہے گا حالانکہ قرآن شریف کی ان آیات سے اور کئی اور آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی مذہب قیامت تک رہے گا۔ ہاں! ذلت اور مسکنت ان کے شامل حال ہوگی اور وہ دوسری طاقتوں کی پناہ میں زندگی بسر کریں گے۔ (برائین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۰۹)

قرآن کریم اس بات کا گواہ ہے کہ سلسلہ کفر کا بلا فصل قیامت کے دن تک قائم رہے گا اور یہ کبھی نہیں ہوگا کہ سب لوگ ایک ہی مذہب پر ہو جائیں اور اختلاف کفر اور ایمان اور بدعت اور توحید کا درمیان سے اٹھ جائے چنانچہ اس اختلاف کو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ضروری الوجود انسانوں کی فطرت کیلئے قرار دیتا ہے اور

کفر کا تخم قیامت تک قائم رہنے کیلئے یہ آیات صریحہ الدلالات ہیں جو پہلے پرچہ میں لکھ چکا ہوں یعنی  
 وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (ال عمران: ۵۶) اور آیت: اَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ  
 الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ - (الحق مباحثہ دہلی، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۹۳)

وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (المائدۃ: ۶۵)۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ یہود اور  
 نصاریٰ میں قیامت تک بغض اور دشمنی رہے گی تو اب بتلاؤ کہ جب تمام یہودی قیامت سے پہلے ہی حضرت  
 مسیح پر ایمان لے آئیں گے تو پھر بغض اور دشمنی قیامت تک کون لوگ کریں گے۔ جب یہودی نہ رہے اور  
 سب ایمان لے آئے تو پھر بغض اور دشمنی کے لئے کون موقعہ اور محل رہا اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاغْرَيْنَا  
 بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ اس کے بھی یہی معنی ہیں جو اوپر گزر چکے اور وہی اعتراض ہے  
 جو اوپر بیان ہو چکا۔ (تحفہ گوڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۳۰۹)

یعنی قیامت تک عیسائیوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

يَا هَلْ الْكِتَابَ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ

الْكِتَابِ وَيَعْقُوا عَنْ كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُبِينٌ ﴿۱۱﴾

وجود مبارک حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم میں کئی نور جمع تھے سوان نوروں پر ایک اور نور آسمانی جو  
 وحی الہی ہے وارد ہو گیا اور اس نور کے وارد ہونے سے وجود باوجود خاتم الانبیاء کا مجمع الانوار بن گیا۔.....  
 انبیاء مجملہ سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی کے وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نور باطنی عطا ہوا  
 ہے کہ گویا وہ نور مجسم ہو گئے ہیں۔ اسی جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور اور  
 سراج منیر رکھا ہے جیسا فرمایا ہے: قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُبِينٌ۔ الجزء نمبر ۶۔ وَ دَاعِيًا إِلَى اللَّهِ  
 بِأَذْنِهِ وَ سِرًّا جَاءَ قُنْيَبَرًا (الاحزاب: ۴۷)۔ الجزء نمبر ۲۲۔ یہی حکمت ہے کہ نور وحی جس کے لئے نور فطرتی کا  
 کامل اور عظیم الشان ہونا شرط ہے صرف انبیاء کو ملا اور انہیں سے مخصوص ہوا۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۹۵، ۱۹۶ء حاشیہ نمبر ۱۱)

ظلمانی زمانہ کے تدارک کے لئے خدائے تعالیٰ کی طرف سے نور آتا ہے وہ نور اس کا رسول اور اس کی

کتاب ہے خدا اس نور سے ان لوگوں کو راہ دکھلاتا ہے کہ جو اس کی خوشنودی کے خواہاں ہیں سوان کو خدا ظلمات سے نور کی طرف نکالتا ہے اور سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۳۸، ۶۳۹)

اس سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں کہ انسان خدا کا پیارا ہو جائے۔ پس جس کی راہ پر چلنا انسان کو محبوب الہی بنا دیتا ہے۔ اس سے زیادہ کس کا حق ہے کہ اپنے تئیں روشنی کے نام سے موسوم کرے۔ اسی لئے اللہ جل شانہ نے قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور رکھا ہے جیسا کہ فرماتا ہے: قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ۔ یعنی تمہارے پاس خدا کا نور آیا ہے۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۳۷۲) قرآن کے ذریعہ سے سلامتی کی راہوں کی ہدایت ملتی ہے اور لوگ ظلمت سے نور کی طرف نکالے جاتے ہیں۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۳۳۰ حاشیہ)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿۱۹﴾

خدا تعالیٰ نے یہودیوں کا ایک قول بطور حکایت عن الیہود قرآن شریف میں ذکر فرمایا ہے اور وہ قول یہ ہے کہ: نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ یعنی ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ اس جگہ ابناء کے لفظ کا خدا تعالیٰ نے کچھ رد نہیں کیا کہ تم کفر بکتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ اگر تم خدا کے پیارے ہو تو پھر وہ تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے؟ اور ابناء کا دوبارہ ذکر بھی نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہودیوں کی کتابوں میں خدا کے پیاروں کو بیٹا کر کے بھی پکارتے تھے۔ (حقیقت الہی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۶۷)

جب انسان خدا کی طرف بکلی آجاتا ہے اور نفس کی طرف کو بکلی چھوڑ دیتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کا دوست ہو جاتا ہے تو کیا وہ پھر دوست کو دوزخ میں ڈال دے گا؟ نَحْنُ أَوْلِيَاءُ اللَّهِ سے ظاہر ہے کہ احباء کو دوزخ میں نہیں ڈالتے۔ (الہد جلد ۲، نمبر ۴۱، ۴۲، مورخہ ۲۹/ اکتوبر ۸ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۲۲)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اپنے اولیاء کو کبھی عذاب نہیں کرتے بلکہ اس دلیل سے یہود و نصاریٰ کے دعوے کی تردید کرتا ہے ان دونوں نے دعویٰ کیا تھا کہ: قَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَ

أَحِبَّاءٌ ۖ - کہ ہم خدا کے پیارے اور بمنزلہ اس کی اولاد کے ہیں تو اس کا جواب خدا تعالیٰ نے یہ دیا: قُلْ قَلِمًا يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ کہ اگر تم خدا کے پیارے اور بمنزلہ اس کی اولاد کے ہو تو پھر تمہاری شامت اعمال پر تم کو وہ دکھ اور تکالیف کیوں دیتا ہے پس اس سے ثابت ہے کہ جو خدا کے پیارے ہوتے ہیں ان کو دنیا میں دکھ نہیں ہوتا اور وہ ہر ایک قسم کے عذاب سے محفوظ ہوتے ہیں۔ پس اگر اس کے پیاروں کو عذاب ہوتا رہے تو پھر کافروں میں اور ان میں کیا فرق ہوا؟ (الہدٰی جلد ۲ نمبر ۲۵ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۵۵)

خوب یاد رکھو کہ جب تک خدا تعالیٰ سے رشتہ نہ ہو اور سچا تعلق اس کے ساتھ نہ ہو جاوے کوئی چیز نفع نہیں دے سکتی۔ یہودیوں کو دیکھو کہ کیا وہ پیغمبروں کی اولاد نہیں یہی وہ قوم ہے جو اس پر ناز کیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی: نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاءُ ۖ ہم اللہ کے فرزند اور اس کے محبوب ہیں مگر جب انہوں نے خدا تعالیٰ سے رشتہ توڑ دیا اور دنیا ہی دنیا کو مقدم کر لیا، کیا نتیجہ ہوا؟ خدا تعالیٰ نے اسے سوراہ بندر کہا اور اب جو حالت ان کی مال و دولت ہوتے ہوئے بھی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

اللہ تعالیٰ نے جو ہم کو مخاطب کیا ہے کہ اَنْتُمْ مَرْثِيٌّ بِمَنْزِلَةِ اَوْلَادِي - اس جگہ یہ تو نہیں کہا کہ تو میری اولاد ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ بمنزلہ اولاد کے ہے یعنی اولاد کی طرح ہے اور دراصل یہ عیسائیوں کی اس بات کا جواب ہے جو وہ حضرت عیسیٰ کو حقیقی طور پر ابن اللہ مانتے ہیں حالانکہ خدا کی کوئی اولاد نہیں اور خدا نے یہودیوں کے اس قول کا عام طور پر کوئی رد نہیں کیا جو کہتے تھے کہ نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاءُ ۖ - بلکہ یہ ظاہر کیا ہے کہ تم ان ناموں کے مستحق نہیں ہو۔ دراصل یہ ایک محاورہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے برگزیدوں کے حق میں اکرام کے طور پر ایسے الفاظ بولتا ہے جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں اور میں اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں اور جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ اے بندے! میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ دیا اور میں بھوکا تھا تو نے مجھے روٹی نہ دی۔ ایسا ہی توریت میں بھی لکھا ہے کہ یعقوب خدا کا فرزند بلکہ نخست زادہ ہے۔ سو یہ سب استعارے ہیں۔ جو عام طور پر خدا تعالیٰ کی عام کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور احادیث میں ہے اور خدا تعالیٰ نے یہ الفاظ میرے حق میں اسی واسطے استعمال کیے ہیں کہ تا عیسائیوں کا رد ہو کیونکہ باوجود ان لفظوں کے میں کبھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا کہ نعوذ باللہ! میں خدا کا بیٹا ہوں بلکہ ایسا دعویٰ کرنا کفر سمجھتے ہیں اور ایسے الفاظ جو انبیاء کے حق میں خدا تعالیٰ نے بولے ہیں ان میں سب سے زیادہ اور سب سے بڑا عزت کا خطاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: قُلْ يُجَادِي (الزمر: ۵۴)۔ جس کے معنی ہیں کہ اے میرے بندو! اب ظاہر ہے کہ وہ لوگ خدا تعالیٰ کے بندے تھے نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے اس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ کا اطلاق استعارہ کے رنگ میں کہاں تک وسیع ہے۔ (الہدٰی جلد ۶ نمبر ۴۵ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

يَا هَلْ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرَّسُلِ أَنْ تَقُولُوا  
مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ  
قَدِيرٌ ﴿٦٠﴾

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت ایک ایسی ظلمانی حالت پر زمانہ آچکا تھا کہ جو آفتابِ صداقت کے ظاہر ہونے کے متقاضی تھے اسی جہت سے خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں اپنے رسول کا بار بار یہی کام بیان کیا ہے کہ اس نے زمانہ کو سخت ظلمت میں پایا اور پھر ظلمت سے ان کو باہر نکالا۔

(براہین احمدیہ چہار حصہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۴)

نزیر کا لفظ اسی مرسل کے لیے خدا تعالیٰ استعمال کرتا ہے جس کی تائید میں یہ مقدر ہوتا ہے کہ اس کے منکروں پر کوئی عذاب نازل ہوگا کیونکہ نذیر ڈرانے والے کو کہتے ہیں اور وہی نبی ڈرانے والا کہلاتا ہے جس کے وقت میں کوئی عذاب نازل ہونا مقدر ہوتا ہے۔ پس آج سے چھبیس ۲۶ برس پہلے جو براہین احمدیہ میں میرا نام نذیر رکھا گیا اس میں صاف اشارہ تھا کہ میرے وقت میں عذاب نازل ہوگا۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۸۶)

قَالُوا يَبُوسَىٰ إِنَّا لَنُؤَدُّ خُلُهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَادْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا  
إِنَّا لَهُنَا قَعْدُونَ ﴿٦٥﴾

توریت میں جا بجا حضرت موسیٰ کے صحابہ کا نام ایک سرکش اور سخت دل اور مرتکب معاصی اور مفسد قوم لکھا ہے جن کی نافرمانیوں کی نسبت قرآن شریف میں بھی یہ بیان ہے کہ ایک لڑائی کے موقع کے وقت میں

انہوں نے حضرت موسیٰ کو یہ جواب دیا تھا: **فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ** یعنی تو اور تیرا رب دونوں جا کر دشمنوں سے لڑائی کرو ہم تو اسی جگہ بیٹھیں گے، یہ حال تھا ان کی فرمانبرداری کا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے دلوں میں وہ جوش عشق الہی پیدا ہوا اور توجہ قدسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تاثیر ان کے دلوں میں ظاہر ہوئی کہ انہوں نے خدا کی راہ میں بھیڑوں اور بکریوں کی طرح سرکٹائے۔ کیا کوئی پہلی اُمت میں ہمیں دکھا سکتا ہے یا نشان دے سکتا ہے کہ انہوں نے بھی صدق اور صدا دکھلایا؟

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲ احاشیہ)

بنی اسرائیل کے حالات اور واقعات کو بنظر غور دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی اصل غرض موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی کیا تھی؟ بڑی بھاری غرض یہی تھی کہ وہ فرعون کی غلامی سے نکلیں چنانچہ روحانی امور اور خدا پرستی کے متعلق وہ ہمیشہ ٹھوکر کھاتے رہے اور بے جا گستاخیوں اور شوخیوں سے کام لیتے رہے یہاں تک کہ **لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ تَرَىٰ اللّٰهَ جَهْرَةً** (البقرہ: ۵۶) اور **اِذْ هَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ** جیسے کلمات کہنے اور ذرا سی غیر حاضری میں گوسالہ پرستی کرنے سے باز نہ آئے اور بات بات میں ضد اور اعتراض سے کام لیتے ان کے حالات پر پوری نظر کے بعد صاف معلوم دیتا ہے کہ وہ صرف (اور) صرف فرعون کی غلامی سے ہی آزاد ہونا چاہتے تھے خود اپنے آپ میں رہبری اور سرداری کی قوت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام کی بات سنتے ہی طیار ہو گئے۔ چونکہ بہت تنگ آچکے تھے اور مرتا کیا نہ کرتا اپنی سرخروئی انہوں نے اسی میں سمجھی، حضرت موسیٰ کے ساتھ نکل پڑے لیکن آخر موسیٰ کی کامیابیوں کی راہ میں ٹھوکر کا پتھر بنے۔ غرض حضرت موسیٰ کو بہت محنت و مشقت کرنے کی ضرورت نہ پڑی قوم زندان غلامی میں گرفتار تھی اور طیار تھی کہ کوئی آئے تو اسے قبول کر لیں۔ ایسی حالت میں کئی لاکھ آدمیوں نے ایک دن میں قبول کر لیا اور انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ وہ کیسی قوم ہے اور موسیٰ کی تعلیم سے انہوں نے کیا فائدہ اٹھایا ہے پس یہاں تک کہ ان کو مصر سے نکال لیا کوئی بڑا کام نہ تھا۔ اصلاح کا زمانہ جب آیا اور موسیٰ نے جب چاہا کہ ان کو خدا پرست قوم بنا کر وعدہ کی سرزمین میں داخل کریں وہ ان کی شوخیوں اور گستاخیوں اور اندرونی بد اعمالیوں میں گزر رہا یہاں تک کہ خود حضرت موسیٰ بھی اس سرزمین میں داخل نہ ہو سکے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو کہا کہ بڑھ کر دشمن پر حملہ کرو تو انہوں نے کیا شرمناک جواب دیا: **فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا فَعِدُوْنَ** تو اور تیرا رب جاؤ اور لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ صحابہ کی لائف میں ایسا کوئی موقع نہیں آیا بلکہ انہوں نے کہا کہ ہم ان میں سے نہیں ہیں جنہوں نے یہ کہا: **فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ**۔ ایسی قوت اور شجاعت اور وفاداری کا جوش کیوں کر پیدا ہو گیا تھا؟ یہ سب ایمان اور یقین کا نتیجہ تھا جو آپ کی قوت قدسی اور تاثیر کا اثر تھا آپ نے ان کو ایمان سے بھر دیا تھا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱، ۱۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر نکلتے ہیں مگر وہ اس قوم کو کجرو کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بات بات پر اعتراض کرنے والے اور انکار کرنے والی قوم تھی۔ یہاں تک کہ کہہ دیا: **فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا فَعِدُوْنَ** مگر اس کے بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو دیکھو کہ انہوں نے بکریوں کی طرح اپنا خون بہا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ایسے گم ہو گئے تھے کہ وہ اس کے لیے ہر ایک تکلیف اور مصیبت کو اٹھانے کو ہر وقت طیار تھے انہوں نے یہاں تک ترقی کی کہ **رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوا عَنْهُ** (المائدة: ۱۲۰) کا سرٹیفکیٹ ان کو دیا گیا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۷ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲، ۱)

**وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنِي آدَمَ بِالْحَقِّ ۖ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتَقَبَّلَ مِنْ اِحْدَاهِمَا وَ كَمَ**

**يُنْتَقَبَلُ مِنَ الْاٰخِرِ ۗ قَالَ لَا فُنْتَلَّتْكَ ۗ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝**

دعا کی راہ میں دو بڑے مشکل امر ہیں جن کی وجہ سے اکثر دلوں سے عظمت دعا کی پوشیدہ رہتی ہے؛ (۱) اول تو شرط تقویٰ اور راست بازی اور خدا ترسی ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: **اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ** یعنی اللہ تعالیٰ پرہیزگار لوگوں کی دعا قبول کرتا ہے۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۲۶۰) تقویٰ کے مدارج اور مراتب بہت ہیں لیکن اگر طالب صادق ہو کر ابتدائی مراتب اور مراحل کو استقلال اور خلوص سے طے کرے تو وہ اس راستی اور طلب صدق کی وجہ سے اعلیٰ مدارج کو پالیتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ** گویا اللہ تعالیٰ متقیوں کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔ یہ گویا اس کا وعدہ ہے اور اس کے وعدوں میں تخلف نہیں ہوتا جیسے کہ فرمایا ہے: **اِنَّ اللهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ** (ال عمران: ۱۰)۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ صفحہ ۱۳۳)

اللہ تعالیٰ متقیوں کی دعائیں قبول کرتا ہے جو لوگ متقی نہیں ہیں ان کی دعائیں قبولیت کے لباس سے نکلی ہیں۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمانیت ان لوگوں کی پرورش میں اپنا کام کر رہی ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

جن لوگوں نے جلد بازی کے ساتھ بدظنی کر کے اس سلسلہ کو جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے رد کر دیا ہے اور اس قدر نشانوں کو (دیکھ کر) پروا نہیں کی اور اسلام پر جو مصائب ہیں اس سے لاپرواہ پڑے ہیں ان لوگوں نے تقویٰ سے کام نہیں لیا اور اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے کہ **إِنَّمَا يَتَّقِبَلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ** خدا صرف متقی لوگوں کی نماز قبول کرتا ہے اس واسطے کہا گیا ہے کہ ایسے آدمی کے پیچھے نماز نہ پڑھو جس کی نماز خود قبولیت کے درجہ تک پہنچنے والی نہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۸)

خدا تعالیٰ نے ذاتوں اور قوموں کو اڑا دیا ہے یہ دنیا کے انتظام اور عرف کے لیے قبائل ہیں۔ مگر ہم نے خوب غور کر لیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے حضور جو مدارج ملتے ہیں ان کا اصل باعث تقویٰ ہی ہے۔ جو متقی ہے وہ جنت میں جائے گا خدا تعالیٰ اس کے لیے فیصلہ کر چکا ہے۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک معزز متقی ہی ہے پھر یہ جو فرمایا ہے: **إِنَّمَا يَتَّقِبَلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ** کہ اعمال اور دعائیں متقیوں کی قبول ہوتی ہیں یہ نہیں کہا کہ **وَمِنَ السَّيِّئِينَ**۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

جب تک انسان اپنا ایمان اس حد تک نہیں پہنچاتا کہ سنت سے فائدہ اٹھاوے تو خدا (تعالیٰ) کیسے اس کے لیے سنت بدل دیوے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۳)

اللہ تعالیٰ کی اجابت بھی متقین کے لیے ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **إِنَّمَا يَتَّقِبَلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ** درحقیقت جب تک انسان تقویٰ اختیار نہ کرے اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں بے نظیر صفات ہیں جو لوگ اس کی راہ پر چلتے ہیں انہیں کو اس سے اطلاع ملتی ہے اور وہی اس سے مزہ پاتے ہیں۔ خدا سے رشتہ میں اس قدر شیرینی اور لذت ہوتی ہے کہ کوئی پھل ایسا شیریں نہیں ہوتا۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

بار بار قرآن شریف کو پڑھو اور تمہیں چاہیے کہ برے کاموں کی تفصیل لکھتے جاؤ اور پھر خدا تعالیٰ کے فضل اور تائید سے کوشش کرو کہ ان بدیوں سے بچتے رہو۔ یہ تقویٰ کا پہلا مرحلہ ہوگا جب تم ایسی سعی کرو گے تو اللہ پھر تمہیں توفیق دے گا اور وہ کافوری شربت تمہیں دیا جاوے گا جس سے تمہارے گناہ کے جذبات بالکل سرد

ہو جائیں گے اس کے بعد نیکیاں ہی سرزد ہوں گی۔ جب تک انسان متقی نہیں بنتا یہ جام اسے نہیں دیا جاتا اور نہ اس کی عبادت اور دعاؤں میں قبولیت کا رنگ پیدا ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ** یعنی بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کی عبادت کو قبول فرماتا ہے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ نماز، روزہ بھی متقیوں ہی کا قبول ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

پہلے ایمان کو درست کرو، یہ ریاضتیں جو طریقہ نبوی سے باہر ہیں یہ تو کسی کام نہ آئیں گی اور نہ منزل مقصود کو پہنچائیں گی دیکھو بعض جوگی اس قدر ریاضتیں کرتے ہیں کہ اپنے بازو سکھا دیتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک مقبول نہیں کیونکہ ایک تو ارشاد نبوی کے خلاف، دوم ایمان ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ** یعنی اللہ ان کی عبادت قبول کرتا ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں اور ڈرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے منشاء کے مطابق کام کرتے ہیں اور سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ اس کے مامور کو مانیں۔ دیکھو! یہودی خدا کو مانتے ہیں اور مشرک بھی نہیں۔ قبلہ بھی ان کا وہ ہے جو پہلے مسلمانوں کا رہ چکا ہے مگر پھر بھی خدا کے حضور مقبول نہیں صرف اس لیے کہ اللہ کے رسول کو نہ مانا۔ رسولوں کو نہ ماننے سے وہی جنہیں عالمین پر فضیلت دی گئی تھی ملعون ہوئے کیونکہ گناہ تو اور بھی ہیں مگر سب سے بڑا گناہ مامور من اللہ کا انکار ہے۔

(البرد جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

انسان کو چاہیے کہ نیکی میں کوشش کرے اور ہر وقت دعا میں لگا رہے۔ یقیناً جانو کہ جماعت کے لوگوں میں اور ان کے غیر میں اگر کوئی ماہ الامتیاز ہی نہیں ہے تو پھر خدا کوئی کسی کا رشتہ دار تو نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ان کو عزت دے اور ہر طرح حفاظت میں رکھے اور ان کو ذلت دے اور عذاب میں گرفتار کرے؟ **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ**۔ متقی وہی ہیں کہ خدا سے ڈر کر ایسی باتوں کو ترک کر دیتے ہیں جو منشاء الہی کے خلاف ہیں نفس اور خواہشات نفسانی کو اور دنیا و مافیہا کو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ہیچ سمجھیں۔ ایمان کا پتہ مقابلے کے وقت لگتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ إِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ بَعَدَ ذَلِكَ

## فِي الْأَرْضِ لَسْرِفُونَ ﴿٣١﴾

(مَنْ قَتَلَ نَفْسًا..... قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا) جس نے ایک انسان کو ناحق بے موجب قتل کر دیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۴۲۵، ۴۲۶ حاشیہ نمبر ۳)

یہ بالکل خطا ہے کہ اسی ایک امر کو پلے باندھ لو کہ طاعون والے سے پرہیز کریں تو طاعون نہ ہوگا۔ پرہیز کرو جہاں تک مناسب ہے لیکن اس پرہیز سے باہمی اخوت اور ہمدردی نہ اٹھ جاوے اور اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق پیدا کرو۔ یاد رکھو کہ مردہ کی تجہیز و تکفین میں مدد دینا اور اپنے بھائی کی ہمدردی کرنا صدقات خیرات کی طرح ہی ہے یہ بھی ایک قسم کی خیرات ہے اور یہ حق حق العباد کا ہے جو فرض ہے.... جو شخص ہمدردی کو چھوڑتا ہے وہ دین کو چھوڑتا ہے۔ قرآن شریف فرماتا ہے: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ الْآيَةِ يَعْنِي جَوْشَخْصِ كَسِي نَفْسٍ كُو بِلَا وَجَلِّ قَتَلْ كَر دِي تَا هے وَه كُو يَا سَارِي دُنْيَا كُو قَتَلْ كَر تَا هے ايسَا هِي مِي كَهْتَا هُولْ كَه اِگَر كَسِي شَخْصِ نَ اِنِ پَنِي بَهَائِي كَه سَا تَه هَمْرُدِي نِي مِي كِي تُو اَس نَ سَارِي دُنْيَا كَه سَا تَه هَمْرُدِي نِي مِي كِي۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۵ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جس شخص نے ایسے شخص کو قتل کیا کہ اس نے کوئی ناحق کا خون نہیں کیا تھا یا کسی ایسے شخص کو قتل کیا جو نہ بغاوت کے طور پر امن عامہ میں خلل ڈالتا تھا اور نہ زمین میں فساد پھیلاتا تھا تو اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا یعنی بے وجہ ایک انسان کو قتل کر دینا خدا کے نزدیک ایسا ہے کہ گویا تمام بنی آدم کو ہلاک کر دیا۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ بے وجہ کسی انسان کا خون کرنا کس قدر اسلام میں جرم کبیر ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۹۴)

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ كَه سَا تَه آ گے اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ بِي لَكْهَا هے۔ فساد كا لفظ وَسِعْ هے جُو شے كَسِي زَمَانَه مِي فساد كا مَوْجِبْ هُو سَكْتِي هے وَه اَسْنَدَه زَمَانَه مِي قَتَلْ نَفْسٍ كَا... مَوْجِبْ بِي هُو سَكْتِي هے۔ حشرات الارض كو هَم دِي كِهْتِي هِي كَه سِي كْطُرُوں هَزَارُوں رُو زَمَارے جَاتِي هِي اَس لِيے كَه وَه كَسِي كِي اِيْذَا كَا مَوْجِبْ نَه هُولْ چِنَا نچ لَكْهَا هے كَه قَتَلْ الْمُوْذِي قَبْلَ الْاِيْذَاهُ تُو هَر اِيْكَ مُوْذِي شے كَا قَتَلْ اَس كَه اِيْذَا دِيْنِي سَ قَبْلَ

جائز ہوتا ہے حالانکہ اس موذی نے ابھی کوئی قتل وغیرہ کیا نہیں ہوتا<sup>۱</sup>

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۹ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۷۰)

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَلِكَ لَهُمْ جزئ في الدنيا ولهم في الآخرة عذاب عظيم ﴿۳۳﴾

یعنی سوا اس کے نہیں کہ بدلہ ان لوگوں کا کہ جو خدا اور رسول سے لڑتے اور زمین پر فساد کے لیے دوڑتے ہیں یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف طرف سے کاٹے جائیں یا جلا وطن کر کے قید رکھے جائیں یہ رسوائی ان کی دنیا میں ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ کے نزدیک ہمارے رسول کریم کی عدول حکمی اور اس کا مقابلہ کچھ چیز نہیں تھا تو ایسے منکروں کو جو موحد تھے (جیسا کہ یہودی) انکار اور مقابلہ کی وجہ سے اس قدر سخت سزا یعنی طرح طرح کے عذابوں سے موت کی سزا دینے کے لیے خدا تعالیٰ کی کتاب میں کیوں حکم لکھا گیا اور کیوں ایسی سخت سزا میں دی گئیں کیونکہ دونوں طرف موحد تھے اس طرف بھی اور اس طرف بھی اور کسی گروہ میں کوئی مشرک نہ تھا اور باوجود اس کے یہودیوں پر کچھ بھی رحم نہ آیا اور ان موحد لوگوں کو محض انکار اور مقابلہ رسول کی وجہ سے بری طرح قتل کیا گیا یہاں تک کہ ایک دفعہ دس ہزار یہودی ایک ہی دن میں قتل کیے گئے حالانکہ انہوں نے صرف اپنے دین کی حفاظت کے لیے انکار اور مقابلہ کیا تھا اور اپنے خیال میں بکے موحد تھے اور خدا کو ایک جانتے تھے۔ ہاں! یہ بات ضرور یاد رکھو کہ بیشک ہزاروں یہودی قتل کیے گئے مگر اس غرض سے نہیں کہ تا وہ مسلمان ہو جائیں بلکہ محض اس غرض سے کہ خدا کے رسول کا مقابلہ کیا اس لیے وہ خدا کے نزدیک مستوجب سزا ہو گئے اور پانی کی طرح ان کا خون زمین پر بہا یا گیا۔ پس ظاہر ہے کہ اگر تو حید کافی ہوتی تو یہودیوں کا کوئی جرم نہ تھا وہ بھی تو موحد تھے وہ محض انکار اور مقابلہ رسول کی وجہ سے کیوں خدا تعالیٰ کے نزدیک قابل سزا ٹھہرے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۶۱، ۱۶۲)

۱۔ قانون قدرت ہمیں اس قانون کے رواج کا نشان دیتا ہے قرآن کریم اور دیگر کسی شریعت آسمانی نے بھی یہی جائز

رکھا اور عقل انسانی بھی اسی قتل حفظ ما تقدم کے لیے سبق دیتی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ  
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۲۱﴾

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ درود شریف کے پڑھنے میں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں ایک زمانہ تک مجھے بہت استغراق رہا کیونکہ میرا یقین تھا کہ خدا تعالیٰ کی راہیں نہایت دقیق راہیں ہیں وہ بجز وسیلہ نبی کریم کے مل نہیں سکتیں جیسا کہ خدا بھی فرماتا ہے: وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ تب ایک مدت کے بعد کشفی حالت میں میں نے دیکھا کہ دو سقے یعنی ماشکی آئے اور ایک اندرونی راستے سے اور ایک بیرونی راہ سے میرے گھر میں داخل ہوئے ہیں اور ان کے کاندھوں پر نور کی مشکیں ہیں اور کہتے ہیں لَهَذَا بِمَا صَلَّيْتَ عَلَي مُحَمَّدٍ - (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۳۱ حاشیہ)

وَ تَقَيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمُ بَعْيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ  
التَّوْرَةِ ۚ وَ اتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَ نُورًا ۚ وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ  
التَّوْرَةِ وَ هُدًى وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۲۲﴾ وَ لِيُحْكُمَ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ  
فِيهِ ۗ وَ مَنْ لَّمْ يُحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۲۳﴾

قرآن کریم یہود و نصاریٰ کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں کی پیروی کریں اور نہ یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی شریعتوں پر ہی قائم رہیں بلکہ وہ انہیں اسلام اور اس کے احکام کی طرف بلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز (قرآن شریف) میں فرمایا ہے: إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ - وَ مَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۗ وَ هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ - پس خدائے قدوس کی ذات کے بارہ میں یہ خیال کیوں کر کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک طرف تو ان آیات میں یہود و نصاریٰ

إِنَّ الْقُرْآنَ لَا يَأْمُرُ الْيَهُودَ وَلَا النَّصَارَىٰ أَنْ يَتَّبِعُوا كُتُبَهُمْ وَيَتَّبِعُوا عَلَىٰ شَرَائِعِهِمْ بَلْ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ الْإِسْلَامِ وَأَوَامِرَهُ وَقَدْ قَالَ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ الْعَزِيزِ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ - وَ مَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۗ وَ هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۗ فَكَيْفَ يُظُنُّ فِي اللَّهِ الْقُدُوسِ أَنَّهُ يَدْعُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ فِي هَذِهِ الْآيَةِ إِلَىٰ

کو اسلام کی طرف بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہرگز کامیابی نہیں پاسکتے ہو اور نہ ہی جنت میں داخل ہو سکتے ہو۔ سوائے اس کے کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور تمہیں قرآن مجید کے سوا تمہاری تورات اور تمہاری انجیل فائدہ نہیں دے سکتیں پھر دوسری طرف اپنے پہلے قول کو بھول جائے اور یہود و نصاریٰ کے ہر فرقہ کو حکم دے کہ وہ اپنی شریعتوں پر ہی قائم رہیں اور اپنی اپنی کتابوں کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں اور یہ بات ان کی نجات کے لیے کافی ہوگی۔ یہ تو اجتماعِ ضدین ہے اور قرآن مجید میں اختلاف کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے حالانکہ اللہ نے اپنی کتاب کو ہر قسم کے اختلاف سے پاک قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ: لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ اگر یہ کتاب منجانب اللہ نہ ہوتی تو لوگ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔ بلکہ وہ آیت جس کے معنی کرنے میں معترض نے یہودیوں کی طرح تحریف کی ہے اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تورات اور انجیل میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آمد کی بشارت موجود تھی۔ تو گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ تورات اور انجیل کے تاکیدی حکموں پر عمل نہیں کرتے اور اسلام نہیں لاتے ان آیات کے بقایا الفاظ یعنی فِيهِ نُورٌ وَ هُدًى اس بات کی دلیل نہیں کہ انجیل کوئی مستقل شریعت ہے کیا زبور وغیرہ انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفے لوگوں کے لیے ہدایت نہیں تھے۔ کیا ان میں ظلمت

الْإِسْلَامِ وَيَقُولُ إِنَّكُمْ لَا تَفْلِحُونَ أَبَدًا وَلَا تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا بَعْدَ أَنْ تَكُونُوا مُسْلِمِينَ. وَلَا يَنْفَعُكُمْ تَوْرَاتُكُمْ وَلَا انجِيلُكُمْ إِلَّا الْقُرْآنُ. ثُمَّ يَنْسَى قَوْلَهُ الْأَوَّلَ وَيَأْمُرُ كُلَّ فِرْقَةٍ مِّنَ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى أَنْ يَتَّبِعْتُوا عَلَى شَرَائِعِهِمْ وَيَتَّبِعُوا كُتُبَهُمْ وَيَكْفِيهِمْ هَذَا لِعَجَابِهِمْ وَإِنْ هَذَا إِلَّا جَمْعُ الضُّدِّينِ وَاخْتِلَافٌ فِي الْقُرْآنِ. وَاللَّهُ نَزَّاهٌ كِتَابَهُ عَنِ الْإِخْتِلَافِ بِقَوْلِهِ وَكَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۗ بَلِ الْآيَةُ الَّتِي حَرَفَ الْمُعْتَرِضُ مَعْنَاهَا كِبْرُ الْيَهُودِ تُشِيرُ إِلَى أَنَّ بَشَارَتِ نَبِيِّنَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ مَوْجُودَةً فِي التَّوْرَاتِ وَالْانجِيلِ فَكَانَ اللَّهُ يَقُولُ مَا لَهُمْ لَا يَعْمَلُونَ عَلَى وَصَايَا التَّوْرَةِ وَالْانجِيلِ وَلَا يُسْلِمُونَ. وَأَمَّا بَقِيَّةُ الْفَاطِ هَذِهِ الْآيَاتِ أَعْنَى لَفْظِ فِيهِ نُورٌ وَ هُدًى فَلَيْسَ هَذَا دَلِيلًا عَلَى كَوْنِ الْانجِيلِ شَرِيعةً مُسْتَقِلَّةً الْيَسَ الرَّبُّورِ وَغَيْرُهُ مِنْ كُتُبِ أَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ هُدًى لِلنَّاسِ أَيُوجَدُ فِيهَا ظَلَمَةٌ وَلَا يُوجَدُ

نُورٌ فَتَفْكَرُوا وَلَا تَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ۔  
 (خطبہ البامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۸، ۹ حاشیہ) | پائی جاتی تھی اور ان میں نور نہیں پایا جاتا تھا۔ پس غور سے  
 کام لو اور جاہلوں میں سے نہ بنو۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

(ایک شخص نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت نہایت گندے الفاظ استعمال کئے اور لکھا  
 ..... حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ذاتی طور پر ایک مستقل شریعت عطا کی گئی تھی اور جو لوگ آپ  
 پر ایمان لائے انہیں آپ نے شریعت کلیمیہ سے مستثنیٰ قرار دیا اور اس نے اپنے دعویٰ میں یہ آیات پیش  
 کیں: وَاتَّبِعْنَا الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً  
 لِّلْمُتَّقِينَ۔ وَ لِيُحْكَمَ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ لِيُعْلَمَ خَيْرَ الْكِنَانَاتِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِي  
 بشارت کے متعلق۔)

اس کے جواب میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا:

اس شخص نے اس آیت کے مفہوم کو نہ سمجھا اور اس نے مجھ پر ایسی آواز سے حملہ کیا ہے جو سب آوازوں  
 میں سے مکروہ تر ہے اور گمان کیا کہ اس نے ایک مضبوط رکن کی پناہ لی ہے اور اس نے مجھے تہمت لگانے والی  
 بدکار عورتوں کی طرح گالیاں دیں اور کہا کہ ایک واضح دلیل ہے اس بات پر کہ انجیل ایک مستقل شریعت  
 ہے۔ ہائے افسوس! اس پر اور اس کے غصہ پر جو اس نے اس طرح نکالا جیسے زمین سے کیڑے نکل آتے ہیں  
 اور لوگوں میں سے بد بخت ترین وہ شخص ہے جو بے عقل ہو اور پھر وہ اپنے آپ کو عقلمندوں سے شمار کرے اور  
 بالغ مردوں اور عورتوں کو جانے دو ہر مسلمان بچہ اور ہر مسلمان بچی یہ جانتی ہے کہ قرآن کریم یہود اور نصاریٰ کو  
 اس بات کا حکم نہیں دیتا کہ وہ اپنی کتابوں کی پیروی کریں اور اپنی شریعتوں پر ثابت قدم رہیں بلکہ وہ تو  
 انہیں اسلام اور اس کے احکام کی طرف بلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی معزز کتاب میں فرمایا ہے: إِنَّ الدِّينَ  
 عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (ال عمران: ۲۰)۔ وَ مَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَكُنْ يُقْبَلُ مِنْهُ ۗ وَ هُوَ فِي  
 الْأَخِرَةِ مِنَ الْخَسِيرِينَ (ال عمران: ۸۶)۔ پس خدائے قدوس کے متعلق یہ گمان کیسے کیا جاسکتا ہے جبکہ وہ  
 یہود و نصاریٰ کو اس آیت میں اسلام کی طرف بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے اور  
 جنت میں داخل نہیں ہو سکتے سوائے اس کے کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور قرآن کریم کے علاوہ تورات اور انجیل  
 تمہیں نفع نہیں دیں گی۔ یہ کہہ کر پھر وہ اپنی پہلی بات کو بھول جائے اور یہود اور نصاریٰ کے ہر فرقہ کو  
 اس بات کا حکم دے کہ وہ اپنی شرائع میں ثابت قدم رہیں اور اپنی کتابوں کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں

اور یہ ان کی نجات کے لیے کافی ہے۔ یہ اجتماع ضدین ہے اور قرآن کریم میں اختلاف ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اپنی کتاب کو اختلاف سے پاک ٹھہرایا ہے کہ: **وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا** (النساء: ۸۳) بلکہ وہ آیت جس کے معنی کو معترض نے یہود کی طرح محرف و مبدل کر دیا ہے وہ تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق اس بشارت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو تورات اور انجیل میں موجود تھی۔ گویا خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ تورات اور انجیل کی وصایا پر عمل نہیں کرتے اور اسلام قبول نہیں کرتے؟ ہاں! اگر قرآن کریم کی عبارت میں صیغہ ماضی کا ہوتا اور وہ یہ نہ کہتا کہ **وَلِيَحْكُمَهُ** بلکہ یہ کہتا: **وَ كَانَ النَّصَّارَى يَحْكُمُونَ بِالْأَنْجِيلِ فَقَطْ** یعنی عیسائی لوگ صرف انجیل کے مطابق فیصلے کرتے تھے تو یہ اس کے دعویٰ پر ایک دلیل ہوتی۔ پھر آیت کے بقیہ الفاظ یعنی **فِيهِ هُدًى وَ نُورٌ** بھی انجیل کے مستقل شریعت ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ کیا زبور اور اس کے علاوہ انبیاء بنی اسرائیل کی دوسری کتابیں لوگوں کے لیے ہدایت نہ تھیں؟ کیا ان میں ظلمت اور تاریکی پائی جاتی تھی اور کوئی نور ان میں نہیں تھا؟ پس تو فکر کرو اور جاہلوں سے نہ بن اور عیسائی خود اس بات پر متفق ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام ان کے پاس کوئی نئی شریعت نہ لائے تھے۔ چنانچہ ہم یہاں جی۔ اے لیفرائے بشپ لاہور (یعنی اس علاقہ کے عیسائیوں کے امام) کی شہادت نقل کرتے ہیں۔ اگر تو روسیاسی اور ذلت سے ڈرتا ہے تو یہ شہادت تیرے لیے کافی ہے اور ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ہم اس شہادت کو علیحدہ حاشیہ میں نقل کریں۔

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۵۱۲ تا ۵۱۵)

حاشیہ نمبر اربع ترجمہ ذیل میں درج ہے

<p>Bishops Bournes Lahore. Aug, 15, 01</p> <p>Dear Sir,</p> <p>The lord Jesus Christ was certainly not a law-giver, in the senses in which Moses was,</p>	<p>ترجمہ از مقام بشپس بورن واقعہ لاہور مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۰۱ء</p> <p>جناب خداوند یسوع مسیح ہرگز شارع نہ تھا جن معنوں میں حضرت موسیٰ صاحب شریعت تھا جس نے ایک کامل مفصل شریعت ایسے امور</p>
---	---

giving a complete descriptive law about such things as clean and unclean food. That He did not do this must be evident to anyone who reads the New Testament with any care or thought whatever. The Mosaic law of moths was given in order to develop in the minds of men who were in a very elementary stage of education and religion, the sense of law, and gradually of Holiness and the reverse. It is, therefore, called in the New-testament a "Schoolmaster to bring us the Christ (Gal iii-24) for it developed a conscience in man which, when awakened, could not find rest in any external or purely ceremonial acts but needed an inner righteousness of heart and life. And it was to bring this that Christ came by his life and death. He both deepened in man's minds the sense of what sin really is and how terrible

کے متعلق دی کہ مثلاً کھانے کے لیے حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے وغیرہ۔ کوئی شخص انجیل کو بغیر غور کے سرسری نگاہ سے بھی دیکھے تو اس پر ضرور ظاہر ہو جائے گا کہ مسیح صاحب شریعت نہ تھا۔ موسیٰ کی شریعت کھانے وغیرہ امور کے متعلق اس واسطے نازل ہوئی تھی کہ انسان کا دل تربیت پا کر شریعت کے مفہوم کو پالے اور رفتہ رفتہ مقدس اور غیر مقدس کو سمجھنے لگے کیونکہ انسان اس وقت تعلیم و مذہب کی ابتدائی منزل میں تھا اس لیے انجیل میں کہا گیا ہے کہ موسیٰ کی شریعت ایک استاد تھی جو ہمیں مسیح تک لائی۔ کیونکہ اس شریعت نے انسان کے دل میں ایک ایسی فطرت پیدا کر دی جو کہ ترقی پا کر صرف بیرونی اور رسمی اعمال پر قانع نہ ہوئی بلکہ دل اور روح کی اندرونی راستی کی تلاش کرنے والی ہوئی اس راستی کے لانے کے واسطے مسیح آیا۔ اپنی زندگی اور موت کے ذریعہ سے اس نے لوگوں کے دلوں میں یہ سمجھ ڈال دی کہ گناہ کیا ہے اور وہ کیسا

it is and also showed men how they could be reconciled to God, obtaining forgiveness of sins and also Power by the gift of the Holy Spirit to live a new life in real holiness, and in love to God and man. What the characteristics of that new life are you can see by reading the sermon on the mount St. Mathew chapter V to VII.

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۵۱۹ تا ۵۲۱)

خوفناک ہے اور گناہوں کی معافی حاصل کر کے اور روح القدس کے عطیہ سے ہم تقدس کی نئی زندگی پا کر اور خدا اور انسان کے درمیان محبت قائم کر کے خدا کو پھر راضی کر سکتے ہیں۔ متی باب ۵ تا ۷ میں پہاڑی تعلیم کے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس نئی زندگی کا طرز طریق کیا تھا

دستخط

جے اے لیفرائے بشپ لاہور

(مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ) مصدق کے معنی قرآنی طور پر یہ ہیں کہ جو کچھ صحیح تھا اس کی توفیق کر دی اور جو نہیں لیا وہ غلط تھا پھر انجیلوں کا آپس میں اختلاف ہے اگر قرآن نے تصدیق کی ہے تو بتلاؤ کون سی انجیل کی ہے؟ قرآن نے یوحنا متی وغیرہ کی انجیل کی کہیں تصدیق نہیں کی۔ ہاں! پطرس کی دعا کی تصدیق کی ہے اسی طرح کون سی توریت کہیں جس کی تصدیق قرآن نے کی؟ پہلے توریت تو ایک بتلاؤ! قرآن تو تمہاری توریت کو محرف بتلاتا ہے اور تم میں خود اختلاف ہے کہ توریت مختلف ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

قرآن شریف انجیل کی تصدیق قول سے نہیں کرتا بلکہ فعل سے کرتا ہے کیونکہ جو حصہ انجیل کی تعلیم کا قرآن کے اندر شامل ہے اس پر قرآن نے عمل درآمد کروا کے دکھلادیا ہے اور اسی لیے ہم اسی حصہ انجیل کی تصدیق کر سکتے ہیں جس کی قرآن کریم نے تصدیق کی ہمیں کیا معلوم کہ باقی کا رطب و یابس کہاں سے آیا؟ ہاں! اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ پھر آیت: وَ لِيُحْكُمَ أَهْلُ الْأَنْجِيلِ میں جو لفظ انجیل عام ہے اس سے کیا مراد ہے، وہاں یہ بیان نہیں ہے کہ انجیل کا وہ حصہ جس کا مصدق قرآن ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں انجیل سے مراد اصل انجیل اور توریت ہے جو قرآن کریم میں درج ہو چکیں۔ اگر یہ نہ مانا جاوے تو پھر بتلایا جاوے کہ اصلی انجیل کون سی ہے کیونکہ آج کل کی مروجہ انجیل تو اصل ہونہیں سکتیں ان کی اصلیت کس کو معلوم ہے

اور یہ بھی خود عیسائی مانتے ہیں کہ اس کا فلاں حصہ الحاقی ہے۔ پھر ایک اور بات دیکھنے والی ہے کہ انجیل میں سے عیسیٰ کی موت اور بعد کے حالات اور تورات میں موسیٰ کی موت کا حال درج ہے تو کیا اب ان کتابوں کا نزول دونوں نبیوں کی وفات کے بعد تک ہوتا رہا؟ اس سے ثابت ہے کہ موجودہ کتب اصل کتب نہیں ہیں اور نہ اب ان کا میسر آنا ممکن ہے۔ (الہدٰی جلد ۲ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۰)

وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِ فَاحِكُمُ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۗ لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَا ۗ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۗ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۵۱﴾

پہلے نوع انسان صرف ایک قوم کی طرح تھی اور پھر وہ تمام زمین پر پھیل گئے تو خدا نے ان کی سہولت تعارف کے لیے ان کو قوموں پر منقسم کر دیا اور ہر ایک قوم کے لیے اس کے مناسب حال ایک مذہب مقرر کیا جیسا کہ وہ فرماتا ہے..... لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَا..... فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ..... ہر ایک قوم کے لیے ہم نے ایک مشرب اور مذہب مقرر کیا تاہم مختلف فطرتوں کے جو ہر بذریعہ اپنی مختلف ہدایتوں کے ظاہر کر دیں۔ پس تم اے مسلمانو! تمام بھلائیوں کو دوڑ کر لو کیونکہ تم تمام قوموں کا مجموعہ ہو اور تمام فطرتیں تمہارے اندر ہیں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۴۶)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۚ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۗ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۵۲﴾

ان آیتوں کو پڑھ کر نادان عیسائی دھوکہ کھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ عیسائی وغیرہ بے دین فرقوں سے محبت نہ کریں لیکن نہیں سوچتے کہ ہر ایک لفظ اپنے محل پر استعمال ہوتا ہے جس چیز کا نام محبت ہے وہ فاسقوں اور کافروں سے اسی صورت میں بجالانا متصور ہے کہ جب ان کے کفر اور فسق سے کچھ حصہ لے لیوے۔ نہایت سخت جاہل وہ شخص ہوگا جس نے یہ تعلیم دی کہ اپنے دین کے دشمنوں سے پیار کرو۔ ہم بارہا

لکھ چکے ہیں کہ پیارا اور محبت اسی کا نام ہے کہ اس شخص کے قول اور فعل اور عادت اور خلق اور مذہب کو رضا کے رنگ میں دیکھیں اور اس پر خوش ہوں اور اس کا اثر اپنے دل پر ڈال لیں اور ایسا ہونا مومن سے کافر کی نسبت ہرگز ممکن نہیں۔ ہاں! مومن کافر پر شفقت کرے گا اور تمام دقائق ہمدردی بجالائے گا اور اس کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا نمگسار ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ بغیر لحاظ مذہب ملت کے تم لوگوں سے ہمدردی کرو، بھوکوں کو کھلاؤ، غلاموں کو آزاد کرو، قرضداروں کے قرض دواور زیر باروں کے بار اٹھاؤ اور بنی نوع سے سچی ہمدردی کا حق ادا کرو۔ (نور القرآن نمبر ۲، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۴۳۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ  
يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي  
سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۗ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ  
وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾

اے ایمان لانے والو! اگر کوئی تم میں سے دین اسلام کو چھوڑ دے گا تو خدا اس کے عوض میں ایک ایسی قوم لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے وہ مومنین کے آگے تذلّل کریں گے اور کافروں پر غالب اور بھاری ہوں گے یعنی خدا کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ ہمیشہ یہ حال ہوتا رہے گا کہ اگر کوئی ناقص الفہم دین اسلام سے مرتد ہو جائے گا تو اس کے مرتد ہونے سے دین میں کچھ کمی نہیں ہوگی بلکہ اس ایک شخص کے عوض میں خدا کئی وفادار بندوں کو دین اسلام میں داخل کرے گا کہ جو اخلاص سے اس پر ایمان لائیں گے اور خدا کے محب اور محبوب ٹھہریں گے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۶۳ حاشیہ ۱۱)

میں نے سنا ہے کہ شیخ بٹالوی اس عاجز کے مخلصوں کی نسبت قسم کھا چکے ہیں کہ لَا غَوِيَّ لَهُمْ أَجْعَلِينَ (الحجر: ۴۰) اور اس قدر غلو ہے کہ شیخ نجدی کا استثنا بھی ان کے کلام میں نہیں پایا جاتا تا صالحین کو باہر رکھ لیتے اگرچہ وہ بعض روگردان ارادت مندوں کی وجہ سے بہت خوش ہیں مگر انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ایک ٹہنی کے خشک ہو جانے سے سارا باغ برباد نہیں ہو سکتا۔ جس ٹہنی کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے خشک کر دیتا ہے اور کاٹ دیتا ہے اور اس کی جگہ اور ٹہنیاں پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی پیدا کر دیتا ہے۔ بٹالوی صاحب یاد رکھیں

کہ اگر اس جماعت سے ایک نکل جائے گا تو خدائے تعالیٰ اس کی جگہ بیس لائے گا اور اس آیت پر غور کریں:

فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ -

(آسانی فیصلہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۳۴۶، ۳۴۷)

(عبدالغفور نامی ایک شخص کے آریہ مذہب اختیار کرنے پر فرمایا کہ) اس طرح کے ارتداد سے اسلام کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا۔ یکجائی نظر سے دیکھنا چاہیے کہ آیا اسلام ترقی کر رہا ہے یا تنزل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت جو بعض لوگ مرتد ہو جاتے تھے تو کیا ان سے اسلام کو نقصان پہنچتا تھا؟ ہرگز نہیں! بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ پہلو انجام کار اسلام کو ہی مفید پڑتا ہے اور اس طرح سے اہل اسلام کے ساتھ اختلاط کی ایک راہ کھلتی ہے اور جب خدا تعالیٰ نے ایک جماعت کی جماعت اسلام میں داخل کرنی ہوتی ہے تو ایسا ہوا کرتا ہے کہ اہل اسلام میں (سے) کچھ ادھر چلے جاویں خدا کے کام بڑے دقیق اور اسرار سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آیا کرتے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰۹)

خدا تعالیٰ نے مومنوں کی صفت فرمائی ہے: لَا يَخَافُونَ كَوْمَةَ كَأْتِيجٍ کہ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں خوف کھاتے اور صرف اپنے مولا کی رضامندی کو مقدم رکھتے ہیں۔ مومن ایک لاپرواہ انسان ہوتا ہے اسے صرف خدا کی رضامندی کی حاجت ہوتی ہے اور اسی کی اطاعت کو وہ ہر دم مد نظر رکھتا ہے کیونکہ جب اس کا معاملہ خدا سے ہے تو پھر اسے کسی کی ضرر اور نفع کا کیا خوف ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

دیکھو جو امور مساوی ہوتے ہیں ان کے بیان کرنے میں ڈرنا نہیں چاہیے اور کسی قسم کا خوف کرنا اہل حق کا قاعدہ نہیں صحابہ کرام کے طرز عمل پر نظر کرو وہ بادشاہوں کے درباروں میں گئے اور جو کچھ ان کا عقیدہ تھا وہ صاف صاف کہہ دیا اور حق کہنے سے ذرا نہیں جھجکے۔ جی تو لَا يَخَافُونَ كَوْمَةَ كَأْتِيجٍ کے مصداق ہوئے۔

(البدر جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۵ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذَلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ ۗ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۗ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَنِ سَبِيلِ ۝۱۱

یہ ضرور نہیں کہ آنے والے کا نام درحقیقت عیسیٰ ابن مریم ہی ہو بلکہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ خدائے

تعالیٰ کے نزدیک قطعی طور پر اس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے جیسے یہودیوں کے نام خدائے تعالیٰ نے بندر اور سور رکھے اور فرمایا: وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِدَادَةَ وَالْخَنَازِيرَ ایسا ہی اس نے اس امت کے مفسد طبع لوگوں کو یہودی ٹھہرا کر اس عاجز کا نام مسیح ابن مریم رکھ دیا اور اپنے الہام میں فرمایا: جَعَلْنَاكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۰۹)

خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کا رشتہ نہیں اور وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ اولاد جو انبیاء کی اولاد کہلاتی تھی یعنی بنی اسرائیل جن میں کثرت سے نبی اور رسول آئے اور خدا تعالیٰ کے عظیم الشان فضلوں کے وہ وارث اور حقدار ٹھہرائے گئے تھے۔ لیکن جب اس کی روحانی حالت بگڑی اور اس نے راہ مستقیم کو چھوڑ دیا سرکشی اور فسق و فجور کو اختیار کیا، نتیجہ کیا ہوا؟ وہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الدِّيلَةُ وَالْمَسْكَنَةُ (البقرة: ۶۲) کی مصداق ہوئی خدا تعالیٰ کا غضب ان پر ٹوٹ پڑا اور ان کا نام سور اور بندر رکھا گیا یہاں تک وہ گر گئے کہ انسانیت سے بھی ان کو خارج کیا گیا یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے بنی اسرائیل کی حالت ہر وقت ایک مفید سبق ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَآكُلُوهُمُ السُّحْتًا لِبَيْسٍ  
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۶﴾ لَوْ لَا يَنْهَاهُمُ الرَّبُّنَّبِيُّونَ وَالْاِحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ  
آكُلِهِمُ السُّحْتًا لِبَيْسٍ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿۳۷﴾

اور اکثر اہل کتاب کو تو دیکھے گا کہ گناہ کے کاموں کی طرف دوڑتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں، کیا ہی برے یہ کام اور بد اعمالیاں ہیں کہ یہ لوگ کر رہے ہیں ان کے مشائخ اور علماء کیوں ان برے کاموں سے ان کو منع نہیں کرتے اور دیکھتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولتے اور جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں پھر بھی چپ رہتے ہیں پس یہ ان کے علماء بھی برے کام کر رہے ہیں کہ خاموش رہ کر ان کی بدی میں آپ بھی شریک ہیں۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۳۹)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غَلَّتْ اَيْدِيهِمْ وَارْتَعَنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدُ  
مَبْسُوطَةٌ لَّيِّنْفِقْ كَيْفَ يَشَاءُ ﴿۳۸﴾ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ مَّا اُنزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ

طُغْيَانًا وَ كُفْرًا ۚ وَ الْفَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبُغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ ۗ كُتِبَ  
 أَوْ قَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَاها اللهُ ۗ وَ يَسْعُونَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۗ وَ اللهُ لَا يُحِبُّ  
 الْمُفْسِدِينَ ﴿١٥﴾

یہود نے کہا کہ خدا کا ہاتھ باندھا ہوا ہے یعنی جو کچھ ہے انسان کی تدبیروں سے ہوتا ہے اور خدا اپنے  
 قادرانہ تصرفات سے عاجز ہے سو خدا نے ہمیشہ کے لیے یہودیوں کے ہاتھ کو باندھ دیا ہے تا اگر ان کے فکر  
 اور ان کی تدبیریں کچھ چیز ہیں تو ان کے زور سے دنیا کی حکومتیں اور بادشاہتیں حاصل کر لیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۳۹ حاشیہ ۱۱)

ہمارے مخالف مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ آخری زمانہ میں ایک خونی مہدی ظاہر ہوگا اور وہ تمام عیسائیوں کو  
 ہلاک کر دے گا اور زمین کو خون سے بھر دے گا اور جہاد ختم نہیں ہوگا جب تک وہ ظاہر نہ ہو اور اپنی تلوار سے  
 ایک دنیا کو ہلاک نہ کرے یہ سب جھوٹی باتیں ہیں جو قرآن کے نص صریح: وَ الْفَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبُغْضَاءَ  
 إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ سے مخالف اور منافی ہیں ہر ایک مسلمان کو چاہیے کہ ان باتوں پر ہرگز اعتقاد نہ رکھے۔

(تحفہ گولڈویہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۲۲، ۲۲۳)

یہود اور نصاریٰ میں قیامت تک بغض اور دشمنی رہے گی تو اب بتلاؤ کہ جب تمام یہودی قیامت سے پہلے  
 ہی حضرت مسیح پر ایمان لے آئیں گے تو پھر بغض اور دشمنی قیامت تک کون لوگ کریں گے۔ جب یہودی نہ  
 رہے اور سب ایمان لے آئے تو پھر بغض اور دشمنی کے لیے کون موقع اور محل رہا اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:  
 فَاعْرَبْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبُغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ (المائدة: ۱۵) اس کے بھی یہی معنی ہیں جو اوپر گزر چکے  
 اور وہی اعتراض ہے جو اوپر بیان ہو چکا اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ جَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ  
 كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ (ال عمران: ۵۶) اس جگہ كَفَرُوا سے مراد بھی یہود ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام  
 محض یہودیوں کے لیے آئے تھے اور اس آیت میں وعدہ ہے کہ حضرت مسیح کو ماننے والے یہود پر قیامت  
 تک غالب رہیں گے اب بتلاؤ کہ جب ان معنوں کے رو سے جو ہمارے مخالف آیت: (إِنَّ مِنْ أَهْلِ  
 الْكِتَابِ) (النساء: ۱۶۰) کے کرتے ہیں تمام یہودی حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئیں گے تو پھر یہ آیتیں کیوں کر  
 صحیح ٹھہر سکتی ہیں کہ یہود اور نصاریٰ کی قیامت تک باہم دشمنی رہے گی اور نیز یہ کہ قیامت تک یہود ایسے فرقوں  
 کے مغلوب رہیں گے جو حضرت مسیح کو صادق سمجھتے ہوں گے۔ (تحفہ گولڈویہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۳۰۹)

آیت: اَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبُغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (المائدۃ: ۱۵) اور آیت: اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبُغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اور آیت: وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (ال عمران: ۵۶) اور آیت: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (الفاتحہ: ۷: ۷)۔ یہ تمام آیتیں بتلا رہی ہیں کہ قیامت تک اختلاف رہے گا۔ منع علیہم بھی رہیں گے مغضوب علیہم بھی رہیں گے۔ ہاں! ملل باطلہ دلیل کے رو سے ہلاک ہو جائیں گی۔ (تحفہ گلڑویہ، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۳۲۰ حاشیہ)

یہود اور نصاریٰ میں قیامت تک عداوت رہے گی پس ظاہر ہے کہ اگر تمام یہود قیامت سے پہلے ہی حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آویں گے تو قیامت تک عداوت رکھنے والا کون رہے گا؟ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۳۶)

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۗ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۸﴾

وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ خدا تجھے ان لوگوں کے شر سے بچائے گا کہ جو تیرے قتل کرنے کی گھات میں ہیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ حاشیہ نمبر ۱۱)

یہ اسلام ہے کہ جو کچھ خدا کی راہ میں پیش آوے اس سے انکار نہ کرے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عصمت کے فکر میں خود لگتے تو وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کی آیت نہ نازل ہوتی۔ حفاظت الہی کا یہی سر ہے۔ (البدرد جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۳)

خدا نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے وہ وعدہ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کا ہے پس اسے کوئی مخالف آزما لے اور آگ جلا کر ہمیں اس میں ڈال دے، آگ ہرگز ہم پر کام نہ کرے گی اور وہ ضرور ہمیں اپنے وعدہ کے موافق بچالے گا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم خود آگ میں کودتے پھریں یہ طریق انبیاء کا نہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ: ۱۹۶) پس ہم خود آگ میں دیدہ دانستہ نہیں پڑتے بلکہ یہ حفاظت کا وعدہ دشمنوں کے مقابلہ پر ہے کہ اگر وہ آگ میں ہمیں جلا ناچاہیں تو ہم ہرگز نہ جلیں گے۔ (البدرد جلد ۲ نمبر ۷ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۳)

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کسی کے ہاتھ سے قتل نہ کیا جانا ایک بڑا بھاری مجزہ ہے اور قرآن شریف کی صداقت کا ثبوت ہے کیونکہ قرآن شریف کی یہ پیشگوئی ہے کہ **وَ اللّٰهُ يُعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ** اور پہلی کتابوں میں یہ پیشگوئی درج تھی کہ نبی آخر زمان کسی کے ہاتھ سے قتل نہ ہوگا۔

(الہدیر جلد ۴ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ہے: **وَ اللّٰهُ يُعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ** یعنی خدا تجھ کو لوگوں سے بچائے گا حالانکہ لوگوں نے طرح طرح کے دکھ دیئے، وطن سے نکالا، دانت شہید کیا، انگلی کو زخمی کیا اور کئی زخم تلوار کے پیشانی پر لگائے سو درحقیقت اس پیشگوئی میں بھی اعتراض کا محل نہیں کیونکہ کفار کے حملوں کی علت غائی اور اصل مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زخمی کرنا یا دانت کا شہید کرنا تھا بلکہ قتل کرنا مقصود بالذات تھا سو کفار کے اصل ارادے سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا نے محفوظ رکھا۔

(ست چکن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۱ حاشیہ)

لکھا ہے کہ اول مرتبہ میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابی کو برعایت ظاہر اپنی جان کی حفاظت کے لیے ہمراہ رکھا کرتے تھے پھر جب یہ آیت نازل ہوئی: **وَ اللّٰهُ يُعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ** یعنی خدا تجھ کو لوگوں سے بچائے گا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو رخصت کر دیا اور فرمایا کہ اب مجھ کو تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۹۹ء صفحہ ۲)

قُلْ يَا هَلْ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنزِلَ  
إِلَيْكُمْ مِّنْ رَبِّكُمْ ۗ وَ لِيُزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَ  
كُفْرًا ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾

اے پیغمبر! تو یہود اور نصاریٰ کو کہہ دے کہ جب تک تم تورات اور انجیل کے احکام پر نہ چلو اور ایسا ہی ان دوسری تمام کتابوں پر قائم نہ ہو جاؤ جو خدا کی طرف تمہیں دی گئی ہیں تب تک تمہارا کچھ بھی مذہب نہیں محض لامذہب ہو کر اپنے نفسوں کی پیروی کر رہے ہو۔ پس ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عرب کے یہود اور عیسائی ایسے بگڑ گئے تھے اور اس درجہ پر وہ بدچلن ہو گئے تھے کہ جو کچھ خدا نے ان کی کتابوں میں حرام کیا تھا یعنی یہ کہ چوری نہ کریں، لوگوں کا ناحق مال نہ کھائیں، ناحق کا خون نہ کریں، جھوٹی گواہی نہ دیں، خدا کے ساتھ کسی

کو شریک نہ کریں یہ تمام ناجائز کام ایسی دلی رغبت سے کرتے تھے کہ گویا ان برے کاموں کو انہوں نے اپنا مذہب قرار دے دیا تھا۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۳۹)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِغُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۳﴾

ہم یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ امر جو عبدالحکیم خان کی ضلالت کا باعث ہوا ہے جس کی وجہ سے اُس کو یہ خیال گزرا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی ضرورت نہیں وہ قرآن شریف کی ایک آیت کی غلط فہمی ہے جو باعثِ کفر اور کفر کی تدبیر کے اُس سے ظہور میں آئی اور وہ آیت یہ ہے: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِغِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرة: ۶۳) (ترجمہ) یعنی جو لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور جو لوگ یہود و نصاریٰ اور ستارہ پرست ہیں جو شخص اُن میں سے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اور اعمال صالحہ بجالائے گا خدا اُس کو ضائع نہیں کرے گا اور ایسے لوگوں کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن کو کچھ خوف نہیں ہوگا اور نہ غم۔

یہ آیت ہے جس سے باعث نادانی اور کج فہمی یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ یہ لوگ اپنے نفسِ اتارہ کے پیرو ہو کر محکمات اور بینات قرآنی کی مخالفت کرتے ہیں اور اسلام سے خارج ہونے کے لئے تشابہات کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اُن کو یاد رہے کہ اس آیت سے وہ کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور آخرت پر ایمان لانا اس بات کو متلزم پڑا ہوا ہے کہ قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اللہ کے نام کی قرآن شریف میں یہ تعریف کی ہے کہ اللہ ذات ہے جو رب العالمین اور رحمن اور رحیم ہے جس نے زمین اور آسمان کو چھ دن میں بنایا اور آدم کو پیدا کیا اور رسول بھیجے اور کتابیں بھیجیں اور سب کے آخر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا جو خاتم الانبیاء اور خیر الرسل ہے اور یوم آخر قرآن شریف کی رُو سے یہ ہے جس میں مُردے جی اٹھیں گے اور پھر ایک فریق بہشت میں داخل کیا جائے گا جو جسمانی اور روحانی نعمت کی جگہ ہے اور ایک فریق دوزخ میں داخل کیا جاوے گا جو روحانی اور جسمانی

عذاب کی جگہ ہے اور خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ اس یوم آخر پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں جو اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں۔

پس جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود لفظ اللہ اور یوم آخر کے بتصریح ایسے معنی کر دیئے جو اسلام سے مخصوص ہیں تو جو شخص اللہ پر ایمان لائے گا اور یوم آخر پر ایمان لائے گا۔ اُس کے لئے یہ لازمی امر ہوگا کہ قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاوے اور کسی کا اختیار نہیں ہے کہ ان معنوں کو بدل ڈالے اور ہم اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی ایسے معنی ایجاد کریں کہ جو قرآن شریف کے بیان کردہ معنوں سے مغائر اور مخالف ہوں۔ ہم نے اول سے آخر تک قرآن شریف کو غور سے دیکھا ہے اور تو جہ سے دیکھا اور بار بار دیکھا اور اس کے معانی میں خوب تدبر کیا ہے ہمیں بدیہی طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ قرآن شریف میں جس قدر صفات اور افعال الہیہ کا ذکر ہے ان سب صفات کا موصوف اسم اللہ ٹھہرایا گیا ہے مثلاً کہا گیا ہے الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ○ (الفاتحة: ۲، ۳)۔ ایسا ہی اس قسم کی اور بہت سی آیات ہیں جن میں یہ بیان ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے قرآن اتارا۔ اللہ وہ ہے جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ پس جبکہ قرآنی اصطلاح میں اللہ کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے لہذا یہ ضروری ہے کہ جو شخص اللہ پر ایمان لاوے تبھی اُس کا ایمان معتبر اور صحیح سمجھا جائے گا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاوے۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ من امن بالرحمن یا من امن بالرحیم یا من امن بالکریم بلکہ یہ فرمایا کہ من امن باللہ اور اللہ سے مراد وہ ذات ہے جو مجتمع جمیع صفات کاملہ ہے اور ایک عظیم الشان صفت اُس کی یہ ہے کہ اُس نے قرآن شریف کو اتارا۔ اس صورت میں ہم صرف ایسے شخص کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان لایا جبکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لایا ہو اور قرآن شریف پر بھی ایمان لایا ہو۔ اگر کوئی کہے کہ پھر ان الذین امنوا کے کیا معنی ہوئے تو یاد رہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو لوگ محض خدا تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان معتبر نہیں ہے۔ جب تک خدا کے رسول پر ایمان نہ لاویں یا جب تک اُس ایمان کو کامل نہ کریں۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن شریف میں اختلاف نہیں ہے۔ پس یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ صدہا آیتوں میں تو خدا تعالیٰ یہ فرماوے کہ صرف توحید کافی نہیں ہے بلکہ اُس کے نبی پر ایمان لانا نجات کے لئے ضروری ہے بجز اس صورت کے کہ کوئی اس نبی سے پیچھ رہا ہو اور پھر کسی ایک

آیت میں برخلاف اس کے یہ بتلاوے کہ صرف توحید سے ہی نجات ہو سکتی ہے۔ قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی کچھ ضرورت نہیں اور طرفہ یہ کہ اس آیت میں توحید کا ذکر بھی نہیں۔ اگر توحید مراد ہوتی تو یوں کہنا چاہیے تھا کہ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَحْدَهُ۔ مگر آیت کا تو یہ لفظ ہے کہ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ۔ پس آمَنَ بِاللَّهِ کا فقرہ ہم پر یہ واجب کرتا ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ قرآن شریف میں اللہ کا لفظ کن معنوں پر آتا ہے۔ ہماری دیانت کا یہ تقاضا ہونا چاہیے کہ جب ہمیں خود قرآن سے ہی یہ معلوم ہوا کہ اللہ کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے قرآن بھیجا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تو ہم اُسی معنی کو قبول کر لیں جو قرآن شریف نے بیان کئے اور خود روی اختیار نہ کریں۔

ماسوا اس کے ہم بیان کر چکے ہیں کہ نجات حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی ہستی پر کامل یقین پیدا کرے اور نہ صرف یقین بلکہ اطاعت کے لئے بھی کمر بستہ ہو جائے اور اس کی رضامندی کی راہوں کو شناخت کرے۔ اور جب سے کہ دنیا پیدا ہوئی ہے یہ دونوں باتیں محض خدا تعالیٰ کے رسولوں کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوتی آئی ہیں پھر کس قدر یہ لغو خیال ہے کہ ایک شخص توحید تو رکھتا ہو مگر خدا تعالیٰ کے رسول پر ایمان نہیں لاتا وہ بھی نجات پائے گا۔ اے عقل کے اندھے اور نادان! توحید بُجُر ذریعہ رسول کے کب حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کی تو ایسی ہی مثال ہے کہ جیسے ایک شخص روزِ روشن سے تو نفرت کرے اور اُس سے بھاگے اور پھر کہے کہ میرے لئے آفتاب ہی کافی ہے دن کی کیا حاجت ہے۔ وہ نادان نہیں جانتا کہ کیا آفتاب کبھی دن سے علیحدہ بھی ہوتا ہے۔ ہائے افسوس! یہ نادان نہیں سمجھتے کہ خدا تعالیٰ کی ذات تو مخفی در مخفی اور غیب در غیب اور وراء الوراء ہے اور کوئی عقل اس کو دریافت نہیں کر سکتی جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (الانعام: ۱۰۴)۔ یعنی بصارتیں اور بصیرتیں اس کو پا نہیں سکتیں اور وہ اُن کے انتہا کو جانتا ہے اور اُن پر غالب ہے۔ پس اُس کی توحید محض عقل کے ذریعہ سے غیر ممکن ہے کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ انسان آفاقی باطل معبودوں سے کنارہ کرتا ہے یعنی بتوں یا انسانوں یا سورج چاند وغیرہ کی پرستش سے دستکش ہوتا ہے۔ ایسا ہی انفسی باطل معبودوں سے پرہیز کرے یعنی اپنی روحانی جسمانی طاقتوں پر بھروسہ کرنے سے اور اُن کے ذریعہ سے عجب کی بلا میں گرفتار ہونے سے اپنے تئیں بچاوے۔ پس اس صورت میں ظاہر ہے کہ بجز ترک خودی اور رسول کا دامن پکڑنے کے توحید کامل حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور جو شخص اپنی کسی تُوّت کو شریک باری ٹھہراتا ہے وہ کیوں کر موحد کہلا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے جا بجا توحید کامل کو پیروی رسول سے وابستہ کیا ہے۔ کیونکہ کامل توحید ایک نئی زندگی ہے اور بُجُر اُس کے نجات حاصل نہیں ہو سکتی جب تک خدا کے رسول کا پیرو ہو کر اپنی سفلی زندگی پر موت وارد نہ کرے۔ علاوہ اس کے قرآن شریف میں بہ وجہ قول ان نادانوں کے تناقض لازم آتا ہے کیونکہ ایک طرف تو جا بجا وہ یہ فرماتا ہے کہ بُجُر ذریعہ رسول توحید حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ پھر دوسری طرف گویا وہ یہ کہتا ہے کہ حاصل ہو سکتی ہے حالانکہ توحید اور نجات کا آفتاب اور اُس کو ظاہر کرنے والا صرف رسول ہی ہوتا ہے اُسی کی روشنی سے توحید ظاہر ہوتی ہے پس ایسا تناقض خدا کی کلام کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔

بڑی غلطی اس نادان کی یہ ہے کہ اُس نے توحید کی حقیقت کو بالکل نہیں سمجھا توحید ایک نور ہے جو آفاقی و انفسی معبودوں کی نفی کے بعد دل میں پیدا ہوتا ہے اور وجود کے ذرہ ذرہ میں سرایت کر جاتا ہے پس وہ بُجُر خدا اور اُس کے رسول کے ذریعہ کے محض اپنی طاقت سے کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے؟ انسان کا فقط یہ کام ہے کہ اپنی خودی پر موت وارد کرے اور اس شیطانی نخوت کو چھوڑ دے کہ میں علوم میں پرورش یافتہ ہوں اور ایک جاہل کی طرح اپنے تئیں تصور کرے اور دعائیں لگا رہے تب توحید کا نور خدا کی طرف سے اُس پر نازل ہوگا اور ایک نئی زندگی اُس کو بخشے گا۔

اخیر پر ہم یہ بیان کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر ہم فرض محال کے طور پر یہ مان لیں کہ اللہ کا لفظ ایک عام معنوں پر مشتمل ہے جس کا ترجمہ خدا ہے اور اُن معنوں کو نظر انداز کر دیں جو قرآن شریف پر نظر تدبر ڈال کر معلوم ہوتے ہیں یعنی یہ کہ اللہ کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ وہ ذات ہے جس نے قرآن شریف بھیجا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ تب بھی یہ آیت مخالف کو مفید نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو ماننا نجات کے لئے کافی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ پر جو خدا تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اور متجمع جمیع صفات کاملہ حضرت عزت ہے ایمان لائے گا تو خدا اُس کو ضائع نہیں کرے گا اور کشاں کشاں اس کو اسلام کی طرف لے آئے گا کیونکہ ایک سچائی دوسری سچائی میں داخل ہونے کے لئے مدد دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ پر خالص ایمان لانے والے آخر حق کو پالیتے ہیں۔

قرآن شریف میں یہ وعدہ ہے کہ جو شخص سچے دل سے خدا تعالیٰ پر ایمان لائے گا خدا اُس کو ضائع نہیں کرے گا اور حق اُس پر کھول دے گا اور راہ راست اُس کو دکھائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنكبوت: ۷۰) پس اس آیت کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا ضائع نہیں کیا جاتا آخر اللہ تعالیٰ پوری ہدایت اُس کو کر دیتا ہے چنانچہ صوفیوں نے صدہا مثالیں اس کی لکھی ہیں کہ بعض غیر قوم کے لوگ جب کمال اخلاص سے خدا تعالیٰ پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ میں مشغول ہوئے تو خدا تعالیٰ نے اُن کو اُن کے اخلاص کا یہ بدلہ دیا کہ اُن کی آنکھیں کھول دیں اور خاص اپنی دستگیری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اُن پر ظاہر کر دی۔ یہی معنی اس آیت کے آخری فقرہ کے ہیں فَكُهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ خدا تعالیٰ کا اجر جب تک دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا آخرت میں بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ پس دنیا میں خدا پر ایمان لانے کا یہ اجر ملتا ہے کہ ایسے شخص کو خدا تعالیٰ پوری ہدایت بخشتا ہے اور ضائع نہیں کرتا۔ اسی کی طرف یہ آیت بھی اشارہ کرتی ہے۔ وَ اِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُبَوِّئْنَ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهِ (النساء: ۱۶۰) یعنی وہ لوگ جو درحقیقت اہل کتاب ہیں اور سچے دل سے خدا پر اور اُس کی کتابوں پر ایمان لاتے اور عمل کرتے ہیں وہ آخر کار اس نبی پر ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہاں خبیث آدمی جن کو اہل کتاب نہیں کہنا چاہیے وہ ایمان نہیں لاتے۔ ایسا ہی سوانح اسلام میں اس کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ایسا کریم و رحیم ہے اگر کوئی ایک ذرہ بھی نیکی کرے تب بھی اُس کی جزا میں اسلام میں اُس کو داخل کر دیتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں بھی ہے کہ کسی صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ میں نے کفر کی حالت میں محض خدا تعالیٰ کے خوش کرنے کے لئے بہت کچھ مال مساکین کو دیا تھا۔ کیا اس کا ثواب بھی مجھ کو ہوگا۔ تو آپ نے فرمایا کہ وہی صدقات ہیں جو تجھ کو اسلام کی طرف کھینچ لائے۔ پس اسی طرح جو شخص کسی غیر مذہب میں خدا تعالیٰ کو واحد لا شریک جانتا ہے اور اُس سے محبت کرتا ہے تو خدا تعالیٰ بموجب آیت: فَكُهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ آخر اُس کو اسلام میں داخل کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ باوانا تک کو پیش آیا۔ جب اُس نے بڑے اخلاص سے بت پرستی کو چھوڑ کر توحید کو اختیار کیا اور خدا تعالیٰ سے محبت کی تو وہی خدا جس نے آیت مدوحہ بالا میں فرمایا ہے: فَكُهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اُس پر ظاہر ہوا اور اپنے الہام سے اسلام کی طرف اُس کو رہبری کی تب وہ مسلمان ہو گیا اور حج بھی کیا۔

اور کتاب بحر الجواہر میں لکھا ہے کہ ابوالخیر نام ایک یہودی تھا جو پارس طبع اور راسخا آدمی تھا اور خدا تعالیٰ کو واحد لا شریک جانتا تھا۔ ایک دفعہ وہ بازار میں چلا جاتا تھا تو ایک مسجد سے اُس کو آواز آئی کہ ایک لڑکا قرآن شریف کی یہ آیت پڑھ رہا تھا:

الْحَسْبَ النَّاسُ أَنْ يُؤْتُوا أَمْناً وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (العنكبوت: ۲، ۳) یعنی کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ یونہی وہ نجات پا جاویں گے صرف اس کلمہ سے کہ ہم ایمان لائے اور ابھی خدا کی راہ میں اُن کا امتحان نہیں کیا گیا کہ کیا ان میں ایمان لانے والوں کی سی استقامت اور صدق اور وفا بھی موجود ہے یا نہیں؟ اس آیت نے ابوالخیر کے دل پر بڑا اثر کیا اور اُس کے دل کو گداز کر دیا۔ تب وہ مسجد کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر زار زار رویا۔ رات کو حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی خواب میں آئے اور فرمایا اَبَا الْخَيْرِ اَعْجَبْنِي اَنَّ مِثْلَكَ مَعَ كَمَالِ فَضْلِكَ يُنْكِرُ بِنَبْوَتِي۔ یعنی اے ابوالخیر! مجھے تعجب آیا کہ تیرے جیسا انسان باوجود اپنے کمال فضل اور بزرگی کے میری نبوت سے انکار کرے۔ پس صبح ہوتے ہی ابوالخیر مسلمان ہو گیا اور اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ میں اس بات کو بالکل سمجھ نہیں سکتا کہ ایک شخص خدا تعالیٰ پر ایمان لاوے اور اُس کو واحد لا شریک سمجھے اور خدا اُس کو دوزخ سے نجات دے مگر نابینائی سے نجات نہ دے حالانکہ نجات کی جڑھ معرفت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ اَعْلَىٰ فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْلَىٰ وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل: ۷۳) یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا ہے وہ دُوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا یا اس سے بھی بدتر۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ جس نے خدا کے رسولوں کو شناخت نہیں کیا اُس نے خدا کو بھی شناخت نہیں کیا۔ خدا کے چہرے کا آئینہ اُس کے رسول ہیں۔ ہر ایک جو خدا کو دیکھتا ہے اسی آئینہ کے ذریعہ سے دیکھتا ہے۔ پس یہ کس قسم کی نجات ہے کہ ایک شخص دنیا میں تمام عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکدّب اور منکر رہا اور قرآن شریف سے انکاری رہا اور خدا تعالیٰ نے اُس کو آنکھیں نہ بخشیں اور دل نہ دیا اور وہ اندھا ہی رہا اور اندھا ہی مر گیا اور پھر نجات بھی پا گیا۔ یہ عجیب نجات ہے! اور ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جس شخص پر رحمت کرنا چاہتا ہے پہلے اُس کو آنکھیں بخشتا ہے اور اپنی طرف سے اُس کو علم عطا کرتا ہے۔ صدہا آدمی ہمارے سلسلہ میں ایسے ہوں گے کہ وہ محض خواب یا الہام کے ذریعہ سے ہماری جماعت میں داخل ہوئے ہیں اور خدا تعالیٰ کی ذات وسیع الرحمت ہے اگر کوئی ایک قدم اس کی طرف آتا ہے تو وہ دو قدم آتا ہے اور جو شخص اُس کی طرف جلدی سے چلتا ہے تو وہ اُس کی طرف دوڑتا آتا ہے اور نابینا کی آنکھیں کھولتا ہے۔ پھر کیوں کر قبول کیا جائے کہ ایک شخص اُس کی ذات پر ایمان لایا اور سچے دل سے اُس کو وحدہ لا شریک سمجھا اور اُس سے محبت کی اور اس کے اولیاء میں داخل ہوا۔ پھر خدا نے اُس کو نابینا رکھا اور ایسا اندھا رہا کہ خدا کے نبی کو شناخت نہ کر سکا۔ اسی کی

مؤید یہ حدیث ہے کہ مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَهُ زَمَانِهِ فَقَدْ مَاتَ مِيتَةً الْجَاهِلِيَّةِ یعنی جس شخص نے اپنے زمانہ کے امام کو شناخت نہ کیا وہ جاہلیت کی موت پر مر گیا اور صراطِ مستقیم سے بے نصیب رہا۔  
(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۴)

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ وَ أُمُّهُ  
صِدِّيقَةٌ ۗ كَانَا يَأْكُلَنِ الطَّعَامَ ۗ أَنْظَرُ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ أَنْظَرُ أَنِّي  
يُؤْفَكُونَ ۝۴

یعنی مسیح صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے نبی فوت ہو چکے ہیں اور ماں اس کی صدیقہ ہے جب وہ دونوں زندہ تھے تو طعام کھایا کرتے تھے۔ یہ آیت بھی صریح نص حضرت مسیح کی موت پر ہے کیونکہ اس آیت میں بصریح بیان کیا گیا ہے کہ اب حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ مریم طعام نہیں کھاتے۔ ہاں! کسی زمانہ میں کھایا کرتے تھے جیسا کہ کانا کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے جو حال کو چھوڑ کر گذشتہ زمانہ کی خبر دیتا ہے۔ اب ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت مریم طعام کھانے سے اسی وجہ سے روکی گئی کہ وہ فوت ہوگئی اور چونکہ کانا کے لفظ میں جو تشبیہ کا صیغہ ہے حضرت عیسیٰ بھی حضرت مریم کے ساتھ شامل ہیں اور دونوں ایک ہی حکم کے نیچے داخل ہیں لہذا حضرت مریم کی موت کے ساتھ ان کی موت بھی ماننی پڑی کیونکہ آیت موصوفہ بالا میں ہرگز یہ بیان نہیں کیا گیا کہ حضرت مریم تو بوجہ موت طعام کھانے سے روکے گئے لیکن حضرت ابن مریم کسی اور وجہ سے، اور جب ہم اس آیت مذکورہ بالا کو اس دوسری آیت کے ساتھ ملا کر پڑھیں کہ مَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا إِلَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ (الانبیاء: ۹۰) جس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا کہ زندہ تو ہو مگر کھانا نہ کھاتا ہو۔ تو اس یقینی اور قطعی نتیجہ تک ہم پہنچ جائیں گے کہ فی الواقعہ حضرت مسیح فوت ہو گئے کیونکہ پہلی آیت سے ثابت ہو گیا کہ اب وہ کھانا نہیں کھاتے اور دوسری آیت بتلا رہی ہے کہ جب تک یہ جسم خاکی زندہ ہے طعام کھانا اس کے لئے ضروری ہے۔ اس سے قطعی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اب وہ زندہ نہیں ہیں۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۲۵، ۴۲۶)

مخلوق کی شناخت کی بڑی علامت یہی ہے کہ بعض بعض سے مشارکت و مشابہت رکھتے ہیں اور کوئی فرد کوئی ایسی ذاتی خاصیت اور خصوصیت نہیں رکھتا جو دوسرے کسی فرد کو اس سے حصہ نہ ہو خواہ اصلاً یا ظلاً تو

پھر اگر اس صورت میں ہم کوئی ایسا فرد افراد بشریہ سے تسلیم کر لیں جو اپنی بعض صفات یا افعال میں دوسروں سے بالکل ممتاز اور لوازم بشریت سے بڑھ کر ہے اور خدا تعالیٰ کی طرح اپنے اس فعل یا صفت میں یگانگت رکھتا ہے تو گویا ہم نے خدا تعالیٰ کی صفت وحدانیت میں ایک شریک قرار دیا۔ یہ ایک دقیق راز ہے اس کو خوب سوچو۔ خدا تعالیٰ نے جو اپنی کلام میں کئی دفعہ حضرت مسیح کی وفات کا ذکر کیا ہے یہاں تک کہ ان کی والدہ مریم صدیقہ کے ساتھ جو با اتفاق فوت شدہ ہے ان کے ذکر کو ملا کر بیان کیا کہ کَانَ يَا كَلْبَانَ الطَّعَامَ کہ وہ دونوں جب زندہ تھے طعام کھایا کرتے تھے اس تا کید کی یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے علم قدیم سے خوب جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں لوگ بباعث خیال حیات مسیح سخت فتنہ میں پڑیں گے اور وہ فتنہ اسلام کیلئے سخت مضر ہوگا اس لئے اس نے پہلے ہی سے فیصلہ کر دیا اور بخوبی ظاہر کر دیا کہ مسیح فوت ہو گیا۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۴۵)

حضرت مسیح ابن مریم میں اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہ وہ صرف ایک رسول ہے اور اس سے پہلے بھی رسول ہی آتے رہے ہیں اور یہ کلمہ کہ اس سے پہلے بھی رسول ہی آتے رہے ہیں۔ یہ قیاس استقرائی کے طور پر ایک استدلال لطیف ہے کیونکہ قیاسات کے جمیع اقسام میں سے استقراء کا مرتبہ وہ اعلیٰ شان کا مرتبہ ہے کہ اگر یقینی اور قطعی مرتبہ سے اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو دین و دنیا کا تمام سلسلہ بگڑ جاتا ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حصہ کثیرہ دنیا کا اور ازمنہ گذشتہ کے واقعات کا ثبوت اسی استقراء کے ذریعہ سے ہوا ہے مثلاً ہم جو اس وقت کہتے ہیں کہ انسان منہ سے کھاتا اور آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا اور ناک سے سونگھتا اور زبان سے بولتا ہے اگر کوئی شخص کوئی مقدس کتاب پیش کرے اور اس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ یہ واقعات زمانہ گذشتہ کے متعلق نہیں ہیں بلکہ پہلے زمانہ میں انسان آنکھوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا اور کانوں کے ذریعہ سے بولتا تھا اور ناک کے ذریعہ سے دیکھتا تھا ایسا ہی اور باتوں کو بھی بدل دے یا مثلاً یہ کہے کہ کسی زمانہ میں انسان کی آنکھیں دونہیں ہوتی تھیں بلکہ بیس ہوتی تھیں۔ دس تو سامنے چہرہ میں اور دس پشت پر لگی ہوئی تھیں تو اب ناظرین سوچ سکتے ہیں کہ گو فرض کے طور پر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ ان عجیب تحریروں کا لکھنے والا کوئی مقدس اور راستباز آدمی تھا۔ مگر ہم اس یقینی نتیجہ سے کہاں اور کدھر گریز کر سکتے ہیں جو قیاس استقرائی سے پیدا ہوا ہے۔ میری رائے میں ایسا بزرگ اگر نہ صرف ایک بلکہ کروڑ سے بھی زیادہ اور قیاس استقرائی سے نتائج قطعیہ بقیہ کو توڑنا چاہیں تو ہرگز ٹوٹ نہیں سکیں گے بلکہ اگر ہم منصف ہوں اور حق پسندی ہمارا شیوہ

ہو تو اس حالت میں کہ اس بزرگ کو ہم درحقیقت ایک بزرگ سمجھتے ہیں اور اس کے الفاظ میں ایسے ایسے کلمات خلاف حقائق مشہودہ محسوسہ کے پاتے ہیں تو ہم اُس کی بزرگی کی خاطر سے صرف عن الظاہ کریں گے اور ایسی تاویل کریں گے جس سے اس بزرگ کی عزت قائم رہ جاوے۔ ورنہ یہ تو ہرگز نہ ہوگا کہ جو حقائق استقراء کے یقینی اور قطعی ذریعہ سے ثابت ہو چکے ہیں وہ ایک روایت دیکھ کر ٹال دیئے جاویں۔ اگر ایسا کسی کا خیال ہو تو یہ بارثبوت اس کی گردن پر ہے کہ وہ استقراء مثبتہ موجودہ قطعہ یقینیہ کے برخلاف اس روایت کی تائید اور تصدیق میں کوئی امر پیش کر دیوے مثلاً جو شخص اس بات پر بحث کرتا اور لڑتا جھگڑتا ہے کہ صاحب ضرور پہلے زمانہ میں لوگ زبان کے ساتھ دیکھتے اور ناک کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے تو اس کا ثبوت پیش کرے اور جب تک ایسا ثبوت پیش نہ کرے تب تک ایک مہذب عقلمند کی شان سے بہت بعید ہے کہ ان تحریرات پر بھروسہ کرے کہ جن کے بصورت صحت بھی بیس بیس معنی ہو سکتے ہیں وہ معنی اختیار کرے جو حقائق ثابت شدہ سے بالکل مغائر اور منافی پڑے ہوئے ہیں مثلاً اگر ایک ڈاکٹر ہی سے اس بات کا تذکرہ ہو کہ سم الفار اور وہ زہر جو تلخ بادام سے تیار کیا جاتا ہے اور بیش یہ تمام زہریں نہیں ہیں۔ اور اگر ان کو دو دوسیر کے قدر بھی انسان کے بچوں کو کھلایا جاوے تو کچھ ہرج نہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ دیوے کہ فلاں مقدس کتاب میں ایسا ہی لکھا ہے اور رومی معتبر ہے تو کیا وہ ڈاکٹر صاحب اس مقدس کتاب کا لحاظ کر کے ایک ایسے امر کو چھوڑ دیں گے جو قیاس استقرائی سے ثابت ہو چکا ہے۔ غرض جب کہ قیاس استقرائی دنیا کے حقائق ثابت کرنے کے لئے اول درجہ کا مرتبہ رکھتا ہے تو اسی جہت سے اللہ جل شانہ نے سب سے پہلے قیاس استقرائی کو ہی پیش کیا۔ اور فرمایا: قَدْ خَلَقْتُ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلَ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام پیشک نبی تھے اور اللہ جل شانہ کے پیارے رسول تھے مگر وہ انسان تھے۔ تم نظر اٹھا کر دیکھو کہ جب سے یہ سلسلہ تبلیغ اور کلام الہی کے نازل کرنے کا شروع ہوا ہے ہمیشہ اور قدیم سے انسان ہی رسالت کا مرتبہ پا کر دنیا میں آتے رہے ہیں یا کبھی اللہ تعالیٰ کا بیٹا بھی آیا ہے؟ اور خلقت کا لفظ اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ جہاں تک تمہاری نظر تاریخی سلسلہ کو دیکھنے کے لئے وفا کر سکتی ہے اور گذشتہ لوگوں کا حال معلوم کر سکتے ہو خوب سوچو اور سمجھو کہ کبھی یہ سلسلہ ٹوٹا بھی ہے۔ کیا تم کوئی ایسی نظیر پیش کر سکتے ہو جس سے ثابت ہو سکے کہ یہ امر ممکنات میں سے ہے، پہلے بھی کبھی ہوتا ہی آیا ہے؟ سو عقلمند آدمی اس جگہ ذرہ ٹھہر کر اور اللہ جل شانہ کا خوف کر کے دل میں سوچے کہ حادثات کا سلسلہ اس بات کو چاہتا ہے کہ اس کی نظیر بھی کبھی کسی زمانہ میں پائی جاوے۔

ہاں! اگر بائبل کے وہ تمام انبیاء اور صلحاء جن کی نسبت بائبل میں بھی الفاظ موجود ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے یا خدا تھے حقیقی معنوں پر حمل کر لئے جائیں تو بیشک اس صورت میں ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ خدائے تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ بیٹے بھی بھیجا کرتا ہے بلکہ بیٹے کیا کبھی کبھی بیٹیاں بھی۔ اور بظاہر یہ دلیل تو عمدہ معلوم ہوتی ہے اگر حضرات عیسائی صاحبان اس کو پسند فرمائیں اور کوئی اس کو توڑ بھی نہیں سکتا کیونکہ حقیقی غیر حقیقی کا تو وہاں کوئی ذکر ہی نہیں بلکہ بعض کو تو پہلوٹا ہی لکھ دیا۔ ہاں! اس صورت میں بیٹوں کی میزان بہت بڑھ جائے گی۔ غرض کہ اللہ جل شانہ نے سب سے پہلے ابطال الوہیت کے لئے بھی دلیل استقرائی پیش کی ہے۔ پھر بعد اس کے ایک اور دلیل پیش کرتا ہے: **وَ اُمَّهٖ صِدِّيْقَةٌ** یعنی والدہ حضرت مسیح کی راستباز تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر حضرت مسیح کو اللہ جل شانہ کا حقیقی بیٹا فرض کر لیا جاوے تو پھر یہ ضروری امر ہے کہ وہ دوسروں کی طرح ایسی والدہ کے اپنے تولد میں محتاج نہ ہوں جو باتفاق فریقین انسان تھی کیونکہ یہ بات نہایت ظاہر اور کھلی کھلی ہے کہ قانون قدرت اللہ جل شانہ کا اسی طرح پر واقع ہے کہ ہر ایک جاندار کی اولاد اس کی نوع کے موافق ہوا کرتی ہے مثلاً دیکھو کہ جس قدر جانور ہیں مثلاً انسان اور گھوڑا اور گدھا اور ہر ایک پرندہ وہ اپنی اپنی نوع کے لحاظ سے وجود پذیر ہوتے ہیں یہ تو نہیں ہوتا کہ انسان کسی پرندہ سے پیدا ہو جاوے یا پرند کسی انسان کے پیٹ سے نکلے۔ پھر ایک تیسری دلیل یہ پیش کی ہے: **كَانَ اَيُّهَا كَلْبِنِ الطَّعَاہَ** یعنی وہ دونوں حضرت مسیح اور آپ کی والدہ صدیقہ کھانا کھایا کرتے تھے۔ اب آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کیوں کھانا کھاتا ہے اور کیوں کھانے کا محتاج ہے۔ اس میں اصل بھید یہ ہے کہ ہمیشہ انسان کے بدن میں سلسلہ تحلیل کا جاری ہے یہاں تک کہ تحقیقات قدیمہ اور جدیدہ سے ثابت ہے کہ چند سال میں پہلا جسم تحلیل پا کر معدوم ہو جاتا ہے اور دوسرا بدن بدل مانتھل ہو جاتا ہے اور ہر ایک قسم کی جو غذا کھائی جاتی ہے اس کا بھی روح پر اثر ہوتا ہے کیونکہ یہ امر بھی ثابت شدہ ہے کہ کبھی روح جسم پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور کبھی جسم روح پر اپنا اثر ڈالتا ہے جیسے اگر روح کو یک دفعہ کوئی خوشی پہنچتی ہے تو اس خوشی کے آثار یعنی بشاشت اور چمک چہرہ پر بھی نمودار ہوتی ہے اور کبھی جسم کے آثار ہنسنے رونے کے روح پر پڑتے ہیں اب جب کہ یہ حال ہے تو کس قدر مرتبہ خدائی سے یہ بعید ہوگا کہ اپنے اللہ کا جسم بھی ہمیشہ اُتار ہے اور تین چار برس کے بعد اور جسم آوے ماسوا اس کے کھانے کا محتاج ہونا بالکل اس مفہوم کے مخالف ہے جو خدا تعالیٰ کی ذات میں مسلم ہے۔ اب ظاہر ہے کہ حضرت مسیح ان حاجتمندیوں سے بری نہیں تھے جو تمام انسان کو لگی ہوئی ہیں۔ پھر یہ ایک عمدہ دلیل اس بات

کی ہے کہ وہ باوجود ان در دوں اور دکھوں کے خدا ہی تھے یا ابن اللہ تھے اور در دم نے اس لئے کہا کہ بھوک بھی ایک قسم درد کی ہے اور اگر زیادہ ہو جائے تو موت تک نوبت پہنچاتی ہے۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۸۹ تا ۹۳)

عیسیٰ مسیح ایک رسول ہے۔ پہلے اُس سے سب رسول فوت ہو چکے ہیں اور ماں اس کی ایک عورت راستباز تھی اور دونوں جب زندہ تھے روٹی کھایا کرتے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کا ابطال کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ پہلے اس سے سب رسول فوت ہو چکے ہیں اور پھر باوجود اس کے یہ خیال کہ مسیح زندہ آسمان پر بیٹھا ہے باطل ہے۔ پس کس طرح اس دلیل سے اس کی خدائی ثابت کی جاتی ہے کیونکہ یہ دلیل ہی فاسد ہے بلکہ حق یہ ہے کہ موت نے کسی کو نہیں چھوڑا سب مر گئے۔ دوسری دلیل اس کی عبودیت پر یہ ہے کہ اس کی ماں تھی جس سے وہ پیدا ہوا اور خدا کی کوئی ماں نہیں۔ تیسری دلیل اس کی عبودیت پر یہ ہے کہ جب وہ اور اس کی ماں زندہ تھے دونوں روٹی کھایا کرتے تھے اور خدا روٹی کھانے سے پاک ہے۔ یعنی روٹی بدل مانتھل ہوتی ہے اور خدا اس سے بلند تر ہے کہ اس میں تحلیل پانے کی صفت ہو۔ مگر مسیح روٹی کھاتا رہتا تھا۔ پس اگر وہ خدا ہے تو کیا خدا کا وجود بھی تحلیل پاتا رہتا ہے؟ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طبعی تحقیقات کی رو سے انسان کا بدن تین برس تک بالکل بدل جاتا ہے اور پہلے اجزاء تحلیل ہو کر دوسرے اجزاء ان کے قائم مقام پیدا ہو جاتے ہیں مگر خدا میں یہ نقص ہرگز نہیں۔ یہ دلیل ہے جس کو خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ کے انسان ہونے پر لایا ہے۔

مگر افسوس ان لوگوں پر کہ جو حضرت عیسیٰ کو آسمان پر پہنچا کر پھر اعتقاد رکھتے ہیں کہ اُن کے وجود میں انسانوں کی طرح یہ خاصیت نہیں کہ سلسلہ تحلیل کا ان میں جاری رہے اور بغیر اس کے جو بذریعہ غذا بدل مانتھل اُن کو ملتا ہو اُن کا وجود فنا سے بچا ہوا ہوگا اس طرح پر وہ خدا کی اس برہان اور دلیل کو توڑنا چاہتے ہیں جو آیت ممدوحہ بالا میں اس نے قائم کی ہے۔ یعنی خدا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انسان ہونے کی یہ دلیل دیتا ہے کہ اور انسانوں کی طرح وہ بھی محتاج غذا تھا اور بغیر غذا کے اس کا بدن قائم نہیں رہ سکتا تھا بلکہ بدل مانتھل کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ لوگ جو حضرت عیسیٰ کو مع جسم عنصری آسمان پر پہنچاتے ہیں وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کا وجود بغیر غذا کے قائم رہ سکتا ہے تو گویا وہ برخلاف منشاء اللہ تعالیٰ کے حضرت عیسیٰ کی خدائی کی ایک دلیل پیش کرتے ہیں۔ شرم کی جگہ ہے کہ جس دلیل کو خدا نے اس غرض سے پیش کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی

انسانیت ثابت ہو یہ لوگ اُس دلیل کی بے عزتی کرتے ہیں۔ کیونکہ جس بات سے خدا تعالیٰ انکار کرتا ہے کہ وہ بات مسیح میں موجود نہیں تا اس کو خدا ٹھہرایا جائے یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بات اُس میں موجود ہے۔ پس یہ خدا کی اس حجت کاملہ کی بے عزتی ہے جو حضرت عیسیٰ کے انسان ہونے کے لئے وہ پیش کرتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے کہ حضرت عیسیٰ باوجود جسم عنصری کے روٹی کھانے کے محتاج نہیں اور ان کا بدن خدا کے وجود کی طرح خود بخود قائم رہ سکتا ہے تو یہ تو اُن کی خدائی کی ایک دلیل ہے جو قدیم سے عیسائی پیش کیا کرتے ہیں اور اس کے جواب میں یہ کہنا کافی نہیں کہ زمین پر تو وہ روٹی کھایا کرتے تھے گو وہ آسمان پر نہیں کھاتے کیونکہ مخالف کہہ سکتا ہے کہ زمین پر وہ محض اپنے اختیار سے کھاتے تھے انسانوں کی طرح روٹی کے محتاج نہ تھے اور اگر محتاج ہوتے تو آسمان پر بھی ضرور محتاج ہوتے۔ مجھے بار بار اس قوم پر افسوس آتا ہے کہ خدا تو حضرت مسیح کا روٹی کھانا ان کی انسانیت پر دلیل لاوے اور یہ لوگ اعتقاد رکھیں کہ گو حضرت مسیح نے زمین پر تیس ۳۰ برس تک روٹی کھائی مگر آسمان پر اُنیس ۱۹۰۰ سو برس سے بغیر روٹی کھانے کے جیتے ہیں۔

(برائین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۳۹۲، ۳۹۳)

مریم علیہا السلام کو صدیقہ کہا گیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اور عورتیں صدیقہ نہ تھیں یہ بھی اسی لیے کہا کہ یہودی ان پر تہمت لگاتے تھے تو قرآن نے اس تہمت کو دور کیا۔

(البدرد جلد ۲ نمبر ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵۷)

حضرت مسیح کی ماں کی نسبت جو صدیقہ کا لفظ آیا ہے یہ بھی دراصل رفع الزام ہی کے لیے آیا ہے یہودی جو معاذ اللہ! ان کو فاسقہ فاجرہ ٹھہراتے تھے قرآن شریف نے صدیقہ کہہ کر ان کے الزاموں کو دور کیا ہے کہ وہ صدیقہ تھیں۔ اس سے کوئی خصوصیت اور فخر ثابت نہیں ہوتا اور نہ عیسائی کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ ان کو تو یہ امور پیش بھی نہیں کرنے چاہئیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

حضرت مسیح اور ان کی ماں مریم پر یہود کا اعتراض تھا۔ مسیح کو وہ لوگ ناجائز ولادت کا الزام لگاتے اور مریم کو زانیہ کہتے تھے۔ قرآن شریف کا کام ہے کہ انبیاء پر سے اعتراضات کو رفع کرے اس لیے اس نے مریم کے حق میں زانیہ کی بجائے صدیقہ کا لفظ رکھا اور مسیح کو مسّ شیطان سے پاک کہا اگر ایک محلہ میں صرف ایک عورت کا تبر یہ کیا جاوے اور اس کی نسبت کہا جاوے کہ وہ بدکار نہیں ہے تو اس سے یہ التزام لازم نہیں آتا کہ باقی کی سب ضرور بدکار ہیں صرف یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس پر جو الزام ہے وہ غلط ہے یا اگر ایک آدمی کو

کہا جاوے کہ وہ بھلا مانس ہے تو اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہوتے کہ باقی کے سب لوگ بھلے مانس نہیں بلکہ بدکار ہیں اسی طرح یہ ایک مقدمہ تھا کہ مسیح اور اس کی ماں پر الزام لگائے گئے تھے خدا نے شہادت دی کہ وہ الزاموں سے بری اور پاک ہیں کیا عدالت اگر ایک ملزم کو قتل کے مقدمہ میں بری کر دے تو اس سے یہ لازم آوے گا کہ باقی کے سب لوگ اس شہر کے ضرور قاتل اور خونخوار ہیں۔ غرضیکہ اس قسم کی بدعات اور فساد پھیلے ہوئے تھے جن کے دور کرنے کے لیے خدا نے ہمیں مبعوث کیا ہے۔

(البدرد جلد ۳ نمبر ۱۵ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

پھر اور ایک آیت حضرت عیسیٰ کی موت پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ كَانَا يَا كَلْبَيْنِ الطَّعَامَ یعنی حضرت مسیح اور حضرت مریم جب زندہ تھے تو روٹی کھایا کرتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ترکِ طعام کی دو ذہبیں ہوتیں تو اللہ تعالیٰ اس کا ذکر علیحدہ علیحدہ کر دیتا کہ مریم تو بوجہ فوت ہونے کے طعام سے مجبور ہوگئی اور عیسیٰ کسی اور وجہ سے کھانا چھوڑ بیٹھا بلکہ دونوں کو ایک ہی آیت میں شامل کرنا اتحادِ امر واقعہ پر دلیل ہے تا معلوم ہو کہ دونوں مر گئے۔

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ۗ  
وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرِي ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ  
قَسِيصِينَ وَرُهْبَانًا ۗ وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۸۶﴾

سب فرقوں میں سے مسلمانوں کی طرف زیادہ تر رغبت کرنے والے عیسائی ہیں کیونکہ ان میں بعض بعض اہل علم اور راہب بھی ہیں جو تکبر نہیں کرتے۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۷۷)

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا  
مِنَ الْحَقِّ ۗ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿۸۷﴾

اور جب خدا کے کلام کو جو اس کے رسول پر نازل ہوا سنتے ہیں تب تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ حقانیت کلامِ الہی کو پہچان جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا یا ہم ایمان لائے ہم کو ان لوگوں میں لکھ لے جو تیرے دین کی سچائی کے گواہ ہیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۷۷)

پانی کا لحاظ تو ہر ایک نے رکھا ہے، ان لوگوں نے تالاب وغیرہ رکھا ہے اور قرآن نے گریہ و بکا کا پانی رکھا ہے۔ وہ ظاہر پر گئے ہیں اور قرآن شریف حقیقت پر گیا ہے جیسے تَزَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۳)

وَمَا كُنَّا لَنُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَ مَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿۱۵﴾

اور کیوں ہم خدا اور خدا کے سچے کلام پر ایمان نہ لائیں حالانکہ ہماری آرزو ہے کہ خدا ہم کو ان بندوں میں داخل کرے جو نیکو کار ہیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۷۷)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْبَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ مِنْ أَوْسَطِ مَا تَطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۗ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامًا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ۗ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْبَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ ۗ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ ۗ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۶﴾

وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ یعنی جب تم قسم کھاؤ تو جھوٹ اور بدعہدی اور بدینتی سے اپنی قسم کو بچاؤ۔ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۶۲۵ حاشیہ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَلْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۷﴾

شراب اور قمار بازی اور بت پرستی اور شگون لینا یہ سب پلید اور شیطانی کام ہیں ان سے بچو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳۶)

جب انسان تعصب اور فاسقانہ زندگی سے اندھا ہو جاتا ہے تو اسے حق اور باطل میں فرق نظر نہیں آتا ہر ایک حلال کو حرام اور ہر ایک حرام کو حلال سمجھتا ہے اور نیکی کے ترک کرنے میں ذرا دریغ نہیں کرتا شراب جو

ام الخبائث ہے عیسائیوں میں حلال سمجھی جاتی ہے مگر ہماری شریعت میں اس کو قطعاً منع کیا گیا ہے اور اس کو رجس من الشیطن کہا گیا ہے۔ کیا کوئی پادری ہے جو یہ دکھا دے کہ انجیل میں حرمت شراب کی لکھی ہے بلکہ شراب ایسی متبرک خیال کی گئی ہے کہ پہلا معجزہ مسیح کا شراب کا ہی تھا تو پھر دلیری کیوں نہ ہو۔ جو بڑا پرہیز گاران میں ہوگا وہ کم از کم ایک بوتل برانڈی کی ضرور استعمال کرتا ہوگا چنانچہ کثرت شراب نے ولایت میں آئے دن نئے نئے جرائم کو ایجاد کر دیا ہے..... قمار بازی میں اتلاف حقوق ہوتا ہے شراب نوشی کے ساتھ دوسرے گناہ مثل زنا، قتل وغیرہ لازمی پڑے ہوئے ہیں۔ جہاں تک ہمیں مجرموں کے حالات سے شہادت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ شراب سے زنا ترقی کرتا ہے چنانچہ شراب نوشی میں اس وقت یورپ اول درجہ پر ہے اور زنا میں بھی اول نمبر پر۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۷)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنَ أَشْيَاءٍ إِن تَبَدَّلَ لَكُمْ تَسْوُكُمْ ۚ وَإِن تَسْأَلُوا  
عَهَا حِينَ يَنْزِلَ الْفُرْقَانُ تَبَدَّلَ لَكُمْ ۖ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ عَفُودٌ حَلِيمٌ ﴿۱۰﴾

جو امر یہاں پیدا ہوتا ہے اس پر اگر غور کیا جاوے اور نیک نیتی اور تقویٰ کے پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر سوچا جاوے تو اس سے ایک علم پیدا ہوتا ہے۔ میں اس کو آپ کی صفائی قلب اور نیک نیتی کا نشان سمجھتا ہوں کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کو پوچھ لیتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے دل میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو نکالتے نہیں اور پوچھتے نہیں۔ جس سے وہ اندر ہی اندر نشوونما پاتا رہتا ہے اور پھر اپنے شکوک اور شبہات کے انڈے بچے دے دیتا ہے اور روح کو تباہ کر دیتا ہے۔ ایسی کمزوری نفاق تک پہنچا دیتی ہے کہ جب کوئی امر سمجھ میں نہ آوے تو اسے پوچھنا نہ جاوے اور خود ہی ایک رائے قائم کر لی جاوے۔ میں اس کو داخل ادب نہیں کرتا کہ انسان اپنی روح کو ہلاک کر لے۔ ہاں! یہ سچ ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر سوال کرنا بھی مناسب نہیں۔ اس سے منع فرمایا گیا ہے: لَا تَسْأَلُوا عَنَ أَشْيَاءٍ ۗ اور ایسا ہی اس سے بھی منع کیا گیا ہے کہ آدمی جاسوسی کر کے دوسروں کی برائیوں کو نکالتا رہے یہ دونوں طریق برے ہیں لیکن اگر کوئی امر اہم دل میں کھٹکتے تو اسے ضرور پیش کر کے پوچھ لینا چاہیے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

اللہ تعالیٰ نے لَا تَسْأَلُوا عَنَ أَشْيَاءٍ بھی فرمایا ہے بہت کھودنا اچھا نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۗ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥١﴾

یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! پہلے اپنے نفسوں کی اصلاح کرو پھر تم دوسروں کی اصلاح کے قابل بنو گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ پہلے اپنے آپ کو درست کیا جاوے۔ جب تک ہم خود اپنے اعمال سے خدا کو راضی نہیں کرتے دوسروں کو خدا کی رضا کی طرف بلانا عبث ہے۔ جس شخص کے اندر خود روشنی اور نور نہیں وہ دوسروں کو کیا روشنی دے سکتا ہے اور جو آپ ٹھوکرین کھا رہا ہے وہ دوسروں کو کیا سہارا دے سکتا ہے۔ جو خود پاک نہیں وہ دوسروں کو کیا پاک کر سکتا ہے۔ جو شخص محض زبان سے کام لیتا ہے وہ مذہب کو بچوں کا کھیل بناتا ہے۔ ایسے مصلحوں سے بجائے اس کے کہ کوئی فائدہ پہنچے ملک کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے..... میں کہوں گا کہ جو شخص مصلح بننا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ پہلے خود اپنی اصلاح کرے۔ پہلے اپنے اندر روشنی پیدا کرے تو پھر دوسروں کو بھی اس سے روشنی پہنچ سکتی ہے۔ سورج کو دیکھ لو کہ پہلے خود روشنی حاصل کر کے روشن ہوا تو پھر دوسروں کو روشنی پہنچانے کے قابل ہوا۔ ایسا ہی چاند پہلے خود سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے پھر دوسروں کو روشنی پہنچاتا ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۱۰ صفحہ ۳۵۰، ۳۵۱)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو درست کرو۔ جس شخص کے اندر خود روشنی اور نور نہیں ہے وہ اگر زبان سے کام لے گا تو وہ مذہب کو بچوں کا کھیل بنا دے گا اور حقیقت میں ایسے ہی مصلحوں سے ملک کو نقصان پہنچا ہے۔ ان کی زبان پر تو منطق اور فلسفہ جاری رہتا ہے مگر اندر خالی ہوتا ہے۔

خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ میں نہایت خیر خواہی سے کہہ رہا ہوں خواہ کوئی میری باتوں کو نیک ظنی سے سنے یا بد ظنی سے مگر میں کہوں گا کہ جو شخص مصلح بننا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ پہلے خود روشن ہو اور اپنی اصلاح کرے۔ دیکھو! یہ سورج جو روشن ہے پہلے اس نے خود روشنی حاصل کی ہے۔

میں یقیناً سمجھتا ہوں کہ ہر ایک قوم کے معلم نے یہی تعلیم دی ہے لیکن اب دوسرے پر لاشی مارنا آسان ہے لیکن اپنی قربانی دینا مشکل ہو گیا ہے۔ پس جو چاہتا ہے کہ قوم کی اصلاح کرے اور خیر خواہی کرے وہ اس کو اپنی اصلاح سے شروع کرے۔ قدیم کے زمانہ کے رشی اور اوتار جنگلوں اور بنوں میں جا کر اپنی اصلاح

کیوں کرتے تھے وہ آجکل کے لیکچر (ار)وں کی طرح زبان نہ کھولتے تھے جب تک خود عمل نہ کر لیتے تھے یہی خدا تعالیٰ کے قرب اور محبت کی راہ ہے۔ جو شخص دل میں کچھ نہیں رکھتا اس کا بیان کرنا پرناہ کے پانی کی طرح ہے جو جھگڑے پیدا کرتا ہے اور جو نور معرفت اور عمل سے بھر کر بولتا ہے وہ بارش کی طرح ہے جو رحمت سمجھی جاتی ہے۔

اس وقت میری نصیحت یاد رکھیں! آج کے بعد آپ مجھے یہاں نہ دیکھیں گے اور میں نہیں جانتا کہ پھر موقعہ ہو یا نہ ہو لیکن ان تفرقوں کو مٹانے کی کوشش کرو میری نسبت خواہ آپ کچھ ہی خیال ہو لیکن یہ سمجھ کر کہ:

سے مرد بائید کہ گیرد اندر گوش در نوشت است پند بر دیوار  
میرا نصیحت پر عمل کرو جو شخص خود زہر کھا چکا ہے وہ دوسروں کی زہر کا کیا علاج کرے گا؟ اگر علاج کرتا ہے تو خود بھی مرے گا اور دوسروں کو بھی ہلاک کرے گا کیونکہ زہر اس میں اثر کر چکا ہے اور اس کے حواس چونکہ قائم نہیں رہے اس لیے اس کا علاج بجائے مفید ہونے کے مضر ہوگا۔ غرض جس قدر تفرقہ بڑھتا جاتا ہے اس کا باعث وہی لوگ ہیں جنہوں نے زبانوں کو تیز کرنا ہی سیکھا ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

تم اپنی تبدیلی کے واسطے تین باتیں یاد رکھو؛ (۱) نفس اتارہ کے مقابل پر تدابیر اور جدوجہد سے کام لو۔  
(۲) دعاؤں سے کام لو۔ (۳) سست اور کاہل نہ بنو اور تھکو نہیں۔

ہماری جماعت بھی اگر بیچ کا بیچ ہی رہے گی تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ جو ردی رہتے ہیں خدا ان کو بڑھاتا نہیں۔ پس تقویٰ، عبادت اور ایمانی حالت میں ترقی کرو۔ اگر کوئی شخص مجھے دجال اور کافر وغیرہ ناموں سے پکارتا ہے تو تم اس بات کی کچھ بھی پروا نہ کرو کیونکہ جب خدا میرے ساتھ ہے تو مجھے ان کے ایسے بدکلمات اور گالیوں کا کیا ڈر ہے؟ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کافر کہا تھا، ایک زمانہ ایسا آ گیا کہ پکار اٹھا کہ میں اس خدا پر ایمان لایا جس پر موسیٰ اور اس کے متبع ایمان لائے ہیں۔ ایسے لوگ یاد رکھو کہ مغنث اور نامرد ہوتے ہیں یہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ جیسے ایک بچہ بعض اوقات اپنی ماں اور باپ کو بھی نا سمجھی کی وجہ سے گالی دے دیتا ہے مگر اس کے اس فعل کو کوئی برا نہیں سمجھتا۔

پس یاد رکھو کہ نرمی بیعت اور ہاتھ پر ہاتھ رکھنا کچھ بھی سود مند نہیں۔ جب کوئی شخص شدت پیاس سے مرنے کے قریب ہو جاوے یا شدت بھوک سے مرنے تک پہنچ جاوے تو کیا اس وقت ایک قطرہ پانی یا ایک دانہ کھانے کا اس کو موت سے بچالے گا؟ ہرگز نہیں! جس طرح اس بدن کو بچانے کے واسطے کافی خوراک اور

کافی پانی بہم پہنچانے کے سوائے مفر نہیں۔ اسی طرح پورے جہنم سے تھوڑی سی نیکی سے تم بھی بچ نہیں سکتے۔ پس اس دھوکہ میں نہ رہو کہ ہم نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا ہے اب ہمیں کیا غم ہے۔ ہدایت بھی ایک موت ہے جو شخص یہ موت اپنے اوپر وارد کرتا ہے اس کو پھر نئی زندگی دی جاتی ہے اور یہی اصفیاء کا اعتقاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی ابتدائی حالت کے واسطے فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ یعنی پہلے اپنے آپ کو درست کرو اپنے امراض کو دور کرو دوسروں کا فکر مت کرو۔ ہاں! رات کو اپنے آپ کو درست کرو اور دن کو دوسروں کو بھی کچھ ہدایت کر دیا کرو۔ خدا تعالیٰ تمہیں بخشے اور تمہارے گناہوں سے تمہیں مخلصی دے اور تمہاری کمزوریوں کو تم سے دور کرے اور اعمال صالح اور نیکی میں ترقی کرنے کی توفیق دیوے۔ (آمین)

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹، ۴۰ مورخہ ۱۰ تا ۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

بیان میں جب تک روحانیت اور تقویٰ و طہارت اور سچا جوش نہ ہو اس کا کچھ نیک نتیجہ مرتب نہیں ہوتا ہے۔ وہ بیان جو کہ بغیر روحانیت و خلوص کے ہے وہ اس پر نالہ کے پانی کی مانند ہے جو موقعہ بے موقعہ جوش سے پڑا جاتا ہے اور جس پر پڑتا ہے اسے بجائے پاک و صاف کرنے کے پلید کر دیتا ہے انسان کو پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہیے پھر دوسروں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ یعنی اے مومنو! پہلے اپنی جان کا فکر کرو۔ اگر تم اپنے وجود کو مفید ثابت کرنا چاہو تو پہلے خود پاکیزہ وجود بن جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ باتیں ہی باتیں ہوں اور عملی زندگی میں ان کا کچھ اثر دکھائی نہ دے۔ ایسے شخص کی مثال اس طرح سے ہے کہ کوئی شخص ہے جو سخت تاریکی میں بیٹھا ہے اب اگر یہ بھی تاریکی ہی لے گیا تو سوائے اس کے کہ کسی پر گر پڑے اور کیا ہوگا اسے چراغ بن کر جانا چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسرے روشنی پائیں۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ ۗ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا ۗ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ

الْغُيُوبِ ﴿۱۱۰﴾

یہ لاعلمی انبیاء کی اُن کی اُس امت کے بارے میں ہوتی ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوتی ہے، مسیح بھی کہتا ہے: كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ (المائدة: ۱۱۸) تو پھر اگر ان کو علم نہیں تو وہ شہید کس طرح ہوئے اور کس بات کے ہوئے؟ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حالات سے تو لاعلمی ظاہر کر سکتے

ہیں مگر صحابہ کرام کی نسبت نہیں کر سکتے کیونکہ آپ کو ان کے حالات معلوم تھے اور آپ ان میں رہتے تھے۔ اس قسم کی لاعلمی سے وہی لاعلمی مراد ہے یعنی اس امت کا ذکر جو کہ نبی کے بعد آیا کرتی ہے یا بہت آخری وقت پر آتی ہے کہ اسے نبی کی صحبت سے کچھ حصہ نہیں ملتا۔ (البدرد جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۱)

إِذْ قَالَ اللَّهُ لِيُعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْنَاكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْنَاكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِأَذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِأَذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْبَةَ وَالْأَبْرَصَ بِأَذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِأَذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَذَا إِلَّا أَسْحَرٌ مُّبِينٌ ﴿۱۱﴾

عصمت سے مراد یہ ہے کہ بڑی آفتوں سے جو دشمنوں کا اصل مقصود تھا بچایا جاوے۔ دیکھو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عصمت کا وعدہ کیا گیا تھا حالانکہ اُحد کی لڑائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت زخم پہنچے تھا اور یہ حادثہ وعدہ عصمت کے بعد ظہور میں آیا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو فرمایا تھا: إِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ یعنی یاد کروہ زمانہ کہ جب بنی اسرائیل کو جو قتل کا ارادہ رکھتے تھے میں نے تجھ سے روک دیا حالانکہ تو اتر قومی سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کو یہودیوں نے گرفتار کر لیا تھا اور صلیب پر کھینچ دیا تھا لیکن خدا نے آخر جان بچادی پس یہی معنی إِذْ كَفَفْتُ کے ہیں جیسا کہ وَاللَّهُ يَعِصُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدة: ۶۸) کے ہیں۔ (نزول المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۵۲۹)

قَالُوا نُزِيْدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمِئِنُّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنَّ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونُ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿۱۲﴾

قرآن شریف کے ایک مقام پر غور کرتے کرتے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی بڑی عظمت اور کامیابی معلوم ہوئی جس کے مقابل میں حضرت مسیح بہت ہی کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ سورہ مائدہ میں ہے کہ نزول ماندہ کی درخواست جب حواریوں نے کی تو وہاں صاف لکھا ہے: قَالُوا نُزِيْدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمِئِنُّ قُلُوبُنَا وَ

لَعَلَّمَهُ أَنْ قَدْ صَدَقْتُنَا وَنَكُونُ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جس قدر معجزات مسیح کے بیان کیے جاتے ہیں اور جو حواریوں نے دیکھے تھے ان سب کے بعد ان کا یہ درخواست کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے قلوب پہلے مطمئن نہ ہوئے تھے ورنہ یہ الفاظ کہنے کی ان کو کیا ضرورت تھی؟ وَ تَطْمِئِنُّ قُلُوبُنَا وَ نَعْلَمَهُ أَنْ قَدْ صَدَقْتُنَا مسیح کی صداقت میں بھی اس سے پہلے کچھ شک ہی سا تھا اور وہ اس جھاڑ پھونک کو معجزہ کی حد تک نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں صحابہ کرام ایسے مطمئن اور قوی الایمان تھے کہ قرآن شریف نے ان کی نسبت رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوا عَنْهُ (المائدۃ: ۱۲۰) فرمایا اور یہ بھی بیان کیا کہ ان پر سکینت نازل فرمائی یہ آیت مسیح علیہ السلام کے معجزات کی حقیقت کھولتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت قائم کرتی ہے صحابہ کا کہیں ذکر نہیں کہ انہوں نے کہا کہ ہم اطمینان قلب چاہتے ہیں بلکہ صحابہ کا یہ حال کہ ان پر سکینت نازل ہوئی اور یہود کا یہ حال يَعْرِفُونَ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ (البقرۃ: ۱۲۷) ان کی حالت بتائی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت یہاں تک کھل گئی تھی وہ اپنے بیٹوں کی طرح شناخت کرتے تھے اور نصاریٰ کا یہ حال کہ ان کی آنکھوں سے آپ کو دیکھیں تو آنسو جاری ہو جاتے تھے یہ مراتب مسیح کو کہاں نصیب!

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

صحابہ کرام کے نمونے ایسے ہیں کہ کل انبیاء کی نظیر ہیں خدا کو تو عمل ہی پسند ہیں انہوں نے بکریوں کی طرح اپنی جان دی اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے نبوت کی ایک ہیکل آدم سے لے کر چلی آتی تھی اور سمجھ نہ آتی تھی مگر صحابہ کرام نے چمکا کر دکھلا دی اور بتلا دیا کہ صدق اور وفا سے کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کا تو حال ہی نہ پوچھو۔ موسیٰ کو کسی نے فروخت نہ کیا مگر عیسیٰ کو ان کے حواریوں نے (تیس) روپے لے کر فروخت کر دیا۔ قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ حواریوں کو عیسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر شک تھا جی تو ماندا مانگا اور کہا: وَ نَعْلَمَهُ أَنْ قَدْ صَدَقْتُنَا تاکہ تیرا سچا اور جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول ماندہ سے پیشتر ان کی حالت نَعْلَمَهُ کی نہ تھی پھر جیسی بے آرامی کی زندگی انہوں نے بسر کی اس کی نظیر کہیں نہیں پائی جاتی صحابہ کرام کا گروہ عجیب گروہ قابل قدر اور قابل پیروی گروہ تھا ان کے دل یقین سے بھر گئے ہوئے تھے جب یقین ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ اول مال وغیرہ دینے کو جی چاہتا ہے پھر جب بڑھ جاتا ہے تو صاحب یقین خدا کی خاطر جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

(البدرد جلد ۲ نمبر ۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۵)

قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُرِّدْتُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أَعَذِّبُهُ عَذَابًا لَاقًا

## أَعِدُّبَهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿١١٢﴾

معارض صاحب کا اس آیت کو پیش کرنا کہ قَالَ اللهُ اِنِّي مُنْزِلُهَا عَلَيْكُمْ ؕ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّي اَعِدُّبُهُ عَذَابًا لَّا اَعِدُّبُهُ اَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مِنْكُمْ کا لفظ اس جگہ خصوصیت کے ساتھ حاضرین کے حق میں آیا ہے ایک بے فائدہ بات ہے کیونکہ..... قرآن کریم کا عام محاورہ جس سے تمام قرآن بھرا پڑا ہے یہی ہے کہ خطاب عام ہوتا ہے اور احکام خطابیہ تمام امت کے لئے ہوتے ہیں نہ صرف صحابہ کے لئے۔ ہاں! جس جگہ کوئی صریح اور صاف قرینہ تحدید خطاب کا ہو وہ جگہ مستثنیٰ ہے چنانچہ آیت موصوفہ بالا میں خاص حواریوں کے ایک طائفہ نے نزول مانندہ کی درخواست کی اسی طائفہ کو مخاطب کر کے جواب ملا۔ سو یہ قرینہ کافی ہے کہ سوال بھی اسی طائفہ کا تھا اور جواب بھی اسی کو ملا۔

(شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۳۴)

وَ اِذْ قَالَ اللهُ يُعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ؕ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِي وَاُمَّيَ الْهَيْنِ  
 مِنْ دُوْنِ اللهِ ۗ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ۗ اِنْ كُنْتُ  
 قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۗ تَعَلَّمْ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَاَلَا اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۗ اِنَّكَ اَنْتَ عَلٰمُ  
 الْغُيُوْبِ ﴿١١٣﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِيْ بِهٖ اِنْ اَعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ وَ كُنْتُ  
 عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۗ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتُ اَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۗ وَاَنْتَ  
 عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٤﴾

جب تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی اُن پر نگہبان تھا۔..... تمام قرآن شریف میں توفیٰ کے معنی یہ ہیں کہ روح کو قبض کرنا اور جسم کو بیکار چھوڑ دینا۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ (السجدة: ۱۲) اور پھر فرماتا ہے: وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِي يَتَوَفَّكُم (يونس: ۱۰۵) اور پھر فرماتا ہے: حَتّٰى يَتَوَفَّيْهُنَّ الْمَوْتُ (النساء: ۱۶) اور پھر فرماتا ہے: حَتّٰى اِذَا جَاءَهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْهُمْ (الاعراف: ۳۸) (الجزء نمبر ۸ سورة الاعراف) اور پھر فرماتا ہے: تَوَفَّيْتَهُ رُسُلُنَا (الانعام: ۶۲)۔ ایسا ہی قرآن شریف کے تمبیس مقام میں برابر توفیٰ کے معنی امات اور قبض روح ہے۔ لیکن افسوس کہ بعض

علماء نے محض الحاد اور تحریف کی رو سے اس جگہ تَوَفِّيْتِنِي سے مراد فَعْتِنِي لیا ہے اور اس طرف ذرہ خیال نہیں کیا کہ یہ معنی نہ صرف لغت کے مخالف بلکہ سارے قرآن کے مخالف ہیں۔ پس یہی تو الحاد ہے کہ جن خاص معنوں کا قرآن کریم نے اوّل سے آخر تک التزام کیا ہے ان کو بغیر کسی قرینہ تو یہ کے ترک کر دیا گیا ہے۔ توفیٰ کا لفظ نہ صرف قرآن کریم میں بلکہ جا بجا احادیث نبویہ میں بھی وفات دینے اور قبض روح کے معنوں پر ہی آتا ہے۔ چنانچہ جب میں نے غور سے صحاح ستہ کو دیکھا تو ہر ایک جگہ جو توفیٰ کا لفظ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے نکلا ہے یا کسی صحابی کے مُنہ سے تو انہیں معنوں میں محدود پایا گیا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ کسی ایک صحیح حدیث میں بھی کوئی ایسا توفیٰ کا لفظ نہیں ملے گا جس کے کوئی اور معنی ہوں۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ اسلام میں بطور اصطلاح کے قبض روح کے لئے یہ لفظ مقرر کیا گیا ہے تا روح کی بقاء پر دلالت کرے۔ افسوس کہ بعض علماء جب دیکھتے ہیں کہ توفیٰ کے معنی حقیقت میں وفات دینے کے ہیں تو پھر یہ دوسری تاویل پیش کرتے ہیں کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتِنِي میں جس توفیٰ کا ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰ کے نزول کے بعد واقع ہوگی۔ لیکن تعجب کہ وہ اس قدر تاویلات رکیکہ کرنے سے ذرہ بھی شرم نہیں کرتے۔ وہ نہیں سوچتے کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتِنِي سے پہلے یہ آیت ہے: **وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِيُحْيِي ابْنَ مَرْيَمَ ۖ أَنْتَ قُلْتَ لِلْمَنَّاكِسِ الْخِ وَلَا تَوَفَّيْتِنِي** سے پہلے یہ آیت ہے اور اس کے اوّل اذ موجود ہے جو خاص واسطے ماضی کے آتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ وقت نزول آیت زمانہ ماضی کا ایک قصہ تھا نہ زمانہ استقبال کا اور پھر ایسا ہی جو جواب حضرت عیسیٰ کی طرف سے ہے یعنی فَلَمَّا تَوَفَّيْتِنِي وہ بھی بصیغہ ماضی ہے اور اس قصہ سے پہلے جو بعض دوسرے قصے قرآن کریم میں اسی طرز سے بیان کئے گئے ہیں وہ بھی انہیں معنوں کے مؤید ہیں مثلاً یہ قصہ: **وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً** (البقرة: ۳۱) کیا اس کے یہ معنی کرنے چاہئے کہ خدائے تعالیٰ کسی استقبال کے زمانہ میں ملائکہ سے ایسا سوال کرے گا؟ ماسوا اس کے قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے اور حدیثیں بھی اس کی مصدق ہیں کہ موت کے بعد قبل از قیامت بھی بطور باز پرس سوالات ہوا کرتے ہیں۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۲۴، ۴۲۵)

خدا تو پابندی اپنے وعدوں کے ہر چیز پر قادر ہے لیکن ایسے شخص کو کسی طرح دوبارہ دنیا میں نہیں لاسکتا جس کے پہلے فتنے نے ہی دنیا کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ مولوی اسلام کے نادان دوست! کیا جانتے ہیں کہ ایسے عقیدوں سے کس قدر عیسائیوں کو مدد پہنچ چکی ہے۔ اب خدا تعالیٰ کوئی نئی عظمت ابن مریم کو دینا نہیں چاہتا

بلکہ یہاں تک کہ جس قدر پہلے اس سے حضرت مسیح کی نسبت اطراء کیا گیا ہے وہ بھی خدا کو سخت ناگوار گزارا ہے اور اسی وجہ سے اس کو کہنا پڑا: **ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ ابَآسْمَانِ كِىَ طَرَفِ دِكْهِنَا كِى كَبَآسْمَانِ سِى** ابن مریم اترتا ہے سخت جہالت ہے۔ (دفع البلاء، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۳۵، ۲۳۶)

ماضی مضارع کے معنوں پر بھی آجاتی ہے بلکہ ایسے مقامات میں جبکہ آنے والا واقعہ متکلم کی نگاہ میں یقینی الوقوع ہو مضارع کو ماضی کے صیغہ پر لاتے ہیں تا اس امر کا یقینی الوقوع ہونا ظاہر ہو اور قرآن شریف میں اس کی بہت نظیریں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے... **وَ اِذْ قَالِ اللّٰهُ يٰعِيسٰى اِبْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاٰمِىَ الْاٰلِهِيْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ**۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۵۹)

قرآن شریف کے کسی مقام سے ثابت نہیں کہ حضرت مسیح اسی خاکی جسم کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھائے گئے بلکہ قرآن شریف کے کئی مقامات میں مسیح کے فوت ہو جانے کا صریح ذکر ہے اور ایک جگہ خود مسیح کی طرف سے فوت ہو جانے کا اقرار موجود ہے اور وہ یہ ہے: **كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۗ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتُ اَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۗ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ**۔ اب جب کہ فوت ہو جانا ثابت ہوا تو اس سے ظاہر ہے کہ اُن کا جسم اُن سب لوگوں کی طرح جو مرتے ہیں زمین میں دفن کیا گیا ہوگا کیونکہ قرآن شریف بصرحت ناطق ہے کہ فقط اُن کی روح آسمان پر گئی نہ کہ جسم۔ تب ہی تو حضرت مسیح نے آیت موصوفہ بالا میں اپنی موت کا صاف اقرار کر دیا اگر وہ زندوں کی شکل پر خاکی جسم کے ساتھ آسمان کی طرف پرواز کرتے تو اپنے مرجانے کا ہرگز ذکر نہ کرتے اور ایسا ہرگز نہ کہتے کہ میں وفات پا کر اس جہان سے رخصت کیا گیا ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ جبکہ آسمان پر اُن کی روح ہی گئی تو پھر نازل ہونے کے وقت جسم کہاں سے ساتھ آجائے گا۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶)

قرآن شریف پر نظر غور ڈالو اور ذرا آنکھ کھول کر دیکھو کہ کیوں کروہ صاف اور بین طور پر عیسیٰ بن مریم کے مرجانے کی خبر دے رہا ہے جس کی ہم کوئی بھی تاویل نہیں کر سکتے مثلاً یہ جو خدائے تعالیٰ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ کی طرف سے فرماتا ہے: **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتُ اَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ** کیا ہم اس جگہ توفیٰ سے نیند مراد لے سکتے ہیں؟ کیا یہ معنی اس جگہ موزوں ہوں گے کہ جب تُو نے مجھے سُلا دیا اور میرے پر نیند غالب کر دی تو میرے سونے کے بعد تُو اُن کا نگہبان تھا ہرگز نہیں بلکہ توفیٰ کے سیدھے اور صاف معنی جو موت ہے وہی اس جگہ چسپاں ہیں لیکن موت سے مراد وہ موت نہیں جو آسمان سے اُترنے کے بعد پھر وارد ہو کیونکہ جو

سوال اُن سے کیا گیا ہے یعنی اُن کی اُمت کا بگڑ جانا اُس وقت کی موت سے اس سوال کا کچھ علاقہ نہیں۔ کیا نصاریٰ اب صراطِ مستقیم پر ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں کہ جس امر کے بارے میں خدائے تعالیٰ نے عیسیٰ بن مریم سے سوال کیا ہے وہ امر تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ہی کمال کو پہنچ چکا ہے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۲۴)

قرآن شریف میں اول سے آخر تک جس جس جگہ توفی کا لفظ آیا ہے ان تمام مقامات میں توفی کے معنی موت ہی لیے گئے ہیں۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۲۴ حاشیہ)

توفی کے معنی وفات دینے کے صرف اجتہادی طور پر ہم نے معلوم نہیں کئے بلکہ مہلکۃ کے باب الحشر میں بخاری اور مسلم کی حدیث جو ابن عباس سے ہے صریح اور صاف طور پر اُس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کی یہی تفسیر فرماتے ہیں کہ درحقیقت اس سے وفات ہی مراد ہے۔ بلکہ اسی حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سوال حضرت مسیح سے عالم برزخ میں اُن کی وفات کے بعد کیا گیا تھا نہ یہ کہ قیامت میں کیا جائے گا۔ پس جس آیت کی تفسیر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی کھول دیا پھر اگر کوئی تفسیر نبوی کو بھی سُن کر شک میں رہے تو اس کے ایمان اور اسلام پر اگر افسوس اور تعجب نہ کریں تو اور کیا کریں۔ دیکھو اس حدیث کو امام بخاری انہیں معنون کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے اپنی صحیح کی کتاب التفسیر میں لایا ہے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۵۰۳)

دیکھو صفحہ ۶۶۵ بخاری۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اسی غرض سے آیہ کریمہ: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ کو کتاب التفسیر میں لایا ہے اور اس ایراد سے اُس کا منشاء یہ ہے کہ تالوگوں پر ظاہر کرے کہ تَوَفَّيْتَنِي کے لفظ کی صحیح تفسیر وہی ہے جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ فرماتے ہیں یعنی مار دیا اور وفات دے دی اور حدیث یہ ہے: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ يُجَاءُ بِرِجَالٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ فَيُؤَخِّدُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَأَقُولُ يَا رَبِّ أَصِيحَابِي فَيُقَالُ إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَحَدُنَا بَعْدَكَ فَأَقُولُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ۔ (صفحہ ۶۶۵ بخاری ۶۹۳ بخاری)

یعنی قیامت کے دن میں بعض لوگ میری اُمت میں سے آگ کی طرف لائے جائیں گے تب میں کہوں گا کہ اے میرے رب! یہ تو میرے اصحاب ہیں تب کہا جائے گا کہ تجھے اُن کاموں کی خبر نہیں جو تیرے پیچھے ان لوگوں نے کئے۔ سو اُس وقت میں وہی بات کہوں گا جو ایک نیک بندہ نے کہی تھی یعنی مسیح ابن مریم نے۔

جب کہ اُس کو پوچھا گیا تھا کہ کیا یہ تو نے تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے ماننا اور وہ بات (جو میں ابن مریم کی طرح کہوں گا) یہ ہے کہ میں جب تک اُن میں تھا اُن پر گواہ تھا پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو اُس وقت تو ہی اُن کا نگہبان اور محافظ اور نگران تھا۔ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قصہ اور مسیح ابن مریم کے قصہ کو ایک ہی رنگ کا قصہ قرار دے کر وہی لفظ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کا اپنے حق میں استعمال کیا ہے جس سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي سے وفات ہی مراد لی ہے کیونکہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلعم فوت ہو گئے ہیں اور مدینہ منورہ میں آنحضرت کی مزار شریف موجود ہے پس جبکہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کی شرح اور تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت وفات پانا ہے ثابت ہوا اور وہی لفظ حضرت مسیح کے مُنہ سے نکلا تھا اور کھلے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ جن الفاظ کو مسیح ابن مریم نے استعمال کیا تھا وہی الفاظ میں استعمال کروں گا پس اس سے بالکل منکشف ہو گیا کہ مسیح ابن مریم بھی وفات پا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وفات پا گئے اور دونوں برابر طور پر اثر آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي سے متاثر ہیں۔ اسی وجہ سے امام بخاری اس آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کو قصداً کتاب التفسیر میں لایا تا وہ مسیح ابن مریم کی نسبت اپنے مذہب کو ظاہر کرے کہ حقیقت میں وہ اس کے نزدیک فوت ہو گیا ہے۔ یہ مقام سوچنے اور غور کرنے کا ہے کہ امام بخاری آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کو کتاب التفسیر میں کیوں لایا؟ پس ادنیٰ سوچ سے صاف ظاہر ہوگا کہ جیسا کہ امام بخاری کی عادت ہے اس کا منشاء یہ تھا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے حقیقی اور واقعی معنی وہی ہیں جن کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ سو اس کا مدعا اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ اس آیت کی یہی تفسیر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پر وارد کر کے آپ فرمائی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس طرز کو امام بخاری نے اختیار کر کے صرف اپنا ہی مذہب ظاہر نہیں کیا بلکہ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے یہی معنی سمجھتے تھے تب ہی تو انہیں الفاظ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کو بغیر کسی تبدیل و تغیر کے اپنی نسبت استعمال کر لیا۔ پھر امام صاحب نے اسی مقام میں ایک اور کمال کیا ہے کہ اس معنی کے زیادہ پختہ کرنے کے لئے اسی صفحہ ۶۶۵ میں آیت يٰعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ قُمْ مَعَنَا کہ بحوالہ ابن عباس کے اسی کے مطابق تفسیر کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

وقال ابن عباس متوقِّفك: هُميتك (دیکھو وہی صفحہ ۶۶۵ بخاری)۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے آیت فَالْمَيِّتَاتُ تَوَفِّيْتِنِّي میں صاف صاف اپنا اظہار دے دیا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے دنیا سے اٹھایا گیا کیونکہ ان کا یہ کہنا کہ جب مجھے وفات دی گئی تو پھر اے میرے رب! میرے بعد تو میری امت کا نگہبان تھا صاف شہادت دے رہا ہے کہ وہ دنیا سے ہمیشہ کے لیے وفات پا گئے کیونکہ اگر ان کا دنیا میں پھر آنا مقدر ہوتا تو وہ ضرور ان دونوں واقعات کا ذکر کرتے اور نزول کے بعد کی تبلیغ کا بھی بیان فرماتے نہ یہ کہ صرف اپنی وفات کا ذکر کر کے پھر بعد اپنے خدا تعالیٰ کو قیامت تک نگہبان ٹھہراتے۔ فتدبر!

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۲۵ حاشہ)

دوسری دلیل مسیح ابن مریم کی وفات پر خود جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے جس کو امام بخاری اپنی کتاب التفسیر میں اسی غرض سے لایا ہے کہ تا یہ ظاہر کرے کہ لَمَيِّتَاتُ تَوَفِّيْتِنِّي کے معنی لَمَيِّتَاتُ امَّتِي ہے اور نیز اسی غرض سے اس موقع پر ابن عباس کی روایت سے متوفیٰ کی: هُمَيَّتُكِ کی بھی روایت لایا ہے تا ظاہر کرے کہ لَمَيِّتَاتُ تَوَفِّيْتِنِّي کے وہی معنی ہیں جو انی متوفیٰ کے معنی ابن عباس نے ظاہر فرمائے ہیں۔ اس مقام پر بخاری کو غور سے دیکھ کر ادنیٰ درجہ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ تَوَفِّيْتِنِّي کے معنی امَّتِنِي ہیں یعنی تُوْنِي مجھے مار دیا۔ اس میں تو کچھ شبہ نہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں اور مدینہ منورہ میں آپ کا مزار موجود ہے۔ پھر جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی لفظ فَالْمَيِّتَاتُ تَوَفِّيْتِنِّي کا حدیث بخاری میں اپنے لئے اختیار کیا ہے اور اپنے حق میں ویسا ہی استعمال کیا ہے جیسا کہ وہ حضرت عیسیٰ کے حق میں مستعمل تھا تو کیا اس بات کو سمجھنے میں کچھ کسر رہ گئی کہ جیسا کہ آنحضرت صلعم وفات پا گئے ویسا ہی حضرت مسیح ابن مریم بھی وفات پا گئے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی آیات اور مفہوم آیات میں کسی طور سے تحریف جائز نہیں اور جو کچھ اصل منشاء اور اصل مفہوم اور اصل مراد ہر ایک لفظ کی ہے اس سے عمداً اس کو اور معنوں کی طرف پھیر دینا ایک الحاد ہے جس کے ارتکاب کا کوئی نبی یا غیر نبی مجاز نہیں ہے۔ اس لئے کیوں کر ہو سکتا ہے کہ نبی معصوم بجز حالت تطابق کلی کے جو فی الواقع مسیح کی وفات سے اس کی وفات کو تھی لفظ فَالْمَيِّتَاتُ تَوَفِّيْتِنِّي کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا اور نعوذ باللہ! تحریف کا مرتکب ہوتا بلکہ ہمارے سید و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم امام المعصومین و سید الخفوضین نے (روحی فداء سبیلہ) لفظ فَالْمَيِّتَاتُ تَوَفِّيْتِنِّي کا نہایت دیانت و امانت کے ساتھ انہیں مقررہ معنی معنوں کے ساتھ اپنے حق میں استعمال کیا ہے کہ جیسا کہ وہ بعینہ حضرت عیسیٰ کے حق میں وارد ہے۔ اب بھائیو! اگر حضرت سید و مولانا بجدہ العصری آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں اور

فوت نہیں ہوئے اور مدینہ میں ان کا مزار مطہر نہیں تو گواہ رہو کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ بھی آسمان کی طرف بجسدہ العصری اٹھائے گئے ہوں گے اور اگر ہمارے سید و مولیٰ و سید الکمل ختم المرسلین افضل الاولین و الاخرین اول المحبوبین و المقربین درحقیقت فوت ہو چکے ہیں تو آؤ خدا تعالیٰ سے ڈرو اور فَلَئِمَّا تَوْفِيْتَنِي کے پیارے لفظوں پر غور کرو جو ہمارے سید و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے میں اور اس عبد صالح میں مشترک بیان کئے۔ جس کا نام مسیح ابن مریم ہے۔ بخاری اس مقام میں سورہ آل عمران کی یہ آیت اِنِّي مُتَوَفِّيْكَ کیوں لایا اور کیوں ابن عباس سے روایت کی کہ مُتَوَفِّيْكَ: هُمِيْتُكَ؟ اس کی وجہ بخاری کے صفحہ ۶۲۵ میں شارح بخاری نے یہ لکھی ہے۔ هَذِهِ الْاٰيَةُ مُتَوَفِّيْكَ مِنْ سُوْرَةِ اٰلِ عِمْرَانَ ذَكَرْ هُهَاتَا لِمَنْ سَبَدَةَ فَلَئِمَّا تَوْفِيْتَنِي یعنی یہ آیت اِنِّي مُتَوَفِّيْكَ سورت آل عمران میں ہے اور بخاری نے جو اس جگہ اس آیت کے ابن عباس سے یہ معنی کئے کہ متوفیک: هُمِيْتُكَ تو اس کا یہ سبب ہے کہ بخاری نے فَلَئِمَّا تَوْفِيْتَنِي کے معنی کھولنے کے لئے بوجہ مناسبت یہ فقرہ لکھ دیا ورنہ آل عمران کی آیت کو اس جگہ ذکر کرنے کا کوئی محل نہ تھا۔ اب دیکھئے شارح نے بھی اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ امام بخاری اِنِّي مُتَوَفِّيْكَ: هُمِيْتُكَ کے لفظ کو شہادت کے طور پر بہ تقریب تفسیر آیت فَلَئِمَّا تَوْفِيْتَنِي لایا ہے اور کتاب التفسیر میں جو بخاری نے ان دونوں متفرق آیتوں کو جمع کر کے لکھا ہے تو بجز اس کے اس کا اور کیا مدعا تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی وفات خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت کر چکا ہے۔ اب جب کہ اصح الکتاب کی حدیث مرفوع متصل سے جس کے آپ طالب تھے حضرت عیسیٰؑ کی وفات ثابت ہوئی اور قرآن کی قطعیت الدلالت شہادت اس کے ساتھ متفق ہو گئی اور ابن عباس جیسے صحابی نے بھی موت مسیح کا اظہار کر دیا۔ تو اس دوہرے ثبوت کے بعد اور کس ثبوت کی حاجت رہی؟

(الحق مباحثہ دہلی، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۲۱۶ تا ۲۱۸)

یاد رہے کہ آیت: فَلَئِمَّا تَوْفِيْتَنِي میں اسی وعدہ کے پورا ہونے کی طرف اشارہ ہے جو آیت: يُعِيْسِي اِنِّي مُتَوَفِّيْكَ وَ رَاٰعِكَ اِنِّي (آل عمران: ۵۶) میں کیا گیا تھا اور تَوْفِي کے ان معنوں کے سمجھنے کیلئے جو مراد اور منشاء اللہ جل شانہ کا ہے ضرور ہے کہ ان دونوں آیتوں وعدہ اور تحقق وعدہ کو یکجائی نظر سے دیکھا جائے مگر افسوس کہ ہمارے علماء کو ان تحقیقوں سے کچھ سروکار نہیں۔ یہی تَوْفِي کا لفظ جو قرآن کریم کے دو مقام میں حضرت مسیح کے بارے میں درج ہے ایسا ہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہی لفظ

قرآن کریم میں موجود ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: **وَإِنَّمَا تُرِيكُم بِعَضِّ أَلْسِنَتِكُمْ أَوْ تَتَوَقَّعُونَ** (الرعد: ۴۱) اگر ہمارے علماء اس جگہ بھی تَوَقَّع کے معنے یہی لیتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں تو ہمیں ان پر کچھ بھی افسوس نہ ہوتا مگر ان کی بے باکی اور گستاخی تو دیکھو کہ تَوَقَّع کا لفظ جہاں کہیں قرآن کریم میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے تو اس کے معنے وفات کے لیتے ہیں اور پھر جب وہی لفظ حضرت مسیح کے حق میں آتا ہے تو اس کے معنے زندہ اٹھائے جانے کے بیان کرتے ہیں اور کوئی ان میں سے نہیں دیکھتا کہ لفظ تو ایک ہی ہے، اندھے کی طرح ایک دوسرے کی بات کو مانتے جاتے ہیں۔ جس لفظ کو خدا تعالیٰ نے پچیس<sup>۲</sup> مرتبہ اپنی کتاب قرآن کریم میں بیان کر کے صاف طور پر کھول دیا کہ اس کے معنی روح کا قبض کرنا ہے نہ اور کچھ۔ اب تک یہ لوگ اس لفظ کے معنی مسیح کے حق میں کچھ اور کے اور کر جاتے ہیں گویا تمام جہاں کیلئے تَوَقَّع کے معنے تو قبض روح ہی ہیں مگر حضرت ابن مریم کے لئے زندہ اٹھالینا اس کے معنی ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۴۳)

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کی خبر دی ہے اور سارا قرآن کریم اسی خبر سے بھرا پڑا ہے۔ اے مخاطب! تو مسیح کی حیات ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید میں ایک حرف یا ایک لفظ بھی نہیں پائے گا اور تیرے لیے قرآن مجید میں حضرت مسیح کا یہ قول کافی ہے: **وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۗ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ مِنَ الرَّقِيبِ عَلَيْهِمْ ۗ** پس دیکھو کہ اس جگہ سے کیسے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مسیح وفات پا چکے ہیں اور گزر چکے ہیں کیونکہ اگر حضرت مسیح کا نزول اور آپ کا دوبارہ اس دنیا میں آنا مقدر ہوتا تو مسیح اپنے مذکورہ بالا قول میں دو شہادتوں کا ذکر کرتے اور اپنے قول **وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا** کے ساتھ یہ بھی کہتے کہ **أَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّرَّةً أُخْرَىٰ** یعنی میں دوبارہ

**أَلَا يَرَوْنَ أَنَّ اللَّهَ أَخْبَرَ مِنْ وِفَاةِ الْمَسِيحِ فِي مَقَامَاتٍ شَتَّىٰ ۖ وَالْقُرْآنُ كُلُّهُ مَعْلُومٌ مِنْ ذَلِكَ وَلَا تَجِدُ فِيهِ لِإِثْبَاتِ حَيَاتِهِ حَرْفًا أَوْ لَفْظًا ۖ وَمَنَّاكَ قَوْلُ الْمَسِيحِ فِي الْقُرْآنِ: وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۗ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ مِنَ الرَّقِيبِ عَلَيْهِمْ ۗ فَاَنْظُرْ كَيْفَ يَثْبُتُ مِنْ هَهُنَا أَنَّ الْمَسِيحَ تَوَفَّىٰ وَ خَلَا ۖ وَ لَوْ كَانَ نَزُولُ الْمَسِيحِ وَ حَيَاتُهُ مُقَدَّرًا ثَانِيًا لَدَكَرَ الْمَسِيحُ فِي قَوْلِهِ شَهَادَتَيْنِ وَ لَقَالَ مَعَ قَوْلِهِ: كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۗ وَأَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّرَّةً أُخْرَىٰ ۖ وَ مَا حَصَرَ**

فی الشَّهَادَةِ الْأُولَى۔  
(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۴۳۲، ۴۳۳) | آکر بھی ان پر گواہ ہوں گا اور صرف پہلی گواہی پر  
حصرنہ کرتے۔ (ترجمہ از مرتب)

یاد رہے کہ قرآن کریم میں ایک جگہ رسل کے لفظ کے ساتھ بھی مسیح موعود کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ سوال کہ ان ہی الفاظ کے ساتھ جو احادیث میں آئے ہیں کیوں قرآن میں ذکر نہیں کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ تا پڑھنے والوں کو دھوکا نہ لگ جاوے کہ مسیح موعود سے مراد درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں جن پر انجیل نازل ہوئی تھی اور ایسا ہی دجال سے کوئی خاص مفسد مراد ہے، سو خدا تعالیٰ نے فرقان حمید میں ان تمام شبہات کو دور کر دیا۔ اس طرح پر کہ اول نہایت تصریح اور توضیح سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کی خبر دی جیسا کہ آیت: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ سے ظاہر ہے اور پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا بھی ظاہر کر دیا جیسا کہ فرمایا: وَلَٰكِنْ دَسُّوا اللَّهَ وَخَاتَمَهُ النَّبِيِّينَ (الاحزاب: ۴۱) اور پھر یہودیوں کی بہت سی نافرمانیاں جا بجا ذکر کر کے متواتر طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ آخری حالت عام مسلمانوں اور مسلمانوں کے علماء کی یہی ہو جائے گی اور پھر ذکر کیا کہ آخری زمانہ میں غلبہ نصاریٰ کا ہوگا اور ان کے ہاتھ سے طرح طرح کے فساد پھیلیں گے اور ہر طرف سے امواج فتنن اٹھیں گی اور وہ ہر یک بلندی سے دوڑیں گی۔

إِنَّ اللَّهَ صَوَّحَ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ بِأَنَّ  
الْمُتَنَصِّرِينَ مَا أَشْرَكُوا وَمَا ضَلُّوا إِلَّا بَعْدَ وِفَاةِ  
الْمَسِيحِ كَمَا يُفْهَمُ مِنْ آيَةِ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي  
كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ فَلَوْ لَمْ يُتَوَفَّ  
الْمَسِيحُ إِلَى هَذَا الزَّمَانِ لَلَزَمَ مِنْ هَذَا أَنْ  
يَكُونُ الْمُتَنَصِّرُونَ عَلَى الْحَقِّ إِلَى هَذَا الْوَقْتِ  
وَيَكُونُوا مُؤْمِنِينَ مُؤْمِنِينَ۔

خدا نے تعالیٰ نے قرآن میں تصریح کر دی ہے  
کہ نصاریٰ مسیح کی وفات کے بعد ہی مشرک بنے  
ہیں جیسا کہ اس آیت سے سمجھا جاتا ہے پس جبکہ تو  
نے مجھے ماریا تو پھر تو ہی ان کا نگہبان تھا پس اگر  
مسیح نے اب تک وفات نہیں پائی تو لازم آئے گا  
کہ نصاریٰ اب تک حق پر ہیں اور مومن اور موحد  
بھی ہیں۔

يَا حَسْرَةً عَلَيْهِمْ! لِمَ لَا يَتَفَكَّرُونَ فِي هَذِهِ  
الآيَاتِ؟ أَلَيْسَ فِيهِمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ وَفَهِيمٌ  
وَأَمِينٌ؟ وَأَنْتَ تَعَلَّمُ إِنَّ آيَةَ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي قَدْ

ان پر افسوس! یہ کیوں ان آیتوں میں فکر نہیں  
کرتے کیا ان میں کوئی بھی رشید اور فہیم اور امین  
نہیں ہے اور تم بخوبی جانتے ہو کہ بڑی وضاحت

سے یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ نصاریٰ کا گمراہ ہونا اور ایک بندہ کو خدا بنانا مسیح کی وفات سے مشروط ہے اور اس سے وہی انکار کر سکتا ہے جو اپنی بے تمیزی سے حق کا دشمن اور مکابرہ کو استعمال میں لائے اور دیدہ و دانستہ ہدایت یاب ہونے سے انکار کرے اور جب ان کو کہا جاتا ہے جس طرح کہ خدا نے اپنی کتاب میں کھلے طور پر بیان کیا ہے کہ مسیح فوت ہو گیا اور ان کی وفات کے بعد نصاریٰ گمراہ ہوئے نہ ان کی حین حیات میں تم بھی مان لو تو کہتے ہیں کیا ہم ایسے معنی مان لیں جو احادیث کے مخالف ہیں اور حال یہ ہے کہ پہلے خود لوگوں کو پڑھایا کرتے تھے کہ خبر واحد جب کتاب اللہ کے معارض ہو تو وہ خبر واحد رد کی جاتی ہے۔ جو لوگوں کو سناتے تھے اب خود بھول گئے اور عالم ہونے کے بعد جاہل ہو گئے اور ہم کسی حدیث میں نہیں پاتے کہ مسیح زندہ بجسم عنصری آسمان پر اٹھایا گیا بلکہ بخاری اور طبرانی وغیرہما (میں) مسیح کی موت ہی کا ذکر پاتے ہیں اور جس کو شک ہے ان کتابوں کا مطالعہ کر لے۔

(ترجمہ از مرتب)

اسی طرح ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے مسیح کی وفات کی خبر دی ہے چنانچہ فرمایا کہ جب میرا خدا میری امت کے فساد کی بابت مجھ سے دریافت فرمائے گا تو میں عرض کروں گا کہ جب تو نے مجھے مار دیا تو پھر تو

دَلَّتْ بِدَلَالَةٍ صَرِيحَةٍ وَأَخْبَتِ بِيْنَتِهِ عَلَى أَنْ ضَلَالَةَ النَّصَارَى وَاتِّخَاذَهُمُ الْعَبْدِ الْهَذَا مَشْرُوطَةً بِوَفَاةِ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَلَا يُنْكِرُهُ إِلَّا مَنْ عَانَدَ الْحَقَّ بِسُوءٍ تَمَيُّزِهِ وَاسْتَعْمَلَ الْمُكَابِرَةَ وَالتَّحَكُّمَ بِجَهْلِهِ وَحَقِّقَهُ، وَأَبَى مَتَعَبِدًا مِّنْ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُهْتَدِينَ. وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا صَرَّحَ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ مِنْ وَفَاةِ الْمَسِيحِ وَضَلَالَةِ النَّصَارَى بَعْدَ وَفَاتِهِ لَا فِي زَمَنِ حَيَاتِهِ، قَالُوا أَنُؤْمِنُ بِمَعَانِي نُخَالِفِ الْأَحَادِيثَ؟ وَقَدْ كَانُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ أَنَّ الْخُبْرَ الْوَاحِدَ يُرَدُّ بِمَعَارِضَةِ كِتَابِ اللَّهِ، فَذَسُّوا مَا ذَكَرُوا النَّاسَ وَانْقَلَبُوا إِلَى الْجَهْلِ بَعْدَمَا كَانُوا عَالِمِينَ. وَمَا نَجِدُ فِي حَدِيثِ ذِكْرِ رَفْعِ الْمَسِيحِ حَيًّا بِجَسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ، بَلْ نَجِدُ ذِكْرَ وَفَاةِ الْمَسِيحِ فِي الْبُخَارِيِّ وَالطَّبْرَانِيِّ وَغَيْرِهِمَا مِنْ كُتُبِ الْحَدِيثِ، فَلْيَرْجِعْ إِلَى تِلْكَ الْكُتُبِ مَنْ كَانَ مِنَ الْمُرْتَابِينَ.

(حمامة البشیری، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۱۹۸ تا ۲۰۰)

وَكَذَلِكَ أَخْبَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ مَوْتِ عِيسَى فِي حَدِيثٍ آخَرَ وَقَالَ إِذَا سَأَلْتَنِي رَبِّي عَنْ فِسَادِ أُمَّتِي فَأَقُولُ فِي جَوَابِهِ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبُ

ہی ان پر نگہبان تھا جیسا کہ عبد صالح یعنی عیسیٰ نے مجھ سے پہلے عرض کی تھی۔ دیکھو! آنحضرتؐ نے مسیح کی وفات کی طرف کیا ہی عجیب اشارہ کیا ہے کہ اپنی ذات مبارکہ کے واسطے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کا جملہ ایسا ہی استعمال فرمایا ہے جیسا کہ مسیح نے اپنے لیے استعمال کیا تھا اور تم جانتے ہو کہ آنحضرتؐ تو وفات پا گئے ہیں اور آپ کی قبر مبارک مدینہ طیبہ میں موجود ہے پس جبکہ آنحضرتؐ نے مسیح کے واقعہ کو اپنے واقعہ سے مشابہ اور متحد کر دیا ہے تو اس سے آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں تَوَفَّى کے معنی بخوبی کھل گئے کہ بجز موت کے اور معنی نہیں اور جو معنی من گھڑت بنائے جاتے ہیں لغت عرب میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے (پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں) اور اگر جسم (سمیت) زندہ آسمان پر اٹھایا جانا اس کے معنی ہوتے تو اس سے لازم آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مع جسم عنصری زندہ آسمان پر اٹھائے جاتے کیونکہ آپ نے اپنی ذات مبارکہ کو عیسیٰ کے ساتھ لفظ تَوَفَّى میں شریک کیا ہے جو آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں ہے جیسا کہ بخاری کی حدیث میں آیا ہے اور اگر ہم اپنی طرف سے مسیح کے لیے آیت میں کوئی خاص معنی لے لیں اور کہیں کہ آنحضرتؐ کے حق میں تَوَفَّى کے معنی وفات ہیں اور عیسیٰ کے حق میں اس کے معنی جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھایا جانا اس کے معنی ہوتے تو اس سے لازم آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَيْهِمْ، كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ مِنْ قَبْلِ يَعْزِي عَيْسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ. فَانظُرْ كَيْفَ أَشَارَ إِلَى وَفَاةِ الْمَسِيحِ بِحَيْثُ اسْتَعْمَلَ لِنَفْسِهِ جُمْلَةً فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كَمَا اسْتَعْمَلَهُ الْمَسِيحُ لِنَفْسِهِ. وَأَنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ تَوَفَّى وَقَبُرُهُ الْمُبَارَكُ مَوْجُودٌ فِي الْمَدِينَةِ. فَانْكَشَفَ مَعْنَى التَّوَفَّى بِجَعْلِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاقِعَةً الْمَسِيحِ وَوَاقِعَةً نَفْسِهِ وَاقِعَةً وَاحِدَةً. وَظَهَرَ أَنَّ مَعْنَى التَّوَفَّى فِي آيَةِ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي الْإِمَاتَةُ لَا غَيْرَهَا مِنَ الْمَعَانِي الْمُنْحَوْتَةِ النَّبِيِّ لَا أَصْلَ لَهَا فِي لُغَةِ الْعَرَبِ. فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ مَاتَ. وَلَوْ كَانَ مَعْنَاهُ الرَّفْعُ إِلَى السَّمَاءِ حَيًّا مَعَ الْجِسْمِ الْعُنْصَرِيِّ كَمَا هُوَ زَعْمُ الْقَوْمِ لَرَفَعَ إِذَا نَبَيْتَنَا إِلَى السَّمَاءِ حَيًّا مَعَ الْجِسْمِ الْعُنْصَرِيِّ، فَإِنَّهُ جَعَلَ نَفْسَهُ شَرِيكَ عَيْسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي لَفْظِ التَّوَفَّى الَّذِي يُوجَدُ فِي آيَةِ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كَمَا جَاءَ فِي حَدِيثِ الْبُخَارِيِّ. وَلَوْ جَعَلْنَا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِنَا لِلْمَسِيحِ مَعْنَى خَاصًّا فِي هَذِهِ الْآيَةِ وَقُلْنَا إِنَّ التَّوَفَّى فِي حَقِّ رَسُولِنَا هُوَ الْوَفَاةُ. وَلَكِنْ فِي حَقِّ عَيْسَى أُرِيدَ مِنْهُ الرَّفْعُ مَعَ الْجِسْمِ

بھی مع جسم عنصری زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے ہیں اور یہ معنی عیسیٰ سے منحصر ہیں اور دوسرا کوئی ان میں شریک نہیں تو یہ سخت ظلم اور جھوٹ اور خیانت اور ترجیح بلا مرجح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عالی کا استخفاف ہے اور یہ ایک دعویٰ ہے جس پر نہ کوئی روشن دلیل ہے اور نہ کوئی چمکتی ہوئی حجت اور نہ کوئی بین شہادت ہے۔

(ترجمہ از مرتب)

ہاں! بعض احادیث میں عیسیٰ بن مریم کے نزول کا لفظ پایا جاتا ہے لیکن کسی حدیث میں یہ نہیں پایا گئے کہ اس کا نزول آسمان سے ہوگا بلکہ قرآن میں اس کی وفات کا ذکر موجود ہے اور جائز نہیں کہ یہ وفات نزول کے بعد ہو کیونکہ جن فتنوں کی طرف آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں اشارہ ہے ان کا روئے زمین پر ظہور اور غلبہ تو ایک لمبے زمانہ سے ہو چکا ہے اور جیسا خدا نے فرمایا ایسا ہی پورا ہو چکا ہے اور تو دیکھ رہا ہے کہ نصاریٰ نے اپنے لیے ایک خدا اور ابن اللہ گھڑ لیا ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي برحق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ قطعی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر دلالت کرتی ہے اور یہ کہ آپ وفات پا گئے ہیں اور ہم اس پر ایمان بھی لاتے ہیں اور تفاسیر کی کتب اس بیان سے بھری پڑی ہیں لیکن

الْعُنْصُرِي لَا شَرِيكَ لَهُ فِي هَذَا الْمَعْنَى،  
فَهَذَا ظَلْمٌ وَزُورٌ وَخِيَانَةٌ شَنِيعَةٌ،  
وَتَرْجِيحٌ بِلَا مَرْجِحٍ، وَاسْتِخْفَافٌ فِي شَأْنِ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَادِّعَاءٌ  
بِلَا دَلِيلٍ وَاصْخٍ وَحُجَّةٍ سَاطِعَةٍ وَبُزْهَانٍ  
مُبِينٍ.

(حسامۃ البشری، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۰۸، ۲۰۹ حاشیہ)

نَعَمْ، يُوجَدُ فِي بَعْضِ الْأَحَادِيثِ لَفْظُ  
نُزُولِ عَيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ، وَلَكِنْ لَنْ تَجِدَ فِي  
حَدِيثٍ ذِكْرَ نُزُولِهِ مِنَ السَّمَاءِ، بَلْ ذِكْرُ  
وَفَاتِهِ مَوْجُودٌ فِي الْقُرْآنِ، وَمَا جَازَ أَنْ  
يَكُونَ هَذَا التَّوْفِيقِيُّ بَعْدَ النُّزُولِ، لِأَنَّ الْفِتْنَ  
الَّتِي أُشِيرَ إِلَيْهَا فِي آيَةِ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي إِنَّمَا  
هَاجَتْ وَظَهَرَتْ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ مِنْ  
مُدَّةٍ طَوِيلَةٍ، وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ كَمَا قَالَ،  
وَتَرَى النَّصَارَى يَنْجِحُونَ لَهُمُ الْهَاءَ  
وَأَبْنَ إِلَهٍ.

(حسامۃ البشری، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۰۲)

وَقَالَ بَعْضُهُمْ أَنَّ آيَةَ: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي،  
حَقٌّ وَلَا شَكَّ أَنَّهَا يُدَلُّ عَلَى وَفَاةِ عَيْسَى  
بِدَلَالَةٍ قَطْعِيَّةٍ، وَأَنَّهُ مَاتَ وَإِنَّا نُوْمِنُ بِهِ،  
وَكُنْتُ التَّفْسِيرُ مَعْلُومًا مِنْ هَذَا الْبَيَانِ،  
وَلَكِنَّهُ مَا بَقِيَ مَبِينًا بَلْ بُعِثَ حَيًّا بَعْدَ

بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام مرنے کے بعد موت کی حالت میں باقی نہیں رہے تھے بلکہ تین دن یا سات گھنٹوں کے بعد دوبارہ زندہ کر دیئے گئے تھے پھر آسمان کی طرف بجد عنصری اٹھالیے گئے۔ پھر آپ آخری زمانہ میں زمین پر اتریں گے اور چالیس سال گزاریں گے۔ پھر دوبارہ وفات پائیں گے اور مدینہ کی زمین میں نبی کریم صلعم کی قبر میں دفن کیے جائیں گے۔ گویا ان کا حاصل کلام یہ ہے کہ تمام مخلوق کے لیے تو ایک ہی موت ہے لیکن مسیح علیہ السلام کے لیے دو موتیں ہیں۔ لیکن جب ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید پر غور کرتے ہیں تو اس قول کو اس کی نصوص بینہ کے خلاف پاتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں ایک ایسے مومن کی طرف سے حکایتاً بیان فرمایا ہے جو ان نعماء پر اپنے نفس کو قابل رشک قرار دیتا تھا۔ جو اسے ہمیشہ رہنے والی جنت اور عزت والے گھر میں موت کے بغیر ہمیشہ کے لیے دی گئیں۔ یقیناً یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ پس اے عزیز! دیکھ کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کس طرح پہلی موت کے بعد دوسری موت کے ناممکن ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہمیں موت کے بعد عالم ثانی میں ہمیشہ رہنے کی بشارت دی ہے پس تو انکار کرنے والوں میں سے نہ بن۔ (ترجمہ از مرتب)

ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَ سَاعَاتٍ، ثُمَّ رُفِعَ إِلَى السَّمَاءِ بِجَسَدِهِ الْعُنْصُرِيِّ، ثُمَّ يَنْزِلُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ عَلَى الْأَرْضِ وَيَمُكِّثُ أَرْبَعِينَ سَنَةً، ثُمَّ يَمُوتُ مَرَّةً ثَانِيَةً وَيُدفَنُ فِي أَرْضِ الْمَدِينَةِ فِي قَبْرِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. فَحَاصِلُ كَلَامِهِمْ أَنَّ لِلْخَلْقِ كُلِّهِمْ مَوْتٌ وَاحِدٌ وَلِلْمَسِيحِ مَوْتَيْنِ. وَلَكِنَّا إِذَا نَظَرْنَا فِي كِتَابِ اللَّهِ سُبْحَانَهُ فَوَجَدْنَا هَذَا الْقَوْلَ مُخَالِفًا لِنُصُوصِهِ الْبَيِّنَةِ. أَلَا تَرَى أَنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى قَالَ فِي كِتَابِهِ الْمُحْكَمِ حِكَايَةً عَنْ مُؤْمِنٍ مُغِيظًا نَفْسَهُ بِمَا أَعْطَاهُ اللَّهُ مِنَ الْخُلْدِ فِي الْجَنَّةِ وَالْإِقَامَةِ فِي دَارِ الْكِرَامَةِ بِلَا مَوْتٍ: أَمَّا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ إِلَّا مَوْتَنَا الْأَوَّلَى وَمَا نَحْنُ بِمُعَدِّيَيْنِ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ فَانظُرْ أَيُّهَا الْعَزِيزُ كَيْفَ أَشَارَ اللَّهُ تَعَالَى إِلَى امْتِنَاعِ الْمَوْتِ الثَّانِي بَعْدَ الْمَوْتِ الْأَوَّلَى، وَبَشَّرَنَا بِالْخُلُودِ فِي الْعَالَمِ الثَّانِي بَعْدَ الْمَوْتِ، فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُنْكَرِينَ.

(حجامة البشري، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۴۲)

بخاری کھول کر دیکھو اور پاک دل کے ساتھ اس آیت میں غور کرو کہ میں قیامت کے دن اسی طرح فَكَلِمًا تَوْقِيئِيٌّ کہوں گا جیسا کہ ایک عبد صالح یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا اور سوچو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلمہ لفظ تَوْقِيٌّ کے لئے کیسی ایک تفسیر لطیف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی تغیر اور تبدیل کے لفظ متنازعہ فیہ کا مصداق اپنے تئیں ایسا ٹھہرا لیا جیسا کہ آیت موصوفہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے مصداق تھے۔ اب کیا ہمیں جائز ہے کہ ہم یہ بات زبان پر لائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیت فَكَلِمًا تَوْقِيئِيٌّ کے حقیقی مصداق نہیں تھے اور حقیقی مصداق عیسیٰ علیہ السلام ہی تھے اور جو کچھ اس آیت سے درحقیقت خدا تعالیٰ کا منشاء تھا اور جو معنی تَوْقِيٌّ کے واقعی طور پر اس جگہ مراد الہی تھی اور قدیم سے وہ مراد علم الہی میں قرار پا چکی تھی یعنی زندہ آسمان پر اٹھائے جانا، نعوذ باللہ! اس خاص معنی میں آنحضرت صلعم شریک نہیں تھے بلکہ آنحضرت نے اس آیت کو اپنی طرف منسوب کرنے کے وقت اس کے معنوں میں تغیر و تبدیل کر دی ہے اور دراصل جب اس لفظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کریں تو اس کے اور معنی ہیں اور جب حضرت مسیح کی طرف یہ لفظ منسوب کریں تو پھر اس کے وہی حقیقی معنی لئے جاویں گے جو خدائے تعالیٰ کے قدیم ارادہ میں تھے۔ پس اگر یہی بات سچ ہے تو علاوہ اس فساد صریح کے کہ ایک نبی کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ ایک قرار دادہ معنوں کو توڑ کر ان میں ایک ایسا تصرف کرے کہ بجز تحریف معنوی کے اور کوئی دوسرا نام اس کا ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسرا فساد یہ ہے کہ جس اتحاد مقولہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا یعنی فَكَلِمًا تَوْقِيئِيٌّ کا وہ اتحاد بھی تو قائم نہ رہا کیونکہ اتحاد تو تب قائم رہتا کہ تَوْقِيٌّ کے معنوں میں آنحضرت اور حضرت عیسیٰ شریک ہو جائے مگر وہ شراکت تو میسر نہ آئی پھر اتحاد کس بات میں ہوا۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اور لفظ نہیں ملتا تھا جو آپ نے ناحق ایک ایسے اشتراک کی طرف ہاتھ پھیلا یا جس کا آپ کو کسی طرح سے حق نہیں پہنچتا تھا۔ بھلا زمین میں دفن ہونے والے اور آسمان پر زندہ اٹھائے جانے والے میں ایک ایسے لفظ میں کہ یا مرنے کے اور یا زندہ اٹھائے جانے کے معنی رکھتا ہے کیوں کر اشتراک ہو؟ کیا ضدین ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں؟ اور اگر آیت فَكَلِمًا تَوْقِيئِيٌّ میں تَوْقِيٌّ کے معنی مارنا نہیں تھا تو پھر کیا امام بخاری کی عقل ماری گئی کہ وہ اپنی صحیح میں اسی معنی کی تائید کے لئے ایک اور آیت دوسرے مقام سے اٹھا کر اس مقام میں لے آیا یعنی آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ اور پھر اسی پر بس نہ کیا بلکہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی اس جگہ جڑ دیا کہ مُتَوَفِّیْکَ : حمیتک یعنی مُتَوَفِّیْکَ کے یہ معنی ہیں کہ میں تجھے مارنے والا ہوں۔ اگر بخاری کا یہ مطلب نہیں

تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمثیلی معنوں کو ابن عباس کے صریح معنوں کے ساتھ زیادہ کھول دے تو ان دونوں آیتوں کو جمع کرنے اور ابن عباس کے معنوں کے ذکر سے کیا مطلب تھا اور کون سا محل تھا کہ توفی کے معنی کی بحث شروع کر دیتا۔ پس درحقیقت امام بخاری نے اس کا روائی سے توفی کے معنوں میں جو کچھ اپنا مذہب تھا ظاہر کر دیا۔ سو اس جگہ ہمارے تائید دعویٰ کے لئے تین چیزیں ہو گئیں؛ اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک کہ جیسے عبد صالح یعنی عیسیٰ نے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کہا۔ میں بھی فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کہوں گا، دوسرے ابن عباسؓ سے توفی کے لفظ کے معنی مارنا ہے، تیسرے امام بخاری کی شہادت جو اس کی عملی کارروائی سے ظاہر ہو رہی ہے۔

اگر مسیح کی وفات کے عقیدہ کی وجہ سے ہمیں کافر کہا جاتا ہے تو امام مالک کو بھی کافر بناؤ کہ ان کا عقیدہ بھی یہی تھا جس سے رجوع ثابت نہیں اور امام بخاری کا بھی یہی عقیدہ تھا اگر یہ عقیدہ نہ ہوتا تو کیوں وہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کی شرح کے وقت تائید حدیث کے لیے ابن عباس کا یہ قول لاتا مَتَوَفَّيْتِكَ : مُهِمَّتِكَ۔ پس اس حساب سے امام بخاری بھی کافر ہوئے اور یہی عقیدہ ابن قیم نے مدارج السالکین میں ظاہر کیا ہے۔

(انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۳۴)

صحیح بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ مُتَوَفَّيْتِكَ : مُهِمَّتِكَ اور اس کی تائید میں صاحب بخاری اسی محل میں ایک حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لایا ہے۔ پس جو معنی توفی کے ابن عباس اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام تنازعہ فیہ میں ثابت ہو چکے اس کے برخلاف کوئی اور معنی کرنا یہی ملحدانہ طریق ہے مسلمان کیلئے اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام تنازعہ فیہ میں یہی معنی کئے۔ پس بڑی بے ایمانی ہے جو نبی کریم کے معنوں کو ترک کر دیا جائے اور جبکہ اس جگہ توفی کے معنی قطعی طور پر وفات دینا ہی ہوا تو پھر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وفات آئندہ کے زمانہ میں ہوگی کیونکہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ صَافٍ بَلَّارٍ هِيَ ہے کہ وفات ہو چکی۔ وجہ یہ کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ جناب الہی میں عرض کرتے ہیں کہ عیسائی میری وفات کے بعد بگڑے ہیں۔ پھر اگر فرض کر لیں کہ اب تک حضرت عیسیٰ فوت نہیں ہوئے تو ساتھ ہی ماننا پڑے گا کہ اب تک عیسائی بھی نہیں بگڑے حالانکہ ان کم بختوں نے عاجز انسان کو خدا بنا دیا اور نہ صرف شرک کی نجاست کھائی بلکہ سو رکھانا، شراب پینا، زنا کرنا سب انہی لوگوں کے حصہ میں آ گیا۔ کیا کوئی دنیا میں بدی ہے جو ان میں پائی نہیں جاتی؟ کیا کوئی ایسا

بدکاری کا کام ہے جس میں یہ لوگ نہراول پر نہیں؟ پس صاف ظاہر ہے کچھ یہ لوگ بگڑ گئے اور شرک اور ناپاکیوں کا جذام ان کو کھا گیا اور اسلام کی عداوت نے ان کو تحت الشریٰ میں پہنچا دیا اور نہ صرف آپ ہی ہلاک ہوئے بلکہ ان کی ناپاک زندگی نے ہزاروں کو ہلاک کیا۔ (ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۸)

اور سب سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان لاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایمان نہیں لاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں کی پیروی کرتے ہیں لیکن حقیقتاً پیروی نہیں کرتے کیا وہ برتر کتاب قرآن کریم میں اس کو نہیں پڑھتے جو عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: اِذْ قَالَ اللَّهُ لِيُحْيِيَ اِنِّي مُتَوَقِّئُكَ اِسَى طرَح فرمایا فَلَمَّا تَوَقَّيْتَنِي اور یہ نہیں فرمایا کہ میں تمہیں دوبارہ زندہ کرنے والا ہوں۔ پس آپ کی صریح موت کے بعد حیات مسیح کا علم ان لوگوں کو کہاں سے ہوا۔ یہ لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ مسیح وفات یافتوں میں جاشامل ہوئے پھر باس ہمہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ فوت نہیں ہوئے۔ یہ ساری باتیں متناقض اور پایا اعتبار سے گری ہوئی ہیں ایسی باتیں صرف حواس باختہ اور عقل و قیاس سے محروم اور ہدایت یافتہ لوگوں کے طریق کو ترک کرنے والا ہی کہہ سکتا ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

کیا اُس نے آیت فَلَمَّا تَوَقَّيْتَنِي پر گہرے غور و فکر سے تدبر نہیں کیا؟ کیونکہ یہ تو اس پر نص صریح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گذشتہ زمانہ میں فوت ہو چکے نہ کہ وہ آئندہ کسی وقت فوت ہوں گے۔ درحقیقت یہ صیغہ زمانہ ماضی پر دلالت کرتا ہے اور علم صرف یہاں

وَالْعَجَبُ كُلُّ الْعَجَبِ اَتَمَّهُمْ يَقُولُونَ اِنَّا اٰمَنَّا بِآيَاتِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَيَقُولُوْنَ اِنَّا نَسْتَبِيعُ صُحُفَ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يَسْتَبِيعُوْنَ. اَلَا يَفْرٰؤُنَ فِى الْكِتَابِ الْاَعْلٰى مَا قَالَ اللّٰهُ فِى عِيسٰى اِذْ قَالَ: لِيُحْيِيَ اِنِّي مُتَوَقِّئُكَ ، وَقَالَ: فَلَمَّا تَوَقَّيْتَنِيْ، وَمَا قَالَ: اِنِّيْ مُحْيِيْكَ. فَمِنْ اَيْنَ عَلِمَ حَيٰةَ الْمَسِيْحِ بَعْدَ مَوْتِهِ الصَّرِيْحِ؟ يُؤْمِنُوْنَ بِاَنَّهُ لَفِى الْاَمْوَاتِ، ثُمَّ يَقُولُوْنَ مَا مَاتَ. تِلْكَ كَلِمَةٌ مُّتَهَافِتَةٌ مُّتَنَاقِضَةٌ. لَا يَنْطِقُ بِهَا اِلَّا الَّذِيْ ضَلَّتْ حَوَاشِيْهُ، وَغَرَبَ عَقْلُهُ وَقِيَاسُهُ، وَتَرَكَ طَرِيْقَ الْمُهْتَدِيْنَ.

(انجام آتم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۸۳)

اَمَّا تَدَبَّرْ اٰيَةَ فَلَمَّا تَوَقَّيْتَنِيْ بِالْفِكْرِ وَالْاِمْعَانِ؟ فَاِنَّهُ نَصُّ صَرِيْحٌ عَلَى اَنَّ عِيسٰى مَاتَ فِىْ سَابِقِ الزَّمَانِ، لَا اَنَّهُ يَمُوْتُ فِىْ حَيٰثِهِ مِنَ الْاَحْيَانِ، فَاِنَّ الصِّيْغَةَ تَدُلُّ عَلَى الزَّمَانِ الْمَاضِيْ،

قاضی کی طرح ہے۔ پھر اگر تم حکم صرف پر راضی نہیں اور ماضی کو حرف تبدیل کر کے مستقبل بناتے ہو تو یہ تم سے اور تم جیسے دوسروں سے ظلم کا ارتکاب ہے مزید برآں تمہاری بحث کا غلو تجھے کچھ فائدہ نہ دے گا اور تو اس پہلو سے بھی کاذبوں میں سے ہوگا۔ بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان آیات میں فرما رہے ہیں کہ میری قوم زندگی میں نہیں بلکہ میری موت کے بعد گمراہ ہوئی پس اگر تو عیسیٰ علیہ السلام کو اب تک آسمان میں زندہ خیال کرتا ہے تو تیرے لئے یہ تسلیم کرنا لازم ہوگا کہ نصاریٰ اس وقت تک حق پر قائم ہیں، گمراہ اور ہوس پرست نہیں ہیں۔ پس اے مسکین! کہاں پھر رہے ہو؟ تم پر براہین نے احاطہ کر رکھا ہے اور حق ظاہر ہو چکا جبکہ تو اسے تجاہل عارفانہ برتنے والوں کی طرح چھپا رہا ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

وَالصَّرْفُ لَهُمَا كَالْقَاضِي. ثُمَّ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَرْضَى بِحُكْمِ الصَّرْفِ، وَتَجْعَلُ الْمَاضِي اسْتِقْبَالًا يَتَبَدَّلُ الْحَرْفِ، فَهَذَا ظُلْمٌ مِّنْكُمْ وَمِنْ أُمَّتِكُمْ، وَمَعَ ذَلِكَ لَا يُفِيدُكُمْ غَلُو جِدَالِكُمْ، وَتَكُونُ فِي هَذَا أَيْضًا مِنَ الْكَاذِبِينَ. فَإِنَّ الْمَسِيحَ يَقُولُ فِي هَذِهِ الْآيَاتِ: إِنَّ قَوْمِي قَدْ صَلُّوا بَعْدَ مَوْتِي لَا فِي الْحَيَاةِ، فَإِنْ كُنْتُمْ تَحْسَبُ عَيْسَى حَيًّا إِلَى هَذَا الزَّمَانِ فِي السَّمَاءِ، فَلَزِمَكَ أَنْ تُقَرَّرَ بِأَنَّ النَّصَارَى قَائِمُونَ عَلَى الْحَقِّ إِلَى هَذَا الْعَصْرِ لَأَمِنْ أَهْلِ الضَّلَالَةِ وَالْهَوَاءِ. فَأَيُّنَ تَذْهَبُ يَا مَسْكِينِ، وَقَدْ أَحَاطَتْ عَلَيْكَ الْبَرَاهِينُ، وَظَهَرَ الْحَقُّ وَأَنْتَ تَكْتُمُهُ كَأَلْمَتِجَاهِلِينَ.

(انجام آہتم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۱۳۵، ۱۳۶)

قرآن شریف صاف کہتا ہے کہ مسیح وفات پا کر آسمان پر اٹھایا گیا ہے۔ لہذا اس کا نزول بروزی ہے نہ کہ حقیقی اور آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي میں صریح ظاہر کیا گیا ہے کہ واقعہ وفات حضرت عیسیٰ علیہ السلام وقوع میں آگیا کیونکہ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بگڑیں گے نہ کہ ان کی زندگی میں۔ پس اگر فرض کر لیں کہ اب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے تو ماننا پڑے گا کہ عیسائی بھی اب تک نہیں بگڑے اور یہ صریح باطل ہے بلکہ آیت تو بتلاتی ہے کہ عیسائی صرف مسیح کی زندگی تک حق پر قائم رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حواریوں کے عہد میں ہی خرابی شروع ہو گئی تھی۔ اگر حواریوں کا زمانہ بھی ایسا ہوتا کہ اس زمانہ میں بھی عیسائی حق پر قائم ہوتے تو خدا تعالیٰ اس آیت میں صرف مسیح کی زندگی کی قید نہ لگاتا بلکہ حواریوں کی زندگی کی بھی قید لگا دیتا۔ پس اس جگہ سے ایک نہایت عمدہ نکتہ عیسائیت کے زمانہ فساد کا معلوم

ہوتا ہے اور وہ یہ کہ درحقیقت حواریوں کے زمانہ میں ہی عیسائی مذہب میں شرک کی تخم ریزی ہو گئی تھی۔

(انجامِ آقثم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۳۲۱)

آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي صاف ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے ہیں اور صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور نیز حدیث نبوی سے اس بات کا ثبوت دے دیا ہے کہ اس جگہ تَوَفَّيْتَنِي کے معنی مار دینے کے ہیں اور یہ کہنا بیجا ہے کہ ”یہ لفظ تَوَفَّيْتَنِي جو ماضی کے صیغہ میں آیا ہے دراصل اس جگہ مضارع کے معنی دیتا ہے یعنی ابھی نہیں مرے بلکہ آخری زمانہ میں جا کر مرے گئے۔“ کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جناب الہی میں عرض کرتے ہیں کہ میری امت کے لوگ میری زندگی میں نہیں بگڑے بلکہ میری موت کے بعد بگڑے ہیں۔ پس اگر فرض کیا جائے کہ اب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اب تک نصاریٰ بھی نہیں بگڑے۔ کیونکہ آیت میں صاف طور پر بتلایا گیا کہ نصاریٰ کا بگڑنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد ہے اور اس سے زیادہ اور کوئی سخت بے ایمانی نہیں ہوگی کہ ایسی نص صریح سے انکار کیا جائے۔ (کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۲۱۹ حاشیہ)

صحابہ..... بلاشبہ بموجب آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي اس بات پر ایمان لاتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔ تبھی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اس بات کا احساس کر کے کہ بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات میں شک رکھتے ہیں زور سے یہ بیان کیا کہ کوئی بھی نبی زندہ نہیں ہے سب فوت ہو گئے اور یہ آیت پڑھی کہ: قَدْ خَلَّكَ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (ال عمران: ۱۴۵) اور کسی نے ان کے اس بیان پر انکار نہ کیا۔

(کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۲۲۰، ۲۲۱ حاشیہ)

خدا تعالیٰ نے چاہا کہ اپنے سچے نبی کے دامن کو اس تہمت سے پاک کرے اس لئے اس نے قرآن میں یہ ذکر کیا: وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ (النساء: ۱۵۸) اور یہ فرمایا: لِيُحْيِيَ اِنِّي مُتَوَقِّئُكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ (ال عمران: ۵۶) تا معلوم ہو کہ یہودی جھوٹے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور سچے نبیوں کی طرح رفع الی اللہ ہو گیا اور یہی وجہ ہے جو اس آیت میں یہ لفظ نہیں فرمائے گئے کہ رافعك الى السماء بلکہ یہ فرمایا گیا کہ رافعك الى تا صریح طور پر ہر ایک کو معلوم ہو کہ یہ رفع روحانی ہے نہ جسمانی کیونکہ خدا کی جناب جس کی طرف راستبازوں کا رفع ہوتا ہے روحانی ہے نہ جسمانی اور خدا کی طرف روح چڑھتے ہیں نہ کہ جسم۔

اور خدا تعالیٰ نے جو اس آیت میں توفیٰ کو پہلے رکھا اور رفع کو بعد تو اسی واسطے یہ ترتیب اختیار کی کہ تاہر ایک کو معلوم ہو کہ یہ وہ رفع ہے کہ جو راستبازوں کے لئے موت کے بعد ہوا کرتا ہے۔ ہمیں نہیں چاہیے کہ یہودیوں کی طرح تحریف کر کے یہ کہیں کہ دراصل توفیٰ کا لفظ بعد میں ہے اور رفع کا لفظ پہلے کیونکہ بغیر کسی محکم اور قطعی دلیل کے محض ظنون اور اوہام کی بنا پر قرآن کو الٹ پلٹ دینا ان لوگوں کا کام ہے جن کی روحمیں یہودیوں کی روحوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ پھر جس حالت میں آیت فَالْمَيِّتُ تَوَفِّيٰ بَدَنِهِ میں صاف طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ عیسائیوں کا تمام بگاڑ اور گمراہی حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد ہوئی ہے تو اب سوچنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ کو اب تک زندہ ماننے میں یہ اقرار بھی کرنا پڑتا ہے کہ اب تک عیسائی بھی گمراہ نہیں ہوئے اور یہ ایک ایسا خیال ہے جس سے ایمان جانے کا نہایت خطرہ ہے۔ (کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۲۴، ۲۵) میں جیسا کہ اور اختلافات میں فیصلہ کرنے کے لئے حکم ہوں ایسا ہی وفات حیات کے جھگڑے میں بھی میں حکم ہوں اور میں امام مالک اور ابن حزم اور معتزلہ کے قول کو مسیح کی وفات کے بارے میں صحیح قرار دیتا ہوں اور دوسرے اہل سنت کو غلطی کا مرتکب سمجھتا ہوں۔ سو میں بحیثیت حکم ہونے کے ان جھگڑا کرنے والوں میں یہ حکم صادر کرتا ہوں کہ نزول کے اجمالی معنوں میں یہ گروہ اہل سنت کا سچا ہے کیونکہ مسیح کا بروزی طور پر نزول ہونا ضروری تھا۔ ہاں! نزول کی کیفیت بیان کرنے میں ان لوگوں نے غلطی کھائی ہے۔ نزول صفت بروزی تھا نہ کہ حقیقی اور مسیح کی وفات کے مسئلہ میں معتزلہ اور امام مالک اور ابن حزم وغیرہ ہم کلام ان کے سچے ہیں کیونکہ بموجب نص صریح آیت کریمہ یعنی آیت فَالْمَيِّتُ تَوَفِّيٰ بَدَنِهِ کے مسیح کا عیسائیوں کے بگڑنے سے پہلے وفات پانا ضروری تھا۔ یہ میری طرف سے بطور حکم کے فیصلہ ہے۔ اب جو شخص میرے فیصلہ کو قبول نہیں کرتا وہ اس کو قبول نہیں کرتا جس نے مجھے حکم مقرر فرمایا ہے۔

(ضرورت الامام، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۴۹۵، ۴۹۶)

آیت فَالْمَيِّتُ تَوَفِّيٰ بَدَنِهِ نے صاف اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ عیسائی عقیدہ میں جس قدر بگاڑ اور فساد ہوا ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوا۔ اب اگر حضرت عیسیٰ کو زندہ مان لیں اور کہیں کہ اب تک وہ فوت نہیں ہوئے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ نصاریٰ نے بھی اب تک اپنے عقائد کو نہیں بگاڑا کیونکہ آیت موصوفہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نصاریٰ کے عقیدوں کا بگڑنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوگا۔ رہی یہ بات کہ توفیٰ کے اس جگہ کیا معنی ہیں؟ اس کا فیصلہ نہایت صفائی سے صحیح بخاری میں ہو گیا ہے

کہ توقی مارنے کو کہتے ہیں۔ یہ قول ابن عباسؓ ہے جس کو حدیث کَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ کے ساتھ بخاری میں اور بھی تقویت دی گئی ہے اور شارح عینی نے اس قول کا اسناد بیان کیا ہے۔ اب ایک تسلی ڈھونڈنے والا سمجھ سکتا ہے کہ قرآن شریف اور اس کتاب میں جو آصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللّٰهِ ہے صاف گواہی دی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو گئے اور اس شہادت میں صرف امام بخاری رضی اللہ عنہ متفرد نہیں بلکہ امام ابن حزم اور امام مالک رضی اللہ عنہما بھی موت عیسیٰ علیہ السلام کے قائل ہیں اور ان کا قائل ہونا گویا اُمت کے تمام اکابر کا قائل ہونا ہے کیونکہ اس زمانہ کے اکابر علماء سے مخالفت منقول نہیں اور اگر مخالفت کرتے تو البتہ کسی کتاب میں اُس کا ذکر ہوتا۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۲۶۹)

یہ جو کہا جاتا ہے کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ تو اس سے ہرگز نہیں سمجھا جاتا کہ مفہوم صلوة کا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت استعمال کیا گیا ہے وہ غیر اس مفہوم کا ہے جو حضرت ابراہیم کی نسبت استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا خیال کرنا تو سراسرا حماقت ہے۔ پس اسی طرح یہ بھی حماقت ہے کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ کُوْاْخِرْتُمْ صَلٰی اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کی طرف نسبت کر کے آنجناب کی وفات مراد لی جائے اور پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اسی آیت کو منسوب کریں تو اُن کی حیات مراد لی جائے تو یہ تشبیہ کیوں کر ٹھہری؟ یہ دونوں امر تو ایک دوسرے کے ضد واقع ہیں۔ اس سے زیادہ اور کوئی حماقت نہیں ہوگی کہ تشبیہ میں مخالفت اور منافات تلاش کی جائے؟ ہاں! جس فرق کا مشبہہ، مشبہ بہ میں باوجود اشتراک امر مشابہت کے ہونا ضروری ہے۔ اس جگہ وہ فرق اس طرح پر ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس بات کا جواب دینا تھا کہ اُن کے مرنے کے بعد اُن کی پرستش ہوئی اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا جواب دینا تھا کہ آپ کی وفات کے بعد بعض لوگ اسلام کی سنتوں اور راہوں پر قائم نہ رہے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی۔ اس اختلاف سے جو دو اُمتوں کی ضلالت میں پایا جاتا ہے مشبہہ اور مشبہ بہ کا فرق ظاہر ہو گیا اور یہی ہونا چاہیے تھا نہ یہ کہ مشبہہ اور مشبہ بہ ایک دوسرے کے نقیض ہوں جیسے مردہ اور زندہ اور بُردل اور شجاع۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۱۷، ۳۱۸)

خدا نے صریح لفظوں میں حضرت عیسیٰ کی وفات کو قرآن کریم میں ظاہر فرما دیا ہے۔ دیکھو کیسی یہ آیت یعنی فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ حضرت عیسیٰ کی وفات پر نص صریح ہے اور اب اس آیت کے سننے کے بعد اگر کوئی حضرت عیسیٰ کی وفات سے انکار کرتا ہے تو اُسے ماننا پڑتا ہے کہ عیسائی اپنے عقائد میں حق پر ہیں کیونکہ اس آیت کا

مطلب یہ ہے کہ عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد بگڑیں گے پھر جب کہ اس آیت سے موت ثابت ہوئی تو آسمان سے نازل کیوں کر ہوں گے؟ آسمان پر مردے تو نہیں رہ سکتے۔

(ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۲۴، ۳۲۵)

یقیناً اُس وقت عیسائیوں نے مسیح کی الوہیت کے لئے یہ حجت بھی پیش کی ہوگی کہ وہ زندہ آسمان پر موجود ہے لہذا اس کے رد میں خدا تعالیٰ کو خود مسیح کے اقرار کے حوالہ سے یہ کہنا پڑا: **فَلَمَّا تَوَقَّيْتُنِي كَذَبْتَ إِنَّتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ**۔

(ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۸۲ حاشیہ)

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام صاف اقرار کرتے ہیں کہ عیسائی میرے مرنے کے بعد بگڑے ہیں میری زندگی میں ہرگز نہیں بگڑے۔ پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب تک بجسمِ عنصری زندہ ہیں تو ماننا پڑے گا کہ عیسائی بھی اب تک اپنے سچے دین پر قائم ہیں اور یہ صریح باطل ہے۔

(تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۴۶۱ حاشیہ)

افسوس کہ قرآن شریف میں **فَلَمَّا تَوَقَّيْتُنِي** کی آیت پڑھتے ہو اور خوب جانتے ہو کہ سارے قرآن شریف میں ہر جگہ **تَوَقَّيْتُنِي** بمعنی قبض روح ہے اور ایسا ہی یقین رکھتے ہو کہ تمام حدیثوں میں بھی **تَوَقَّيْتُنِي** بمعنی قبض روح ہے اور پھر افترا کے طور پر کہتے ہو کہ اس جگہ پر **تَوَقَّيْتُنِي** بمعنی زندہ اٹھالینے کے ہیں۔ پس اگر تم اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا نہیں کرتے تو بتلاؤ اور پیش کرو کہ کس حدیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ مع جسمِ عنصری آسمان پر چلے گئے تھے۔ ہائے افسوس! اس قدر جھوٹ اور افترا۔

(تحفہ غزنیہ، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۵۶۲)

میں تو اب بھی ماننے کو تیار ہوں اگر آیت **فَلَمَّا تَوَقَّيْتُنِي** کے معنی بجز مارنے اور ہلاک کرنے کے کسی حدیث سے کچھ اور ثابت کر سکو یا کسی آیت یا حدیث سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مع جسمِ عنصری آسمان پر چڑھنا یا مع جسمِ عنصری آسمان سے اترا نا ثابت کر سکو یا اگر اخبارِ غیبیہ میں جو خدا تعالیٰ سے مجھ پر ظاہر ہوتی ہیں میرا مقابلہ کر سکو یا استجابت دعائیں میرا مقابلہ کر سکو یا تحریر زبانِ عربی میں میرا مقابلہ کر سکو یا اور آسمانی نشانوں میں جو مجھے عطا ہوئے ہیں میرا مقابلہ کر سکو تو میں جھوٹا ہوں۔

(تحفہ غزنیہ، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۵۴۳)

خود بخاری نے اسی مقام میں اس آیت یعنی **فَلَمَّا تَوَقَّيْتُنِي** کو بغرض تظاہر آیتین ذکر کر کے جتلا دیا ہے کہ یہی تفسیر **فَلَمَّا تَوَقَّيْتُنِي** کی ہے اور وہی استدلالِ قولِ ابن عباس کا اس جگہ صحیح ہے جیسا کہ **إِنِّي مُتَوَقِّئُكَ** میں صحیح

ہے اور نیز اس جگہ یہ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ جو اصدق الصادقین ہے اُس نے اپنی کلام میں صدق کو دو قسم قرار دیا ہے؛ ایک صدق باعتبار ظاہر الاقوال، دوسرے صدق باعتبار التاویل والمآل۔ پہلی قسم صدق کی مثال یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسیٰ مریم کا بیٹا تھا اور ابراہیم کے دو بیٹے تھے اسمعیل و اسحاق کیونکہ ظاہر واقعات بغیر تاویل کے یہی ہیں۔ دوسری قسم صدق کی مثال یہ ہے کہ جیسے قرآن شریف میں کفار یا گذشتہ مومنوں کے کلمات کچھ تصرف کر کے بیان فرمائے گئے ہیں اور پھر کہا گیا کہ یہ انہی کے کلمات ہیں اور یا جو قصے توریت کے ذکر کئے گئے ہیں اور ان میں بہت سا تصرف ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جس اعجازی طرز اور طریق اور فصیح فقروں اور دلچسپ استعارات میں قرآنی عبارات ہیں اس قسم کے فصیح فقرے کافروں کے منہ سے ہرگز نہیں نکلے تھے اور نہ یہ ترتیب تھی بلکہ یہ ترتیب قصوں کی جو قرآن میں ہے توریت میں بھی بالالتزام ہرگز نہیں ہے۔ حالانکہ فرمایا ہے إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَىٰ (الاعلیٰ: ۱۹، ۲۰) اور اگر یہ کلمات اپنی صورت اور ترتیب اور صیغوں کے رُو سے وہی ہیں جو مثلاً کافروں کے منہ سے نکلے تھے تو اس سے اعجاز قرآنی باطل ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ فصاحت کفار کی ہوئی نہ قرآن کی اور اگر وہی نہیں تو بقول تمہارے کذب لازم آتا ہے کیونکہ ان لوگوں نے تو اور اور لفظ اور اور ترتیب اور اور صیغے اختیار کئے تھے اور جس طرح مُتَوَفِّيكَ اور تَوَفِّيْتَنِي دو مختلف صیغے ہیں۔ اسی طرح صد ہا جگہ ان کے صیغے اور قرآنی صیغے باہم اختلاف رکھتے تھے مثلاً توریت میں ایک قصہ یوسف ہے نکال کر دیکھ لو اور پھر قرآن شریف کی سورہ یوسف سے اس کا مقابلہ کر تو دیکھو کہ کس قدر صیغوں میں اختلاف اور بیان میں کمی بیشی ہے بلکہ بعض جگہ بظاہر معنوں میں بھی اختلاف ہے۔ ایسا ہی قرآن نے بیان کیا ہے کہ ابراہیم کا باپ آزر تھا لیکن اکثر مفسر لکھتے ہیں کہ اس کا باپ کوئی اور تھا نہ آزر۔ اب اے نادان! جلد توبہ کر کہ تو نے پادریوں کی طرح قرآن پر بھی حملہ کر دیا۔ صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے کہ إِنَّهَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، اسی طرح جب ہم نے دیکھا کہ اس محل میں تمام احادیث کا مقصود مشترک یہ ہے کہ تَوَفِّيْتَنِي کے معنی ہیں اَمْتَنِي تو بصحت نیت اس کا ذکر کر دیا۔ اس طرز کے بیان کو جھوٹ سے کیا مناسبت اور جھوٹ کو اس سے کیا نسبت؟ کیا یہ سچ نہیں کہ امام بخاری کا مدعا اس فقرہ متَوَفِّيكَ: همیتك سے یہ ثابت کرنا ہے کہ لَمَّا تَوَفِّيْتَنِي کے معنی ہیں اَمْتَنِي اور اسی لئے وہ دو مختلف محل کی دو آیتیں ایک جگہ ذکر کر کے اور ایک دوسرے کو بطور نطا ہر قوت دے کر دکھلاتا ہے کہ ابن عباس کا یہ منشاء تھا کہ لَمَّا تَوَفِّيْتَنِي کے معنی ہیں اَمْتَنِي۔ اس لئے ہم نے بھی بطور تاویل اور مآل کے یہ کہہ دیا کہ حدیثوں کے

رُو سے لَبَّأ تَوْقَيْتَنِي کے معنی اَمْتَنِي ہے۔ بھلا اگر یہ صحیح نہیں ہے تو تو ہی بتلا کہ جبکہ متَوْقِيكَ کے معنی ہمیتک ہوئے تو اس قول ابن عباس کے رُو سے لَبَّأ تَوْقَيْتَنِي کے کیا معنی ہوئے؟ کیا ہمیں ضرور نہیں کہ ہم لَبَّأ تَوْقَيْتَنِي کے معنی ایسی حدیث کی رُو سے کریں جیسی کہ حدیث کے رُو سے متَوْقِيكَ کے معنی کئے گئے ہیں۔ اگر ہم اس بات کے مجاز ہیں کہ ایک ہی محل کی دو آیتوں کی تفسیر میں ایک آیت کی تفسیر کو بطور حجت پیش کر دیں تو اس میں کیا جھوٹ ہوا کہ ہم نے لکھ دیا کہ حدیث کے رُو سے لَبَّأ تَوْقَيْتَنِي کے معنی لَبَّأ اَمْتَنِي ہیں۔ جبکہ تَوْقِي کے ایک صیغہ میں حدیث کی رُو سے یہ مستفاد ہو چکا کہ اس کے معنی وفات دینا ہے تو وہی استدلال دوسرے صیغہ میں بھی جاری کرنا کیوں حدیثی استدلال سے باہر سمجھا جاتا ہے اور یہ کہنا کہ ہم اُسی قول کو حدیث کہیں گے جس کا اسناد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو یعنی وہ مرفوع متصل ہو، یہ اور جہالت ہے کیا جو منقطع حدیث ہو اور مرفوع متصل نہ ہو وہ حدیث نہیں کہلاتی؟ شیعہ مذہب کے امام اور محدث کسی حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچاتے تو کیا اُن اخبار کا نام احادیث نہیں رکھتے اور خود سنیوں کے محدثوں نے بعض اخبار کو موضوع کہہ کر پھر بھی اُن کا نام حدیث رکھا ہے اور حدیث کو کئی قسموں پر منقسم کر کے سب کا نام حدیث ہی رکھ دیا ہے۔ افسوس کہ تم لوگوں کی کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ اُن باتوں کا نام بھی جھوٹ رکھتے ہو جس طرز کو قرآن شریف نے اختیار کیا ہے اور محض شرارت سے خدا کی پاک کلام پر حملہ کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر مثلاً کوئی یہ کہے کہ میں نے پلاؤ کی ساری رکابی کھالی تو اُس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے جھوٹ بولا ہے اور جھوٹ یہ کہ اُس نے چاول کھائے ہیں رکابی کو توڑ کر تو نہیں کھایا اور جبکہ نصوص حدیثیہ کا استدلال کَلِمَتِ كَا فَا نَدَه بَخْشَا ہے تو یہ کہنا کہ حدیث کے رُو سے لَبَّأ تَوْقَيْتَنِي کے معنی لَبَّأ اَمْتَنِي ہیں یعنی اس بنا پر کہ متَوْقِيكَ: مُہْمِيْتِكَ آچکا ہے اس میں کون سا کذب اور دروغ ہے لیکن ایسے جاہل کو کون سمجھائے جو اپنی جہالت کے ساتھ تعصب کی زہر بھی مخلوط رکھتا ہے مگر غنیمت ہے کہ جیسا کہ یہ لوگ تین جھوٹ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں ایسا ہی تین جھوٹ میری طرف بھی منسوب کئے۔ ہم اس ابراہیمی مشابہت پر فخر کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کے جھوٹ اور افترا کو ان کے مُنہ پر مارتے ہیں۔

(تحفہ غزنی، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۵۶۸-۵۷۱)

ایماندار کے لئے صرف ایک آیت فَالَبَّأ تَوْقَيْتَنِي اس بات پر دلیل کافی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے کیونکہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کے تمہیں مقامات میں لفظ تَوْقِي کو قبض رُوح کے موقع پر

استعمال کیا۔ اول سے آخر تک قرآن شریف میں کسی جگہ لفظ تَوْفًی کا ایسا نہیں جس کے بجز قبض روح اور مارنے کے اور معنے ہوں اور پھر ثبوت پر ثبوت یہ کہ صحیح بخاری میں ابن عباس سے متوفیٰ کے معنے ہیتاک لکھے ہیں۔ ایسا ہی تفسیر فوز الکبیر میں بھی یہی معنے مندرج ہیں اور کتاب عینی تفسیر بخاری میں اس قول کا اسناد بیان کیا ہے۔ اب اس نص قطعی سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عیسائیوں کے بگڑنے سے پہلے ضرور مر چکے ہیں اور احادیث میں جہاں کہیں تَوْفًی کا لفظ کسی صیغہ میں آیا ہے اس کے معنے مارنا ہی آیا ہے جیسا کہ محدثین پر پوشیدہ نہیں اور علم لغت میں یہ مُسَلَّم اور مقبول اور متفق علیہ مسئلہ ہے کہ جہاں خدا فاعل اور انسان مفعول بہ ہے وہاں بجز مارنے کے اور کوئی معنے تَوْفًی کے نہیں آتے۔ تمام دو اور ابن عرب اس پر گواہ ہیں۔

(تحفہ گولڈویہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۹۰)

ہمارے علماء کا یہ خیال ہے کہ وہی مسیح عیسیٰ ابن مریم جس پر انجیل نازل ہوئی تھی آخری زمانہ میں آسمان پر سے نازل ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ قرآن شریف اس خیال کے مخالف ہے اور آیت: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كَذَّبَتْ آتَتِ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ... اور دوسری تمام آیتیں جن کا ہم اپنی کتابوں میں ذکر کر چکے ہیں اس امر پر قطعاً الدلالت ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں اور ان کی موت کا انکار قرآن سے انکار ہے۔

(تحفہ گولڈویہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۹۵)

قرآن شریف جو خدا کا کلام ہے اس کے نصوص صریحہ سے تو حضرت مسیح کی موت ہی ثابت ہوتی ہے کیونکہ خدا نے صاف لفظوں میں فرمادیا کہ وہ وفات پا چکا جیسا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي اس پر شاہد ہے۔ آپ لوگ خوب جانتے ہیں کہ تَوْفًی کے معنے بجز قبض روح کے اور کچھ نہیں۔ (اربعین، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۳۷۳، ۳۷۴) جیسا کہ لغت میں تَوْفًی کے معنے جہاں خدا فاعل اور انسان مفعول بہ ہو بجز مارنے کے اور کچھ نہیں ایسا ہی قرآن شریف میں اول سے آخر تک تَوْفًی کا لفظ صرف مارنے اور قبض روح پر ہی استعمال ہوا ہے۔ بجز اس کے سارے قرآن میں اور کوئی معنے نہیں۔

یہ آیت تو صاف دلالت کرتی ہے کہ وہ عیسائیوں کے بگڑنے سے پہلے مر چکے ہیں غرض اگر آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے یہ معنی ہیں کہ مع جسم زندہ عیسیٰ کو آسمان پر اٹھالیا تو کیوں خدا نے ایسے شخص کی موت کا سارے قرآن میں ذکر نہیں کیا جس کی زندگی کے خیال نے لاکھوں کو ہلاک کر دیا گیا تو خدا نے اس کو ہمیشہ کے لئے اس لئے زندہ رہنے دیا کہ تا لوگ مشرک اور بے دین ہو جائیں اور گویا یہ لوگوں کی غلطی نہیں بلکہ خدا نے یہ سب کچھ خود کیا تا لوگوں کو گمراہ کرے۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۱۶، ۱۷)

اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر دنیا میں نہیں آئیں گے کیونکہ اگر وہ دنیا میں آنے والے ہوتے تو اس صورت میں یہ جواب حضرت عیسیٰ کا محض جھوٹ ٹھہرتا ہے کہ مجھے عیسائیوں کے بگڑنے کی کچھ خبر نہیں جو شخص دوبارہ دنیا میں آیا اور چالیس برس رہا اور کروڑ ہا عیسائیوں کو دیکھا جو اس کو خدا جانتے تھے اور صلیب توڑا اور تمام عیسائیوں کو مسلمان کیا وہ کیوں کر قیامت کو جناب الہی میں یہ عذر کر سکتا ہے کہ مجھے عیسائیوں کے بگڑنے کی کچھ خبر نہیں۔ (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۱۶ حاشیہ)

یاد رکھو کہ اب عیسیٰ تو ہرگز نازل نہیں ہوگا کیونکہ جو اقرار اُس نے آیت فَكَلِمَا تَوْفِيقِي تَنبِيءِ کے رو سے قیامت کے دن کرنا ہے اس میں صفائی سے اُس کا اعتراف پایا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ دنیا میں نہیں آئے گا اور قیامت کو اس کا یہی عذر ہے کہ عیسائیوں کے بگڑنے کی مجھے خبر نہیں اور اگر وہ قیامت کے پہلے دنیا میں آتا تو کیا وہ یہی جواب دیتا کہ مجھے عیسائیوں کے بگڑنے کی کچھ خبر نہیں۔ لہذا اس آیت میں اُس نے صاف اقرار کیا ہے کہ میں دوبارہ دنیا میں نہیں گیا اور اگر وہ قیامت سے پہلے دنیا میں آنے والا تھا اور برابر چالیس برس رہنے والا تب تو اُس نے خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹ بولا کہ مجھے عیسائیوں کے حالات کی کچھ خبر نہیں اس کو تو کہنا چاہئے تھا کہ آمد ثانی کے وقت میں نے چالیس برس کروڑ کے قریب دنیا میں عیسائی پایا اور اُن سب کو دیکھا اور مجھے ان کے بگڑنے کی خوب خبر ہے اور میں تو انعام کے لائق ہوں کہ تمام عیسائیوں کو مسلمان کیا اور صلیبوں کو توڑا، یہ کیسا جھوٹ ہے کہ عیسیٰ کہے گا کہ مجھے خبر نہیں۔ غرض اس آیت میں نہایت صفائی سے مسیح کا اقرار ہے کہ وہ دوبارہ دنیا میں نہیں آئے گا اور یہی سچ ہے کہ مسیح فوت ہو چکا اور سرینگر محلہ خانیاں میں اُس کی قبر ہے۔ اب خدا خود نازل ہوگا اور ان لوگوں سے آپ لڑے گا جو سچائی سے لڑتے ہیں۔ خدا کا لڑنا قابل اعتراض نہیں کیونکہ وہ نشانوں کے رنگ میں ہے لیکن انسان کا لڑنا قابل اعتراض ہے کیونکہ وہ جبر کے رنگ میں ہے۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۷۶)

کیا تم مجھ کو جھٹلاتے ہو حالانکہ نہ تم میرے پاس آتے ہو اور نہ	اَنْتُمْ كَذِبُونَ وَلَا تَجِئُونَنِي
مجھ سے پوچھتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کس طرح فوت ہو گئے ہیں	وَلَا تَسْأَلُونَ اِنَّ عَيْسَى مَاتَ وَلَا
حالانکہ وہ تمہارے زندہ قرار دینے سے زندہ نہیں ہو سکتے پس	يَجِيئِي بِاحْيَاءٍ كُمْ فَلَا تُكْذِبُوا
اے جرات کرنے والو! تم قرآن مجید کی تکذیب نہ کرو۔ اگر مسیح	الْقُرْآنَ اِيَّهَا الْمَجْتَرُونَ. وَاِنَّ
قیامت سے قبل آسمان سے نازل ہونے والے ہوتے جیسا کہ تم	كَانَ نَازِلًا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ

خیال کرتے ہو تو پھر جب ان سے عیسائیوں کی گمراہی کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے انکار کیوں کیا اور کیوں عدم علم کا عذر کیا جیسا کہ تم قرآن مجید میں پڑھتے ہو اور یہ نہ کہا کہ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے میرے بعد کیا کیا بدعتیں اختیار کیں کیونکہ میں دنیا میں واپس گیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ وہ کیا کرتے ہیں پس حق یہ تھا کہ آپ کہتے کہ اے میرے پروردگار! تیرے اذن سے دوبارہ دنیا میں گیا تھا اور ان میں چالیس سال رہا تھا۔ میں نے انہیں اپنی اور اپنی والدہ کی عبادت کرتے پایا اور وہ اس طریق پر مصر رہے۔ پس میں نے ان کی صلیبوں کو توڑا اور میں نے ان کے زمانہ کی اصلاح کی اور ان میں سے بہتوں کو قتل کیا پس وہ تضرع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہو گئے۔ پس اپنے عیسیٰ سے دریافت کرو کہ وہ قیامت کے دن کیوں جھوٹ بولیں گے اور اس طرح اس شہادت کو جو ان کے پاس تھی چھپائیں گے۔ گویا کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے۔ (ترجمہ از مرتب)

كَمَا تَزْعُمُونَ. فَلِمَ أَنْكَرْتُمْ لَنَا سُئِلَ  
عَنْ ضَلَالَةِ النَّصَارَى. وَاعْتَذَرَ بَعْدَهُ  
الْعِلْمُ كَمَا أَنْتُمْ تَدْرُسُونَ. وَلَمْ  
يَقُلْ إِنِّي أَعْلَمُ مَا أَحَدُتُوا بَعْدِي  
بِمَا رَدِدْتُ إِلَى الدُّنْيَا وَرَكَيْتُ مَا  
كَانُوا يَعْمَلُونَ. وَكَانَ الْحَقُّ أَنْ يَقُولَ  
رَبِّ إِنِّي رَجَعْتُ إِلَى الدُّنْيَا بِإِذْنِكَ  
وَلَبِثْتُ فِيهِمْ إِلَى أَرْبَعِينَ سَنَةً  
فَوَجَدْتُهُمْ يَعْبُدُونَنِي وَأُجِّ وَعَلَيْهِ  
يُصِرُّونَ. فَكَسَرْتُ صَلْبَانَهُمْ  
وَأَصْلَحْتُ زَمَانَهُمْ وَقَتَلْتُ كَثِيرًا  
مِنْهُمْ فَدَخَلُوا فِي دِينِ اللَّهِ وَهُمْ  
يَتَضَرَّعُونَ. فَاسْأَلُوا عِيسَى كَمْ  
لَهُ يَكْذِبُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيُخْفِي  
شَهَادَةً كَانَتْ عِنْدَهُ كَأَنَّهُ مِنَ الَّذِينَ  
لَا يَعْلَمُونَ.

(تحفة الندوة، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۸۹)

اللہ تعالیٰ قیامت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھے گا کہ کیا تو نے ہی کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے ماننا تو حضرت عیسیٰ جواب دیں گے کہ یا الہی! اگر میں نے ایسا کہا ہے تو تجھے معلوم ہوگا کیونکہ تیرے علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ میں نے تو صرف وہی کہا تھا جو تو نے فرمایا تھا پھر جبکہ تو نے مجھے وفات دے دی تو پھر صرف تو ہی ان کا نگہبان تھا مجھے ان کے حال کا کیا علم تھا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر یہ بات سچ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور چالیس برس دنیا میں ٹھہریں گے اور صلیب کو توڑیں گے اور عیسائیوں کے ساتھ لڑائیاں کریں گے تو وہ

قیامت کو خدائے تعالیٰ کے حضور میں کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ جب تو نے مجھے وفات دی تو اس کے بعد مجھے کیا علم ہے کہ عیسائیوں نے کون سی راہ اختیار کی۔ اگر وہ یہی جواب دیں گے کہ مجھے خبر نہیں تو ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی جھوٹا نہیں ہوگا کیونکہ جس شخص کو یہ علم ہے کہ وہ دنیا میں دوبارہ آیا تھا اور عیسائیوں کو دیکھا تھا کہ اس کو خدا سمجھ رہے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں اور ان سے لڑائیاں کیں اور پھر وہ خدا تعالیٰ کے روبرو انکار کرتا ہے کہ مجھے کچھ بھی خبر نہیں کہ میرے بعد انہوں نے کیا کیا اس سے زیادہ کاذب کون ٹھہر سکتا ہے۔ جواب صحیح تو یہ تھا کہ ہاں! میرے خداوند مجھے عیسائیوں کی گمراہی کی خوب خبر ہے کیونکہ میں دوبارہ دنیا میں جا کر چالیس برس تک وہاں رہا اور صلیب کو توڑا پس میرا کچھ گناہ نہیں ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مشرک ہیں تو میں اسی وقت ان کا دشمن ہو گیا بلکہ ایسی صورت میں کہ جبکہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام چالیس برس تک دنیا میں رہ چکے ہوں گے اور ان سب کو سزا دیں دی ہوں گی جو ان کو خدا سمجھتے تھے خدا تعالیٰ کا ایسا سوال ان سے ایک لغو سوال ہوگا کیونکہ جبکہ خدا تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہے کہ اُس شخص نے اپنے معبود ڈھرائے جانے کی اطلاع پا کر ایسے لوگوں کو خوب سزا دی تو پھر ایسا سوال کرنا اس کی شان سے بعید ہے۔ غرض جس قدر مسلمانوں کو خدا تعالیٰ نے یہ کھول کر سنا دیا ہے کہ عیسیٰ فوت ہو گیا ہے اور پھر دنیا میں نہیں آئے گا۔ ہاں اس کا مثیل آنا ضروری ہے۔ اگر اس قسم کی تصریح ملا کی نبی کے صحیفہ میں ہوتی تو یہود ہلاک نہ ہوتے پس بلاشبہ وہ لوگ یہود سے بدتر ہیں کہ جو اس قدر تصریحات خدا تعالیٰ کے پاک کلام میں پا کر پھر حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آنے کے منتظر ہیں۔

خدا تعالیٰ قیامت کو حضرت عیسیٰ سے پوچھے گا کہ کیا تو نے ہی یہ تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے ماننا اور ہماری پرستش کرنا اور وہ جواب دیں گے کہ اے میرے خدا! اگر میں نے ایسا کہا ہے تو تجھے معلوم ہوگا کیونکہ تو عالم الغیب ہے۔ میں نے تو وہی باتیں اُن کو کہیں جو تو نے مجھے فرمائیں یعنی یہ کہ خدا کو وحدہ لا شریک اور مجھے اس کا رسول مانو۔ میں اُس وقت تک اُن کے حالات کا علم رکھتا تھا جب تک کہ میں اُن میں تھا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تو اُن پر گواہ تھا۔ مجھے کیا خبر ہے کہ میرے بعد انہوں نے کیا کیا۔ اب ان آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ جواب دیں گے کہ جب تک میں زندہ تھا عیسائی لوگ بگڑے نہیں تھے اور جب میں مر گیا تو مجھے خبر نہیں کہ ان کا کیا حال ہوا۔ پس اگر مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب تک زندہ ہیں تو ساتھ ہی ماننا پڑے گا کہ عیسائی بھی اب تک بگڑے نہیں اور سچے مذہب

پر قائم ہیں۔ پھر ماسوا اس کے اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی وفات کے بعد اپنی بے خبری ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے میرے خدا! جب تُو نے مجھے وفات دے دی اُس وقت سے مجھے اپنی امت کا کچھ حال معلوم نہیں۔ پس اگر یہ بات صحیح مانی جائے کہ وہ قیامت سے پہلے دنیا میں آئیں گے اور مہدی کے ساتھ مل کر کافروں سے لڑائیاں کریں گے تو نعوذ باللہ! قرآن شریف کی یہ آیت غلط ٹھہرتی ہے۔ اور یا یہ ماننا پڑتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹ بولیں گے اور اس بات کو چھپائیں گے کہ وہ دوبارہ دنیا میں آئے تھے اور چالیس برس تک رہے تھے اور مہدی کے ساتھ مل کر عیسائیوں سے لڑائیاں کی تھیں۔ پس اگر کوئی قرآن شریف پر ایمان لانے والا ہو تو فقط اس ایک ہی آیت سے تمام وہ منصوبہ باطل ثابت ہوتا ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مہدی خونی پیدا ہوگا اور عیسیٰ اس کی مدد کے لئے آسمان سے آئے گا۔ بلاشبہ وہ شخص قرآن شریف کو چھوڑتا ہے جو ایسا اعتقاد رکھتا ہے۔

(لیکچر لاہور، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۹۶، ۱۹۷)

عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے وفات دے دی جیسا کہ خدا تعالیٰ کی صاف اور صریح آیت: **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الْوَقِيبَ عَلَيْهِمْ** اس پر شاہد ہے جس کے معنی آیات متعلقہ کے ساتھ یہ ہیں کہ خدا قیامت کو عیسیٰ سے پوچھے گا کہ کیا تو نے ہی اپنی امت کو یہ تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے مانو تو وہ جواب دیں گے کہ جب تک میں ان میں تھا تو اُن پر شاہد تھا اور اُن کا نگہبان تھا اور جب تُو نے مجھے وفات دے دی تو پھر مجھے کیا علم تھا کہ میرے بعد وہ کس ضلالت میں مبتلا ہوئے۔ اب اگر کوئی چاہے تو آیت **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي** کے یہ معنی کرے کہ جب تُو نے مجھے وفات دے دی اور چاہے تو اپنی ناحق کی ضد سے باز نہ آ کر یہ معنی کرے کہ جب تُو نے مع جسمِ عنصری مجھے آسمان پر اُٹھالیا۔ بہر حال اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے کیونکہ اگر وہ قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں آئے ہوتے اور صلیب توڑی ہوتی تو اس صورت میں ممکن نہیں کہ عیسیٰ جو خدا کا نبی تھا ایسا صریح جھوٹ خدا تعالیٰ کے روبرو قیامت کے دن بولے گا کہ مجھے کچھ بھی خبر نہیں کہ میرے بعد میری امت نے یہ فاسد عقیدہ اختیار کیا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا قرار دے دیا۔ کیا وہ شخص جو دوبارہ دنیا میں آوے اور چالیس برس دنیا میں رہے اور عیسائیوں سے لڑائیاں کرے، وہ نبی کہلا کر ایسا مکروہ جھوٹ بول سکتا ہے کہ مجھے کچھ بھی خبر نہیں؟ پس جب کہ یہ آیت حضرت عیسیٰ کو دوبارہ آنے سے روکتی ہے ورنہ وہ دروغ گو ٹھہرتے ہیں۔ تو اگر وہ مع جسمِ عنصری آسمان پر ہیں

اور بموجب تصریح اس آیت کے قیامت کے دن تک زمین پر نہیں اتریں گے تو کیا وہ آسمان پر ہی مریں گے اور آسمان میں ہی اُن کی قبر ہوگی لیکن آسمان پر مرنا آیت **فِيهَا تَمُوتُونَ** (الاعراف: ۲۶) کے برخلاف ہے۔ پس اس سے تو یہی ثابت ہوا کہ وہ آسمان پر مع جسم عنصری نہیں گئے بلکہ مر گئے اور جس حالت میں کتاب اللہ نے کمال تصریح سے یہ فیصلہ کر دیا تو پھر کتاب اللہ کی مخالفت کرنا اگر معصیت نہیں تو اور کیا ہے؟

(رسالہ الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴)

جو لوگ مسلمان کہلا کر حضرت عیسیٰؑ کو مع جسم عنصری آسمان پر پہنچاتے ہیں وہ قرآن شریف کے برخلاف ایک لغو بات منہ پر لاتے ہیں۔ قرآن شریف تو آیت **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي** میں حضرت عیسیٰؑ کی موت ظاہر کرتا ہے اور آیت: **قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا** (بنی اسرائیل: ۹۴) میں انسان کا مع جسم عنصری آسمان پر جانا ممنوع قرار دیتا ہے۔ پھر یہ کیسی جہالت ہے کہ کلام الہی کے مخالف عقیدہ رکھتے ہیں۔ توفیٰ کے یہ معنی کرنا کہ مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھائے جانا اس سے بڑھ کر کوئی جہالت نہیں ہوگی۔ اول تو کسی کتاب لغت میں توفیٰ کے یہ معنی نہیں لکھے کہ مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھایا جانا پھر ماسوا اس کے جبکہ آیت **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي** قیامت کے متعلق ہے یعنی قیامت کو حضرت عیسیٰؑ خدا تعالیٰ کو یہ جواب دیں گے تو اس سے لازم آتا ہے کہ قیامت تو آجائے گی مگر حضرت عیسیٰؑ نہیں مریں گے اور مرنے سے پہلے ہی مع جسم عنصری خدا کے سامنے پیش ہو جائیں گے قرآن شریف کی یہ تحریف کرنا یہودیوں سے بڑھ کر قدم ہے۔

(چشمہ مبسمی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۴۵ حاشیہ)

دوسرا گناہ ان لوگوں کا یہ ہے کہ قرآن شریف کی نص صریح کے برخلاف حضرت عیسیٰؑ کو زندہ تصور کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں صریح یہ آیت موجود ہے: **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ** اور اس آیت کے معنی یہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ جب کہ تو نے مع جسم عنصری مجھ کو آسمان پر اُٹھالیا۔ یہ عجیب لغت ہے جو حضرت عیسیٰؑ سے ہی خاص ہے۔ افسوس! اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جیسا کہ قرآن شریف میں تصریح ہے یہ سوال حضرت عیسیٰؑ سے قیامت کے دن ہوگا۔ پس ان معنوں سے جو لفظ **مَتَوَفَّيْتُكَ** کے کئے جاتے ہیں لازم آتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ تو فوت ہونے سے پہلے ہی قیامت کے دن اللہ جل شانہ کے سامنے حاضر ہو جائیں گے اور اگر کہو کہ آیت **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي** کے یہ معنی ہیں کہ جبکہ تو نے مجھ کو وفات دے دی تو پھر مجھ کو کیا خبر تھی کہ میرے مرنے کے بعد میری اُمت نے کیا طریق اختیار کیا تو یہ معنی بھی اُن کے عقیدہ کی رو سے غلط ٹھہرتے ہیں اور

دونوں معنوں کے رو سے خدا تعالیٰ عیسیٰؑ کو ایسے عذر باطل کا یہ جواب دے سکتا ہے کہ تو میرے سامنے جھوٹ کیوں بولتا ہے کہ مجھے کچھ بھی خبر نہیں کیونکہ تو دوبارہ دنیا میں گیا تھا اور دنیا میں چالیس برس تک رہا تھا اور نصاریٰ سے لڑائیاں کی تھیں اور صلیب کو توڑا تھا۔ ماسوا اس کے ان معنوں کے رو سے یہ لازم آتا ہے کہ جب تک حضرت عیسیٰؑ زندہ رہے عیسائی نہیں بگڑے بلکہ اُن کی موت کے بعد بگڑے پس اس سے تو ان لوگوں کو ماننا پڑتا ہے کہ عیسائی اب تک حق پر ہیں کیونکہ اب تک حضرت عیسیٰؑ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔

(چشمہ مسیحی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۸۲، ۳۸۳ حاشیہ)

مولوی ثناء اللہ صاحب.... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کڈا ب قرار دیتے ہیں تو اگر مجھے بھی کڈا ب کہیں تو ان پر کیا افسوس کرنا چاہئے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اس سوال پر کہ کیا تو نے ہی کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے مانا کرو، عیسیٰؑ نے جھوٹ بولا یعنی ایسا جواب دیا کہ سراسر جھوٹ تھا کیونکہ انہوں نے کہا کہ جب تک میں اپنی اُمّت میں تھا تو اُن پر گواہ تھا اور جب اُن نے وفات دے دی تو پھر تو اُن کا رقیب تھا، مجھے کیا معلوم کہ میرے پیچھے کیا ہوا؟ اور ظاہر ہے کہ اُس شخص سے زیادہ کون کڈا ب ہو سکتا ہے جو قیامت کے دن جب عدالت کے تخت پر خدا بیٹھے گا اُس کے سامنے جھوٹ بولے گا۔ کیا اس سے بدتر کوئی اور جھوٹ ہوگا کہ وہ شخص جو قیامت سے دوبارہ پہلے دنیا میں آئے گا اور چالیس برس دنیا میں رہے گا اور نصاریٰ کے ساتھ لڑائیاں کرے گا اور صلیب کو توڑے گا اور خزیروں کو قتل کرے گا اور تمام نصاریٰ کو مسلمان کر دے گا، وہی قیامت کو ان تمام واقعات سے انکار کر کے کہے گا کہ مجھے خبر نہیں کہ میرے بعد کیا ہوا اور اس طرح پر خدا کے سامنے جھوٹ بولے گا اور ظاہر کرے گا کہ مجھے اس وقت سے نصاریٰ کی حالت اور اُن کے مذہب کی کچھ بھی خبر نہیں جب سے اُن نے مجھے وفات دے دی۔ دیکھو یہ کیسا گندہ جھوٹ ہے اور پھر خدا کے سامنے، اس طور سے حضرت مسیح کڈا ب ٹھہرتے ہیں یا نہیں؟ قرآن شریف کھولو اور آیت **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كَوْآخِرْتِكُمْ أَفَرَأَيْتُ لَكُمْ إِذَا فُتِحُوا بَابُ الْجَنَّةِ وَأَنَّ الْآرْضَ كُلَّهَا نَارُ الْجَهَنَّمَ وَالْكُلُوبُ أَعْيُنُ النَّارِ تُبْصِرُ أَفَرَأَيْتُ لَكُمْ إِذَا فُتِحُوا بَابُ الْجَنَّةِ وَأَنَّ الْآرْضَ كُلَّهَا نَارُ الْجَهَنَّمَ وَالْكُلُوبُ أَعْيُنُ النَّارِ تُبْصِرُ أَفَرَأَيْتُ لَكُمْ إِذَا فُتِحُوا بَابُ الْجَنَّةِ وَأَنَّ الْآرْضَ كُلَّهَا نَارُ الْجَهَنَّمَ وَالْكُلُوبُ أَعْيُنُ النَّارِ تُبْصِرُ** اور پھر کہو کہ کیا تم نے عیسیٰ علیہ السلام کو کڈا ب قرار دیا یا نہیں۔

مگر اس پر کیا افسوس کریں کیونکہ آپ لوگوں کے نزدیک تو خدا بھی کاذب ہے، خدا تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی وفات آیت **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي** میں صاف طور پر بیان کر دی اور بتصریح حضرت عیسیٰؑ کا یہ عذر پیش کر دیا کہ میری وفات کے بعد یہ لوگ بگڑے ہیں۔ پس خدا سمجھا رہا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰؑ فوت نہیں ہوئے تو عیسائی بھی اب تک نہیں بگڑے کیونکہ عیسائیوں کا راہ راست پر رہنا صرف اُن کی حیات تک ہی وابستہ رکھا گیا تھا اور عیسائیوں کی ضلالت کی علامت حضرت عیسیٰؑ کی وفات پر ٹھہرائی گئی تھی۔ اب کہو اس صورت میں آپ کے

نزدیک خدا کیوں کر سچا ٹھہر سکتا ہے جس کا بیان باور نہیں کیا گیا۔

(عجاز احمدی، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶)

اللہ تعالیٰ کے فرمان یُعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ لِنَأْسٍ فِي جَوَابِهِ، أَصَدَقَ أَمْ كَذَبَ بِنَاءٍ عَلَى زَعْمِ قَوْمٍ يُرْجِعُونَهُ مِنْ سِوَايَ الْحَنَائِسِ؟ فَإِنَّهُ إِنْ كَانَ حَقًّا أَنْ يَرْجِعَ عِيسَى قَبْلَ يَوْمِ الْحُشْرِ وَالْقِيَامِ، وَيَكْسِرَ الصَّلِيبَ وَيُدْخَلَ النَّصَارَى فِي الْإِسْلَامِ، فَكَيْفَ يَقُولُ إِنِّي مَا أَعْلَمُ مَا صَنَعْتُ أُمَّتِي بَعْدَ رَفْعِي إِلَى السَّمَاءِ؟ وَكَيْفَ يَصِحُّ مِنْهُ هَذَا الْقَوْلُ مَعَ أَنَّهُ أَظْلَعَ عَلَى شُرَكَ النَّصَارَى بَعْدَ رُجُوعِهِ إِلَى الْعِبْرَاءِ، وَأَظْلَعَ عَلَى اخْتِزَائِهِمْ إِيَّاهُ وَأُمَّةِ الْهَيَبِ مِنَ الْأَهْوَاءِ؟ فَمَا هَذَا إِلَّا كَذِبًا فَاحِشًا وَتَرَكَ الْحَيَاءَ. وَالْعَجَبُ أَنَّهُ كَيْفَ لَا يَسْتَحِي مِنَ الْكُذِبِ الْعَظِيمِ، وَيَكْذِبُ بَيْنَ يَدَيِ الْخَبِيرِ الْعَلِيمِ! مَعَ أَنَّهُ قَدْ رَجَعَ إِلَى الدُّنْيَا وَقَتَلَ النَّصَارَى وَكَسَرَ الصَّلِيبَ وَقَتَلَ الْخَنُزَيْرَ بِالْحُسَامِ الْحَسِيمِ. وَمَا كَانَ مُكْثُ

اللہ تعالیٰ کے فرمان یُعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ لِنَأْسٍ فِي جَوَابِهِ، أَصَدَقَ أَمْ كَذَبَ بِنَاءٍ عَلَى زَعْمِ قَوْمٍ يُرْجِعُونَهُ مِنْ سِوَايَ الْحَنَائِسِ؟ فَإِنَّهُ إِنْ كَانَ حَقًّا أَنْ يَرْجِعَ عِيسَى قَبْلَ يَوْمِ الْحُشْرِ وَالْقِيَامِ، وَيَكْسِرَ الصَّلِيبَ وَيُدْخَلَ النَّصَارَى فِي الْإِسْلَامِ، فَكَيْفَ يَقُولُ إِنِّي مَا أَعْلَمُ مَا صَنَعْتُ أُمَّتِي بَعْدَ رَفْعِي إِلَى السَّمَاءِ؟ وَكَيْفَ يَصِحُّ مِنْهُ هَذَا الْقَوْلُ مَعَ أَنَّهُ أَظْلَعَ عَلَى شُرَكَ النَّصَارَى بَعْدَ رُجُوعِهِ إِلَى الْعِبْرَاءِ، وَأَظْلَعَ عَلَى اخْتِزَائِهِمْ إِيَّاهُ وَأُمَّةِ الْهَيَبِ مِنَ الْأَهْوَاءِ؟ فَمَا هَذَا إِلَّا كَذِبًا فَاحِشًا وَتَرَكَ الْحَيَاءَ. وَالْعَجَبُ أَنَّهُ كَيْفَ لَا يَسْتَحِي مِنَ الْكُذِبِ الْعَظِيمِ، وَيَكْذِبُ بَيْنَ يَدَيِ الْخَبِيرِ الْعَلِيمِ! مَعَ أَنَّهُ قَدْ رَجَعَ إِلَى الدُّنْيَا وَقَتَلَ النَّصَارَى وَكَسَرَ الصَّلِيبَ وَقَتَلَ الْخَنُزَيْرَ بِالْحُسَامِ الْحَسِيمِ. وَمَا كَانَ مُكْثُ

قیام صرف گھڑی بھر کا نہیں تھا جو بغیر کسی جگہ قیام کرنے کے ایک ملک سے دوسرے ملک کو چلا جاتا ہے اور عزم صمیم سے کسی امر کی تحقیق و تفتیش نہیں کر سکتا بلکہ آپ ان لوگوں میں چالیس برس تک رہے اور انہیں قتل کیا، قید کیا اور انہیں جبراً اسلام میں داخل کیا۔ پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میری قوم نے میرے بعد کیا کیا۔ پس ایسے مسیح اور اس کے ایسے جھوٹ سے تعجب پر تعجب ہے! کیا ہم یہ بھی ایمان رکھیں کہ وہ یوم حساب اور سزا کے کوڑے سے نہیں ڈرتے اور ایسا واضح طور پر جھوٹ بولتے ہیں جس سے ادنیٰ لوگ بھی نفرت کریں اور وہ ایسے جھوٹ پر راضی ہیں جس سے ایسے رذیل لوگ بھی ناک چڑھالیں جو گندگیوں میں ملوث ہوتے ہیں؟ کیا عقل کسی نبی کی شان میں جائز قرار دیتی ہے کہ وہ آسمان پر چڑھ جانے کے بعد دنیا میں واپس لوٹے اور اپنی قوم نصاریٰ کے شرک اور تثلیث کے عقیدہ کو اپنی آنکھوں سے کھلم کھلا مشاہدہ کرے پھر بھی اپنے رب کے حضور اس تمام واقعہ سے انکار کر دے اور کہہ دے کہ میں تو حقیر دنیا میں واپس نہیں گیا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ جب سے میں دوسرے آسمان کی طرف اٹھایا گیا میری قوم کا کیا حال ہوا؟ پس دیکھو کہ کون سا جھوٹ اس جھوٹ سے بڑا ہو سکتا ہے جس کے مرتکب مسیح علیہ السلام ہوں گے اور وہ بھی قیامت کے دن اور خدا تعالیٰ کے روبرو اور ایسا کرتے ہوئے وہ خدا تعالیٰ سے بھی نہیں ڈریں گے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جب قرآن نے

سَاعَةً كَعَرِيبٍ يَمُرُّ مِنْ أَرْضٍ بِأَرْضٍ  
غَيْرٍ مُّقِيمٍ، وَلَا يُفْتَشُّ بِالْعَزْمِ  
الصَّبِيْمِ، بَلْ لَيْتَ فِيهِمْ إِلَىٰ أَرْبَعِينَ  
سَنَةً، وَقَتْلَهُمْ وَأَسْرَهُمْ وَأَدْخَلَهُمْ  
جَدْرًا فِي الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيمِ. ثُمَّ يَقُولُ:  
لَا أَعْلَمُ مَا صَنَعُوا بَعْدِي، فَالْعَجَبُ كُلُّ  
الْعَجَبِ مِنْ هَذَا الْمَسِيحِ وَكَذِبِهِ  
الصَّرِيحِ! أَنْتُمْ بَأْتَهُ لَا يَخَافُ يَوْمَ  
الْحِسَابِ وَلَا سَوَاطِ الْعِقَابِ، وَيَكْذِبُ  
كَذِبًا فَاحِشًا يِعَافُهُ زَمْعُ النَّاسِ،  
وَيَرْضَىٰ بِزُورٍ يَأْتِي مِنْهُ الْأَرَاذِلُ  
الْمَلَوْتُونَ بِالْأَدْنَائِسِ؛ أَجْوَزُ الْعَقْلُ فِي  
شَأْنِ نَبِيِّ أَنَّهُ رَجَعَ إِلَى الدُّنْيَا بَعْدَ  
الصُّعُودِ إِلَى السَّمَاءِ، وَرَأَى قَوْمَهُ  
النَّصَارَىٰ وَشَرَّكَهُمْ وَتَثَلَيْتَهُمْ بِعَيْنِيهِ  
مِنْ غَيْرِ الْخَفَاءِ، ثُمَّ أَنْكَرَ أَمَامَ رَبِّهِ هَذِهِ  
الْقِصَّةَ. وَقَالَ: مَا رَجَعْتُ إِلَى الدُّنْيَا  
الدَّيْبِيَّةِ، وَلَا أَعْلَمُ مَا بَالُ قَوْمِي مُذْ  
رُفِعْتُ إِلَى السَّمَاءِ الثَّانِيَّةِ. فَانظُرُوا  
أَيُّ كَذِبٍ أَكْبَرُ مِنْ هَذَا الْكَذِبِ  
الَّذِي يَزْتَكِيهِ الْمَسِيحُ أَمَامَ عَيْنِ اللَّهِ فِي  
يَوْمِ الْحِسَابِ وَالْمَسْأَلَةِ، وَلَا يَخَافُ  
حَضْرَةَ رَبِّ الْعِزَّةِ. فَالْحَاصِلُ أَنَّهُ لَمَّا مَتَعَ

اس آیت میں جو قطعیت الدلالت ہے عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے اترنے کو رد کر دیا ہے تو یہ بات بغیر کسی شک کے معین طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنے والا مسیح یہود میں سے نہیں ہوگا بلکہ اسی امت میں سے ہوگا اور یہ ہو ہی کیسے سکتا ہے جبکہ یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ذلت وارد کی گئی اور اس ابدی سزا کے بعد وہ عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ (ترجمہ از مرتب)

الْقُرْآنُ نَزُولَ الْمَسِيحِ مِنَ السَّمَاءِ فِي الْآيَةِ الَّتِي هِيَ قَطْعِيَّةُ الدَّلَالَةِ، تَعَيَّنَ إِذَا مِّنْ غَيْرِ شَكٍّ أَنَّ الْمَسِيحَ الْمَوْعُودَ لَيْسَ مِنَ الْيَهُودِ بَلْ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ. وَكَيْفَ وَإِنَّ الْيَهُودَ صُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلِيلَةُ؛ فَهَمْ لَا يَسْتَحِقُّونَ الْعِزَّةَ بَعْدَ الْعُقُوبَةِ الْأَبَدِيَّةِ.

(مواہب الرحمن، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۹۲ تا ۲۹۴)

اگر توفیق کے معنی مع جسم عصری آسمان پر اٹھانا تجویز کیا جائے تو یہ معنی تو بدیہی البطلان ہیں کیونکہ قرآن شریف کی انہی آیات سے ظاہر ہے کہ یہ سوال حضرت عیسیٰ سے قیامت کے دن ہوگا۔ پس اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ موت سے پہلے اس رفع جسمانی کی حالت میں ہی خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہو جائیں گے اور پھر کبھی نہیں مریں گے کیونکہ قیامت کے بعد موت نہیں اور ایسا خیال بے ادبیت باطل ہے۔

علاوہ اس کے قیامت کے دن یہ جواب اُن کا کہ اُس روز سے کہ میں مع جسم عصری آسمان پر اٹھایا گیا مجھے معلوم نہیں کہ میرے بعد میری اُمت کا کیا حال ہوا۔ یہ اس عقیدہ کی رُو سے صریح دروغ بے فروغ ٹھہرتا ہے جبکہ یہ تجویز کیا جائے کہ وہ قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں آئیں گے کیونکہ جو شخص دوبارہ دنیا میں آوے اور اپنی اُمت کی مُشرکانه حالت کو دیکھ لے بلکہ اُن سے لڑائیاں کرے اور اُن کی صلیب توڑے اور اُن کے خنزیر کو قتل کرے وہ کیوں کر قیامت کے روز کہہ سکتا ہے کہ مجھے اپنی اُمت کی کچھ بھی خبر نہیں۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۳۳)

قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت صاف فرمایا ہے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے بطور حکایت ذکر کر کے فرماتا ہے: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ، یعنی قیامت کو خدا تعالیٰ عیسیٰ سے پوچھے گا کہ کیا تو نے اپنی قوم کو یہ تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے مانا کرو تو وہ جواب دیں گے کہ جب تک میں اپنی قوم میں تھا میں اُن کو یہی تعلیم دیتا رہا کہ خدا ایک ہے اور میں اس کا رسول ہوں اور پھر جب تو نے مجھ کو وفات دے دی تو بعد اُس کے مجھے اُن کے عقائد کا کچھ علم نہیں۔ اس

آیت میں حضرت عیسیٰ اپنی وفات کا صاف اقرار کرتے ہیں اور اس میں یہ بھی اقرار ہے کہ میں دنیا میں واپس نہیں گیا کیونکہ اگر وہ دنیا میں واپس آئے ہوتے تو پھر اس صورت میں قیامت کے دن یہ کہنا جھوٹ تھا کہ مجھے اپنی امت کی کچھ بھی خبر نہیں کہ میرے بعد انہوں نے کون سا طریق اختیار کیا کیونکہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے کہ وہ قیامت سے پہلے دنیا میں واپس آئیں گے اور عیسائیوں سے لڑائیاں کریں گے تو پھر قیامت کے دن انکار کر کے یہ کہنا کہ عیسائیوں کے بگڑنے کی مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں سراسر جھوٹ ہوگا۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْهُ!

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۲۹، ۲۳۰)

اس تمام آیت کے اول آخر کی آیتوں کے ساتھ یہ معنی ہیں کہ خدا قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہے گا کہ کیا تو نے ہی لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اپنا معبود ٹھہرانا تو وہ جواب دیں گے کہ جب تک میں اپنی قوم میں تھا تو میں اُن کے حالات سے مطلع تھا اور گواہ تھا پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو پھر تو ہی اُن کے حالات سے واقف تھا یعنی بعد وفات مجھے اُن کے حالات کی کچھ بھی خبر نہیں۔

اب اس آیت سے صریح طور پر دو باتیں ثابت ہوتی ہیں؛ (۱) اول یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس آیت میں اقرار کرتے ہیں کہ جب تک میں اُن میں تھا میں ان کا محافظ تھا اور وہ میرے روبرو بگڑے نہیں بلکہ میری وفات کے بعد بگڑے ہیں۔ پس اب اگر فرض کیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب تک آسمان پر زندہ ہیں تو ساتھ ہی اقرار کرنا پڑے گا کہ اب تک عیسائی بھی بگڑے نہیں کیونکہ اس آیت میں عیسائیوں کا بگڑنا آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كَايَكُنْتُمْ أَشْهُدًا عَلَىٰ آلِيكُمْ بِمَا نَعَمْتُمْ عَلَيْهِمُ فِي سَعْيِهِمْ وَنَعْمَ فِعْلُهُمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كَايَكُنْتُمْ أَشْهُدًا عَلَىٰ آلِيكُمْ بِمَا نَعَمْتُمْ عَلَيْهِمُ فِي سَعْيِهِمْ وَنَعْمَ فِعْلُهُمْ کی وفات پر موقوف رکھا گیا ہے۔ لیکن جبکہ ظاہر ہے کہ عیسائی بگڑ چکے ہیں تو ساتھ ہی ماننا پڑتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی فوت ہو چکے ہیں ورنہ تکذیب آیت قرآنی لازم آتی ہے، (۲) دوسرے یہ کہ آیت میں صریح طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عیسائیوں کے بگڑنے کی نسبت اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے اور کہیں گے کہ مجھے تو اُس وقت تک ان کے حالات کی نسبت علم تھا جبکہ میں اُن میں تھا اور پھر جب مجھے وفات دی گئی تب سے میں اُن کے حالات سے محض بے خبر ہوں مجھے معلوم نہیں کہ میرے پیچھے کیا ہوا؟ اب ظاہر ہے کہ یہ عذر اُن کا اس حالت میں کہ وہ قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں کسی وقت آئے ہوتے اور عیسائیوں کی ضلالت پر اطلاع پاتے، محض دروغ گوئی ٹھہرتا ہے اور اس کا جواب تو خدائے تعالیٰ کی طرف سے یہ ہونا چاہیے کہ اے گستاخ شخص! میرے روبرو اور میری عدالت میں کیوں جھوٹ بولتا ہے اور کیوں محض دروغ کے طور پر

کہتا ہے کہ مجھے اُن کے بگڑنے کی کچھ بھی خبر نہیں حالانکہ تجھے معلوم ہے کہ میں نے قیامت سے پہلے دوبارہ تجھے دنیا میں بھیجا تھا اور تو نے عیسائیوں سے لڑائیاں کی تھیں اور اُن کی صلیب توڑی تھی اور اُن کے خنزیر قتل کئے تھے اور پھر میرے روبرو اتنا جھوٹ کہ گویا تجھے کچھ بھی خبر نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے عقیدے میں کہ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں آئیں گے کس قدر ان کی ہتک ہے اور نعوذ باللہ! اس سے وہ دروغ گوٹھرتے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۵۱، ۵۲)

فَلَمَّا تَوَقَّعْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مجھے وفات دینے کے بعد تُو ہی اُن پر رقیب تھا اور کیا ان تمام آیات پر نظر ڈالنے سے صریح طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ خدا تعالیٰ کے سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ میں جب تک اپنی امت میں تھا میں اُن کے اعمال کا گواہ تھا اور اُن کے حالات کا علم رکھتا تھا پھر جب تُو نے مجھے وفات دے دی تو بعد اس کے تُو ہی اُن کا رقیب اور محافظ تھا۔ پس کیا ان آیات کا بدیہی طور پر یہ خاص مطلب نہیں ہے کہ میری امت میری زندگی میں نہیں بگڑی بلکہ میری وفات کے بعد بگڑی اور بعد وفات مجھے معلوم نہیں کہ ان کا کیا حال ہوا اور کیا مذہب اختیار کیا۔ پس خدا تعالیٰ کے اس کلام سے ظاہر ہے کہ اگر فرض کیا جائے کہ حضرت عیسیٰ اب تک زندہ ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ عیسائی بھی اب تک بگڑے نہیں اور سچے مذہب پر قائم ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ اپنی امت کا صراطِ مستقیم پر ہونا اپنی زندگی تک وابستہ کرتے ہیں اور اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ میں نے یہ تعلیم دی ہے کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے مانا کرو اور جناب الہی میں عرض کرتے ہیں کہ جب تک میں اپنی امت میں تھا میں نے وہی تعلیم اُن کو دی جس کی تُو نے مجھے ہدایت دی تھی اور جب تُو نے مجھے وفات دے دی تو بعد کے حالات کا مجھے کچھ علم نہیں اور ان آیات سے صاف طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے ورنہ لازم آتا ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹ بولیں گے کیونکہ اگر وہ قیامت سے پہلے دنیا میں دوبارہ آئے ہوتے تو اس صورت میں اُن کا یہ کہنا کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میری امت نے میرے بعد کیا عقیدہ اختیار کیا صریح جھوٹ ٹھہرتا ہے کیونکہ جو شخص دوبارہ دنیا میں آوے اور پشیم خود دیکھ جاوے کہ اس کی امت بگڑ چکی ہے اور نہ صرف ایک دن بلکہ برابر چالیس برس تک اُن کے کفر کی حالت دیکھتا رہے وہ کیوں کر قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے کہہ سکتا ہے کہ اپنی امت کی حالت سے محض بے خبر ہوں۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۸۲)

حضرت عیسیٰ کا خود اپنا ایک اقرار ہے جو ان کی وفات پر شاہد ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے اس سوال کے جواب میں کہ اے عیسیٰ! کیا تو نے ہی لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کر کے مانو؟ یہ جواب دیتے ہیں جو قرآن شریف میں مندرج ہے یعنی یہ آیت: وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۗ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۗ یعنی میں تو اس زمانہ تک ان پر گواہ تھا جب میں ان کے درمیان تھا اور جب تو نے مجھے وفات دے دی تو پھر ان کا محافظ تو ہی تھا۔ اس جواب میں حضرت عیسیٰ عیسانیوں کی ہدایت کو اپنی زندگی سے وابستہ کرتے ہیں۔ پس اگر حضرت عیسیٰ اب تک زندہ ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ عیسانی بھی حق پر ہیں اور اس آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ قبل از قیامت دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے ورنہ نعوذ باللہ! یہ لازم آتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹ بولیں گے کہ مجھے اپنی امت کے بگڑنے کی کچھ بھی اطلاع نہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۹۴ ۳۹۴ حاشیہ)

بعض نادان اس جگہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جس حالت میں قرآن شریف کی یہ آیت کہ: وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۗ اور آیت: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۗ صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حضور میں یہ عذر پیش کریں گے کہ میری وفات کے بعد لوگ بگڑے ہیں نہ میری زندگی میں تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے کہ حضرت عیسیٰ صلیب سے بچ کر کشمیر کی طرف چلے گئے تھے اور کشمیر میں ستا سٹی برس عمر بسر کی تھی تو پھر یہ کہنا کہ میری وفات کے بعد لوگ بگڑ گئے صحیح نہیں ہوگا بلکہ یہ کہنا چاہیے تھا کہ میرے کشمیر کے سفر کے بعد لوگ بگڑے ہیں کیونکہ وفات تو صلیب کے واقعہ سے ستا سٹی برس بعد ہوئی۔

پس یاد رہے کہ ایسا وسوسہ صرف قلت تدرّ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ورنہ کشمیر کا سفر اس فقرہ کی ضد نہیں کیونکہ مَا دُمْتُ فِيهِمْ کے یہ معنی ہیں کہ جب تک میں اپنی امت میں تھا جو میرے پر ایمان لائے تھے یہ معنی نہیں کہ جب تک میں ان کی زمین میں تھا کیونکہ ہم قبول کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ زمین شام میں سے ہجرت کر کے کشمیر کی طرف چلے گئے تھے مگر ہم یہ قبول نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ اور آپ کے حواری پیچھے رہ گئے تھے بلکہ تاریخ کی رو سے ثابت ہے کہ حواری بھی کچھ تو حضرت عیسیٰ کے ساتھ اور کچھ بعد میں آپ کو آملے تھے جیسا کہ دھوما حواری حضرت عیسیٰ کے ساتھ آیا تھا باقی حواری بعد میں آگئے تھے اور

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی رفاقت کے لئے صرف ایک ہی شخص اختیار کیا تھا یعنی دھوما کو جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے وقت صرف حضرت ابوبکر کو اختیار کیا تھا۔ کیونکہ سلطنت رومی حضرت عیسیٰ کو باغی قرار دے چکی تھی اور اسی جرم سے پیلاطوس بھی قیصر کے حکم سے قتل کیا گیا تھا کیونکہ وہ درپردہ حضرت عیسیٰ کا حامی تھا اور اس کی عورت بھی حضرت عیسیٰ کی مرید تھی۔ پس ضرور تھا کہ حضرت عیسیٰ اس ملک سے پوشیدہ طور پر نکلنے کوئی قافلہ ساتھ نہ لیتے اس لئے انہوں نے اس سفر میں صرف دھوما حواری کو ساتھ لیا جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے سفر میں صرف ابوبکر کو ساتھ لیا تھا اور جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی اصحاب مختلف راہوں سے مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا پہنچے تھے ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری مختلف راہوں سے مختلف وقتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں جا پہنچے تھے اور جب تک حضرت عیسیٰ ان میں رہے جیسا کہ آیت: مَا دُمْتُ فِيْهِمْ كَانُمْشَاءَ ہے وہ سب لوگ توحید پر قائم رہے بعد وفات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان لوگوں کی اولاد بگڑ گئی۔ یہ معلوم نہیں کہ کس پشت میں یہ خرابی پیدا ہوئی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ تیسری صدی تک دین عیسائی اپنی اصلیت پر تھا بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد وہ تمام لوگ پھر اپنے وطن کی طرف چلے آئے کیونکہ ایسا اتفاق ہو گیا کہ قیصر روم عیسائی ہو گیا پھر بے وطنی میں رہنا حاصل تھا۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۰۱، ۴۰۲)

فَلَمَّا تَوَقَّيْنِيْ سُوْرَةَ مَّائِدَةٍ كِيْ آيْتٍ پَرِ اَجْ پُھَر غُور كَرْتِے هُوَے اِيْكَ نِيْ بَات مَعْلُوم هُوِيْ اُوْر دِه يِه هِيْ كِه اللّٰهُ تَعَالٰى نِيْ فَر مَآيَا هِيْ كِه حَضْرَت مَسِيْحٌ سِيْ يِه سُوَال هُوَا كِه كِيَا تُوْنِيْ كِهَا تَهَا كِه مَجْهُوَا دُوْر مِيْرِيْ مَاو كُوْ اِلّٰه بِنَا لُو؟ تُوْوِه اِيْنِيْ بَرِيْت كِيْ لِيْے جُوَاب دِيْتِيْ هِيْ كِه مِيْن نِيْ تُوْوِهِيْ تَعْلِيْم دِيْ تَهِيْ جُو تُوْنِيْ مَجْهُو دِيْ تَهِيْ اُوْر جَب تَنَك مِيْن اِن مِيْن رَهَا مِيْن اِن كَا نَكْرَان تَهَا اُوْر جَب تُوْنِيْ مَجْهُو وَفَات دِيْ تُو تُو اِن پَر نَكْرَان تَهَا اَب صَاف ظَاهِر هِيْ كِه اِكْر حَضْرَت مَسِيْحٌ دُو بَارِه دُنْيَا مِيْن آئِيْ تَهِيْ اُوْر يِه سُوَال هُوَا تَهَا قِيَامَت مِيْن تُو اَس كَا يِه جُوَاب نِيْ هُوْنَا چَاهِيْے تَهَا بَلَكِه اِن كُو تُو يِه جُوَاب دِيْنَا چَاهِيْے تَهَا كِه هَا! بِيْشَك مِيْرِيْ اَسْمَان پَر اُٹْهَائِيْ جَانِيْ كِه بَعْدَان مِيْن شَرَك پَهِيْل گِيَا تَهَا لِيْكِن پُھَر دُو بَارِه جَا كَر تُو مِيْن نِيْ صَلْبِيُو كُو تُوْزَا، فَلَآ كَا فَر كُو مَارَا اَسِيْ هَلَاك كِيَا، اَسِيْ تَبَاه كِيَا نِه يِه كِه وَ يِه جُوَاب دِيْتِيْ: وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ اَس جُوَاب سِيْ صَاف مَعْلُوم هُوْتَا هِيْ كِه حَضْرَت مَسِيْحٌ كُو هَر گَز هَر گَز خُوْد دُنْيَا مِيْن نِيْ اِنَا هِيْ اُوْر يِه نَص هِيْ اِن كِه عَدَم

نزول پر۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

حضرت عیسیٰ کی حیات ثابت نہیں، ان کی زندگی ہی میں ایسا فتنہ برپا ہوا کہ کسی اور نبی کی زندگی میں وہ فتنہ نہیں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت عیسیٰ سے مطالبہ کرنا پڑا کہ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِي وَاٰجِيَ الْاٰلِهِيْنَ یعنی کیا تو نے ہی کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو۔ جو جماعت حضرت عیسیٰ نے تیار کی وہ ایسی کمزور اور ناقابل اعتبار تھی کہ خود یہی عیسائی بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔ انجیل سے ثابت ہے کہ وہ بارہ شاگرد جو ان کی خاص قوت قدسی اور تاثیر کا نمونہ تھے ان میں سے ایک نے جس کا نام یہودا اسکریوٹی تھا اس نے تیس روپے پر اپنے آقا و مرشد کو بیچ دیا اور دوسرے نے جو سب سے اول نمبر پر ہے اور شاگرد رشید کہلاتا تھا اور جس کے ہاتھ میں بہشت کی کنجیاں تھیں یعنی پطرس اس نے سامنے کھڑے ہو کر تین مرتبہ لعنت کی جب خود حضرت مسیح کی موجودگی میں ان کا اثر اور فیض اس قدر تھا اور اب انیس سو سال گزرنے کے بعد خود اندازہ کر لو کہ کیا باقی رہا ہوگا۔ اس کے بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جماعت طیار کی تھی وہ ایسی صادق اور وفادار جماعت تھی کہ انہوں نے آپ کے لیے جانیں دے دیں، وطن چھوڑ دیئے، عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ دیا۔ غرض آپ کے لیے کسی چیز کی پرواہ نہ کی۔ یہ کیسی زبردست تاثیر تھی اس تاثیر کا بھی مخالفوں نے اقرار کیا ہے اور پھر آپ کی تاثیرات کا سلسلہ بند نہیں ہوا بلکہ اب تک وہ چلی جاتی ہیں قرآن شریف کی تعلیم میں وہی اثر وہی برکات اب بھی موجود ہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

ہم علی وجہ البصیرت یقین رکھتے ہیں کہ توفیٰ کے معنی لغت عرب میں، نہ کلام خدا اور رسول میں ہرگز مع جسم غضری اٹھائے جانے کے نہیں ہیں۔ تمام قرآن شریف کو یکجائی نظر سے دیکھنا چاہیے، قرآن خدائے علیم وخبیر کی طرف سے کامل علم اور حکمت سے نازل کیا گیا ہے اس میں اختلاف ہرگز نہیں۔ بعض آیات بعض کی تفسیر واقع ہوئی ہیں اگر ایک تشابہات ہیں تو دوسری محکمت ہیں۔

جب یہی لفظ اور مقامات میں دوسرے انبیاء کے حق میں بھی وارد ہے تو اس کے معنی بجز موت کے اور کچھ نہیں لیے جاتے تو پھر نہ معلوم کہ کیوں حضرت مسیحؑ کو ایسی خصوصیت دی جاتی ہے؟ کیا ابھی تک مسیحؑ کو خصوصیت دینے کا انہوں نے مزہ نہیں چکھا؟

دیکھو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صاف یہ لفظ ہیں: اِنَّمَا تُرِيَّتَكَ بَعْضُ الَّذِي نَعُدُّهُمْ اَوْ

نَتَوَقَّيْكَ (یونس: ۷۷) پھر حضرت یوسفؑ کے متعلق بھی قرآن شریف میں یہی تَوَقُّیْ کا لفظ وارد ہے اور اس کے معنی بجز موت اور ہرگز نہیں ہیں، دیکھو! تَوَقَّيْ مُسْلِمًا وَ الْخَفِيَّ بِالضَّلِيلِينَ (یوسف: ۱۰۲)۔ یہ حضرت یوسفؑ کی دعا ہے تو کیا اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ اے خدا! مجھے زندہ مع جسم عنصری آسمان پر اٹھالے اور پہلے صلحاء کے ساتھ شامل کر دے جو کہ زندہ آسمان پر موجود ہیں۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُصِفُوْنَ۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل میں جو ساحر فرعون نے بلائے تھے ان کے ذکر میں تَوَقُّیْ کا لفظ مذکور ہے جہاں فرمایا: رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَ تَوَقَّنَا مُسْلِمِينَ (الاعراف: ۱۲۷)۔ اب ایک مسلمان کی یہ شان نہیں کہ خدا اور اس کے کلام کے مقابلہ میں دم مارے۔ قرآن حضرت عیسیٰؑ کو سراسر مارتا ہے اور ان کے وفات پا جانے کو دلائل اور براہین قطعہ سے ثابت کرتا ہے اور رسول اکرمؐ نے اس کو معراج کی رات میں وفات یافتہ انبیاء میں دیکھا۔

جائے غور ہے کہ اگر حضرت عیسیٰؑ زندہ مع جسم عنصری آسمان (پر) اٹھائے جا چکے تھے تو پھر ان کو وفات شدہ انبیاء سے کیا مناسبت، زندہ کو مردہ سے کیا تعلق اور کیسی نسبت؟ ان کے لیے تو کوئی الگ کوٹھری چاہیے تھی۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۷۷ مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

پہلا جھگڑا وفات مسیحؑ کا ہی ہے۔ کھلی کھلی آیات اس کی حمایت میں ہیں: لِيُعِيسَىٰ اِٰنِي مُتَوَقِّيكَ وَ رَاٰعَاكَ اِلٰى (ال عمران: ۵۶) پھر: فَلَمَّا تَوَقَّيْتَنِي كُنْتُ اَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ۔ یہ عذر بالکل جھوٹا ہے کہ تَوَقُّیْ کے معنی کچھ اور ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور خود ہادیؑ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے معنی امانت کے کر دیئے ہیں۔ یہ لوگ بھی جہاں کہیں لفظ تَوَقُّیْ استعمال کرتے ہیں۔ تو معنی امانت اور قبض روح سے مراد لیے ہیں قرآن نے بھی ہر ایک جگہ اس لفظ کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۸)

خود حضرت مسیحؑ کا اپنا اقرار موجود ہے: فَلَمَّا تَوَقَّيْتَنِي كُنْتُ اَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ اور یہ قیامت کا واقعہ ہے حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام سے سوال ہوگا کہ کیا تو نے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ؟ تو حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب تک میں ان میں زندہ تھا میں نے تو نہیں کہا اور میں وہی تعلیم دیتا رہا جو تو نے مجھے دی تھی لیکن جب تو نے مجھے وفات دے دی اس وقت تو ہی ان کا نگہبان تھا۔ اب یہ کیسی صاف بات ہے۔

اگر یہ عقیدہ صحیح ہوتا کہ حضرت مسیحؑ کو دنیا میں قیامت سے پہلے آنا تھا تو پھر یہ جواب ان کا کس طرح صحیح ہو

سکتا ہے؟ ان کو تو کہنا چاہیے تھا کہ میں دنیا میں جب دوبارہ گیا تو اس وقت صلیب پرستی کا زور تھا اور میری الوہیت اور ابنیت پر بھی شور مچا ہوا تھا مگر میں نے جا کر صلیبوں کو توڑا اور خنزیروں کو قتل کیا اور تیری توحید کو پھیلایا۔ نہ یہ جواب دیتے کہ جب تو نے مجھے وفات دے دی اس وقت تو خود مگر ان تھا۔ کیا قیامت کے دن حضرت مسیحؑ جھوٹ بولیں گے؟

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

ہر عقلمند جانتا ہے کہ حیات عیسیٰ علیہ السلام کو ثابت کرنا ایک محال اور باطل خیال ہے۔ اس لئے کہ قرآن شریف نے بڑی وضاحت سے یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ عیسیٰؑ وفات پا چکے ہیں اور ایسا مومن جو اپنے دل میں رب جلیل کے کلام کی عظمت رکھتا ہے اس کے لئے یہ آیت کافی ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ اب اے اس آیت کے سننے والے غور سے دیکھ کہ کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ اس آیت سے وفات کے علاوہ کوئی دیگر معنی نکال سکے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں بلکہ ہر منصف اور محقق کہ جو آیت کریمہ پر غور کرے گا وہ (قرآن کے) منطوق و مفہوم میں غور کرے گا۔ وہ ہدایت نظر کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہی سمجھے گا اور قطعی و یقینی طور پر ان کی وفات پر ہی ایمان لائے گا اور حضرت عیسیٰؑ کی وفات پر بصیرت حاصل ہو جانے کے بعد موت عیسیٰؑ سے انکار کو نہ صرف ضلالت بلکہ الحاد اور زندقیت شمار کرے گا۔ ممکن ہے کسی کو اپنی نادانی کے سبب لفظ توفی کے معنی میں تردد پیدا ہو جائے لیکن جب حدیث کی طرف اور صحابہ کی روایات کی طرف رجوع کرے گا تو اس کا یہ سبب تردد کا عدم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ وہ وہاں اس آیت کی تفسیر

ہر عاقلے میدانہ کہ حیات عیسیٰ علیہ السلام را ثابت کردن امریست محال و خیالیست باطل۔ چرا کہ قرآن شریف بکمال وضاحت این فیصلہ کردہ است کہ عیسیٰ وفات یافت۔ و مومن را کہ عظمت کلام رب جلیل در دل خود می دارد این آیت کافی است کہ اللہ جل شانہ می فرماید: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ انکوں اے شنوندرہ این آیت بغور بنگر آئی می توانی کہ بجز وفات معنی دیگر از این آیت بر آری۔ ہرگز ممکن نیست۔ بلکہ ہر منصف و محقق کہ بریں آیت کریمہ غور خواہد کرد و در منطوق و مفہوم آں تا ملے خواہد نمود و از اینجا بہد اہت نظر وفات عیسیٰ علیہ السلام خواہد فہمید و بقطع و یقین بر موت شاں ایمان خواہد آورد و بعد از این بصیرت انکار موت را نہ صرف ضلالت بلکہ الحاد و زندقہ خواہد شمارد۔ ہاں ممکن است کہ کسے را بوجہ نادانی خود در معنی لفظ توفی تردد سے پیدا شود۔ لیکن چون سوئے حدیث و آثار صحابہ رجوع خواہد کرد آں ہمہ تردد کا لعدم خواہد شد۔ چرا کہ او

میں بجز امات یعنی مارنے کے دوسرے معنی نہیں پائے گا۔ کیا تو نہیں دیکھتا صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے ”متوفیک : ہمتیک“ یعنی متوفیک کے یہ معنی ہیں: میں تجھے مارنے والا ہوں اور ہم نے ہر چند کہ کتب حدیث کا سیر حاصل مطالعہ کیا ہے اور تمام روایات واقوال صحابہؓ کو دیکھا اور خود ہم نے پڑھا ہے اور (لوگوں سے) سنا بھی ہے لیکن کسی جگہ نہیں پایا کہ اس کی شرح میں سوائے امات کے معنی کے کوئی دوسری چیز کسی حدیث یا کسی روایت یا کسی قول میں آئی ہو اور ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ جو کچھ صحابہ کرامؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے توفی کے معنی میں آیت مذکورہ میں ثابت ہے وہی مارنے کے معنی ہیں کوئی اور نہیں، اور نہیں کہا جاسکتا کہ مارنا مسلم ہے لیکن وہ موت ابھی واقع نہیں ہوئی بلکہ آئندہ واقع ہوگی اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي والی آیت میں فرماتے ہیں کہ ضلالت نصاریٰ کا فتنہ میری موت کے بعد وقوع میں آیا ہے نہ کہ میری موت سے پہلے۔ پس اگرچہ یہ فرض کریں کہ وعدہ موت ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں پس ہم پر یہ واجب ہے کہ ہم یہ بھی قبول کر لیں کہ نصاریٰ ابھی تک صراط مستقیم پر ہیں اور ابھی تک گمراہ نہیں ہوئے ہیں کیونکہ مذکورہ آیت میں عیسائیوں کی گمراہی موت عیسیٰ سے وابستہ ہے۔ پس جب تک عیسیٰ علیہ السلام مردہ نہیں ہوں گے عیسائیوں کو

آنجا در تفسیر میں آیت بجز امات یعنی میرا نیدن معنی دیگر نخواهد یافت۔ آیانمی بینی کہ در صحیح بخاری از عبد اللہ بن عباس است مُتَوَفِّيكَ، ہمتیک یعنی معنی مُتَوَفِّيكَ این است کہ من ترا میرا نندہ ام۔ و ما ہر چند سیر کتب حدیث کردیم و تمام آثار و اقوال صحابہ را دیدیم و خواندیم و شنیدیم اما ہیج جانیا فیتم کہ در شرح میں آیت بجز معنی امات چیزے دیگر در حدیث یا اثرے یا قولے آمدہ باشد۔ و ما بدعویٰ میگوئیم کہ ہرچہ از صحابہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم در معنی توفی در آیت موصوفہ ثابت شدہ است آں ہمیں معنی میرا نیدن است نہ غیر آں۔ نتواں گفت کہ میرا نیدن مسلم است لیکن آں موت ہنوز واقع نشدہ۔ بلکہ آئندہ واقع خواهد شد۔ زیر آنکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام در آیه فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي مفیر ماید کہ فتنہ ضلالت نصاریٰ بعد از موت من بوقوع آمدہ است نہ قبل از موت من۔ پس اگر فرض کنیم کہ وعدہ موت ہنوز بظہور نیامدہ است و حضرت عیسیٰ علیہ السلام تا ایں وقت زندہ است۔ پس بر ما واجب مے شود کہ ایں ہم قبول کنیم کہ نصاریٰ ہم تا ہنوز بر صراط مستقیم ہستند و گمراہ نشدہ اند۔ زیرا نکہ در آیت موصوفہ گمراہی عیسائیاں را بموت مسیح وابستہ کردہ

کس طرح گمراہ کہا جاسکتا ہے۔ علماء اور قوم کی عقل پر تعجب ہے کہ ہماری قوم اس آیت کی طرف توجہ نہیں کرتے اور نصوص صریحہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور اوہام کو اپنے مذہب کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔

الغرض عیسیٰ علیہ السلام کی وفات نصوص قرآنیہ اور حدیثوں سے ثابت ہے اور کسی شخص کو انکار کی جرأت نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ قرآن و حدیث سے روگردانی کرے اور اس آیت کے معنی تفسیر بالرائے کے ساتھ کر لے اور اگرچہ لفظ توفی کے معنوں پر اہل لغت کا اتفاق ہے اور اس قاعدہ مستمرہ کے مطابق ہیں کہ جب کسی عبارت میں اس لفظ کا فاعل خدا ہو اور مفعول کوئی انسان انسانوں میں سے ہو تو اس صورت میں توفی کے معنی مارنے میں محصور ہوں گے اور سوائے مارنے اور قبض روح کے کوئی دیگر معنی اس جگہ نہیں ہوں گے۔ لیکن اس جگہ ہمیں ضرورت نہیں کہ ہم عرب کی لغت کی کتب کی طرف رجوع کریں ہم اس جگہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابن عباس کے قول کو صحیح بخاری میں پاتے ہیں۔ اور یہ دونوں کافی ہیں اور ہم خوب جانتے ہیں جو کوئی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کرتا ہے وہ منافق ہوگا نہ کہ مؤمن۔ پس چونکہ رسول اللہ علیہ وسلم نے لفظ تَوَفَّيْتَنِي کو جو مذکورہ آیت میں ہے اس کا اپنے اوپر اطلاق فرمایا ہے اور معنی وفات کے صریح طور بیان فرمائے ہیں اور ابن عباس نے ان معنوں کی وضاحت کو مارنے

اند۔ پس تا وقتیکہ عیسیٰ نمرودہ باشد عیسائیاں را چگو نہ گمراہ تو اوں گفت عجب است از عقل علماء قوم ما کہ بسوئے این آیت توجہ نمی کنند و نصوص صریحہ را مے گذارند و اوہام را مذہب خود می گیرند۔

غرض مردن عیسیٰ علیہ السلام از نصوص قرآنیہ و حدیثہ ثابت است و هیچ کس را مجال انکار نیست بجز آں صورت کہ از قرآن و حدیث رو بگرداند یا معنی آیت بطور تفسیر بالرائے کند۔ و ہر چند در بارہ لفظ توفی اتفاق اہل لغت بر ہمیں قاعدہ مستمرہ است کہ چون در عبارتے فاعل این لفظ خدا باشد و مفعول بہ انسانے از انسان ہا در آں صورت معنی توفی در میرانیدن محصور خواہد بود و بجز میرانیدن و قبض روح معنی دیگر در آنجا ہرگز نخواہد بود لیکن ما در اینجا ضرورتے و حاجتے نمی داریم کہ سوئے کتب لغت عرب رجوع کنیم۔ ما در آں مقام حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و قول ابن عباس کہ آن ہر دو در صحیح بخاری موجود اند کافی است و ما خوب می دانیم کہ ہر کہ از گفتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعراض کند او منافقے باشد نہ مومنے پس چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لفظ تَوَفَّيْتَنِي را کہ در آیت موصوفہ است بر خود اطلاق کردہ معنی وفات را تصریح کردہ است۔ و ابن عباس بصراحت معنی آں میرانیدن نمودہ

کے معنوں میں ظاہر کیا ہے اور شارح عینی نے ابن عباس کے قول کو بہ تمام و کمال بیان فرمایا ہے۔ پس اتنی وضاحت کے بعد ہمیں کسی ثبوت دیگر کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ ہم دوسرے ثبوت بھی رکھتے ہیں۔ لغت عرب ہمارے ساتھ ہے، انسانی عقل ہمارے ساتھ ہے، دیگر قوموں کا اقرار ہمارے ساتھ ہے، اسلام کے اکثر ائمہ کا تصور و اقرار ہمارے ساتھ ہے اور بلا دیشام میں ابھی تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر موجود ہے۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

تو جس شخص سے قرآن وحدیث (بیان کرنے) سے رہائی نہ پاسکے، اس کا (صحیح) جواب یہ ہے کہ اسے جواب نہ دے۔ (ترجمہ از مرتب)

و شارح عینی سلسلہ قول ابن عباس را تمام و کمال بیان فرموده۔ پس مارا بعد زین وضاحت با حاجت ثبوتے دیگر نیست گو ثبوت ہائے دیگر ہم داریم۔ لغت عرب با ماست۔ عقل انسانی با ماست اقرار دیگر قوم با ماست۔ اقرار اکثر آئمہ اسلام با ماست و تا هنوز قبر عیسیٰ علیہ السلام در بلاد شام موجود است۔

آں کس کہ بقرآن و خبر زوزہی ایں است جوابش کہ جوابش ندہی (مجموعہ اشتہارات، جلد دوم صفحہ ۲۹۳۲)

قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ۗ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۗ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۗ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۰﴾

طاعون کے بارے میں خواہ کوئی حیلہ حوالہ کریں ہرگز کام نہ آوے گا آخر مستقر خدا تعالیٰ ہی ہوگا۔ لوگ جب اس کو مانیں گے تب وہ اس سے رہائی دے گا۔ آئین المفقور بھی اسی پر چسپاں ہے کیونکہ دوسرے آفات میں تو کوئی نہ کوئی مفر ہوتا ہے مگر طاعون میں کوئی مفر نہیں ہے صرف خدا کی پناہ ہی کام آوے گی۔ خدا کی طرف ظلم کبھی منسوب نہیں ہو سکتا۔ جو صادق ہوگا وہ ضرور اپنے صدق سے نفع پاوے گا۔ یہ وہی دن ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے: هَذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ۔

(الہدیر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

اب اس جگہ سوچنے کے قابل یہ بات ہے کہ قیامت کا دن ہوگا اور سب لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑے ہوں گے اور وہ گھڑی ہوگی جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ هَذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ۔ وہ دن ہوگا جبکہ سچ بولنے والوں کو ان کا سچ نفع دے گا۔ اچھا تو ایسے وقت میں حضرت عیسیٰ خدا تعالیٰ کو یہ کہیں

گے کہ میں جب تک دنیا میں تھا تب تو ان کو وحدانیت کا وعظ کرتا تھا بعد کی خبر نہیں انہیں کیا ہو گیا۔ قطع نظر اس بات کے کہ وہ اس وقت زمین میں مدفون ہیں یا کہیں آسمان پر بیٹھے ہوئے ہیں اس جگہ یہ امر سب سے زیادہ قابلِ غور ہے کہ اگر وہ قیامت سے پہلے دنیا میں آئیں گے اور چالیس سال تک رہیں گے اور عیسائیوں کو انہیں اور ان کی ماں کو خدا بنانے کے سبب خوب سزا بھی دیں گے اور پھر ان کی اصلاح بھی کریں گے اور ماننے والوں کو مسلمان بنائیں گے تو پھر قیامت کے دن ان کا جواب یہ کیوں ہونا چاہیے کہ مجھے تو کچھ خبر نہیں کہ میرے بعد کیا ہوا اور کیا نہ ہوا بلکہ انہیں تو یہ جواب دینا چاہیے کہ اے باری تعالیٰ! میں نے تو ان کے ایسے عقیدے کے سبب ان کو خوب سزا میں دی ہیں اور ان کی صلیب کو توڑا ہے اور چالیس سال تک ان کی خوب خبر لی ہے۔

سو دیکھنا چاہیے کہ اگر مسیح دوبارہ دنیا میں آوے گا تو کیا اس کا یہ جواب جو قرآن شریف میں درج ہے سچا ہوگا اور اگر ان ملائوں کی بات درست مان لی جاوے تو روزِ قیامت حضرت عیسیٰ کو ایسا جواب دینے سے کیا انعام ملے گا؟ نادان یہ بھی نہیں جانتے کہ ایسی باتیں بنا کر وہ ایک خدا کے نبی کو نعوذ باللہ جھوٹ بولنے والا قرار دے رہے ہیں اور پھر جھوٹ بھی قیامت کے دن اور پھر وہ بھی خدا تعالیٰ کے دربار میں۔ نعوذ باللہ من ذالک!

(الہدٰی جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)



أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## تفسیر سورۃ الانعام

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ

يَسْتَهْزِءُونَ ﴿١٠﴾

سچ جب ان کے پاس آیا تو انہوں نے جھٹلایا۔ سوا ب عنقریب اس صداقت کی ان کو خبریں ملیں گی جس پر وہ ٹھٹھا کرتے تھے۔

وَ لَقَدْ اسْتَهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ

يَسْتَهْزِءُونَ ﴿١١﴾

اور تجھ سے پہلے بھی پیغمبروں سے ہنسی اور ٹھٹھا ہوتا رہا ہے مگر ہمیشہ ٹھٹھا کرنے والے اپنے ٹھٹھے کا بدلہ پاتے رہے ہیں۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكذِّبِينَ ﴿١٢﴾

ان لو کہہ کہ زمین کا سیر کر کے دیکھو کہ جو لوگ خدا کے نبیوں کو جھٹلاتے رہے ہیں ان کا کیا انجام ہوا ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

کبھی سفر عجائبات دنیا کے دیکھنے کے لیے بھی ہوتا ہے جس کی طرف آیت کریمہ: قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ اشاره فرما رہی ہے اور کبھی سفر صادقین کی صحبت میں رہنے کی غرض سے جس کی طرف آیت کریمہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (التوبة: ۱۱۹) ہدایت فرماتی ہے اور کبھی سفر عیادت کے لیے بلکہ اتباع خیار کے لیے بھی ہوتا ہے اور کبھی بیمار یا بیماردار علاج کرانے کی غرض سے سفر کرتا ہے اور کبھی کسی مقدمہ عدالت یا تجارت وغیرہ کے لیے بھی سفر کیا جاتا ہے اور یہ تمام قسم سفر کی قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے رو سے جائز ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۶۰۷)

وَإِنْ يَسْأَلْكَ اللَّهُ بَصِيرًا فَلَا تُكْشِفْ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَسْأَلْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۸﴾

اگر تجھے کوئی تکلیف پہنچے تو بجز خدا اور کوئی تیرا یا نہیں کہ اس تکلیف کو دور کرے اور اگر تجھے کچھ بھلائی پہنچے تو ہر ایک بھلائی کے پہنچانے پر خدا قادر ہے۔ کوئی دوسرا نہیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۱، ۵۲۲ حاشیہ نمبر ۳)

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ۗ وَ هُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿۱۹﴾

اسی کا تمام بندوں پر تسلط اور تصرف ہے اور وہی صاحب حکمت کاملہ اور ہر ایک چیز کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۲ حاشیہ نمبر ۳)

قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۗ قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَ أَوْحَىٰ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنَ لِأُنذِرَكُمْ بِهِ وَ مَن بَلَغَ ۗ أَيْتَكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا أُخْرَىٰ ۗ قُلْ لَا أَشْهَدُ ۚ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ وَ أَنِنِي بِرَبِّي ۗ مِمَّا تُشْرِكُونَ ﴿۲۰﴾

لَا يُنذِرُكُمْ بِهِ وَ مَن بَلَغَ ۗ یعنی لازمی ہوگا کہ جس کو قرآنی تعلیم پہنچے وہ خواہ کہیں بھی ہو اور کوئی بھی ہو۔ اس تعلیم کی پیروی کو اپنی گردن پر اٹھائے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

الَّذِينَ اتَّبَعَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ ۗ وَالَّذِينَ خَسِرُوا

## ۱۱) أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ

کافر لوگ جو اہل کتاب ہیں ایسے ایسے یقینی طور پر اس کو شناخت کرتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔  
(الحق مباحثہ دہلی، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۶۶)

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ  
الظَّالِمُونَ ۝۱۱

اس سے زیادہ تر ظالم اور کون ہے جو خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھے۔ بیشک مفتری خدا تعالیٰ کی لعنت کے نیچے ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ پر افترا کرنے والا جلد مر جاتا ہے۔

(انجام آہٹم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۵۰)

افترا سے مراد ہمارے کلام میں وہ افترا ہے کہ کوئی شخص عمداً اپنی طرف سے بعض کلمات تراش کر یا ایک کتاب بنا کر پھریہ دعویٰ کرے کہ یہ باتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اس نے مجھے الہام کیا ہے اور ان باتوں کے بارے میں میرے پر اس کی وحی نازل ہوئی ہے حالانکہ کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ سو ہم نہایت کامل تحقیقات سے کہتے ہیں کہ ایسا افترا کبھی کسی زمانہ میں چل نہیں سکا اور خدا کی پاک کتاب صاف گواہی دیتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے والے جلد ہلاک کیے گئے ہیں۔

(انجام آہٹم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۶۳ حاشیہ)

قرآن شریف میں صد ہا جگہ اس بات کو پاؤ گے کہ خدا تعالیٰ مفتری علی اللہ کو ہرگز سلامت نہیں چھوڑتا اور اسی دنیا میں اس کو سزا دیتا ہے اور ہلاک کرتا ہے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ ایک موقع میں فرماتا ہے کہ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ یعنی مفتری نامراد مرے گا اور دوسری جگہ فرماتا ہے: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ (ظہ: ۶۲) یعنی اس شخص سے ظالم تر کون ہے جو خدا پر افترا کرتا ہے یا خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتا ہے اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے خدا کے نبیوں کے ظاہر ہونے کے وقت خدا کے کلام کی تکذیب کی خدا نے ان کو زندہ نہیں چھوڑا اور برے برے عذابوں سے ہلاک کر دیا۔ دیکھو نوح کی قوم اور عاد و ثمود اور لوط کی قوم اور فرعون اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن مکہ والے ان کا کیا انجام ہوا۔ پس جبکہ تکذیب کرنے والے اسی دنیا میں سزا پا چکے تو پھر جو شخص خدا پر افترا کرتا ہے جس کا نام اس آیت میں پہلے نمبر پر ذکر کیا

گیا ہے وہ کیوں کر بچ سکتا ہے کیا خدا کا صادقوں اور کاذبوں سے معاملہ ایک ہو سکتا ہے اور کیا افترا کرنے والوں کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس دنیا میں کوئی سزا نہیں۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ (الصُّفَّت: ۱۵۵)  
(الرابعین، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۴۳۳، ۴۳۴)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا پر افترا کرنے والا سب کافروں سے بڑھ کر کافر ہے جیسا کہ فرماتا ہے: فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ۔ یعنی بڑے کافر وہی ہیں ایک خدا پر افترا کرنے والا دوسرا خدا کی کلام کی تکذیب کرنے والا پس جبکہ میں نے ایک مکذب کے نزدیک خدا پر افترا کیا ہے اس صورت میں نہ میں صرف کافر بلکہ بڑا کافر ہوا اور اگر میں منفتری نہیں تو بلاشبہ وہ کفر اس پر پڑے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خود فرمایا ہے۔  
(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۶۳)

ظالم سے مراد اس جگہ کافر ہے اس پر قرینہ یہ ہے کہ منفتری کے مقابل پر مکذب کتاب اللہ کو ظالم ٹھہرایا ہے اور بلاشبہ وہ شخص جو خدا تعالیٰ کے کلام کی تکذیب کرتا ہے کافر ہے سو جو شخص مجھے نہیں مانتا وہ مجھے منفتری قرار دے کر مجھے کافر ٹھہراتا ہے اس لیے میری تکفیر کی وجہ سے آپ کافر بنتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۶۷ حاشیہ)

اس سے ظالم ترکون ہے کہ خدا پر افترا کرے یا خدا کے کلام کی تکذیب کرے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۵۷۹)

جو شخص دلائل اور نشانات کو دیکھتا ہے اور پھر دیانت، امانت اور انصاف کو ہاتھ سے چھوڑتا ہے اسے یاد رکھنا چاہیے کہ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۹ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

وہ شخص جو رات کو ایک بات بناتا اور دن کو لوگوں کو بتاتا اور کہتا ہے کہ مجھے خدا نے ایسا کہا ہے وہ کیوں کر

بامراد اور بابرگ و بار ہو سکتا ہے۔  
(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۳)

اس شخص سے ظالم ترکون ہے جو خدا پر افترا کرے یا خدا کی آیتوں اور نشانوں کا مکذب ہو۔

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۶۷۷)

کذب اختیار کرنے سے انسان کا دل تاریک ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر اسے ایک دیمک لگ جاتی ہے۔ ایک جھوٹ کے لیے پھر اسے بہت سے جھوٹ تراشنے پڑتے ہیں کیونکہ اس جھوٹ کو سچائی کا رنگ دینا ہوتا ہے۔ پس اسی طرح اندر ہی اندر اس کے اخلاقی اور روحانی قوی زائل ہو جاتے ہیں اور پھر اسے

یہاں تک جرأت اور دلیری ہو جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر بھی افترا کر لیتا اور خدا تعالیٰ کے رسولوں اور ماموروں کی تکذیب بھی کر دیتا ہے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ اظلمہ ٹھہرتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے: مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ یعنی اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ اور افترا باندھے یا اس کی آیات کی تکذیب کرے۔

یقیناً یاد رکھو کہ یہ جھوٹ بہت ہی بری بلا ہے۔ انسان کو ہلاک کر دیتا ہے اس سے بڑھ کر جھوٹ کا خطرناک نتیجہ کیا ہوگا کہ انسان خدا تعالیٰ کے رسولوں اور اس کی آیات کی تکذیب کر کے سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

دیکھو افتراء کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور مفتری ہمیشہ خائب و خاسر رہتا ہے۔ وَقَدْ خَابَ مَن افْتَرَىٰ (ظہ: ۶۲) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ اگر تو افترا کرے تو تیری رگ جان ہم کاٹ ڈالیں گے اور ایسا ہی فرمایا: مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا (الانعام: ۲۲)

ایک شخص ان باتوں پر ایمان رکھ کر افتراء کی جرأت کیوں کر کر سکتا ہے۔ ظاہری گورنمنٹ میں ایک شخص اگر فرضی چپڑاسی بن جائے تو اس کو سزا دی جاتی ہے اور وہ جیل میں بھیجا جاتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ ہی کی مقتدر حکومت میں یہ اندھیر ہے کہ کوئی شخص جھوٹا دعویٰ مامور من اللہ ہونے کا کرے اور پکڑا نہ جائے بلکہ اس کی تائید کی جائے؟ اس طرح تو دہریت پھلتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی ساری کتابوں میں لکھا ہے کہ مفتری ہلاک کیا جاتا ہے۔ پھر کون نہیں جانتا کہ یہ سلسلہ ۲۵ سال سے قائم ہے اور لاکھوں آدمی اس میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ باتیں معمولی نہیں بلکہ غور کرنے کے قابل ہیں محض ذاتی خیالات بطور دلیل مانے نہیں جاسکتے۔ ایک ہندو جو گنگا میں غوطہ مار کر نکلتا ہے اور کہتا ہے کہ میں پاک ہو گیا بلا دلیل اس کو کون مانے گا؟ بلکہ اس سے دلیل مانگے گا۔ پس میں نہیں کہتا کہ بلا دلیل میرا دعویٰ مان لو۔ نہیں! منہاج نبوت کے لئے جو معیار ہے اس پر میرے دعویٰ کو دیکھو۔ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں خدا سے وحی پاتا ہوں اور منہاج نبوت کے تینوں معیار میرے ساتھ ہیں اور میرے انکار کے لیے کوئی دلیل نہیں۔

(الہد جلد ۳ نمبر ۲۰، ۲۱، ۲۲ مورخہ ۲۴ مئی و یکم جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

پس خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ میں دوسرا پہلو اختیار کروں جو اصل بنیاد میرے دعویٰ کی ہے یعنی اپنے سچے لہم ہونے کا ثبوت کیونکہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر وہ لوگ مجھے خدائے تعالیٰ کی طرف سے

سچا ملہم سمجھتے اور میرے الہامات کو میرا ہی افتراء یا شیطانی وساوس خیال نہ کرتے تو اس قدر سب و شتم اور ہنسی اور ٹھٹھا اور تکفیر اور بدتہذیب کے ساتھ پیش نہ آتے بلکہ اپنے بہت سے ظنونِ فاسدہ کا حُسنِ ظن کے غلبہ سے آپ فیصلہ کر لیتے کیونکہ کسی کی سچائی اور مخائب اللہ ہونے کے یقین کے بعد وہ مشکلات ہرگز پیش نہیں آتیں کہ جو اس حالت میں پیش آتی ہیں کہ انسان کے دل پر اس کے کاذب ہونے کا خیال غالب ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے میری سچائی کے سمجھنے کے لیے بہت سے قرآنِ واضح ان کو عطا کئے تھے، میرا دعویٰ صدی کے سر پر تھا، میرے دعویٰ کے وقت میں خسوف کسوف ماہ رمضان میں ہوا تھا، میرے دعویٰ الہام پر پورے بیس برس گذر گئے اور مفتری کو اس قدر مہلت نہیں دی جاتی، میری پیشگوئی کے مطابق خدانے آتھم کو کچھ مہلت بھی دی اور پھر مار بھی دیا، مجھ کو خدانے بہت سے معارف اور حقائق بخشے اور اس قدر میری کلام کو معرفت کے پاک اسرار سے بھر دیا کہ جب تک انسان خدائے تعالیٰ کی طرف سے پورا تائید یافتہ نہ ہو اس کو یہ نعمت نہیں دی جاتی لیکن مخالف مولویوں نے ان باتوں میں سے کسی بات پر غور نہیں کی۔

سواب چونکہ تکذیب اور تکفیر ان کی انتہاء تک پہنچ گئی اس لیے وقت آ گیا کہ خدائے قادر اور علیم اور خبیر کے ہاتھ سے جھوٹے اور سچے میں فرق کیا جائے۔ ہمارے مخالف مولوی اس بات کو جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں ایسے شخص سے کس قدر بیزاری ظاہر کی ہے جو خدائے تعالیٰ پر افتراء باندھے۔ یہاں تک کہ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے کہ اگر بعض قول میرے پر افتراء کرتا تو میں فی الفور پکڑ لیتا اور رگ جان کاٹ دیتا۔ غرض خدا تعالیٰ پر افتراء کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں فلاں الہام مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے حالانکہ کچھ بھی نہیں ہوا، ایک ایسا سخت گناہ ہے کہ اس کی سزا میں صرف جہنم کی ہی وعید نہیں بلکہ قرآن شریف کے نصوص قطعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا مفتری اسی دنیا میں دست بدست سزا پالیتا ہے اور خدائے قادر وغیر کبھی اس کو امن میں نہیں چھوڑتا اور اس کی غیرت اس کو کچل ڈالتی ہے اور جلد ہلاک کرتی ہے۔ اگر ان مولویوں کا دل تقویٰ کے رنگ سے کچھ بھی رنگین ہوتا اور خدا تعالیٰ کی عادتوں اور سنتوں سے ایک ذرہ بھی واقف ہوتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ ایک مفتری کا اس قدر دراز عرصہ تک افتراء میں مشغول رہنا بلکہ روز بروز اس میں ترقی کرنا اور خدا تعالیٰ کا اس کے افتراء پر اس کو نہ پکڑنا بلکہ لوگوں میں اس کو عزت دینا دلوں میں اس کی قبولیت ڈالنا اور اس کی زبان کو چشمہ حقائق و معارف بنانا یہ ایک ایسا امر ہے کہ جب سے خدا تعالیٰ نے دنیا کی بنیاد ڈالی ہے اس کی نظیر ہرگز نہیں پائی جاتی۔ افسوس کہ کیوں یہ منافق مولوی خدا تعالیٰ کے احکام

اور مواعد کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے؟ کیا ان کے پاس حدیث یا قرآن شریف سے کوئی نظیر موجود ہے کہ ایک ایسے خبیث طبع مفتری کو خدا تعالیٰ نہ پکڑے جو اس پر افتراء پر افتراء باندھے اور جھوٹے الہام بنا کر اپنے تئیں خدا کا نہایت ہی پیارا ظاہر کرے اور محض اپنے دل سے شیطانی باتیں تراش کر اس کو عہدِ خدا کی وحی قرار دیوے اور کہے کہ خدا کا حکم ہے کہ لوگ میری پیروی کریں اور کہے کہ خدا مجھے اپنے الہام میں فرماتا ہے کہ تو اس زمانہ میں تمام مومنوں کا سردار ہے حالانکہ اس کو کبھی الہام نہ ہوا ہو اور نہ کبھی خدا نے اس کو مومنوں کا سردار ٹھہرایا ہو اور کہے کہ مجھے خدا مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تو ہی مسیح موعود ہے جس کو میں کسرِ صلیب کے لیے بھیجتا ہوں حالانکہ خدا نے کوئی ایسا حکم اس کو نہیں دیا اور نہ اس کا نام عیسیٰ رکھا اور کہے کہ خدائے تعالیٰ مجھے مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ مجھ سے تو ایسا ہے جیسا کہ میری توحید۔ تیرا مقامِ قرب مجھ سے وہ ہے جس سے لوگ بے خبر ہیں حالانکہ خدا اس کو مفتری جانتا ہے اس پر لعنت بھیجتا ہے اور مردودوں اور مخذولوں کے ساتھ اس کا حصہ قرار دیتا ہے۔ پھر کیا یہی خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ ایسے کذاب اور بیباک مفتری کو جلد نہ پکڑے یہاں تک کہ اس افتراء پر بیس برس سے زیادہ عرصہ گزر جائے۔

کون اس کو قبول کر سکتا ہے کہ وہ پاک ذات جس کے غضب کی آگ وہ صاعقہ ہے کہ ہمیشہ جھوٹے ملہموں کو بہت جلد کھاتی رہی ہے، اس لمبے عرصہ تک اس جھوٹے کو چھوڑ دے جس کی نظیر دنیا کے صفحہ میں مل ہی نہیں سکتی۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: **وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا** یعنی اس سے زیادہ تر ظالم اور کون ہے جو خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھے۔ بیشک مفتری خدا تعالیٰ کی لعنت کے نیچے ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ پر افتراء کرنے والا جلد مارا جاتا ہے۔

سوا یک تقویٰ شعار آدمی کے لیے یہ کافی تھا کہ خدا نے مجھے مفتریوں کی طرح ہلاک نہیں کیا بلکہ میرے ظاہر اور میرے باطن اور میرے جسم اور میری روح پر وہ احسان کئے جن کو میں شمار نہیں کر سکتا۔ میں جو ان تھا جب خدا کی وحی اور الہام کا دعویٰ کیا اور اب میں بوڑھا ہو گیا اور ابتداء دعویٰ پر بیس برس سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا، بہت سے میرے دوست اور عزیز جو مجھ سے چھوٹے تھے فوت ہو گئے اور مجھے اس نے عمرِ دراز بخشی اور ہر یک مشکل میں میرا متکفل اور متولی رہا پس کیا ان لوگوں کے یہی نشان ہوا کرتے ہیں کہ جو خدا تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہیں؟

(مجموعہ اشتہارات جلد اول صفحہ ۵۸۳ تا ۵۸۵)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَنْبِعُ إِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمُ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي

اذَانَهُمْ وَقَرَأُوا وَإِنْ يَدْرَأْ كُلَّ آيَةٍ إِلَّا يُؤْمِنُوا بِهَا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ  
يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۲۷﴾

یعنی یہ لوگ تمام نشانوں کو دیکھ کر ایمان نہیں لاتے۔ پھر جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے لڑتے ہیں۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۴۲)

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبُ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونُ  
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۸﴾

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۖ قَالَ الْكَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۖ قَالَ  
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۲۹﴾

جس شخص نے کافیہ یا ہدایت انجوبھی پڑھی ہوگی وہ خوب جانتا ہے کہ ماضی مضارع کے معنوں پر بھی آجاتی ہے بلکہ ایسے مقامات میں جبکہ آنے والا واقعہ متکلم کی نگاہ میں یقینی الوقوع ہو مضارع کو ماضی کے صیغہ پر لاتے ہیں تاکہ اس امر کا یقینی الوقوع ہونا ظاہر ہو اور قرآن شریف میں اس کی بہت نظیریں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَى النَّارِ (الانعام: ۲۸) اور جیسا کہ فرماتا ہے: وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۖ قَالَ الْكَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۵۹)

وَلَقَدْ كَذَّبْتَ رَسُولٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كَذَّبُوا وَ أُوذُوا حَتَّىٰ أَنزَلْنَاهُمْ  
نَصْرًا ۗ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۗ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَّبَايَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۰﴾

اور تجھ سے پہلے جو نبی آئے ان کی بھی تکذیب کی گئی تھی پس انہوں نے تکذیب پر صبر کیا اور ایک مدت تک دکھ دیئے گئے یہاں تک کہ ہماری مدد ان کو پہنچ گئی چنانچہ گذشتہ رسولوں کی خبریں بھی تجھ کو آچکی ہیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۶)

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ..... خدا کی باتیں کبھی نہیں ٹلیں گی اور کوئی نہیں جو ان کو روک سکے۔

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۵۸، ۵۹)

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ كَوْنِي نَبِيْسٌ جَوْخَدَا كِي بَاتُوْنَ كُو بَدَل دے۔

(تحفہ گوٹڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۴)

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ.....خدا كِي بَاتُوْنَ كُو كُوْنِيْ ثَال نَبِيْسٌ۔

(اربعین، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۳۶۱)

وَ اِنْ كَانَ كَبْرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنْ اَسْتَضَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِى الْاَرْضِ اَوْ  
سُلْبًا فِى السَّمَاۗءِ فَتَاتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۗ وَ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنُ نَفْسٌ  
مِّنَ الْجَاهِلِيْنَ ۗ ﴿٣١﴾

یعنی اگر تیرے پر (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) ان کافروں کا اعراض بہت بھاری ہے سو اگر تجھے طاقت ہے تو زمین میں سرنگ کھود کر یا آسمان پر زینہ لگا کر چلا جا اور ان کے لیے کوئی نشان لے اور اگر خدا چاہتا تو ان سب کو جو نشان مانگتے ہیں ہدایت دے دیتا پس تو جاہلوں میں سے مت ہو۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۳۳۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت جلد فیصلہ کفار کے حق میں چاہتے تھے مگر خدا تعالیٰ اپنے مصالِح اور سنن کے لحاظ سے بڑے توقف اور حلم کے ساتھ کام کرتا ہے۔ لیکن آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ایسا کچلا اور پیسا کہ ان کا نام و نشان مٹا دیا۔ اسی طرح پر ممکن ہے کہ ہماری جماعت کے بعض لوگ طرح طرح کی گالیاں، افترا پردازیاں اور بدزبانیاں خدا تعالیٰ کے سچے سلسلے کی نسبت سن کر اضطراب اور استعجال میں پڑیں مگر انہیں خدا تعالیٰ کی اس سنت کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتی گئی ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ اس لیے میں پھر اور بار بار بتا کید حکم کرتا ہوں کہ جنگ و جدال کے مجموعوں، تحریکوں اور تقریبوں سے کنارہ کشی کرو۔ اس لیے کہ جو کام تم کرنا چاہتے ہو یعنی دشمنوں پر حجت پوری کرنا وہ اب خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

وَ قَالُوا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يُنَزِّلَ آيَةً وَّ  
لَكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣١﴾

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی اپنے رب کی طرف سے کیوں نازل نہ ہوئی کہہ خدا نشانوں کے

نازل کرنے پر قادر ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

قدرت تو حقیقت میں اسی بات کا نام ہے جو داغ احتیاج اسباب سے منزہ اور پاک اور ادراک انسانی سے برتر ہو۔ اول خدا کو قادر کہنا اور پھر یہ زبان پر لانا کہ اس کی قدرت اسباب مادی سے تجاوز نہیں کرتی۔ حقیقت میں اپنی بات کو آپ رد کرنا ہے۔ (پرانی تحریریں، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۳۶)

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا ظَلِيٍّ يَبْيُطِرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلُكُمْ ۗ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ﴿۳۶﴾

کوئی صداقت علم الہی کے متعلق جو انسان کے لیے ضروری ہے اس کتاب سے باہر نہیں۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۲۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

اس کتاب (قرآن شریف) سے کوئی دینی حقیقت باہر نہیں رہی بلکہ یہ جمع حقائق و معارف دینیہ پر مشتمل ہے۔ (سرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۶۱ حاشیہ)

ہر چند میرا مذہب یہی ہے کہ قرآن اپنی تعلیم میں کامل ہے اور کوئی صداقت اس سے باہر نہیں کیونکہ اللہ جلّ شانہ فرماتا ہے..... مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ یعنی ہم نے اس کتاب سے کوئی چیز باہر نہیں رکھی لیکن ساتھ اس کے یہ بھی میرا اعتقاد ہے کہ قرآن کریم سے تمام مسائل دینیہ کا استخراج و استنباط کرنا اور اس کی مجملات کی تفصیل صحیحہ پر حسبِ منشاء الہی قادر ہونا ہر ایک مجتہد اور مولوی کا کام نہیں بلکہ یہ خاص طور پر ان کا کام ہے جو وحی الہی سے بطور نبوت یا بطور ولایت عظمیٰ مدد دیئے گئے ہوں۔ سوائے لوگوں کے لیے جو استخراج و استنباط معارف قرآنی پر بعلمت غیر ملہم ہونے کے قادر نہیں ہو سکتے یہی سیدھی راہ ہے کہ وہ بغیر قصد استخراج و استنباط قرآن کے ان تمام تعلیمات کو جو سنن متوارثہ متعاملہ کے ذریعہ سے ملی ہیں۔ بلا تامل و توقف قبول کر لیں اور جو لوگ وحی ولایت عظمیٰ کی روشنی سے منور ہیں اور اِلَّا الْمُهَيَّجُونَ (الواقعة: ۸۰) کے گروہ میں داخل ہیں ان سے بلاشبہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً دقائق مخفیہ قرآن کے ان پر کھولتا رہتا ہے اور یہ بات ان پر ثابت کر دیتا ہے کہ کوئی زائد تعلیم آنحضرت صلی اللہ علی وسلم نے ہرگز نہیں دی بلکہ احادیث صحیحہ میں مجملات و اشارات قرآن کریم کی تفصیل ہے۔ سوا اس معرفت کے پانے سے اعجاز قرآن کریم ان پر کھل جاتا

ہے اور نیز ان آیات بینات کی سچائی ان پر روشن ہو جاتی ہے جو اللہ جل شانہ فرماتا ہے جو قرآن کریم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اگرچہ علماء ظاہر بھی ایک قبض کی حالت کے ساتھ ان آیات پر ایمان لاتے ہیں تا ان کی تکذیب لازم نہ آوے لیکن وہ کامل یقین اور سکینت اور اطمینان جو ملہم کامل کو بعد معائنہ مطابقت و موافقت احادیث صحیحہ اور قرآن کریم اور بعد معلوم کرنے اس احاطہ تام کے جو درحقیقت قرآن کو تمام احادیث پر ہے ملتی ہے وہ علماء ظاہر کو کسی طرح مل نہیں سکتی بلکہ بعض تو قرآن کریم کو ناقص و ناتمام خیال کر بیٹھے ہیں اور جن غیر محدود صدائق اور حقائق اور معارف پر قرآن کریم کے دائمی اور تمام تر اعجاز کی بنیاد ہے اس سے وہ منکر ہیں اور نہ صرف منکر بلکہ اپنے انکار کی وجہ سے ان تمام آیات بینات کو جھٹلاتے ہیں۔ جن میں صاف صاف اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے کہ قرآن جمیع تعلیمات دینیہ کا جامع ہے۔

(الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۸۰، ۸۱)

تعلیمات ضروریہ میں سے کوئی چیز قرآن سے باہر نہیں رہی اور قرآن ایک مکمل کتاب ہے جو کسی دوسرے مکمل کا منتظر نہیں بناتا۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۸۶)

(کرامات الصادقین، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۱۰)

کوئی صداقت اس سے باہر نہیں۔

میں قرآن شریف سے یہ استنباط کرتا ہوں کہ سب انبیاء کے وصفی نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے کیونکہ آپ تمام انبیاء کے کمالات متفرقہ اور فضائل مختلفہ کے جامع تھے اور اسی طرح جیسے تمام انبیاء کے کمالات آپ کو ملے قرآن شریف بھی جمیع کتب کی خوبیوں کا جامع ہے۔ چنانچہ فرمایا: فِيهَا كُتِبَ قِسْمَةُ (البینة: ۴) اور مَا فَزَّطْنَا فِي الْكِتَابِ اِيسَاهِي اِيك جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے کہ تمام نبیوں کا اقتدار۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

اور کتاب اللہ کی شان کی نسبت جو اللہ نے اُس کی تعریف و توصیف فرمائی وہی تیرے لئے کافی ہے۔ اُس نے فرمایا کہ: مَا فَزَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ۔ اور یہ کہ اس میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے۔ اور جو مسلم کی حدیث میں زید بن ارقم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مکہ اور مدینہ کے درمیان غدیر خم پر ہمارے

وَيَكْفِي لَكَ فِي شَأْنِ كِتَابِ اللَّهِ مَا أَتَى اللَّهُ عَلَيْهِ وَقَالَ: مَا فَزَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ، فِيهِ تَفْصِيلُ كُلِّ شَيْءٍ، وَمَا جَاءَ فِي حَدِيثِ مُسْلِمٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمٍ قَالَ: قَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فِينَا خَطِيبًا بِمَاءٍ

درمیان خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنائیاں کی اور وعظ و نصیحت کی اور پھر فرمایا: اما بعد، اے لوگو! غور سے سنو، میں ایک بشر ہوں قریب ہے کہ میرے رب کا پیامبر (ملک الموت) میرے پاس آئے اور میں اُسے لَبَّيْكَ کہوں اور میں تم میں دو نہایت گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ان میں سے پہلی کتاب اللہ (قرآن) ہے جس میں ہدایت اور نور ہے۔ پس تم اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھام لو اور اس کی تعلیمات پر عمل کرو۔ چنانچہ آپ نے کتاب اللہ کے لئے تحریص و ترغیب دلائی پھر فرمایا: اور (دوسرے) میرے اہل بیت ہیں۔ میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں اور (یاد رکھو) کہ اللہ کی کتاب ہی جبل اللہ ہے۔ جس نے اس کی پیروی کی تو وہ ہدایت پر ہے اور جس نے اُسے چھوڑا تو وہ گمراہی پر ہے۔ پس غور کر کہ کس طرح آنحضرت نے اس (قرآن) کی ترغیب دلائی ہے اور اُس نے اُسے ڈرایا ہے جس نے قرآن کو اس طور پر اعراض کرتے ہوئے چھوڑا کہ اُس نے وہ لیا جو اس کے معارض ہے۔ پس تو جان لے کہ قرآن امام اور نور ہے اور وہ حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور یقیناً وہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

يُدْعَىٰ مُخْتَلِفًا بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ فَحَمِدَ  
اللَّهَ وَأَثْنَىٰ عَلَيْهِ، وَوَعظَ وَذَكَرَ، ثُمَّ  
قَالَ: أَمَّا بَعْدُ. أَلَا يَا أَيُّهَا النَّاسُ!  
إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَيُّشِكُ أَنْ يَأْتِيَنِي رَسُولٌ  
رَّبِّي فَأَجِيبُ، وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ  
الثَّقَلَيْنِ، أَوْلَاهَا كِتَابُ اللَّهِ فِيهِ  
الْهُدَىٰ وَالنُّورُ، فَخُذُوا بِكِتَابِ اللَّهِ  
وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ. فَحَثَّ عَلَى كِتَابِ  
اللَّهِ وَرَعَّبَ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ: وَأَهْلُ  
بَيْتِي، أَذْكَرُكُمْ اللَّهُ فِي أَهْلِ بَيْتِي.  
وَكِتَابُ اللَّهِ هُوَ حَبْلُ اللَّهِ، مَنْ اتَّبَعَهُ  
كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ، وَمَنْ تَرَكَهُ كَانَ عَلَى  
الضَّلَالَةِ. فَانظُرْ كَيْفَ رَعَّبَ فِيهِ  
وَخَوَّفَ مَنْ تَرَكَهُ مُعْرِضًا عَنْهُ  
بِحَيْثُ أَخَذَ غَيْرَهُ الَّذِي يِعَارِضُهُ.  
فَاعْلَمْ أَنَّ الْقُرْآنَ إِمَامٌ وَنُورٌ،  
وَيَهْدِي إِلَى الْحَقِّ، وَأَنَّهُ تَنْزِيلُ رَبِّ  
الْعَالَمِينَ.

(حسامة البشزي، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲)

بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ﴿٦٦﴾

اللہ تعالیٰ نے دوسری دعاؤں میں قبول کرنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ فرمادیا ہے کہ چاہوں تو قبول کروں اور

چاہوں تو رد کروں جیسا کہ یہ آیت قرآن کی صاف بتلا رہی ہے۔ (برکات الدعاء، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۳)

فَلَبَّاسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۗ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا  
أَخَذْنَاهُمْ بِغُتَّةٍ فَأَذَاهُمْ مُجِيبُونَ ﴿٥٦﴾

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ ایسے وقت آئے گا کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی بلکہ لوگ ہماری تکذیب کر چکے ہوں گے کہ وہ پیشگوئی جھوٹی نکلی۔ قرآن شریف سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے: فَلَبَّاسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ۔ یہ عادت اللہ ہے کہ ایسے وقت عذاب آتا ہے جب لوگ اسے بالکل بھول جاتے ہیں۔ ایسا ہی ان الہامات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا چھپ کر آؤں گا گویا ہر شخص کا دل یقین کر لے گا کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ بَعْتَةٌ کا یہی منشاء ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

فَقَطِّعْ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۗ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٦﴾

مولوی غلام دستگیر نے میرے صدق یا کذب کا فیصلہ آیت: فَقَطِّعْ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا پر چھوڑا تھا جس کے اس محل پر یہ معنی ہیں کہ جو ظالم ہوگا اس کی جڑھ کاٹ دی جائے گی اور یہ امر کسی اہل علم پر مخفی نہیں کہ آیت ممدوحہ بالا کا مفہوم عام ہے جس کا اس شخص پر اثر ہوتا ہے جو ظالم ہے پس ضرور تھا کہ ظالم اس کے اثر سے ہلاک کیا جاتا لہذا چونکہ غلام دستگیر خدا تعالیٰ کی نظر میں ظالم تھا اس لیے اس قدر بھی اس کو مہلت نہ ملی جو اپنی اس کتاب کی اشاعت کو دیکھ لیتا اس سے پہلے ہی مر گیا اور سب کو معلوم ہے کہ وہ اس دعا سے چند روز بعد ہی فوت ہو گیا۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۳۴۴)

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي  
مَلَكٌ ۚ إِن أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۗ أَفَلَا  
تَتَفَكَّرُونَ ﴿٥٦﴾

ہَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ کیا اندھا اور بینا مساوی ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! پس جب ہم اس بات کو دیکھتے ہیں تو پھر کس قدر غلطی ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ غرض یہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرنا چاہیے اور مقابلہء مومن کے لیے تیار ہو جانا دانشمندانہ انسان کا کام نہیں ہے اور مومن کی شناخت انہیں آثار

اور نشانات سے ہو سکتی ہے جو ہم نے ابھی بیان کیے ہیں اسی فراست الہیہ کا رعب تھا جو صحابہ کرام پر تھا اور ایسا ہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہ رعب بطور نشان الہی آتا ہے۔ وہ پوچھ لیتے تھے کہ اگر یہ وحی الہی ہے تو ہم مخالفت نہیں کرتے اور وہ ایک ہیبت میں آجاتے تھے.... جو لوگ یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ مومن کے ساتھ خدا ہے وہ اس کی مخالفت چھوڑ دیتے ہیں اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو تنہا بیٹھ کر اس پر غور کرتے ہیں۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ، ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳)

وَ إِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى  
نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَا آتَاكَ مِنْ عَمَلٍ مِنْكُمْ سُوءٌ أَبْجَهَ لَةً ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَ أَصْلَحَ  
فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۵۵﴾

کفارہ کی تلاش میں لگنا ہنسی کی بات ہے کیا کفارہ وعدوں کو توڑ سکتا ہے بلکہ وعدہ وعدہ سے بدلتا ہے اور نہ کسی اور تدبیر سے جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: سَلَمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۸۱)

جو شخص غم میں سے بوجہ اپنی جہالت کے کوئی بدی کرے اور پھر توبہ کرے اور نیک کاموں میں مشغول ہو جائے پس اللہ غفور رحیم ہے۔ (شہادت القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۳۲)

وَ كَذَلِكَ نَقُصُّ الْأَيَاتِ وَ لَتَسْتَبِينَ سَبِيلَ الْمُجْرِمِينَ ﴿۵۶﴾

وَ لَتَسْتَبِينَ سَبِيلَ الْمُجْرِمِينَ ..... تا مجرموں کی راہ کھل جائے یعنی سعید لوگ الگ ہو جائیں اور شرارت پیشہ اور سرکش آدمی الگ ہو جائیں۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۰۹ احاشیہ)

وَ لَتَسْتَبِينَ سَبِيلَ الْمُجْرِمِينَ: اور تا مجرموں کی راہ صاف طور پر کھل جاوے یعنی تا معلوم ہو جاوے کہ کون لوگ تیرا ساتھ اختیار کرتے ہیں او کون لوگ بغیر بصیرت کامل کے مخالفت پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۹۳)

وَ لَتَسْتَبِينَ سَبِيلَ الْمُجْرِمِينَ: تاکہ مجرموں کی راہ کھل جائے یعنی معلوم ہو جائے کہ کون تجھ سے برگشتہ (حقیقتہ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۷۳) ہوتا ہے۔

وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ: اور تا خدا کی حجت پوری ہو جائے اور مجرموں کی راہ کھل جائے۔  
(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۳۵۸)

وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ: اور تا کہ مجرموں کی راہ کھل جائے یعنی معلوم ہو جائے کہ کون مجرم اور کون طالب حق ہے۔  
(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۳۸۶)

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ ۗ مَا عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۗ إِنَّ  
الْحُكْمَ لِلَّهِ ۗ لِيَقْضِيَ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَصِّلِينَ ۝

مجھے اپنی رسالت پر کھلی کھلی دلیل اپنے رب کی طرف سے ملی ہے

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۲۵)

کہہ میں کامل ثبوت لے کر اپنے رب کی طرف سے آیا ہوں اور تم اس ثبوت کو دیکھتے ہو اور پھر تکذیب کر رہے ہو۔ جس چیز کو تم جلدی سے مانگتے ہو (یعنی عذاب) وہ تو میرے اختیار میں نہیں۔ حکم اخیر صادر کرنا تو خدا ہی کا منصب ہے۔ وہی حق کو کھول دے گا اور وہی خیر الفاصلین ہے جو ایک دن میرا اور تمہارا فیصلہ کر دے گا۔  
(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۲۲)

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۗ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبُرِّ وَالْبَحْرِ ۗ وَمَا  
تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلْمَتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ  
إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝

میں نے کئی بار اشتہار دیا ہے کہ کوئی ایسی سچائی پیش کرو جو ہم قرآن شریف سے نہ نکال سکیں، لا رطبٍ و لا یابسٍ إلا فی کتبٍ مبینہ۔ یہ ایک ناپیدا اکتار سمندر ہے اپنے حقائق اور معارف کے لحاظ سے اور اپنی فصاحت و بلاغت کے رنگ میں۔

اگر بشر کا کلام ہوتا تو سطحی خیالات کا نمونہ دکھایا جاتا مگر یہ طرز ہی اور ہے جو بشری طرزوں سے الگ اور ممتاز ہے۔ اس میں باوجود اعلیٰ درجہ کی بلند پروازی کے نمود و نمائش بالکل نہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷/نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

اگر کسی کا یہ ارادہ ہو کہ بلا استصواب کتاب اللہ اس کا حرکت و سکون نہ ہوگا اور اپنی ہر ایک بات پر کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے گا تو یقینی امر ہے کہ کتاب اللہ مشورہ دے گی جیسے فرمایا: لَا رَطْبٌ وَلَا يَأْسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ سو اگر ہم یہ ارادہ کریں کہ ہم مشورہ کتاب اللہ سے لیں گے تو ہم کو ضرور مشورہ ملے گا۔  
(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۵)

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثْكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۵﴾

بعض جلد باز کہتے ہیں کہ توفیٰ کا لفظ قرآن کریم میں نیند کے معنی میں بھی آیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثْكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ وَإِلَىٰ رَبِّهِ رُجُوعٌ ۚ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ تَعَالَىٰ مَا أَرَادَ فِي هَذِهِ الْآيَاتِ مِنْ لَفْظِ التَّوَفَّىٰ إِلَّا الْإِمَامَةُ وَقَبْضُ الرُّوحِ ۖ فَلَأَجَلٍ ذَلِكَ أَقَامَةُ الْقَرَآنِ ۖ وَقَالَ وَاللَّيْلِ لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ يَعْنِي وَاللَّيْلِ لَمْ تَمُتْ بِمَوْتٍ حَقِيقِيٍّ يَتَوَفَّاهُ اللَّهُ فِي مَنَامِهَا بِمَوْتٍ حَقِيقِيٍّ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ أَشَارَ فِي هَذِهِ الْآيَةِ إِلَىٰ أَنَّ قَبْضَ الرُّوحِ فِي التَّوَمِّ مَوْتٌ حَقِيقِيٌّ ۖ فَذَكَرَ لَفْظَ التَّوَفَّىٰ هَهُنَا بِإِقَامَةِ قَرِينَةِ الْمَنَامِ تَنْبِيْهَا عَلَىٰ أَنَّ لَفْظَ التَّوَفَّىٰ هَهُنَا قَدْ نُقِلَ مِنَ الْمَعْنَى الْحَقِيقِيَّةِ إِلَى الْمَعْنَى

بعض جلد باز کہتے ہیں کہ توفیٰ کا لفظ قرآن کریم میں نیند کے معنی میں بھی آیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثْكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ وَإِلَىٰ رَبِّهِ رُجُوعٌ ۚ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ تَعَالَىٰ مَا أَرَادَ فِي هَذِهِ الْآيَاتِ مِنْ لَفْظِ التَّوَفَّىٰ إِلَّا الْإِمَامَةُ وَقَبْضُ الرُّوحِ ۖ فَلَأَجَلٍ ذَلِكَ أَقَامَةُ الْقَرَآنِ ۖ وَقَالَ وَاللَّيْلِ لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ يَعْنِي وَاللَّيْلِ لَمْ تَمُتْ بِمَوْتٍ حَقِيقِيٍّ يَتَوَفَّاهُ اللَّهُ فِي مَنَامِهَا بِمَوْتٍ حَقِيقِيٍّ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ أَشَارَ فِي هَذِهِ الْآيَةِ إِلَىٰ أَنَّ قَبْضَ الرُّوحِ فِي التَّوَمِّ مَوْتٌ حَقِيقِيٌّ ۖ فَذَكَرَ لَفْظَ التَّوَفَّىٰ هَهُنَا بِإِقَامَةِ قَرِينَةِ الْمَنَامِ تَنْبِيْهَا عَلَىٰ أَنَّ لَفْظَ التَّوَفَّىٰ هَهُنَا قَدْ نُقِلَ مِنَ الْمَعْنَى الْحَقِيقِيَّةِ إِلَى الْمَعْنَى

کے حقیقی معنی موت ہیں نہ کچھ اور۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں **ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ** اور **الْيَوْمَ** کا قرینہ بھی ساتھ لگایا ہے یعنی **هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ** الخ۔ کی آیت میں اور یہ قرآن اس لیے قائم کیے تا یہ بتایا جائے کہ اس جگہ **تَوَفَّى** کے لفظ کے معنی سلانے کے نہیں۔ بلکہ اس سے مراد امت اور امت کے بعد بعث ہے تاکہ یہ بات بعث یوم الدین کے لیے دلیل ہو۔

اسی لیے اس آیت کے بعد بعث یوم القيامة کا خدا تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اور فرمایا **ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ** (پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر آؤ گے) تا یہ مجازی موت اور مجازی بعث حقیقی موت اور حقیقی بعث پر دلیل ہو۔ (ترجمہ از مرتب)

الْمَجَازِيِّ، وَإِشَارَةً إِلَى أَنَّ مَعْلَى لَفْظِ التَّوَفَّى حَقِيقَةً هُوَ الْمَوْتُ لَا غَيْرُهُ. وَكَذَلِكَ أَقَامَ قَرِينَةَ قَوْلِهِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ وَقَرِينَةَ اللَّيْلِ فِي آيَةٍ أُخْرَى. أَعْنِي آيَةَ وَ هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ. الخ. تَنْبِيْهَا عَلَى أَنَّ لَفْظَ التَّوَفَّى هَهُنَا لَيْسَ بِمَعْنَى الْإِنْتَامَةِ بَلِ الْمَقْصُودُ الْإِمَاتَةُ، وَالْبَعْثُ بَعْدَ الْإِمَاتَةِ لِيَكُونَ دَلِيلًا عَلَى بَعْثِ يَوْمِ الدِّينِ.

فَلِأَجْلِ ذَلِكَ ذَكَرَ بَعْثَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ بَعْدَ هَذِهِ الْآيَةِ وَقَالَ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ، لِيَجْعَلَ هَذَا الْمَوْتَ الْمَجَازِيَّ وَالْبَعْثَ الْمَجَازِيَّ دَلِيلًا عَلَى الْمَوْتِ الْحَقِيقِيِّ وَالْبَعْثِ الْحَقِيقِيِّ. (حمامة البشرى، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۳۶۱، ۳۶۲)

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ الْمَوْتُ

تَوَفَّيْتَهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ﴿۳۱﴾

تم پر حفاظت کرنے والے مقرر ہیں خدا تعالیٰ ان کو بھیجتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے چوکیدار مقرر ہیں جو اس کے بندوں کی ہر طرف سے یعنی کیا ظاہری طور پر اور کیا باطنی طور پر حفاظت کرتے ہیں۔ اس مقام میں صاحبِ معالم نے یہ حدیث لکھی ہے کہ ہر ایک بندہ کیلئے ایک فرشتہ موکل ہے جو اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اور اس کی نیند اور بیداری میں شیاطین اور دوسری بلاؤں سے اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے اور اسی مضمون کی ایک اور حدیث کعب الاحبار سے بیان کی ہے اور ابن جریر اس آیت کی تائید میں یہ حدیث لکھتا ہے: إِنَّ مَعَكُمْ مِّنْ لَّا يُفَارِقُكُمْ إِلَّا عِنْدَ الْخَلَاءِ وَعِنْدَ الْجَمَاعِ فَاسْتَحْيُوهُمْ وَ أَكْرِمُوهُمْ۔ یعنی تمہارے ساتھ وہ فرشتے ہیں کہ بجز جماع اور پاخانہ کی حاجت کے تم سے جدا نہیں ہوتے۔ سو تم ان سے شرم

کرو اور ان کی تعظیم کرو اور اسی جگہ عکرمہ سے یہ حدیث لکھی ہے کہ ملائکہ ہر ایک شتر سے بچانے کیلئے انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور جب تقدیر مبرم نازل ہو تو الگ ہو جاتے ہیں اور پھر مجاہد سے نقل کیا ہے کہ کوئی ایسا انسان نہیں جس کی حفاظت کیلئے دائمی طور پر ایک فرشتہ مقرر نہ ہو۔ پھر ایک اور حدیث عثمان بن عفان سے لکھی ہے جس کا ما حاصل یہ ہے کہ میں<sup>۲</sup> فرشتے مختلف خدمات کے بجالانے کیلئے انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور دن کو ابلیس اور رات کو ابلیس کے بچے ضرر رسانی کی غرض سے ہر دم گھات میں لگے رہتے ہیں اور پھر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ حدیث مندرجہ ذیل لکھی ہے:

حَدَّثَنَا اسْوَدُ بْنُ عَامِرٍ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ حَدَّثَنِي مَنْصُورٌ عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ عَنْ أَبِيهِ  
عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وُجِّلَ بِهِ  
قَرِينُهُ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِينُهُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالُوا وَإِيَّاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ وَإِيَّايَ وَلَكِنَّ اللَّهَ  
أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِخَيْرٍ انفراد باخراجه مسلم صفحہ ۲۴۴

یعنی توسط اسود وغیرہ عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی تم میں سے ایسا نہیں کہ جس کے ساتھ ایک قرین جن کی نوع میں سے اور ایک قرین فرشتوں میں سے موگن نہ ہو۔ صحابی نے عرض کی کہ کیا آپ بھی یا رسول اللہ صلعم؟ فرمایا کہ ہاں! میں بھی۔ پر خدا نے میرے جن کو میرے تابع کر دیا۔ سو وہ بجز خیر اور نیکی کے اور کچھ بھی مجھے نہیں کہتا۔ اس کے اخراج میں مسلم منفرد ہے اس حدیث سے صاف اور کھلے طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جیسے ایک داعی شر انسان کیلئے مقرر ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے ایسا ہی ایک داعی خیر بھی ہر ایک بشر کے لئے موگن ہے جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا اور ہمیشہ اس کا قرین اور رفیق ہے اگر خدا تعالیٰ فقط ایک داعی الی الشر ہی انسان کے لئے مقرر کرتا اور داعی الی الخیر مقرر نہ کرتا تو خدا تعالیٰ کے عدل اور رحم پر دھبہ لگتا کہ اس نے شر انگیزی اور وسوسہ اندازی کی غرض سے ایسے ضعیف اور کمزور انسان کو فتنہ میں ڈالنے کیلئے کہ جو پہلے ہی نفس اتارہ ساتھ رکھتا ہے شیطان کو ہمیشہ کا قرین اور رفیق اس کا ٹھہرا دیا جو اس کے خون میں بھی سرایت کر جاتا ہے اور دل میں داخل ہو کر ظلمت کی نجاست اس میں چھوڑ دیتا ہے مگر نیکی کی طرف بلانے والا کوئی ایسا رفیق مقرر نہ کیا تا وہ بھی دل میں داخل ہوتا اور خون میں سرایت کرتا اور تا میزان کے دونوں پلے برابر رہتے مگر اب جب کہ قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہو گیا کہ جیسے بدی کی دعوت کیلئے خدا تعالیٰ نے ہمیشہ کا قرین شیطان کو مقرر کر رکھا ہے ایسا ہی دوسری طرف نیکی کی دعوت

کرنے کیلئے رُوح القدس کو اس رحیم و کریم نے دائمی ترین انسان کا مقرر کر دیا ہے اور نہ صرف اس قدر بلکہ بقا اور لقا کی حالت میں اثر شیطان کا کالعدم ہو جاتا ہے گو یا وہ اسلام قبول کر لیتا ہے اور وہ رُوح القدس کا نور انتہائی درجہ پر چمک اٹھتا ہے تو اُس وقت اس پاک اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔ بجز اس نادان اور اندھے کے کہ جو صرف حیوانات کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اور پاک تعلیم کے نور سے کچھ بھی حصہ نہیں رکھتا بلکہ سچ اور واقعی امر تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی یہ تعلیم بھی منجملہ معجزات کے ایک معجزہ ہے کیونکہ جس خوبی اور اعتدال اور حکیمانہ شان سے اس تعلیم نے اس عقیدہ کو حل کر دیا کہ کیوں انسان میں نہایت قوی جذبات خیر یا شر کے پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ عالم رویا میں بھی ان کے انوار یا ظلمتیں صاف اور صریح طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ اس طرز محکم اور حقائق سے کسی اور کتاب نے بیان نہیں کیا اور زیادہ ترا عجازی صورت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ بجز اس طریق کے ماننے کے اور کوئی بھی طریق بن نہیں پڑتا اور اس قدر اعتراض وارد ہوتے ہیں کہ ہرگز ممکن نہیں کہ ان سے مخلصی حاصل ہو کیونکہ خدا تعالیٰ کا عام قانون قدرت ہم پر ثابت کر رہا ہے کہ جس قدر ہمارے نفوس قوی و اجسام کو اس ذات مبدئ فیض سے فائدہ پہنچتا ہے وہ بعض اور چیزوں کے توسط سے پہنچتا ہے مثلاً اگرچہ ہماری آنکھوں کو وہی روشنی بخشتا ہے مگر وہ روشنی آفتاب کے توسط سے ہم کو ملتی ہے اور ایسا ہی رات کی ظلمت جو ہمارے نفوس کو آرام پہنچاتی ہے اور ہم نفس کے حقوق اس میں ادا کر لیتے ہیں وہ بھی درحقیقت اسی کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ درحقیقت ہر ایک پیدا شونده کی علت العلل وہی ہے۔ پھر جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک بندھا ہوا قانون قدیم سے ہمارے افاضہ کے لئے چلا آتا ہے کہ ہم کسی دوسرے کے توسط سے ہر ایک فیض خدا تعالیٰ کا پاتے ہیں۔ ہاں! اس فیض کے قبول کرنے کیلئے اپنے اندر قوی بھی رکھتے ہیں جیسے ہماری آنکھ روشنی کے قبول کرنے کیلئے ایک قسم کی روشنی اپنے اندر رکھتی ہے اور ہمارے کان بھی ان اصوات کے قبول کرنے کیلئے جو ہوا پہنچاتی ہے ایک قسم کی حس اپنے اعصاب میں موجود رکھتے ہیں لیکن یہ تو نہیں کہ ہمارے قوی ایسے مستقل اور کامل طور پر اپنی بناوٹ رکھتے ہیں کہ ان کو خارجی معینات اور معاونات کی کچھ بھی ضرورت اور حاجت نہیں ہم کبھی نہیں دیکھتے کہ کوئی ہماری جسمانی قوت صرف اپنے ملکہ موجودہ سے کام چلا سکے اور خارجی مدد و معاون کی محتاج نہ ہو۔ مثلاً اگرچہ ہماری آنکھیں کیسی ہی تیز بین ہوں مگر پھر بھی ہم آفتاب کی روشنی کے محتاج ہیں اور ہمارے کان کیسے ہی شنوا ہوں مگر پھر بھی ہم اس ہوا کے حاجت مند ہیں جو آواز کو اپنے اندر لپیٹ کر ہمارے کانوں تک پہنچا دیتی ہے اس سے

ثابت ہے کہ صرف ہمارے قویٰ ہماری انسانیت کی کل چلانے کیلئے کافی نہیں ہیں۔ ضرور ہمیں خارجی مُمدّوں اور معاونوں کی حاجت ہے مگر قانون قدرت ہمیں بتلا رہا ہے کہ وہ خارجی مدد و معاون اگرچہ بلحاظ علت العلل ہونے کے خدائے تعالیٰ ہی ہے مگر اُس کا یہ انتظام ہرگز نہیں ہے کہ وہ بلا توسط ہمارے قویٰ اور اجسام پر اثر ڈالتا ہے بلکہ جہاں تک ہم نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور جس قدر ہم اپنے فکر اور ذہن اور سوچ سے کام لیتے ہیں صریح اور صاف اور بدیہی طور پر ہمیں نظر آتا ہے کہ ہر ایک فیضان کیلئے ہم میں اور ہمارے خداوند کریم میں علل متوسطہ ہیں جن کے توسط سے ہر ایک قوت اپنی حاجت کے موافق فیضان پاتی ہے پس اسی دلیل سے ملائک اور جنّات کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم نے صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ خیر اور شر کے اکتساب میں صرف ہمارے ہی قویٰ کافی نہیں بلکہ خارجی مُمدّات اور معاونات کی ضرورت ہے جو خارق عادت اثر رکھتے ہوں مگر وہ مُمدّ اور معاون خدا تعالیٰ براہ راست اور بلا توسط نہیں بلکہ بتوسط بعض اسباب ہے سو قانون قدرت کے ملاحظہ نے قطعی اور یقینی طور پر ہم پر کھول دیا کہ وہ مُمدّات اور معاونات خارج میں موجود ہیں گوان کی کنہ اور کیفیت ہم کو معلوم ہو یا نہ مگر یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ نہ براہ راست خدا تعالیٰ ہے اور نہ ہماری ہی قوتیں اور ہمارے ہی ملکہ ہیں بلکہ وہ ان دونوں قسموں سے الگ ایسی مخلوق چیزیں ہیں جو ایک مستقل وجود اپنا رکھتی ہیں اور جب ہم ان میں سے کسی کا نام داعی الی الخیر رکھیں گے تو اسی کو ہم روح القدس یا جبرائیل کہیں گے اور جب ہم ان میں سے کسی کا نام داعی الی الشر رکھیں گے تو اسی کو ہم شیطان اور ابلیس کے نام سے بھی موسوم کریں گے۔ یہ تو ضرور نہیں کہ ہم روح القدس یا شیطان ہر ایک تاریک دل کو دکھلاویں اگرچہ عارف ان کو دیکھ بھی لیتے ہیں اور کشفی مشاہدات سے وہ دونوں نظر بھی آجاتی ہیں مگر محبوب کیلئے جو ابھی نہ شیطان کو دیکھ سکتا ہے نہ روح القدس کو یہ ثبوت کافی ہے کیونکہ متاثر کے وجود سے موثر کا وجود ثابت ہوتا ہے اور اگر یہ قاعدہ صحیح نہیں ہے تو پھر خدا تعالیٰ کے وجود کا بھی کیوں کر پتہ لگ سکتا ہے؟ کیا کوئی دکھلا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کہاں ہے؟ صرف متاثرات کی طرف دیکھ کر جو اس کی قدرت کے نمونے ہیں اس موثر حقیقی کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔ ہاں! عارف اپنے انتہائی مقام پر روحانی آنکھوں سے اس کو دیکھتے ہیں اور اس کی باتوں کو بھی سنتے ہیں مگر محبوب کیلئے بجز اس کے اور استدلال کا طریق کیا ہے کہ متاثرات کو دیکھ کر اس موثر حقیقی کے وجود پر ایمان لاوے سوائے طریق سے روح القدس اور شیاطین کا وجود ثابت ہوتا ہے اور نہ صرف ثابت ہوتا ہے بلکہ نہایت صفائی سے نظر آجاتا ہے افسوس ان لوگوں کی حالت پر جو فلسفہ باطلہ کی

ظلمت سے متاثر ہو کر ملا یک اور شیاطین کے وجود سے انکار کر بیٹھے ہیں اور بینات اور نصوص صریحہ قرآن کریم سے انکار کر دیا اور نادانی سے بھرے ہوئے الحاد کے گڑھے میں گر پڑے۔ اور اس جگہ واضح رہے کہ یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن کے اثبات کے لئے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کے استنباط حقائق میں اس عاجز کو متفرد کیا ہے۔ فالحمد لله علی ذالک۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۷۹-۸۹)

قُلْ مَنْ يُنَجِّبِكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۗ لَّيِّنٌ  
أَنْجِدْنَا مَنِ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۳۷﴾

اب ظاہر ہے کہ ان آیات کا حاصل مطلب یہی ہے کہ جب بعض گناہ گاروں کو ہلاک کرنے کے لیے خدا تعالیٰ اپنے قہری ارادہ سے اس دریا میں صورت طوفان پیدا کرتا ہے جس میں ان لوگوں کی کشتی ہو تو پھر ان کی تضرع اور رجوع پر ان کو بچا لیتا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ پھر وہ مفسدانہ حرکات میں مشغول ہوں گے۔ کیا اس طوفان سے یہ غرض ہوتی ہے کہ کشتی والوں کو صرف خفیف خفیف چوٹیں لگیں مگر ہلاک نہ ہوں۔ (مجموعہ اشتہارات جلد اول صفحہ ۴۴۸)

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ  
أَرْضِكُمْ أَوْ يَلْبَسَكُمْ شِيْعًا وَيَذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ أَنْظُرْ كَيْفَ نَصْرِفُ  
الْآيَاتِ لَعَالَهُمْ يَفْقَهُونَ ﴿۳۸﴾

کہہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ تم کو نشان دکھلانے کے لیے اوپر سے کوئی عذاب نازل کرے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب نمودار ہو یا ایمان داروں کی لڑائی سے تم کو عذاب کا مزہ چکھاوے۔ دیکھو ہم کیوں کر آیات کو پھیرتے ہیں تا وہ سمجھ لیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۲ حاشیہ نمبر ۱۱) کہہ وہی پروردگار اس بات پر قادر ہے کہ اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب تم پر بھیجے اور چاہے تو تمہیں دو فریق بنا کر ایک فریق کی لڑائی کا دوسرے کو مزہ چکھا دے۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۴۳)

یہ ضرور نہیں ہے کہ خدا ہر وقت ایک ہی رنگ میں عذاب دیوے۔ قرآن شریف میں عذاب کے کئی

اقسام بیان کئے ہیں جیسے: قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْضِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيْعًا وَيُذِيقَكُمْ بَعْضَكُمْ بَعْضًا ۗ - جنگ و لڑائی وغیرہ کو بھی عذاب قرار دیا ہے۔ عذاب بہت اقسام کے ہوتے ہیں۔ کیا خدا کے پاس عذاب کی ایک ہی قسم ہے اور خدا کی عادت ہے کہ ہر نشان میں ایک پہلو اٹھا کر رکھتا ہے ورنہ وہ چاہے تو چن چن کر بڑے بڑے بد معاش ہلاک کر دے۔ سب لوگ ایک ہی دن میں سیدھے ہو جائیں۔ (البدر، جلد ۲، نمبر ۱، مورخہ ۲۳ تا ۳۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲، ۳)

قُلْ اَنْدَعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيْطٰنُ فِي الْاَرْضِ حٰيْرًا ۗ لَهٗ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَكَ اِلٰى الْهُدٰى اَتَيْنَا ۗ قُلْ اِنَّ هُدٰى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَ اٰمُرْنَا لِنُسَلِّمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۷﴾

قُلْ اِنَّ هُدٰى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى..... ان کو کہہ دے کہ تمہارے خیالات کیا چیز ہیں؟ ہدایت وہی ہے جو خدا تعالیٰ براہ راست آپ دیتا ہے ورنہ انسان اپنے غلط اجتہادات سے کتاب اللہ کے معنی بگاڑ دیتا ہے اور کچھ کا کچھ سمجھ لیتا ہے وہ خدا ہی ہے جو غلطی نہیں کھاتا لہذا ہدایت اسی کی ہدایت ہے۔ انسانوں کے اپنے خیالی معنی بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۸۷، ۸۸)

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَنِیْفًا ۗ وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۸﴾

جب تک انسان پورے طور پر حنیف ہو کر اللہ تعالیٰ ہی سے سوال نہ کرے اور اسی سے نہ مانگے سچ سمجھو کہ حقیقی طور پر وہ سچا مسلمان اور سچا مومن کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسلام کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تمام طاقتیں اندرونی ہوں یا بیرونی سب کی سب اللہ تعالیٰ ہی کے آستانہ پر گری ہوئی ہوں۔ جس طرح ایک بڑا انجن بہت سی گلوں کو چلاتا ہے پس اسی طور پر جب تک انسان اپنے ہر کام اور ہر حرکت و سکون تک کو اسی انجن کی طاقت عظمیٰ کے ماتحت نہ کر لیوے وہ کیوں کر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا قائل ہو سکتا ہے؟ اور کیوں کر اپنے آپ کو اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَنِیْفًا۔ کہتے وقت واقعی حنیف کہہ سکتا ہے؟ جیسے

منہ سے کہہ سکتا ہے دل سے بھی ادھر کی طرف متوجہ ہو تو لاریب وہ مسلم ہے وہ مومن اور حنیف ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا غیر اللہ سے سوال کرتا ہے اور ادھر بھی جھکتا ہے اور روح اور دل کی طاقتیں (اس درخت کی طرح جس کی شاخیں ابتداءً ایک طرف کر دی جائیں اور پرورش پالیں) ادھر ہی جھکتا ہے اور خدائے تعالیٰ کی طرف سے ایک سختی اور تشدد اس کے دل میں پیدا ہو کر اسے منجمد اور پتھر بنا دیتا ہے۔ جیسے وہ شاخیں پھر دوسری طرف مڑ نہیں سکتیں۔ اسی طرح پر وہ دل اور روح دن بدن خدا تعالیٰ سے دور ہوتی جاتی ہے پس یہ بڑی خطرناک اور دل کو کپکپا دینے والی بات ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے سے سوال کرے۔ اس لیے نماز کا التزام اور پابندی بڑی ضروری چیز ہے تاکہ اولاً وہ ایک عادتِ راسخہ کی طرح قائم ہو اور رجوع الی اللہ کا خیال ہو۔ پھر رفتہ رفتہ وہ وقت خود آجاتا ہے کہ انقطاع کلی کی حالت میں انسان ایک نور اور ایک لذت کا وارث ہو جاتا ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۶، ۷ جنوری ۱۹۰۲ء)

جب تک انسان پورے طور پر حنیف ہو کر اللہ تعالیٰ ہی سے سوال نہ کرے اور اسی سے نہ مانگے سچ سمجھو کہ حقیقی طور پر وہ سچا مسلمان اور سچا مومن کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسلام کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تمام طاقتیں اندرونی ہوں یا بیرونی سب کی سب اللہ تعالیٰ ہی کے آستانہ پر گری ہوئی ہوں جس طرح پر ایک بڑا انجن بہت سی گلوں کو چلاتا ہے پس اسی طور پر جب تک انسان اپنے ہر کام اور ہر حرکت و سکون کو اسی انجن کی طاقتِ عظمیٰ کے ماتحت نہ کر ليوے وہ کیوں کر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا قائل ہو سکتا ہے اور اپنے آپ کو اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہتے وقت واقعی حنیف کہہ سکتا ہے؟ جیسے منہ سے کہتا ہے ویسے ہی ادھر کی (طرف) متوجہ ہو تو لاریب وہ مسلم ہے وہ مومن اور حنیف ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا غیر اللہ سے سوال کرتا ہے اور ادھر بھی جھکتا ہے وہ یاد رکھے کہ بڑا ہی بد قسمت اور محروم ہے کہ اس پر وہ وقت آجانے والا ہے کہ وہ زبانی اور نمائشی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف نہ جھک سکے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲/۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۶)

برکات اور فیوض الہی کے حصول کے واسطے دل کی صفائی کی بھی بہت بڑی ضرورت ہے جب تک دل صاف نہ ہو کچھ نہیں۔ چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ دل پر نظر ڈالے تو اس کے کسی حصہ یا کسی گوشہ میں کوئی شعبہ نفاق کا نہ ہو جب یہ حالت ہو تو پھر الہی نظر کے ساتھ تجلیات آتی ہیں اور معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے ایسا وفادار اور صادق ہونا چاہیے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنا صدق دکھایا یا جس طرح پر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمونہ دکھایا۔ جب انسان اس نمونہ پر قدم مارتا ہے تو وہ بابرکت آدمی ہو جاتا ہے پھر دنیا کی زندگی میں کوئی ذلت نہیں اٹھاتا اور نہ تنگی رزق کی مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ اس پر خدا تعالیٰ کے فضل و احسان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کو لعنتی زندگی سے ہلاک نہیں کرتا بلکہ اس کا خاتمہ بالخیر کرتا ہے مختصر یہ کہ جو خدا تعالیٰ سے سچا اور کامل تعلق رکھتا ہو تو خدا تعالیٰ اس کی ساری مرادیں پوری کر دیتا ہے اسے نامراد نہیں رکھتا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

الَّذِينَ آمَنُوا وَ لَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَ هُمْ

مُهْتَدُونَ ﴿۱۷﴾

جب اس (انسان) کی سرشت میں محبت الہی اور موافقت باللہ بخوبی داخل ہوگئی۔ یہاں تک کہ خدا اس کے کان ہو گیا جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں ہو گیا جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو گیا جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو گیا جس سے وہ چلتا ہے تو پھر کوئی ظلم اس میں باقی نہ رہا اور ہر ایک خطرہ سے امن میں آ گیا۔ اسی درجہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: الَّذِينَ آمَنُوا وَ لَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَ هُمْ مُهْتَدُونَ۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۰۱، ۶۰۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان میں کسی ظلم کو نہیں ملا یا وہ امن کی حالت میں ہیں اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۹۴)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو کسی ظلم سے آلودہ نہیں کیا ان کو ہر ایک بلا سے امن ہے اور وہی ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔

(الرعین، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۴۱۶)

جو لوگ ان برکات و انوار پر ایمان لائیں گے کہ جو تجھ کو خدائے تعالیٰ نے عطا کیے ہیں اور ایمان ان کا خالص اور وفاداری سے ہوگا تو ضلالت کی راہوں سے امن میں آ جائیں گے اور وہی ہیں جو خدا کے نزدیک ہدایت یافتہ ہیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۶۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

خدا تعالیٰ نے اگرچہ جماعت کو وعدہ دیا ہے کہ وہ اسے اس بلا (طاعون) سے محفوظ رکھے گا مگر اس میں

بھی ایک شرط لگی ہوئی ہے کہ **لَمْ يَلْبِسُوا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ** کہ جو لوگ اپنے ایمانوں کو ظلم سے نہ ملاویں گے وہ امن میں رہیں گے..... **لَمْ اَشْكُرْكُمْ اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ** میں شرک سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہندوؤں کی طرح پتھروں کے بتوں یا اور مخلوقات کو سجدہ کیا بلکہ جو شخص ماسوا اللہ کی طرف مائل ہے اور اس پر بھروسہ کرتا ہے حتیٰ کہ دل میں جو منصوبے اور چالاکیاں رکھتا ہے ان پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ بھی شرک ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۳ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۳)

بعض وقت انسان موجودہ حالتِ امن پر بھی بے خطر ہو جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ امن میں زندگی گذارتا ہوں مگر یہ غلطی ہے کیونکہ یہ تو معلوم نہیں ہے کہ سابقہ زندگی میں کیا ہوا ہے اور کیا کیا بے اعتدالیاں اور کمزوریاں ہو چکی ہیں اس واسطے مومن کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ کبھی بے خوف نہ ہو اور ہر وقت توبہ اور استغفار کرتا رہے کیونکہ استغفار سے انسان گذشتہ بدیوں کے برے نتائج سے بھی خدا کے فضل سے بچ رہتا ہے یہ سچی بات ہے کہ توبہ اور استغفار سے گناہ بخشے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

اگر ہمارا کوئی مرید طاعون سے مر جاتا ہے تو اس پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ خدا کے کلام میں یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صرف بیعت کرنے والا ہی اس سے محفوظ رہے گا بلکہ اس نے ایک دفعہ مجھے مخاطب کر کے فرمایا: **الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ** یعنی بقدر دعویٰ کے ایمان میں کسی قسم کا ظلم نہ ہو۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ پوری وفا، پورا صدق اور اخلاص کا معاملہ ہو اور اس کی شناخت کامل ہو تو وہ شخص اس آیت کا مصداق ہو سکتا ہے لیکن یہ ایسی بات ہے کہ جس کو سوائے خدا (تعالیٰ) کے اور کوئی نہیں جان سکتا کہ آیا فلاں شخص میں پورا صدق و اخلاص ہے کہ نہیں۔ بعض وقت ایک انسان کے حق میں موت ہی اچھی ہوتی ہے کہ خدا سے اس ذریعہ سے آئندہ لغزش سے بچا لیتا ہے (جیسے بعض کافروں کے حق میں زندگی اس لیے بہتر ہوتی ہے کہ.... ان کو آئندہ ایمان نصیب ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بعض مومن کے حق میں موت اس لیے بہتر ہوتی ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو کافر ہو جاتا) کہ اس کا خاتمہ کفر پر نہ ہو۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۲، ۲۳ مورخہ ۸ تا ۱۶ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

میرے کسی کلام میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ ہر ایک شخص جو بیعت کرے وہ طاعون سے محفوظ رہے گا بلکہ یہ ذکر ہے کہ **وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا لَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاٰمَنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ**۔ پس کامل

پیروی کرنے والے اور ہر ایک ظلم سے بچنے والے جس کا علم محض خدا کو ہے بچائے جائیں گے اور کمزور لوگ طاعون سے شہید ہو کر شہادت کا اجر پائیں گے اور طاعون ان کے لیے تمحیص اور تطہیر کا موجب ٹھہرے گی۔  
(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۷۱، ۷۲)

جن لوگوں نے مجھے قبول کیا اور مجھ پر ایمان لائے اور اپنے ایمان کو کسی ظلم اور قصور اور کسی نوع کی ایمانی یا عملی تاریکی یا نقص کے ساتھ مختلط نہیں کیا وہ طاعون کے حملہ سے امن میں رہیں گے۔ پس وحی الہی سے کہاں سے یہ ثابت ہے کہ جو لوگ اپنے اندر کچھ نقص اور ظلم رکھتے ہیں یا کوئی ایمانی کمزوری ہے وہ بھی اس وعدہ الہی کے نیچے داخل ہیں۔  
(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲۳ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

ماننا پڑتا ہے کہ بعض مومنوں کو بھی طاعون ہو سکتا ہے مگر یاد رہے وہی مومن جو کامل نہیں۔ اسی لیے میرے الہام میں ہے کہ وہ طاعون سے محفوظ رہیں گے جو کہ **يَلْبِسُوا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ** کے مصداق ہیں یعنی اپنے ایمان کے نور میں کسی قسم کی تاریکی شامل نہیں کرتے اور یہ مقام سوائے کاملین کے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا سنہ ۶ ہجری میں جب طاعون پڑا ہے تو کوئی مسلمان نہیں مرا لیکن جب حضرت عمر کے عہد میں طاعون پڑا تو کئی صحابی بھی شہید ہوئے۔ وجہ یہ کہ کامل مومن ہی ایسی باتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

جن لوگوں نے مان لیا ہے اور اپنے ایمان کے ساتھ کسی ظلم کو نہ ملایا۔ ایسے لوگوں کے واسطے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے کہ جماعت کے وہ لوگ بچائے جائیں گے جو پورے طور سے ہماری ہدایتوں پر عمل کریں اور اپنے اندرونی عیوب اور اپنی غلطیوں کی میل کو دور کر دیں گے اور نفس کی بدی کی طرف نہ جھکیں گے۔  
(بدر جلد ۶ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۲۳ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

وَمِنْ اٰبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَاٰخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ ۚ وَهَدَيْنَاهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ

مُسْتَقِيمٍ ﴿۸۸﴾

اجْتَبَيْنَاهُمْ اور ہم نے ان کو چن لیا یعنی وہ باعتبار اپنی فطرتی قوتوں کے دوسروں میں سے چیدہ اور برگزیدہ تھے اس لیے قابل رسالت و نبوت ٹھہرے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۸۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۱۱)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ فَبِهِدَاهِهِمْ أَقْتَدِهٖ ۗ قُلْ لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۗ إِن هُوَ  
إِلَّا ذِكْرًا لِّلْعَالَمِينَ ﴿٩١﴾

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے نام اپنے اندر جمع رکھتے ہیں کیونکہ وہ وجود پاک جامع کمالات متفرقہ ہے پس وہ موسیٰ بھی ہے اور عیسیٰ بھی اور آدم بھی اور ابراہیم بھی اور یوسف بھی اور یعقوب بھی۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہ اشارہ فرماتا ہے: فَبِهِدَاهِهِمْ أَقْتَدِهٖ یعنی اے رسول اللہ! تو ان تمام ہدایات متفرقہ کو اپنے وجود میں جمع کر لے جو ہر ایک نبی خاص طور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ پس اس سے ثابت ہے کہ تمام انبیاء کی شانیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں شامل تھیں اور درحقیقت محمدؐ کا نام صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ محمدؐ کے یہ معنی ہیں کہ بغایت تعریف کیا گیا اور غایت درجہ کی تعریف بھی متصور ہو سکتی ہے کہ جب انبیاء کے تمام کمالات متفرقہ اور صفات خاصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہوں چنانچہ قرآن کریم کی بہت سی آیتیں جن کا اس وقت لکھنا موجب طوالت ہے اسی پر دلالت کرتی بلکہ بصراحت بتلاتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک باعتبار اپنی صفات اور کمالات کے مجموعہ انبیاء تھی اور ہر ایک نبی نے اپنے وجود کے ساتھ مناسبت پا کر یہی خیال کیا کہ میرے نام پر وہ آنے والا ہے اور قرآن کریم ایک جگہ فرماتا ہے کہ سب سے زیادہ ابراہیم سے مناسبت رکھنے والا یہ نبی ہے اور بخاری میں ایک حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری مسیح سے شدت مناسبت ہے اور اس کے وجود سے میرا وجود ملا ہوا ہے۔ پس اس حدیث میں حضرت مسیح کے اس فقرہ کی تصدیق ہے کہ وہ نبی میرے نام پر آئے گا۔ سو ایسا ہی ہوا کہ ہمارا مسیح صلی اللہ علیہ وسلم جب آیا تو اس نے مسیح ناصری کے نام تمام کاموں کو پورا کیا اور اس کی صداقت کیلئے گواہی دی اور ان تہمتوں سے اس کو بری قرار دیا جو یہود اور نصاریٰ نے اس پر لگائی تھیں اور مسیح کی روح کو خوشی پہنچائی۔ یہ مسیح ناصری کی روحانیت کا پہلا جوش تھا جو ہمارے سید، ہمارے مسیح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے اپنی مراد کو پہنچا۔ فالحمد للہ!

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۳۴۳)

یہ کمالات متفرقہ اس امت میں جمع کرنے کا کیوں وعدہ دیا گیا؟ اس میں بھید یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات متفرقہ ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَبِهِدَاهِهِمْ أَقْتَدِهٖ یعنی

تمام نبیوں کو جو ہدایتیں ملی تھیں ان سب کا اقتدار کر۔ پس ظاہر ہے کہ جو شخص ان تمام متفرق ہدایتوں کو اپنے اندر جمع کرے گا اس کا وجود ایک جامع وجود ہو جائے گا اور تمام نبیوں سے وہ افضل ہوگا پھر جو شخص اس نبی جامع الکملات کی پیروی کرے گا ضرور ہے کہ ظلی طور پر وہ بھی جامع الکملات ہو۔

(چشمہ مبہمی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۸۱)

یہ جو قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ: **فَبِهَذَا هُمْ اَقْتَدَا** پس ان کی یعنی گذشتہ نبیوں کی جن کا اوپر ذکر آیا ہے اقتدار کر۔ اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جس قدر گذشتہ انبیاء ہوئے انہوں نے مخلوق کی ہدایت مختلف پہلوؤں سے کی اور مختلف قسم کی ان میں خوبیاں تھیں۔ کسی میں کوئی خوبی اور کمال تھا اور کسی میں کوئی اور ان تمام نبیوں کی اقتدار کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ان تمام متفرق خوبیوں کو اپنے اندر جمع کر لینا چاہیے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو شخص جامع ان تمام خوبیوں کا ہے جو متفرق طور پر تمام انبیاء سے افضل ہیں کیونکہ ہر ایک کی خوبی اس میں موجود ہے اور وہ تمام متفرق خوبیوں کا جامع ہے مگر پہلے اس سے کوئی نبی ان تمام خوبیوں کا جامع نہ تھا۔

(بدر جلد ۴ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے کہ **فَبِهَذَا هُمْ اَقْتَدَا** ان کی ہدایت کی پیروی کر یعنی تمام گذشتہ انبیاء کے کمالات متفرقہ کو اپنے اندر جمع کر لے۔ یہ آیت حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی فضیلت کا اظہار کرتی ہے۔ تمام گذشتہ نبیوں اور ولیوں میں جس قدر خوبیاں اور صفات اور کمال تھے وہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دینے گئے تھے۔ سب کی ہدایتوں کا اقتدار کر کے آپ جامع تمام کمالات کے ہو گئے مگر جامع بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان متکبر نہ ہو۔ جو سمجھتا ہے کہ میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے وہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ خاکساری سے زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جہاں انسان کوئی فائدہ کی بات دیکھے چاہیے کہ اسی جگہ سے فائدہ حاصل کرے۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۳۳ مورخہ ۶ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

یہ امر جو ہے کہ تو سب کی اقتدار کر یہ امر بھی خلقی اور کونی ہے یعنی تیری فطرت کو حکم دیا کہ وہ کمالات جو جمع انبیاء علیہم السلام میں متفرق طور پر موجود تھے اس میں یکجائی طور پر موجود ہوں اور گویا اس کے ساتھ ہی وہ کمالات اور خوبیاں آپ کی ذات میں جمع ہو گئیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ ۗ قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَى نُورًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ يُبَدُّونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا ۗ وَعِلْمُتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ ۗ قُلْ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ ﴿۱۱﴾

الہام کے منکروں نے اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کا کچھ قدر شناخت نہیں کیا اور اس کی رحمت کو جو بندوں کی ہر ایک حاجت کے وقت جوش مارتی ہے نہیں پہچانا تب ہی انہوں نے کہا کہ خدا نے کوئی کتاب کسی بشر پر نازل نہیں کی۔

ترا عقل تو ہر دم پائے بند کبری دارد برو عقلے طلب کن کت ز خود بینی بروں آرد  
ہماں بہتر کہ ما آن علم حق از حق بیا موزیم کہ این علمی کہ ما داریم صد سہو و خطا دارد  
کہ گوید بہتر از قولش گر او خاموش عبشید کہ گیر دست اے ناداں گرا دست تو بگذارد  
برو قدرش بہ ہیں و از حجت بے اصل دم در کش کہ ایں حجت کہ می آری بلا با بر سر آرد  
(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۶۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

قُلِ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ: کہہ خدا نے یہ کلام اتارا ہے پھر ان کو لہو و لعب کے خیالات میں چھوڑ دے۔

قُلِ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ: ان کو جواب دے کہ خدا اس کا روبرو کا بانی ہے۔ پھر ان کو ان کی لہو و لعب میں چھوڑ دے۔

قُلِ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ: کہہ نہیں! یہ وعدے خدا کی طرف سے ہیں اور پھر ان کو ان کے لہو و لعب میں چھوڑ دے یعنی جو بدگمانی کر رہے ہیں کرتے رہیں۔ آخر دیکھ لیں گے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں یا انسان کی۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کو محدود القوی ہستی سمجھتے ہیں وہ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ میں داخل ہیں، جو ایک حد تک ہی خدا کو مانتے ہیں یہ نیچریت کا شعبہ ہے۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ یہ مشکل ہے کہ مصنوعی خدا پر موت آوے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مانا نہیں وہ مَا

قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ کے پورے مصداق ہیں۔ دنیا میں اگر کوئی ابتلا پیدا ہوتا ہے تو اس کے مصالحو اور اسباب کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس وقت دنیا بہت تاریکی میں پھنسی ہوئی ہے اور اس کو مردہ پرستی نے ہلاک کر ڈالا ہے لیکن اب خدا نے ارادہ کر لیا ہے کہ وہ دنیا کو اس ہلاکت سے نجات دے اور اس تاریکی سے اس کو روشنی میں لاوے۔ یہ کام بہتوں کی نظر میں عجیب ہے مگر جو یقین رکھتے ہیں کہ خدا قادر ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں وہ خدا جس نے ایک گن کے کہنے سے سب کچھ کر دیا کیا قادر نہیں کہ اپنے قدیم ارادہ کے موافق ایسے اسباب پیدا کرے جو لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کو دنیا تسلیم کر لے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

بعض آدمی اپنی بیوقوفی اور شتاب کاری سے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ کیا ہم نے ولی بننا ہے؟ میرے نزدیک ایسے لوگ کفر کے مقام پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو سب کو ولی کہتا ہے اور سب کو ولی بنانا چاہتا ہے اسی لئے وہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم منعم علیہ گروہ کی مانند ہو جاؤ۔ جو کہتا ہے کہ میں ایسا نہیں ہو سکتا وہ اللہ تعالیٰ پر بغل کی تہمت لگاتا ہے اور اس لئے یہ کلمہ کفر ہے..... مگر اصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ ہی کو شناخت نہیں کیا مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۱)

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اگر ہمارے پاس کبھی کچھ ہو تو دوسرے دن سب خرچ ہو جاتا ہے جو کچھ ہوتا ہے جماعت کا ہوتا ہے اور وہ بھی لنگر خانہ میں خرچ ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات کچھ بھی نہیں رہتا اور ہمیں غم پیدا ہوتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ کہیں سے بھیج دیتا ہے اکثر لوگ خدا تعالیٰ کی پوری پوری قدر نہیں سمجھتے۔ وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے۔ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (الذَّارِيَات: ۲۳)۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

یاد رکھو کہ ہر ایک چیز خدا تعالیٰ کی آواز سنتی ہے ہر ایک چیز پر خدا تعالیٰ کا تصرف ہے اور ہر ایک چیز کی تمام ڈوریاں خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اس کی حکمت ایک بے انتہا حکمت ہے جو ہر ایک ذرہ کی جڑ تک پہنچی ہوئی ہے اور ہر ایک چیز میں اتنی ہی خاصیتیں ہیں جتنی اس کی قدرتیں ہیں جو شخص اس بات پر ایمان نہیں لاتا وہ اس گروہ میں داخل ہے جو مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ کے مصداق ہیں اور چونکہ انسان کامل مظہر اتم تمام عالم کا ہوتا ہے اس لیے تمام عالم اس کی طرف وقتاً فوقتاً کھینچا جاتا ہے وہ روحانی عالم کا ایک عکس ہوتا ہے اور تمام عالم اس کی تاریخیں ہوتی ہیں اور خوارق کا یہی سر ہے۔

برکار و بارہستی اثری صد عارفاں را ز جہاں چہ دید آں کس کہ ندید ایں جہاں را  
(برکات الدعا، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۱، ۳۰ حاشیہ)

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبْرَكًا مُّصَدِّقًا لِّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ  
حَوْلَهَا ۗ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿۱۰﴾

میں ایک دن اپنے کی سرمایہ کو یاد کر رہا تھا اور نرم اور  
نوخیز سبزہ کی طرح کانپتا تھا اور انہیں غموں میں بیقرار ہو رہا  
تھا اور قرآن شریف کی آیتیں پڑھتا تھا اور دلی کوشش سے  
فکر کر رہا تھا اور تدبر اور سوچ کی دلی اونٹنی کو چلا رہا تھا اور  
خدا تعالیٰ سے مانگ رہا تھا کہ مجھے معرفت کی راہ دکھاوے  
اور اہل ظلم پر میری حجت کو پوری کرے اور اس ظلم کا  
تدارک کرے جو زیادتی کرنے والوں سے صادر ہو چکا  
ہے۔ پس اس عرصہ میں جو میں ایک سرلیج الحرکت انسان  
کی طرح فکر کر رہا تھا اور تفتیش کا تنور گرم تھا اور میں بعض  
آیتوں کو دیکھتا اور ان کے بینات میں غور کرتا تھا کہ ناگاہ  
میری آنکھوں کے سامنے ایک آیت قرآن شریف کی چمکی  
اور وہ ایسی چمک نہ تھی جیسا کہ عمان کے موتیوں کی بلکہ اس  
سے بڑھ کر تھی پس جبکہ میں نے ان آیتوں کے مضمون  
میں غور کیا اور روشنی کی پیروی کی اور ان کے میدان تک  
پہنچا تو میں نے ان آیتوں کو مخزن علوم پایا اور چھپے ہوئے  
بھیدوں کا دھندہ دیکھا۔ سو اس کے دیکھنے نے میرے بازو کو  
ہلا دیا اور اس کی قوت میرے پر ہزار سوار کی طرح ظاہر  
ہوئی اور اس کی سبزی اور تازگی نے میرے دل کو کھینچ لیا اور

فَكُنْتُ يَوْمًا أَدَّكُرُ قَلَّةَ الْبَعَاغِ وَ  
أَزْتَعِدُ كَاللُّبَاعِ. وَأَفْلَقُ فِي هَذِهِ  
الْأَحْزَانِ. وَأَقْرَأُ آيَاتِ الْقُرْآنِ وَ أَفَكِّرُ  
فِيهَا بِجَهْدِ الْجَبَانِ. وَأُرِجِي نِصْوَةَ التَّدْبِيرِ  
وَالْإِمْعَانِ وَادْعُوا اللَّهَ أَنْ يَهْدِيَنِي  
طُرُقَ الْعُرْفَانِ. وَبَيْتَمَّ حُجْبِي عَلَى أَهْلِ  
الْعُدْوَانِ. وَيَتَلَا فِي مَا سَلَفَ مِنْ جَوْرِ  
السُّعْتَدِيِّنَ. فَبَيَّنَمَا أَنَا أَفْتِشُ  
كَالْكَيْبِشِ وَقَدْ حَمَى وَطَيْسُ التَّفْتِيشِ  
وَإَنْظُرُ بَعْضَ الْآيَاتِ. وَأَتَوَسَّمُ فُحْوَاءَ  
الْبَيْتَاتِ. إِذَا تَلَّالَاتُ أَمَامَ عَيْنِي آيَةٌ  
مِّنْ آيَاتِ الْفُرْقَانِ. وَ لَا كَتَلَالُو دَرِّ  
الْعُبَانِ. فَإِذَا فَكَّرْتُ فِي فُحْوَاءِهَا.  
وَأَتَّبَعْتُ أَنْوَاعَ ضِيَاءِهَا. وَأَجَزْتُ حَمِي  
أَرْجَاءِهَا. وَأَفْضَيْتُ إِلَى فِضَائِهَا وَجَدْتُهَا  
خَزِينَةً مِّنْ خَزَائِنِ الْعُلُومِ. وَدَفِينَةً مِّنْ  
السُّبُرِ الْمَكْتُومِ. فَهَزَّتْ عِظْفِي رُؤْيُهَا وَ  
تَجَلَّتْ لِي كَجَبَرَةِ قُوَّهَا. وَأَضْبَى قَلْبِي

اس کی لڑائی نے ایک دفعہ دشمنوں کو ہلاک کر دیا اور اس کی جماعت نے میرے دل کو خوش کیا سو میں نے الحمد للہ کہا اور اللہ تعالیٰ کا شکر کیا اور میں نے ان آیات میں وہ عجائبات دیکھے جو آنکھوں کو خنکی سے بھر دیتے ہیں اور معارف کی دولت بخشتے ہیں اور مسلمانوں کے دلوں کو خوش کر دیتے ہیں اور مجھ کو لغتوں کا سراور ان کی اصل جگہ بتلائی گئی اور کلمات کے پیوند اور ان کے راز سے میں توشہ دیا گیا اور اسی طرح بلند بھید مجھ کو عطا کیے گئے اور بڑے بڑے نکتے مجھ کو دیئے گئے تا خدا تعالیٰ میرا یقین زیادہ کرے اور تا تجاؤز کرنے والوں کا پیچھا کاٹ ڈالے اور اگر تو چاہتا ہے کہ آیت موصوفہ اور اس کے حملہ سے نجات ہو تو قرآن کے اس مقام کو پڑھ جہاں یہ لکھا ہے: لِنُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا جس کے یہ معنی ہیں ہم نے قرآن کو عربی زبان میں بھیجا تا تو اس شہر کو ڈراوے جو تمام آبادیوں کی ماں ہے اور ان آبادیوں کو جو اس کے گرد ہیں یعنی تمام دنیا کو اور اس میں قرآن کی مدح اور عربی کی مدح ہے پس عقلمندوں کی طرح تدبر کر! اور غافلوں کی طرح ان پر سے مت گذر اور جان کہ یہ آیت قرآن اور عربی اور مکہ کی عظمت ظاہر کرتی ہے اور اس میں ایک نور ہے جس نے دشمنوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور لاجواب کر دیا۔ پس تمام آیت کو پڑھ اور اس کے نظام کی طرف دیکھ اور دانشمندی کی طرح تحقیق کر اور میں نے ان آیتوں میں تدبر کیا پس کئی بھید ان میں پائے۔ پھر ایک گہری غور کی تو کئی نور ان میں پائے پھر ایک بہت ہی عمیق نظر سے دیکھا تو اتارنے والے قہار کا

نُضَارُهَا وَنَضْرُئُهَا. وَاعْتَالَتِ الْعِدَا  
 كَرِيهَتُهَا. وَسَرَّتْ مُهَجَّتِي صَرِيهَتُهَا  
 فَحَمَدْتُ وَشَكَرْتُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.  
 وَرَأَيْتُ بِهَا مَا يَمْلَأُ الْعَيْنَ قَرَّةً وَيُعْطَى  
 مِنَ الْمَعَارِفِ ذَوَلَةً. وَيُسِرُّ قُلُوبَ  
 الْمُسْلِمِينَ. وَعَلِمْتُ مِنْ سِرِّ اللُّغَاتِ  
 وَمَنْوَاهَا. وَزَوَّدْتُ مِنْ فَصِّ الْكَلِمَاتِ  
 وَتَجَوَّاهَا وَكَذَلِكَ أُعْطِيَتْ مِنْ أَسْرَارِ  
 عَلَيْهَا وَنِكَاتِ عَظْمَى. لِيَزِيدَ يَقِينِي رَجِي  
 الْأَعْلَى. وَلِيَقْطَعَ دَائِرَ الْمُعْتَدِينَ. وَإِنْ  
 كُنْتُ تُحِبُّ أَنْ تَعْرِفَ الْآيَةَ وَصَوْلَهَا  
 فَاقْرَأْ لِنُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ  
 حَوْلَهَا. وَإِنَّ فِيهَا مَدْحَ الْقُرْآنِ  
 وَعَرَبِيٍّ مُّبِينٍ. فَتَدَبَّرْهَا كَالْعَاقِلِينَ. وَ  
 لَا تَمَرَّ بِهَا مُرُورَ الْغَافِلِينَ. وَعَلِمْنَا أَنَّ  
 هَذِهِ الْآيَةَ تُعَظَّمُ الْقُرْآنَ وَالْعَرَبِيَّةَ  
 وَمَكَّةَ وَ فِيهَا نُورٌ مَزَّقَ الْأَعْدَاءَ  
 وَبَكَتْ. فَاقْرَأْهَا بِتَمَامِهَا وَانظُرْ إِلَى  
 نِظَامِهَا وَفَتِّشْ كَالْمُسْتَبْصِرِينَ. وَإِنِّي  
 تَدَابَّرْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيهَا أَسْرَارًا. ثُمَّ  
 أَمَعَنْتُ فَرَأَيْتُ أَنْوَارًا. ثُمَّ عَمَّقْتُ  
 فَشَاهَدْتُ مُدْرِلًا قَهَّارًا رَبَّ  
 الْعَالَمِينَ. وَكُشِفَ عَلَيَّ أَنَّ الْآيَةَ

مجھے مشاہدہ ہوا جو رب العالمین ہے اور میرے پرکھولا گیا کہ آیت موصوفہ اور اشارات ملفوفہ عربی کے فضائل کی طرف ہدایت کرتی ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ ام الالسنہ ہے اور قرآن پہلی کتابوں کا ام یعنی اصل ہے اور مکہ تمام زمین کا ام ہے۔ سو مجھے اس آیت کی روشنی نے طرح طرح کے فہم اور درایت کی طرف کھینچا اور مجھے یہ بھید سمجھ آ گیا کہ قرآن کیوں عربی زبان میں نازل ہوا اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نبوت ختم ہوئی اس میں بھید کیا ہے پھر میرے پر اور آیتیں ظاہر ہوئیں اور بعض نے بعض کی متواتر مدد کی یہاں تک کہ میرے خدا نے حق الیقین تک مجھے کھینچ لیا اور یقین کرنے والوں میں مجھے داخل کیا اور میرے پر ظاہر ہو گیا کہ قرآن ہی پہلی تمام کتابوں کی ماں ہے اور ایسا ہی عربی تمام زبانوں کی ماں اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور باقی زبانیں اس کی بیٹی بیٹیوں کی طرح ہیں اور کچھ شک نہیں کہ وہ تمام زبانیں اس کے فرزندوں یا خانہ زاد کینیزکوں کی طرح ہیں اور ہر ایک اسی کی دیگوں اور اسی کے خوان میں سے کھا رہا ہے اور ہر ایک اسی کے پھل چکھ رہا ہے اور اسی خوان سے اپنے پیٹ بھر رہے ہیں اور اسی دریا سے پانی پی رہے ہیں اور اسی حلہ سے انہوں نے اپنا لباس بنایا ہے اور وہ ان کی مربی ہے جس نے بعاریت ان کو لباس دیا اور اپنی ذات کے لیے مسند اختیار کیا اور یہ بات کہ اگر عربی ام الالسنہ ہی ہے تو زبانوں کی ترکیبوں میں کیوں اختلاف ہے تو یہ کچھ

الْمَوْصُوفَةَ وَالْإِشَارَاتِ الْمَلْفُوفَةَ. تَهْدِي إِلَى فَضَائِلِ الْعَرَبِيَّةِ. وَتُشِيرُ إِلَى أَنَّهَا أُمُّ الْأَلْسِنَةِ. وَأَنَّ الْقُرْآنَ أُمُّ الْكُتُبِ السَّابِقَةِ. وَأَنَّ مَكَّةَ أُمُّ الْأَرْضِينَ. فَاقْتَادِنِي بِرُوقِ هَذِهِ الْآيَةِ إِلَى أَنْوَاعِ التَّنَطُّسِ وَالِدَّرَايَةِ. وَفَهْمُ سِرِّ نَزُولِ الْقُرْآنِ فِي هَذَا اللِّسَانِ وَسِرِّ خْتَمِ النَّبُوَّةِ عَلَى خَيْرِ الْبَرِيَّةِ وَخْتَمِ الْمُرْسَلِينَ. ثُمَّ ظَهَرَتْ عَلَيَّ آيَاتٌ أُخْرَى وَ أَيْدٍ بَعْضُهَا بَعْضًا تَتَرَا. حَتَّى جَرَّنِي رَبِّي إِلَى حَقِّ الْيَقِينِ. وَأَدْخَلَنِي فِي الْمُسْتَيَقِينِ. وَظَهَرَ عَلَيَّ أَنَّ الْقُرْآنَ هُوَ أُمُّ الْكُتُبِ الْأُولَى وَالْعَرَبِيَّةِ أُمُّ الْأَلْسِنَةِ مِنَ اللَّهِ الْأَعْلَى. وَأَمَّا الْبَاقِيَّةُ مِنَ اللُّغَاتِ فَهِيَ لَهَا كَالْبَنِينَ أَوِ الْبَنَاتِ. وَلَا شَكَّ أَنَّهَا كَبِشَلٌ وَلَدِيهَا أَوْ وَلَا يَدِيهَا وَكُلٌّ يَأْكُلُ مِنْ أَعْشَارِهَا وَمَوَايِدِهَا وَكُلٌّ يَجْتَنُونَ فَكَيْهَةَ هَذِهِ اللَّهْجَةِ وَيَمْلَأُونَ الْبُطُونَ بِتِلْكَ الْمَائِدَةِ وَيَشْرَبُونَ مِنْ تِلْكَ اللَّجَّةِ وَ يَتَّخِذُونَ لِبَاسًا مِنْ هَذِهِ الْحَلَّةِ. فَهِيَ مُرَبِّيَّةٌ أَعَارَهَا الدَّسْتُ. وَاخْتَارَ لِنَفْسِهَا الدَّسْتَ. وَأَمَّا اخْتِلَافُ

عجیب بات نہیں اور اسی طرح جو اختلاف تصریف اور اطراد مواد میں ہے وہ بھی عدم اتحاد کی دلیل نہیں ٹھہر سکتا اور اگر یہ تھوڑا سا اختلاف بھی جو ترکیبات کا اختلاف ہے لغات میں باقی نہ رہے تو وہ تغایر درمیان سے اٹھ جائے گا جو کثرت لغات کا موجب ہے کیونکہ مختلف ترکیبوں کا زبانوں میں پایا جانا ہی تو وہ امر ہے جس نے زبانوں کی صورت کو متغایر کر رکھا ہے اور وہی تو زبانوں کے تفرقہ کا پہلا سبب ہے پس کسی معترض کے لیے جائز نہیں جو ایسے کلمے منہ پر لاوے اور ایسے اعتراضات کی گنجائش کہاں ہے کیونکہ یہ مصادرہ علی المطلوب ہے جو مناظرات میں ممنوع ہے اور تجھے یہ بات کفایت کرتی ہے کہ تمام زبانیں بہت سے مفردات میں شریک ہیں اور میں نے یہ مبالغہ سے نہیں کہا۔ بلکہ میں عنقریب تجھے بدیہات کی طرح دکھلاؤں گا۔ پس تو قائم اور ثابت قدم ہو جیسا کہ تو نے سن لیا اور خطا کاروں میں سے مت ہو اور میں نے جب قرآن کریم سے دلائل پائے اور کتاب اللہ کی گواہی سے میرا دل مطمئن ہو گیا تو میں نے ارادہ کیا کہ احادیث سے بھی کچھ دلائل لوں پس جبکہ میں نے حدیث کو دیکھا تو اس میں بہت بھید پائے پس میں ایسا خوش ہوا جیسا کہ نشاء مینے والا شراب سے خوش ہوتا ہے اور جیسا کہ مست کو شراب سے خوشی پہنچتی ہے اور خدا تعالیٰ کا میں نے شکر کیا جو پیوں کا حامی ہے۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

الْأَلْسِنَةَ فِي صُورِ التَّرَكِيبِ فَلَيْسَ مِنَ الْعَجِيبِ وَكَذَلِكَ الْإِخْتِلَافُ فِي التَّصْرِيفِ وَالْأَطْرَادِ الْمَوَادِّ لَيْسَ مِنْ دَلَائِلِ عَدَمِ الْإِتِّحَادِ وَالْوَلَا اخْتِلَافٌ بِهَذَا الْقَدْرِ فِي التَّرَكِيبَاتِ لَا مَتَمَّعَ تَغَايُرٌ يُوجِبُ كَثْرَةَ اللُّغَاتِ. فَإِنَّ وُجُودَ التَّرَاكِيبِ الْمُخْتَلِفَةِ هُوَ الَّذِي غَيَّرَ صُورَ الْأَلْسِنَةِ. وَهُوَ السَّبَبُ الْأَوَّلُ لِلتَّفَرُّقَةِ فَلَا يَسُوغُ لِمُعْتَرِضٍ أَنْ يَتَكَلَّمَ بِمِثْلِ هَذِهِ الْكَلِمَاتِ. وَ آيْنُ مُنْتَدِحَةٌ هَذِهِ الْإِعْتِرَاضَاتِ فَإِنَّهَا مُصَادِرَةٌ وَ مِنَ الْمَبْنُوعَاتِ وَكَفَالِكَ أَنَّ الْأَلْسِنَةَ كُلَّهَا مُشْتَرِكَةٌ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْمَفْرَدَاتِ. وَ مَا أَوْعَلْتُ بَلْ سَأُرِيكَ كَأَجَلِي الْبَدِيهِيَّاتِ فَاسْتَقَمَّ كَمَا سَمِعْتَ وَ لَا تَكُنْ مِنَ الْمُخْطِئِينَ. وَإِنِّي لَنَا وَجَدْتُ الدَّلَائِلَ مِنَ الْفُرْقَانِ وَاطْمَنَّ قَلْبِي بِكِتَابِ اللَّهِ الرَّحْمَانِ أَرَدْتُ أَنْ أَظْلُبَ الشَّهَادَةَ مِنَ الْأَثَارِ. فَإِذَا فِيهَا كَثِيرٌ مِنَ الْأَسْرَارِ فَفَرِحْتُ بِهَا فَرَحَةَ النَّشْوَانِ بِالْظَّلَاءِ وَ وَجَدْتُ وَجْدَ الثَّيْلِ بِالصَّهْبَاءِ وَشَكَرْتُ اللَّهُ نَصِيرَ الصَّادِقِينَ.

اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کے کئی مقامات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زبانوں کی ماں اور خدا کی وحی صرف عربی ہے اور اسی واسطے اس نے مکہ کا نام مکہ اور ام القرى رکھا کیوں کہ لوگوں نے اس سے ہدایت اور زبان کا دودھ پیا پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف عربی زبان ہی نطق اور عقل کا منبع ہے پس خدا تعالیٰ کے اس قول میں فکر کر کہ یہ قرآن عربی ہے تا تو مکہ کو جو تمام آبادیوں کی ماں ہے ڈراوے اور اس میں اس شخص کے لیے نشان ہے جو خدا سے ڈرے اور حق کو ڈھونڈے اور انکار نہ کرے اور کنارہ کش لوگوں کا پیرو نہ ہو۔ پھر تو جانتا ہے کہ ہمارا رسول خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لیے نذیر ہے اور یہی خدا تعالیٰ نے اس کا نام رکھا ہے اور وہ اصدق الصادقین خدا ہے پس اس سے ثابت ہوا کہ مکہ تمام دنیا کی ماں ہے اور تمام قلیل و کثیر کا مولد ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عربی تمام زبانوں کی ماں ہے کیونکہ مکہ تمام مکانوں کی ماں ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قرآن تمام الہی کتابوں کی ماں ہے اور اسی لیے کامل زبان میں اترا ہے جو محیط کل ہے اور الہی ارادوں کی حکمتوں نے تقاضا کیا کہ اس کی کامل کتاب جو خاتم الکتب ہے اس زبان میں نازل ہو جو جز زبانوں کی ہے اور تمام مخلوقات کی زبانوں کی ماں ہے اور وہ عربی ہے۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

وَإِنَّ اللَّهَ أَوْحَىٰ فِي مَقَامَاتٍ مِّنَ الْفُرْقَانِ إِلَىٰ أَنَّ الْعَرَبِيَّةَ هِيَ أُمَّةُ الْأَلْسِنَةِ وَوَحَىٰ الرَّحْمَانِ. وَلَا جِلَّ ذَلِكُمْ سَمِيًّا مَّكَّةَ وَأُمَّةَ الْقُرَىٰ. فَإِنَّ النَّاسَ أَرْضِعُوا مِنْهَا لِبَنَانِ اللَّسَانِ وَالْهُدَىٰ. فَهَذِهِ إِشَارَةٌ إِلَىٰ أَنَّهُمَا هِيَ مَنبَعُ النَّطْقِ وَاللُّغَىٰ. فَفَكِّرْ فِي قَوْلِ رَبِّ الْوَرَىٰ قُرَانًا عَرَبِيًّا لِيُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ ۗ وَفِي ذَلِكُمْ آيَةٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ اللَّهَ وَيَخْشَوْنَ الْحَقَّ وَلَا يَأْتُونَ وَلَا يَتَّبِعُونَ سُبُلَ الْمُعْرِضِينَ. ثُمَّ أَنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ رَسُولَنَا خَاتَمَ النَّبِيِّينَ كَانَ نَذِيرًا لِلْعَالَمِينَ. وَكَذَلِكَ سَمَاءُ رَبُّهُ وَهُوَ أَصْدَقُ الصَّادِقِينَ. فَجَبَّتْ أَنَّ مَكَّةَ أُمَّ الدُّنْيَا كُلِّهَا وَمَوْلِدُ كَثْرَتِهَا وَقَلْبُهَا وَمَبْدَأُ أَصْلِ اللُّغَاتِ وَمَرْكَزُ الْكَائِنَاتِ أَجْمَعِينَ. وَثَبَّتْ مَعَهُ أَنَّ الْعَرَبِيَّةَ أُمَّةُ الْأَلْسِنَةِ بِمَا كَانَتْ مَكَّةَ أُمَّةُ الْأَمَكِنَةِ مِنْ بَدَأِ الْفِطْرَةِ. وَثَبَّتْ أَنَّ الْقُرْآنَ أُمَّةُ الصُّحُفِ الْمُطَهَّرَةِ. وَلِذَلِكَ نَزَلَ فِي اللُّغَةِ الْكَامِلَةِ الْمَحِيظَةِ. وَاقْتَضَتْ حِكْمَ إِرَادَاتِ الْإِلَهِيَّةِ أَنْ يَنْزَلَ كِتَابُهُ الْكَامِلُ الْخَاتَمُ فِي اللُّهْجَةِ الْعَرَبِيَّةِ هِيَ أَصْلُ الْأَلْسِنَةِ وَ أُمَّةٌ كُلِّ لُغَةٍ مِّنْ لُّغَاتِ الدُّنْيَا. وَهِيَ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ.

(من الرحمن، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸)

اگر اشتراک الالسنہ کی مثال پوچھنا چاہو تو لفظ ام اور امۃ کافی ہے یہ لفظ ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی بلکہ سب زبانوں میں مشترک ہے اور تجربہ اس پر گواہ ہے اور وجہ تسمیہ بتاتی ہے کہ یہ لفظ عربی زبان سے عجمی بولیوں میں گیا۔ کیونکہ حقیقی وجہ تسمیہ اسی زبان میں ہے اور اوروں میں بناوٹ اور تکلف ہے کیونکہ حقیقی وجہ تسمیہ کی شان یہ ہے کہ کسی زمانہ میں بھی وہ مسمیٰ سے الگ نہ ہو اور کبھی بھی کوئی اس سے اس کو الگ نہ کر سکے اور انسانی تصنع کی بوجہ اس میں نہ پائی جائے اور دیکھنے سننے والا اس کی نسبت پکاراٹھے کہ لاریب یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

وَ اِنْ كُنْتَ تَقْتَرِحُ اَنْ تَسْمَعَ وَيُنِي فِي  
اَشْتِرَاكِ الْاَلْسِنَةِ فَكَفَاكَ لَفْظُ الْاُمِّ وَالْاُمَّةِ. فَاِنَّ هَذَا  
لَفْظًا تَشَارَكَ فِيهِ اللِّسَانُ الْهِنْدِيَّةُ وَالْعَرَبِيَّةُ. وَ كَذَلِكَ  
اللِّسَانُ الْفَارِسِيَّةُ وَالْاِنْكِلِيْبِيَّةُ. بَلْ كُلُّهَا كَمَا تَشْهَدُ  
التَّجْرِبَةُ الصَّحِيحَةُ فَاَنْظُرْ كَالْمُنْقِدِ يَنْ وَقَدْ ظَهَرَ مِنْ  
وَجْهِ التَّسْمِيَةِ. اِنَّ هَذَا اللَّفْظَ دَخَلَ فِي الْاَلْسِنِ الْاَعْ  
جَمِيَّةِ مِنَ الْعَرَبِيَّةِ فَاِنَّ التَّسْمِيَةَ بِحَقِيْقَةٍ لَا تُوجَدُ اِلَّا  
فِي هَذَا اللِّسَانِ. وَ اَمَّا غَيْرُهُ فَلَا يَجْلُو مِنَ التَّصْنُجِ فِي  
الْبَيَانِ. فَاِنَّ مِنْ شَأْنِ التَّسْمِيَةِ الْحَقِيْقِيَّةِ الَّذِي هِيَ مِنْ  
حَصْرَةِ الْعُرَّةِ. اَنْ لَا تَنْفَكَ بِرَمَسٍ مِنَ الْاَزْمَنَةِ الثَّلَاثَةِ  
وَتَكُوْنَ لِلْمَسْمِيِّ كَالْعَرَضِ الْاَلَزِمِ وَ اَنْ تُجَايِزُهُ فِي هَذِهِ  
النَّشْأَةِ وَلَا يَفْرُضُ فَرَضٌ فَاْرِضٌ كَوْنَهَا فِي وَقْتٍ مِنَ  
الْاُمُوْرِ الْمُنْفَكَّةِ وَ لَا تَكُوْنَ كَالْاُمُوْرِ الْمُسْتَحْدَاثَةِ  
الْمَصْنُوْعَةِ وَ لَا تُوجَدُ فِيهَا رِيْحُ التَّصْنُغَاتِ الْاِلْسِيَّةِ وَ  
يُوْفَّرُ مِنْ اسْتَشْفَافِ جَوْهَرِهَا بِاَيْتِهَا مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(من الرحمن، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۲۲، ۲۳۸)

وَ جَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوا لَهُ بَنِيْنَ وَ بَنَتْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ

سُبْحٰنَهُ وَ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۱﴾

وَ خَرَقُوا لَهُ بَنِيْنَ وَ بَنَتْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ..... فرمایا کہ ان لوگوں نے ناحق اپنے دل سے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تراش رکھی ہیں اور نہیں جانتے کہ ابن مریم ایک عاجز انسان تھا۔ اگر خدا چاہے تو عیسیٰ ابن مریم کی مانند کوئی اور آدمی پیدا کر دے یا اس سے بھی بہتر جیسا کہ اس نے کیا۔

(دفع البلاء و معیار اہل الاصفاء، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۴۰)

سُبْحٰنَهُ وَتَعَالٰی عَمَّا يُصِفُوْنَ..... خدا تعالیٰ ان عیبوں سے پاک و برتر ہے جو وہ لوگ اس کی ذات پر لگاتے ہیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۰۶ حاشیہ نمبر ۳)

اور مشرک لوگ ایسے نادان ہیں کہ جنات کو خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے اور اس کے لیے بغیر کسی علم اور اطلاع حقیقتِ حال کے بیٹے اور بیٹیاں تراش رکھی ہیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۳ حاشیہ نمبر ۳)

(عرب صاحب نے عرض کیا کہ خدا آسمان پر ہے فرمایا:)

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے لہٰذا اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (ظہ: ۹) اس نے اپنے آپ کو عَلُوٰہی سے منسوب کیا ہے پستی کی طرف اس کو منسوب نہیں کر سکتے سبحانہ و تعالیٰ۔ عَلُوٰہی کو ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور کشفی صورتوں میں آسمان سے نور نازل ہوتا ہوا دیکھا ہے گو ہم اس کی کنہ اور کیفیت بیان نہ کر سکیں مگر یہ سچی بات ہے کہ اس کو عَلُوٰہی سے تعلق ہے بعض امور آنکھوں سے نظر آتے ہیں اور بعض نہیں ہر صورت میں فلسفہ کام نہیں آتا پس اصل بات یہی ہے کہ ایک وقت ایسی حالت انسان پر آتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ آسمان سے اس کے دل پر کچھ گرا ہے جو اسے رقیق کر دیتا ہے اس وقت نیکی کا بیج اس میں بویا جائے گا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

بَدِيعِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ اُنّٰی يَكُوْنُ لَهٗ وَاَدَّ وَ لَمْ تَكُنْ لَهٗ صَاحِبَةً ۗ وَ خَاقِ  
كُلِّ شَيْءٍ ۗ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳۰﴾

لفظ کل کے ساتھ جو احاطہ تامہ کے لیے آتا ہے ہر ایک چیز کو جو اس کے سوا ہے مخلوق میں داخل کر دیا۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۶۵)

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۗ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۗ وَ هُوَ الْاَلْبَسُ الْخَبِيْرُ ﴿۳۱﴾

آنکھیں اس کی کنہ دریافت کرنے سے عاجز ہیں اور اس کو آنکھوں کی کنہ معلوم ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۱ حاشیہ نمبر ۳)

اس کی مانند کوئی بھی چیز نہیں بصارتیں اور بصیرتیں اس کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتیں اور اس کو ہر یک نظر اور فکر کی

حدود معلوم ہیں۔ (شخصہ حق، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۳۹۸)

خدا کی اصل حقیقت کا اندازہ کسی کو معلوم نہیں صرف سماعی باتوں پر مدار رہا مطلب یہ کہ ایمان کے طور پر خدا کو مانا گیا مگر اصل کنہ اس کی کسی کو معلوم نہ ہوئی..... لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ یعنی خدا کو آنکھیں نہیں پاسکتیں اور وہ آنکھوں کو پاسکتا ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی کنہ کوئی عقل دریافت نہیں کر سکتی۔ (ست پجین، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲)

خدا تعالیٰ کی ذات تو مخفی اور غیب در غیب اور وراء الوراہ ہے اور کوئی عقل اس کو دریافت نہیں کر سکتی جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ یعنی بصارت میں اور بصیرت میں اس کو پاسکتیں اور وہ اُن کے انتہا کو جانتا ہے اور اُن پر غالب ہے۔ پس اُس کی توحید محض عقل کے ذریعہ سے غیر ممکن ہے کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ انسان آفاقی باطل معبودوں سے کنارہ کرتا ہے یعنی جوں یا انسانوں یا سورج چاند وغیرہ کی پرستش سے دستکش ہوتا ہے۔ ایسا ہی نفسی باطل معبودوں سے پرہیز کرے یعنی اپنی روحانی جسمانی طاقتوں پر بھروسہ کرنے سے اور اُن کے ذریعہ سے عجب کی بلا میں گرفتار ہونے سے اپنے تئیں بچاوے۔ پس اس صورت میں ظاہر ہے کہ مجزئ ترک خودی اور رسول کا دامن پکڑنے کے توحید کامل حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور جو شخص اپنی کسی قوت کو شریک باری ٹھہراتا ہے وہ کیونکر موحد کہلا سکتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۴، ۱۳۸)

وہ غیر محدود ہے جیسا کہ اس آیت میں لکھا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ یعنی آنکھیں اس کے انتہا کو نہیں پاسکتیں اور وہ آنکھوں کے انتہا تک پہنچتا ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۹۷)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ اس جگہ بظاہر انکار دیدار ہے اور اس کے مخالف یہ آیت ہے اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (القیامۃ: ۲۴) اس سے دیدار ثابت ہوتا ہے مسیح اور یحییٰ کے کلمات میں اسی قسم کا تناقض ہے جو دراصل تناقض نہیں ایک نے مجاز کو ذہن میں رکھا اور دوسرے نے حقیقت کو اس لیے کچھ تناقض نہ ہوا۔ (تزیاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۶۳ حاشیہ)

خدا کے کلام میں دقیق نظر کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور مخلوقات کی ترتیب اس کے

ازلی ہونے کی مخالف نہیں ہے اور استعارات کو ظاہر پر حمل کر کے مشہودات پر لانا بھی ایک نادانی ہے۔ اس کی صفت ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔

(الہد راجلہ ۲ نمبر ۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸)

خدا کی کنہ میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ اسلم طریق یہی ہے کہ انسان لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ پر ایمان رکھے کہ میرا منصب نہیں کہ خدا کی کل صفات کو میں دیکھ لوں اور ان کی تحقیقات کر لوں۔

طیب بیان کرتے ہیں کہ پانی سرد اور آگ گرم ہے مگر یہ نہیں بتلا سکتے کہ پانی سرد کیوں ہے اور آگ گرم کیوں ہے؟ فلاسفر بھی یہاں گنہ اشیا میں آ کر عاجز رہ گئے ہیں۔ یہاں اَفَوْضَ اِلٰی اللّٰهِ پرحلے کہ ہم خدا پر چھوڑ دیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

حقیقت میں محبت کے ثمرات میں سے نفی وجود ضروری ہے۔ اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا بلکہ قرآن شریف سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جو فنا فی اللہ کہلاتا ہے لیکن وجود یوں کا یہ حال نہیں ان کا تو یہ حال ہے کہ گویا انہوں نے ڈاکٹروں کی طرح تشریح کر کے خدا تعالیٰ کو دیکھ لیا ہے۔ تب ہی تو یہ خود بھی خدا بننے ہیں حالانکہ یہ صریح غلط اور بے ہودہ امر ہے۔ اللہ تعالیٰ تو صاف فرماتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

بجز اس طریق کے کہ خدا خود ہی تجلی کرے اور کوئی دوسرا طریق نہیں ہے جس سے اس کی ذات پر یقین کامل حاصل ہو لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ سے بھی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ابصار پر وہ آپ ہی روشنی ڈالے تو ڈالے۔ ابصار کی مجال نہیں ہے کہ خود اپنی قوت سے اسے شناخت کر لیں۔

(الہد راجلہ ۲ نمبر ۲ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳)

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کے یہی معنی ہیں کہ وہ صرف عقولوں کے ذریعہ سے شناخت نہیں کیا جا سکتا بلکہ خود جو ذریعہ (اس) نے بتلائے ہیں ان سے ہی اپنے وجود کو شناخت کروا تا ہے اور اس امر کے لیے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ جیسی اور کوئی دعا نہیں ہے۔

(الہد راجلہ ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۚ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا

## اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ﴿۱۵﴾

خدا نے میری رسالت پر روشن نشان تمہیں دیئے ہیں۔ سو جو ان کو شناخت کرے اس نے اپنے ہی نفس کو فائدہ پہنچایا اور جو اندھا ہو جائے اس کا وبال بھی اسی پر ہے میں تو تم پر نگہبان نہیں۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۲۲، ۴۲۳)

وَلَا تَسْبُوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسْبُوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَلِكَ زَيْنًا لِّكُلِّ أُمَّةٍ عَلَيْهِمْ ۗ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس قدر ہمیں طریق ادب اور اخلاق کا سبق سکھلایا ہے کہ وہ فرماتا ہے کہ لَا تَسْبُوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسْبُوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (سورة الانعام الجزء ۷) یعنی تم مشرکوں کے بتوں کو بھی گالی مت دو کہ وہ پھر تمہارے خدا کو گالیاں دیں گے کیونکہ وہ اس خدا کو جانتے نہیں۔ اب دیکھو کہ باوجودیکہ خدا کی تعلیم کی رو سے بت کچھ چیز نہیں ہیں مگر پھر بھی خدا مسلمانوں کو یہ اخلاق سکھلاتا ہے کہ بتوں کی بدگونی سے بھی اپنی زبان بند رکھو اور صرف نرمی سے سمجھاؤ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ مشتعل ہو کر خدا کو گالیاں نکالیں اور ان گالیوں کے تم باعث ٹھہر جاؤ۔ (پیغام صلح، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۶۰، ۴۶۱)

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۗ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۚ إِنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۷﴾

یہ لوگ سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر کوئی نشان دیکھیں تو ضرور ایمان لے آئیں گے ان کو کہہ دے کہ نشان تو خدا تعالیٰ کے پاس ہیں اور تمہیں خبر نہیں کہ جب نشان بھی دیکھیں گے تو کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۳۳۳)

قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ یعنی ان کو کہہ دو کہ نشان اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں جس نشان کو چاہتا ہے اسی نشان کو ظاہر کرتا ہے بندہ کا اُس پر زور نہیں ہے کہ جبر کے ساتھ اس سے ایک نشان لیوے۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۵۵)

اقتراح کے نشانوں کو اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ نبی کبھی جرأت کر کے یہ نہیں کہے گا کہ تم جو نشان مجھ سے

مانگو میں وہی دکھانے کو طیار ہوں اس کے منہ سے جب نکلے گا یہی نکلے گا: اِنَّمَا الْاٰلِیْتُ عِنْدَ اللّٰهِ اور یہی اس کی صداقت کا نشان ہوتا ہے۔ کم نصیب مخالف اس قسم کی آیتوں سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ معجزات سے انکار کیا گیا ہے مگر وہ آنکھوں کے اندھے ہیں ان کو معجزات کی حقیقت ہی معلوم نہیں ہوتی اس لیے وہ ایسے اعتراض کرتے ہیں اور نہ ذات باری کی عزت اور جبروت کا ادب ان کے دل پر ہوتا ہے ہمارا خدا تعالیٰ پر کیا حق ہے کہ ہم جو کہیں وہ وہی کر دے۔ یہ سوء ادب ہے اور ایسا خدا خدا ہی نہیں ہو سکتا..... پس اقتراحی نشانات سے اس لیے منع کیا جاتا ہے اور روکا جاتا ہے کہ اس میں پہلی رگ سوء ادبی کی پیدا ہو جاتی ہے جو ایمان کی جڑ کاٹ ڈالتی ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

وَ نَقَلَبُ اٰیٰتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَ نَدَّرْهُمْ فِیْ طَعِیَانِهِمْ یَعْبَهُوْنَ ﴿۱۱﴾

نشانیوں کے دکھلانے کا ذکر قرآن شریف میں جا بجا آیا ہے بعض جگہ اپنے پہلے نشانوں کا حوالہ بھی دیا ہے دیکھو آیت کَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖ اَوَّلَ مَرَّةٍ۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۴)

اَفْغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَعِیْ حَکْمًا وَ هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ اِلَیْكُمْ الْکِتٰبَ مَفْصَلًا ۗ وَ الَّذِیْنَ اٰتٰیْنٰهُمْ الْکِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ مُنْزَلٌ مِّنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۱۱﴾

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے وہی کچھ حدیث میں۔ ہاں! بعض باتوں کا استنباط ایسا اعلیٰ حدیثوں نے کیا ہے کہ دوسرے کو اس کو سمجھ نہیں سکتے ورنہ حدیث قرآن سے باہر نہیں۔ خدا نے قرآن کا نام رکھا ہے مفصلاً اس پر ایمان ہونا چاہیے۔ بعض تفاسیر سوائے انبیاء کے اور کی سمجھ نہیں آتیں پھر اس طرح حدیث میں قرآن سے زائد کچھ نہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

کیا بجز خدا کے میں کوئی اور حکم طلب کروں اور وہ وہی ہے جس نے مفصل کتاب تم پر اتاری اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب یعنی قرآن دیا ہے مراد یہ ہے کہ جن کو ہم نے علم قرآن سمجھایا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ ہے سوائے پڑھنے والے تو شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اب ان آیات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب اس آیت کے جو فلا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُتَكَبِّرِينَ ہے ایسے لوگ ہیں جو ہنوز یقین اور ایمان اور علم سے کم حصہ رکھتے ہیں بلکہ اوپر کی آیتوں سے یہ بھی کھلتا ہے کہ اس جگہ یہ حکم فلا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُتَكَبِّرِينَ کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ شروع کی آیت میں جس سے یہ آیت تعلق رکھتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی قول ہے یعنی یہ کہ أَفَغَيْرَ اللَّهِ ابْتِغَىٰ حَكَمًا سوان تمام آیات کا بماحورہ ترجمہ یہ ہے کہ میں بجز خدائے تعالیٰ کے کوئی اور حکم جو مجھ میں اور تم میں فیصلہ کرے مقرر نہیں کر سکتا وہ وہی ہے جس نے تم پر مفصل کتاب نازل کی سو جن کو اس کتاب کا علم دیا گیا ہے وہ اس کا منجانب اللہ ہونا خوب جانتے ہیں سو تو (اے بے خبر آدمی) شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اب تحقیق سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شک نہیں کرتے بلکہ شک کرنے والوں کو بحوالہ شواہد و دلائل منع فرماتے ہیں پس باوجود ایسے کھلے کھلے بیان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف شک فی الرسائل کو منسوب کرنا بے خبری و بے علمی یا محض تعصب نہیں تو کیا ہے۔

پھر اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر شک کرنے سے بعض ایسے نو مسلم یا متردّد منع کئے گئے تھے جو ضعیف الایمان تھے تو ان کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ تم شک مت کرو نہ یہ کہ تو شک مت کر کیونکہ ضعیف الایمان آدمی صرف ایک ہی نہیں ہوتا بلکہ کئی ہوتے ہیں بجائے جمع کے واحد مخاطب کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وحدت سے وحدت جنسی مراد ہے جو جماعت کا حکم رکھتی ہے اگر تم اوّل سے آخر تک قرآن شریف کو پڑھو تو یہ عام محاورہ اُس میں پاؤ گے کہ وہ اکثر مقامات میں جماعت کو فرد واحد کی صورت میں مخاطب کرتا ہے..... تمام قرآن شریف میں ایک نقطہ یا ایک شعثہ اس بات پر دلالت کرنے والا نہیں پاؤ گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت یا قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے کی نسبت کچھ شک تھا بلکہ یقینی اور قطعی بات ہے کہ جس قدر یقین کامل و بصیرت کامل و معرفت اکمل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات بابرکات کی نسبت دعویٰ کیا ہے اور پھر اُس کا ثبوت دیا ہے ایسا کامل ثبوت کسی دوسری موجودہ کتاب میں ہرگز نہیں پایا جاتا۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۲۲۲ تا ۲۶۲)

وَ اِنْ تُطْعَمْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿۹۷﴾

قرآن کریم کی محکمات اور بینات علم ہے اور مخالف قرآن کے جو کچھ ہے وہ ظن ہے اور جو شخص علم ہوتے ظن کا اتباع کرے وہ اس آیت کے نیچے داخل ہے۔ (الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۹۴)

وَ مَا لَكُمْ اِلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذَكَرَ اللّٰهُ عَلَيْهٖ وَ قَدْ فَضَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرَّرْتُمْ اِلَيْهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَاٰيِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۰﴾

(اس سوال کے جواب میں کہ کیا کسی غریب سید کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے فرمایا:)

اصل میں منع ہے۔ اگر اضطراری حالت ہو، فاقہ پر فاقہ ہو تو ایسی مجبوری کی حالت میں جائز ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِلَّا مَا اضْطُرَّرْتُمْ اِلَيْهٖ۔ حدیث سے فتویٰ تو یہ ہے کہ نہ دینی چاہیے اگر سید کو اور قسم کا رزق آتا ہو تو اسے زکوٰۃ لینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہاں! اگر اضطراری حالت ہو تو اور بات ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

اَوْ مَنْ كَانَ مِيْتًا فَاحْيِيْنِهٖ وَ جَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّشِيْءُ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مِّثْلُهٗ فِي الظُّلْمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ؕ كَذٰلِكَ ذُرِّيَّتُ الْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱﴾

کیا وہ شخص جو مردہ تھا اور ہم نے اس کو زندہ کیا اور ہم نے اس کو ایک نور عطا کیا جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے یعنی اس نور کی برکات لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں کیا ایسا آدمی اس آدمی کی مانند ہو سکتا ہے جو سراسر تاریکی میں اسیر ہے اور اس سے نکل نہیں سکتا نور اور حیات سے مراد روح القدس ہے کیونکہ اس سے ظلمت دور ہوتی ہے اور وہ دلوں کو زندہ کرتا ہے اسی لیے اس کا نام روح القدس ہے یعنی پاکی کی روح جس کے داخل ہونے سے ایک پاک زندگی حاصل ہوتی ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۹۹)

وَ اِذَا جَاءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَا اُوْتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ؕ اللّٰهُ

أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ﴿۲۵﴾

صاحب الہام ہونے میں استعداد اور قابلیت شرط ہے یہ بات نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس خدائے تعالیٰ کا پیغمبر بن جائے اور ہر ایک پر حقانی وحی نازل ہو جایا کرے، اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ ہی اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ ہے: وَ إِذَا جَاءَهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّى نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۗ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ یعنی جس وقت قرآن کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے کوئی نشانی کفار کو دکھائی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ جب تک خود ہم پر ہی کتاب الہی نازل نہ ہو تب تک ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ خدا خوب جانتا ہے کہ کس جگہ اور کس محل پر رسالت کو رکھنا چاہیے۔ یعنی قابل اور ناقابل اسے معلوم ہے اور اسی پر فیضان الہام کرتا ہے کہ جو جو ہر قابل ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حکیم مطلق نے افراد بشریہ کو بوجہ مصالح مختلفہ مختلف طوروں پر پیدا کیا ہے اور تمام بنی آدم کا سلسلہ فطرت ایک ایسے خط سے مشابہ رکھا ہے جس کی ایک طرف نہایت ارتفاع پر واقعہ ہو اور دوسری طرف نہایت انحضاض پر۔ طرف ارتفاع میں وہ نفوس صافیہ ہیں جن کی استعدادیں حسب مراتب متفاوتہ کامل درجہ پر ہیں اور طرف انحضاض میں وہ نفوس ہیں جن کو اس سلسلہ میں ایسی پست جگہ ملی ہے کہ حیوانات لا یعقل کے قریب قریب پہنچ گئے ہیں اور درمیان میں وہ نفوس ہیں جو عقل وغیرہ میں درمیان کے درجہ میں ہیں اور اس کے اثبات کے لئے مشاہدہ افراد مختلفہ الاستعداد کافی دلیل ہے۔ کیونکہ کوئی عاقل اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ افراد بشریہ عقل کے رو سے تقویٰ اور خدا ترسی کے لحاظ سے محبت الہیہ کی وجہ سے مختلف مدارج پر پڑی ہوئی ہیں اور جس طرح قدرتی واقعات سے کوئی خوبصورت پیدا ہوتا ہے، کوئی بدصورت، کوئی سوجا کھا، کوئی اندھا، کوئی ضعیف البصر، کوئی قوی البصر، کوئی تام الخلق، کوئی ناقص الخلق۔ اسی طرح قویٰ دماغیہ اور انوار قلبیہ کا تفاوت مراتب بھی مشہود اور محسوس ہے۔ ہاں! یہ سچ بات ہے کہ ہر ایک فرد بشر بشرطیکہ نرا محبط الحواس اور مسلوب العقل نہ ہو عقل میں، تقویٰ میں، محبت الہیہ میں ترقی کر سکتا ہے۔ مگر اس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی نفس اپنے دائرہ قابلیت سے زیادہ ہرگز ترقی نہیں کر سکتا۔ ایک شخص جو اپنے قویٰ دماغیہ میں من حیث الفطرت نہایت کمزور ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک ایسا دھوا آدمی ہے جس کو ہمارے ملک کے

عوام الناس دو لے شاہ کا چوہا کہا کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگرچہ اس کی تعلیم و تربیت میں کیسی ہی کوشش و محنت کی جائے اور خواہ کیسا ہی کوئی بڑا فلاسفر اس کا اتالیق بنایا جاوے لیکن تب بھی وہ اس فطرتی حد سے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے زیادہ ترقی کرنے پر قادر نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ باعث تنگی دائرہ قابلیت ان مراتبہ عالیہ تک ہرگز پہنچ نہیں سکتا جن تک ایک وسیع القوی آدمی پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایسا بدیہی مسئلہ ہے کہ میں باور نہیں کر سکتا کہ کوئی عاقل اس میں غور کر کے پھر اس سے منکر رہے۔ ہاں جو شخص رقبہ عقل سے قطعاً مخلف ہوا اگر وہ منکر ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر تفاوت فی العقول نہ ہو تو فہم علوم میں کیوں اختلاف پایا جاوے۔ کیوں بعض اذہان بعضوں پر سبقت لے جائیں۔ حالانکہ جو لوگ تعلیم و تربیت کا پیشہ رکھتے ہیں وہ اس امر کو خوب سمجھتے ہوں گے کہ بعض طالب العلم ایسے ذکی الطبع ہوتے ہیں کہ ادنیٰ رمز اور اشارت سے مطلب کو پا جاتے ہیں۔ بعض ایسے بیدار مغز کہ خود اپنی طبع سے عمدہ عمدہ باتیں نکالتے ہیں اور بعضوں کی طبیعتیں اصل فطرت سے کچھ ایسی غبی و بلید واقع ہوتی ہیں کہ ہر اتم ان سے مغز زنی کرو کیسا ہی کھول کر سمجھاؤ بات کو نہیں سمجھتے اور اگر تعجب شدید کے بعد کچھ سمجھے بھی تو پھر حافظہ ندارد۔ ایسے جلد بھولتے ہیں جیسے پانی کا نقش مٹ جاتا ہے۔ اسی طرح قوی اخلاقیہ اور انوار قلبیہ میں بغایت درجہ تفاوت پایا جاتا ہے۔ ایک ہی باپ کے دو بیٹے ہوتے ہیں اور ایک ہی استاد سے تربیت پاتے ہیں پر کوئی ان میں سے سلیم الطبع اور نیک ذات نکلتا ہے اور کوئی خمیٹ اور شریر النفس اور کوئی بزدل اور کوئی شجاع اور کوئی غیور اور کوئی بے غیرت۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شریر النفس بھی وعظ و نصیحت سے کسی قدر صلاحیت پر آ جاتا ہے کبھی بزدل بھی بوجہ کسی نفسانی طمع کے کچھ دلیری ظاہر کرتا ہے جس سے کم تجربہ آدمی اس غلطی میں پڑ جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی اصلیت کو چھوڑ دیا ہے لیکن ہم بار بار یاد دلاتے ہیں کہ کوئی نفس اپنی قابلیت کی حد سے آگے قدم نہیں رکھتا۔ اگر کچھ ترقی کرتا ہے تو اسی دائرے کے اندر اندر کرتا ہے جو اس کی فطرتی طاقتوں کا دائرہ ہے۔ بہت سے کم فہم لوگوں نے یہ دھوکا کھایا ہے کہ قوی فطرتیہ بذریعہ ریاضات مناسبہ اپنے پیدائشی اندازے سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تر مہمل اور دوران عقل عیسائیوں کا قول ہے کہ صرف مسیح کو خدا ماننے سے انسان کی فطرت مُنقلب ہو جاتی ہے اور گو کیسا ہی کوئی من حیث الخلق قوی سبعیہ یا قوی شہویہ کا مغلوب ہو۔ یا قوت عقلیہ میں ضعیف ہو۔ وہ فقط حضرت عیسیٰ کو خدائے تعالیٰ کا اکلوتا بیٹا کہنے سے اپنی جملی حالت چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ایسے خیالات انہیں لوگوں کے دل میں اٹھتے ہیں جنہوں نے علوم طبعی اور طبابت میں کبھی غور نہیں کیا جن کی

آنکھیں فرط غضب اور مخلوق پرستی سے اندھی ہو گئی ہیں ورنہ طبائع مختلفہ کا مسئلہ یہاں تک ثابت ہے کہ حکماء نے جب اس بارہ میں تحقیق کی تو متواتر تجربوں سے ان پر یہ امر کھل گیا کہ بزدل یا شجاع ہونا اور طبعاً مسک ہونا یا سختی ہونا اور ضعیف العقل یا قوی العقل ہونا اور دنی الہمت یا رفیع الہمت ہونا اور بردبار یا مغلوب الغضب ہونا اور فاسد الخیال یا صالح الخیال ہونا یہ اس قسم کے عوارض نہیں ہیں کہ سرسری اور اتفاقی ہوں بلکہ صانع قدیم نے بنی آدم کی کیفیت مواد اور کمیت اخلاط اور سینہ اور دل اور کھوپڑی کی وضع خلقت میں مختلف طور پر طرح طرح کے فرق رکھے ہیں۔ انہیں فرقوں کے باعث سے افراد انسانی کی قوی اخلاقیہ اور عقلیہ میں فرق بین نظر آتا ہے۔ اس قدیم رائے کو ڈاکٹروں نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ ان کا بھی یہ قول ہے کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی کھوپڑیوں کو جب غور سے دیکھا گیا تو ان کی وضع ترکیب ایسی پائی گئی جو اسی فرقہ فاسد الخیال سے مخصوص ہے۔ بعض یونانیوں نے اس سے بھی کچھ بڑھ کر لکھا ہے۔ بعض گردن اور آنکھ اور پیشانی اور ناک اور دوسرے کئی اعضاء سے بھی اندرونی حالات کا استنباط کرتے ہیں۔ بہر حال یہ ثابت ہو چکا ہے اور اس کے ماننے سے کچھ چارہ نہیں کہ بنی آدم کا خلقی اور عقلی استعدادوں میں فطرتی تفاوت واقع ہے اور ہر ایک نفس کسی قدر صلاحیت کی طرف تو قدم رکھتا ہے۔ مگر اپنی قابلیت کے دائرہ سے زیادہ نہیں۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۸۱ تا ۱۸۴ احاشیہ نمبر ۱۱)

جب کوئی نشان پاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم کبھی نہیں مانیں گے جب تک ہمیں خود ہی وہ باتیں حاصل نہ

ہوں جو رسولوں کو ملتی ہیں۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۴۲)

ذرا غور کرنے سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ جسے خدا تعالیٰ مامور کرتا ہے ضرور ہے کہ اس کے لیے اجتناب اور

اصطفا ہو اور کچھ نہ کچھ اس میں ضرور خصوصیت چاہیے کہ خدا تعالیٰ کل مخلوق میں سے اسے برگزیدہ کرے۔

خدا کی نظر خطا جانے والی نہیں ہوتی پس جب وہ کسی کو منتخب کرتا ہے وہ معمولی آدمی نہیں ہوتا قرآن شریف میں

بھی اسی کی طرف اشارہ ہے: **اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ**۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

**إِنَّ مَا تَعْدُونَ لَأَلٍ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۳۰﴾**

جو کچھ تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے یعنی دین اسلام کا عزت کے ساتھ دنیا میں پھیل جانا اور اس کے روکنے

والوں کا ذلیل اور رسوا ہو جانا یہ وعدہ عنقریب پورا ہونے والا ہے اور تم ہرگز اس کو روک نہیں سکو گے۔  
(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۴۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

قُلْ يَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ ۚ اِنِّي عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۗ مَنْ تَكُونُ لَهُ  
عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۳﴾

اگر تم بھی کچھ چیز ہو تو اپنے مکان پر فیصلہ کے لیے کوشش کرو اور میں بھی کروں گا پھر تم دیکھو گے کہ خدا کس کے ساتھ ہے۔  
(تزیین القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۲۶۹ حاشیہ)

اس وقت خود اسلام میں کئی فرقے موجود ہیں جو کہ ایک دوسرے کی تردید کر رہے ہیں پھر دوسرے مذاہب کے حملے الگ ہیں..... اور ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ ہم حق پر ہیں پس ایسی حالت میں فیصلہ کرنا ایک آسان امر نہیں ہے یا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کو فہم دے اور رشد عطا کرے اور یا خود انسان جلدی نہ کرے اور صبر اور دعا سے کام لے تاکہ وقت پر حقیقت کھل جاوے کہ خدا کی تائید اور نصرت کس کے شامل حال ہے کیونکہ جھوٹے مذہب کے ساتھ اس کی نصرت اور تائید کبھی شامل نہیں ہو سکتی۔ اگر جھوٹے مذہب کی بھی وہی خاطر خدا کو ہو جو کہ سچے مذہب کی ہوتی ہے تو پھر سچ اور جھوٹ کا امتیاز کرنا محال ہو جائے گا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے کہ قرآن شریف میں درج ہے یہ جواب دیا کہ: اَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ ۚ اِنِّي عَامِلٌ کہ اگر تم لوگوں پر میرا سچا ہونا مشتبہ ہے تو تم بھی اپنی اپنی جگہ عمل کرو میں بھی کرتا ہوں انجام پر دیکھ لینا کہ خدا کی تائید اور نصرت کس کے شامل حال ہے۔

(الہدٰی جلد ۴ نمبر ۶ مورخہ ۱۸ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

اَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ ۚ اِنِّي عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ تم اپنی جگہ کام کرو میں اپنا کام کرتا ہوں عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ سچا کون ہے۔  
(بدر جلد ۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

ان کو کہہ کہ تم اپنے طور پر اپنی کامیابی کے لیے عمل میں مشغول رہو اور میں بھی مشغول ہوں پھر دیکھو گے کہ کس کے عمل میں قبولیت پیدا ہوتی ہے۔  
(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۹۵)

قُلْ لَا اَجِدُ فِي مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ يَطْعَمُهٗٓ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ مَيْتَةً

أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِزْيِيرٍ فَإِنَّهُ رَجْسٌ أَوْ فَسَقًا أَهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۚ فَمَنْ  
اضْطَرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ عَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۰﴾

دیکھو سود کا کس قدر سنگین گناہ ہے کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں۔ سور کا کھانا تو بحالت اضطرار جائز رکھا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: فَمَنْ اضْطَرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ یعنی جو شخص باغی نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اللہ غفور و رحیم ہے مگر سود کے لیے نہیں فرمایا کہ بحالت اضطرار جائز ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۵ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ  
شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَلِكَ جَزَيْنَهُمْ  
بِغَيْرِهِمْ ۗ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۳۱﴾

عیسائی نامہ نگاروں نے بیان کیا ہے کہ اگر انبیاء کی نسبت جرم کا لفظ نہیں آیا تو یہودیوں کی نسبت بھی نہیں آیا۔ یہ ان کی جہالت کا دوسرا ثبوت ہے یہودیوں کی نسبت کئی جگہ جرم کا لفظ قرآن شریف میں آیا ہے۔ نمونہ کے لیے صرف تین آیتیں لکھنی کافی ہوں گی۔ ایک آیت یہ ہے: وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَلِكَ جَزَيْنَهُمْ بِغَيْرِهِمْ ۗ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ اس آیت میں یہودیوں کا ذکر ہے جن کی نسبت لفظ مجرمین آیا ہے۔ دوسری آیت یہ ہے: وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَأَنْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرُمْ وَأَوَّكَّانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرَ الْمُؤْمِنِينَ (الزوم: ۴۸) اس آیت میں گذشتہ انبیاء کے دشمنوں کو مجرم بیان کیا ہے حضرت مسیح بھی انہیں نبیوں میں شامل ہیں اس لیے ان کے دشمن قرآن شریف کی رو سے مجرم ٹھہرتے ہیں۔ اب ہم عیسائی صاحبان سے پوچھتے ہیں کہ آیا یہودی حضرت مسیح کے دشمن تھے یا دوست؟ اگر وہ آپ کے دوست تھے تو بیشک وہ مجرم نہیں ہیں لیکن اگر وہ آپ کے دشمن تھے تو پھر قرآن شریف کی رو سے وہ مجرم ٹھہرتے ہیں۔ تیسری آیت یہ ہے: وَ كَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ (الفرقان: ۳۲)

اس آیت سے بھی انبیاء کے دشمن مجرمین کے لفظ سے پکارے گئے ہیں اور اس لیے یہودی بھی مجرم ٹھہرتے ہیں کیونکہ وہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے جانی دشمن تھے اور آنحضرتؐ کے بھی دشمن تھے۔

عیسائی نامہ نگاروں کو اپنے اس بیہودہ قول سے شرم کرنی چاہیے کہ قرآن شریف میں جرم کا لفظ یہودیوں کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ ان کا یہ قول بھی ایسا ہی بیہودہ ہے جیسا کہ ان کا پہلا قول کہ جرم کا لفظ قرآن شریف میں آیا ہی نہیں۔ اس سے عیسائی نامہ نگاروں نے صرف اپنی کم علمی کا ہی ثبوت نہیں دیا بلکہ اپنی کم فہمی کا بھی ثبوت دیا ہے اگر قرآن شریف میں یہودیوں کی نسبت جرم لفظ نہ بھی آتا تو کیا پھر وہ انبیاء سے مساوی ٹھہر سکتے تھے؟ خدا ان کی نسبت ان کی بد عملی اور بدی بیان کرتے ہوئے ہر ایک لفظ سے کام لیتا ہے جو خیال میں آسکتا ہے ان کو فاسق، ملعون، کافر، معتدین، شیطین، ظالم، بندر، مغضوب علیہم وغیرہ بیان کرتا ہے۔ ان الفاظ کے مقابل اگر قرآن شریف یہودیوں کی نسبت جرم کا لفظ نہ بھی بیان کرتا تو کیا وہ انبیاء کی طرح بے گناہ ثابت ہو سکتے تھے جن کے متعلق ان الفاظ میں سے کوئی بھی استعمال نہیں ہوا۔

(ریویو آف دیلیجنز جلد ۲ نمبر ۶ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۳۸، ۲۳۹)

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسْعَاءٍ ۖ وَلَا يَرُدُّ بَأْسَهُ عَنِ الْقَوْمِ

الْمُجْرِمِينَ ﴿۳۸﴾

اگر یہ لوگ تکذیب پر کمر بستہ ہوں تو ان کو کہہ دے کہ اگر تم ایمان لاؤ تو خدا کی وسیع رحمت سے تمہیں حصہ ملے گا اور اگر تکذیب سے باز نہ آؤ تو اس کا عذاب ایسا نہیں کہ کسی حیلہ اور تدبیر سے ٹل سکے۔

(ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۲۳۳، ۲۳۴ حاشیہ)

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۖ وَ بِالْوَالِدَيْنِ

إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ ۖ مِمَّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرِزُقُكُمْ ۖ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا

الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطْنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا

بِالْحَقِّ ۖ ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۳۹﴾

لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ..... اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳۵، ۳۳۶)

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۗ وَ أَوفُوا  
الْكَيْلَ وَالْهَيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۗ لَا تَكْفِفْ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۗ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدُوا ۗ وَ لَوْ  
كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ وَ بِعَهْدِ اللَّهِ أَوفُوا ۗ ذٰلِكُمْ وَصَّوْكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۵۷﴾

وَ إِذَا قُلْتُمْ فَاعْدُوا ۗ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ..... اور جب تم بولو تو وہی بات منہ پر لاؤ جو سراسر سچ اور  
عدالت کی بات ہے اگرچہ تم اپنے کسی قریبی پر گواہی دو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۰، ۳۶۱)

وَ أَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ ۗ وَلَا تَتَّبِعُوا السَّبِيلَ فَتَفْزَقَ بِكُمْ عَنْ  
سَبِيلِهِ ۗ ذٰلِكُمْ وَصَّوْكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۵۸﴾

ان کو کہہ دے کہ میری راہ جو ہے وہی راہ سیدھی ہے سو تم اسی کی پیروی کرو اور اور راہوں پر مت چلو کہ وہ  
تمہیں خدا تعالیٰ سے دور ڈال دیں گی۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۶۴، ۱۶۵)

یہ میری راہ ہے سو آؤ میری راہ اختیار کرو اور اس کے مخالف کوئی راہ اختیار نہ کرو کہ خدا سے دور جا پڑو  
گے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۲۵)

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ  
رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ أَمَنَتْ مِنْ قَبْلُ  
أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انْتظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ ﴿۵۹﴾

جب بعض نشان ظاہر ہوں گے تو اس دن ایمان لانا بے سود ہوگا اور جو شخص صرف نشان کے دیکھنے کے  
بعد ایمان لایا ہے اس کو وہ ایمان نفع نہیں دے گا۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۳۳۳)

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۶۰﴾

مخالفین کو کہہ دے کہ میں جان کو دوست نہیں رکھتا۔ میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا خدا کے لیے

ہے وہی حقدار خدا جس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا ہے۔ (شخصہ حق، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۳۳۰، ۳۳۱ حاشیہ) ان کو کہہ دے کہ میری نماز اور میری پرستش میں جدوجہد اور میری قربانیاں اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کے لئے اور اس کی راہ میں ہے۔ وہی خدا جو تمام عالموں کا رب ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں اول المسلمین ہوں یعنی دنیا کی ابتداء سے اس کے اخیر تک میرے جیسا اور کوئی کامل انسان نہیں جو ایسا اعلیٰ درجہ کا فنا فی اللہ ہو جو خدا تعالیٰ کی ساری امانتیں اس کو واپس دینے والا ہو۔ اس آیت میں ان نادان موحدوں کا رد ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلت کلی ثابت نہیں اور ضعیف حدیثوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مجھ کو یونس بن مثنیٰ سے بھی زیادہ فضیلت دی جائے۔ یہ نادان نہیں سمجھتے کہ اگر وہ حدیث صحیح بھی ہوتی بھی وہ بطور انکسار اور تدلل ہے جو ہمیشہ ہمارے سید صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی ہر ایک بات کا ایک موقع اور محل ہوتا ہے اگر کوئی صالح اپنے خط میں احقر عبد اللہ لکھے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ شخص درحقیقت تمام دنیا یہاں تک کہ بت پرستوں اور تمام فاسقوں سے بدتر ہے اور خود اقرار کرتا ہے کہ وہ احقر عبد اللہ ہے کس قدر نادانی اور شرارت نفس ہے۔

غور سے دیکھنا چاہیے کہ جس حالت میں اللہ جل شانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اول المسلمین رکھتا ہے اور تمام مطیعوں اور فرمانبرداروں کا سردار ٹھہراتا ہے اور سب سے پہلے امانت کو واپس دینے والا آنحضرت صلعم کو قرار دیتا ہے تو پھر کیا بعد اس کے کسی قرآن کریم کے ماننے والے کو گنجائش ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اعلیٰ میں کسی طرح کا جرح کر سکے۔ خدا تعالیٰ نے آیت موصوفہ بالا میں اسلام کے لئے کئی مراتب رکھ کر سب مدارج سے اعلیٰ درجہ وہی ٹھہرایا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کو عنایت فرمایا۔ سُبْحَانَ اللَّهِ مَا عَظَّمَهُ شَأْنُكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ۔

موسیٰ و عیسیٰ ہمہ خلیلِ تواند      جملہ درین راہ طفیلِ تواند

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۶۲ تا ۱۶۴)

نجات اس کو ملتی ہے جس نے اپنا سارا وجود اللہ کی راہ میں سوپ دیا۔ یعنی اپنی زندگی کو خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیا اور اس کی راہ میں لگا دیا اور وہ بعد وقف کرنے اپنی زندگی کے نیک کاموں میں مشغول ہو گیا اور ہر ایک قسم کے اعمالِ حسنہ بجالانے لگا پس وہی شخص ہے جس کو اس کا اجر اس کے رب کے پاس سے ملے گا

اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ ڈر ہے اور نہ وہ کبھی غمگین ہوں گے یعنی وہ پورے اور کامل طور پر نجات پا جائیں گے۔ اس مقام میں اللہ جل شانہ نے عیسائیوں اور یہودیوں کی نسبت فرما دیا کہ جو وہ اپنی اپنی نجات یا نبی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں اور ان آرزوؤں کی حقیقت جو زندگی کی روح ہے ان میں ہرگز پائی نہیں جاتی بلکہ اصلی اور حقیقی نجات وہ ہے جو اسی دنیا میں اس کی حقیقت نجات یا بندہ کو محسوس ہو جائے اور وہ اس طرح پر ہے کہ نجات یا بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ توفیق عطا ہو جائے کہ وہ اپنا تمام وجود خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دے۔ اس طرح پر کہ اس کا مرنا اور جینا اور اس کے تمام اعمال خدا تعالیٰ کے لئے ہو جائیں اور اپنے نفس سے وہ بالکل کھو یا جائے اور اس کی مرضی خدا تعالیٰ کی مرضی ہو جائے اور پھر نہ صرف دل کے عزم تک یہ بات محدود رہے بلکہ اس کی تمام جوارج اور اس کے تمام قوی اور اس کی عقل اور اس کا فکر اور اس کی تمام طاقتیں اسی راہ میں لگ جائیں تب اس کو کہا جائے گا کہ وہ محسن ہے یعنی خدمت گاری کا اور فرمانبرداری کا حق بحال یا جہاں تک اس کی بشریت سے ہو سکتا تھا سو ایسا شخص نجات یاب ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام میں فرماتا ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗٓ وَبِنَالِكَ اُورْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (س ۸ سورہ انعام رکوع ۷) کہہ نماز میری اور عبادتیں میری اور زندگی میری اور موت میری تمام اس اللہ واسطے ہیں جو رب ہے عالموں کا جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی درجہ کے حاصل کرنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں اول مسلمانوں کا ہوں۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴)

کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

(سب بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۹)

میری نماز اور میری قربانی اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کے لئے ہے اور جب انسان کی محبت خدا کے ساتھ اس درجہ تک پہنچ جائے کہ اس کا مرنا اور جینا اپنے لئے نہیں بلکہ خدا ہی کے لئے ہو جائے۔ تب وہ خدا جو ہمیشہ سے پیار کرنے والوں کے ساتھ پیار کرتا آیا ہے اپنی محبت کو اس پر اتارتا ہے اور ان دونوں محبتوں کے ملنے سے انسان کے اندر ایک نور پیدا ہوتا ہے جس کو دنیا نہیں پہچانتی اور نہ سمجھ سکتی ہے اور ہزاروں صدیقیوں اور ہرگزیدوں کا اسی لئے خون ہوا کہ دنیا نے ان کو نہیں پہچانا۔ وہ اسی لئے مکار اور خود غرض کہلائے کہ دنیا ان کے نورانی چہرہ کو دیکھ نہ سکی۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۸۴)

کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا اس خدا کیلئے ہے جس کی ربوبیت تمام چیزوں پر محیط ہے کوئی چیز اور کوئی شخص اس کا شریک نہیں اور مخلوق کو کسی قسم کی شراکت اس کے ساتھ نہیں۔ مجھے یہی حکم ہے کہ میں ایسا کروں اور اسلام کے مفہوم پر قائم ہونے والا یعنی خدا کی راہ میں اپنے وجود کی قربانی دینے والا سب سے اول میں ہوں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۲۵)

ان کو کہہ دے کہ میری عبادت اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا خدا کی راہ میں ہے یعنی اس کا جلال ظاہر کرنے کے لئے اور نیز اس کے بندوں کے آرام دینے کے لئے ہے تا میرے مرنے سے ان کو زندگی حاصل ہو۔ اس جگہ جو خدا کی راہ میں اور بندوں کی بھلائی کے لئے مرنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ آپ نے نعوذ باللہ! جاہلوں یا دیوانوں کی طرح درحقیقت خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس وہم سے کہ اپنے تئیں کسی آلہ سے قتل کے ذریعہ سے ہلاک کر دینا اوروں کو فائدہ پہنچائے گا بلکہ آپ ان بیہودہ باتوں کے سخت مخالف تھے اور قرآن ایسی خودکشی کے مرتکب کو سخت مجرم اور قابل سزا ٹھہراتا ہے۔... غرض اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی ہمدردی اور محنت اٹھانے سے بنی نوع کی رہائی کے لئے جان کو وقف کر دیا تھا اور دُعا کے ساتھ اور تبلیغ کے ساتھ اور ان کے جو رجحان اٹھانے کے ساتھ اور ہر ایک مناسب اور حکیمانہ طریق کے ساتھ اپنی جان اور اپنے آرام کو اس راہ میں فدا کر دیا تھا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۳۸، ۴۳۹)

اور اسی وجہ سے ان ذبح ہونے والے جانوروں کا نام قربانی رکھا گیا کیونکہ حدیثوں میں آیا ہے کہ یہ قربانیاں خدا تعالیٰ کے قرب اور ملاقات کا موجب ہیں اس شخص کے لئے کہ جو قربانی کو اخلاص اور خدا پرستی اور ایمان داری سے ادا کرتا ہے اور یہ قربانیاں شریعت کی بزرگ تر عبادتوں میں سے ہیں اور اسی لئے قربانی کا نام عربی میں نسیکۃ ہے اور نُسُک کا لفظ عربی زبان میں فرمانبرداری اور بندگی کے معنوں میں آتا ہے اور ایسا ہی یہ لفظ یعنی نُسُک اُن جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی زبان مذکور میں استعمال پاتا ہے جن کا ذبح کرنا مشروع ہے۔ پس یہ

فَلَا جَلَّ ذَالِكُ سُمِّيَ الضَّحَايَا  
قُرْبَانًا - بِمَا وَرَدَ فِيهَا تَوَيْدُ قُرْبًا  
وَلُقْيَانًا. كُلُّ مَنْ قَرَّبَ إِخْلَاصًا  
وَتَعَبُّدًا وَاجْمَاعًا - وَآمَنًا مِنْ أَعْظَمِ  
نُسُكِ الشَّرِيْعَةِ - وَلِذَلِكَ سُمِّيَتْ  
بِالنَّسِيكَةِ وَالنُّسُكِ: الطَّاعَةُ  
وَالْعِبَادَةُ فِي اللِّسَانِ الْعَرَبِيِّ -  
وَكَذَلِكَ جَاءَ لَفْظُ النُّسُكِ بِمَعْنَى  
ذَنْجِ الذَّبِيحَةِ- فَهَذَا الْإِسْتِرَاكُ

اشتراک کہ جو نُسُک کے معنوں میں پایا جاتا ہے قطعی طور پر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حقیقی پرستار اور سچا عابد وہی شخص ہے جس نے اپنے نفس کو مع اس کی تمام قوتوں اور مع اس کے اُن محبوبوں کے جن کی طرف اُس کا دل کھینچا گیا ہے اپنے رب کی رضا جوئی کیلئے ذبح کر ڈالا ہے اور خواہش نفسانی کو دفع کیا یہاں تک کہ تمام خواہشیں پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں اور نابود ہو گئیں اور وہ خود بھی گداز ہو گیا اور اس کے وجود کا کچھ نمود نہ رہا اور چھپ گیا اور فنا کی تہ بند ہو انیس اس پر چلیں اور اس کے وجود کے ذرات کو اس ہوا کے سخت دھکے اڑا کر لے گئے۔ اور جس شخص نے ان دونوں مفہوموں میں کہ جو باہم نُسُک کے لفظ میں مشارکت رکھتے ہیں غور کی ہوگی اور اس مقام کو تدبیر کی نگاہ سے دیکھا ہوگا اور اپنے دل کی بیداری اور دونوں آنکھوں کے کھولنے سے پیش و پس کو زیر نظر رکھا ہوگا پس اُس پر پوشیدہ نہیں رہے گا اور اس امر میں کسی قسم کی نزاع اس کے دامن کو نہیں پکڑے گی کہ یہ دو معنوں کا اشتراک کہ جو نُسُک کے لفظ میں پایا جاتا ہے اس بھید کی طرف اشارہ ہے کہ عبادت جو آخرت کے خسارہ سے نجات دیتی ہے وہ اس نفس امارہ کا ذبح کرنا ہے کہ جو بڑے کاموں کیلئے زیادہ سے زیادہ جوش رکھتا ہے اور ایسا حاکم ہے کہ ہر وقت بدی کا حکم دیتا رہتا ہے پس نجات اس میں ہے کہ اس بُرا حکم دینے والے کو انتطاع الی اللہ کے کارروں سے ذبح کر دیا جائے اور خلقت سے قطع تعلق کر کے خدا تعالیٰ کو اپنا مونس اور آرام جاں قرار دیا جائے اور اس کے ساتھ انواع اقسام کی تلخیوں کی برداشت بھی کی جائے تا نفس غفلت کی موت سے نجات پاوے اور یہی اسلام کے معنی ہیں اور یہی کامل اطاعت کی حقیقت ہے۔ (ترجمہ اصل کتاب سے)

يَذُلُّ قَطْعًا عَلَىٰ أَنَّ الْعَابِدَ فِي الْحَقِيقَةِ هُوَ الَّذِي ذَبَحَ نَفْسَهُ وَقُوَاهُ وَكُلَّ مَنْ أَصْبَاهُ لِرِضَىٰ رَبِّ الْحَقِيقَةِ وَ ذَبَّ الْهُوَىٰ حَتَّىٰ يَهَاقِفَ وَأَمْلَىٰ وَذَابَ وَغَابَ وَاخْتَفَىٰ وَهَبَّتْ عَلَيْهِ عَوَاصِفُ الْفِتَاءِ - وَسَفَّتْ ذُرَاتِهِ شَدَائِدُ هَذِهِ الْهُوجَاءِ - وَمَنْ فَكَّرَ فِي هَذَيْنِ الْمَفْهُومَيْنِ الْمَشْتَرِكَيْنِ - وَتَدَبَّرَ الْمَقَامَ بِتَيْقِظِ الْقَلْبِ وَفَتَحَ الْعَيْنَيْنِ - فَلَا يَبْقَىٰ لَهُ خِفَاءٌ وَلَا مِرَاءٌ - فِي أَنَّ هَذَا إِيْمَاءٌ - إِلَىٰ أَنَّ الْعِبَادَةَ الْمُنْجِيَّةَ مِنَ الْخُسَارَةِ - هِيَ ذَبْحُ النَّفْسِ الْأَمَّارَةِ - وَخَرْهَا بِمَدَى الْإِنْقِطَاعِ إِلَى اللَّهِ ذِي الْأَلَاءِ وَالْأَمْرِ وَالْإِمَارَةِ - مَعَ تَحْمُلِ أَنْوَاعِ الْمِرَارَةِ - لِتَنْجُو النَّفْسُ مِنْ مَوْتِ الْعَرَاةِ وَهَذَا هُوَ مَعْنَى الْإِسْلَامِ - وَحَقِيقَةُ الْإِنْقِيَادِ التَّامِّ -

پس دیکھ کہ کیوں کر نُسُك کے لفظ کی حیات اور ممات کے لفظ سے تفسیر کی ہے اور اس تفسیر سے قربانی کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے پس اے عقلمندو! اس میں غور کرو اور جس نے اپنی قربانی کی حقیقت کو معلوم کر کے قربانی ادا کی اور صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ ادا کی پس بہ تحقیق اس نے اپنی جان اور اپنے بیٹوں اور اپنے پوتوں کی قربانی کر دی اور اس کے لئے اجر بزرگ ہے جیسا کہ ابراہیم کے لئے اس کے رب کے نزدیک اجر تھا اور اسی کی طرف ہمارے سید برگزیدہ اور رسول برگزیدہ نے جو پرہیزگاروں کا امام اور انبیاء کا خاتم ہے اشارہ کیا اور فرمایا اور وہ خدا کے بعد سب سچوں سے زیادہ تر سچا ہے بہ تحقیق قربانیاں وہی سواریاں ہیں کہ جو خدا تعالیٰ تک پہنچاتی ہیں اور خطاؤں کو مٹھو کرتی ہیں اور بلاؤں کو دور کرتی ہیں۔

(ترجمہ اصل کتاب سے)

فَانظُرْ كَيْفَ فَسَّرَ النُّسُكَ بِلَفْظِ  
الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ - وَآشَارَ بِهِ إِلَى حَقِيقَةِ  
الْأَضْحَاةِ - فَفَكِّرُوا فِيهِ يَا ذَوِي الْأَصْحَاةِ -  
وَمَنْ ضَلَّى مَعَ عِلْمِهِ حَقِيقَةَ ضَلِّيَّتِهِ -  
وَصَدَّقَ طَوِيَّتَهُ - وَخُلُوصَ نِيَّتِهِ - فَقَدْ  
ضَلَّى بِنَفْسِهِ وَمُهَجَّتَهُ - وَأَبْنَاءَهُ وَحَفَدَاتِهِ -  
وَلَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ - كَأَجْرِ إِبْرَاهِيمَ عِنْدَ  
رَبِّهِ الْكَرِيمِ - وَإِلَيْهِ أَشَارَ سَيِّدُنَا  
الْمُصْطَفَى وَرَسُولُنَا الْمُجْتَبَى وَآمَامُ  
الْمُتَّقِينَ - وَحَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَقَالَ وَهُوَ  
بَعَدَ اللَّهُ أَصْدَقُ الصَّادِقِينَ - إِنَّ الضَّحَايَا  
هِيَ الْمَطَايَا - تُوصِلُ إِلَى رَبِّ الْبَرَايَا -  
وَتَمْحُو الْعَطَايَا - وَتَدْفَعُ الْبَلَايَا -

(خطبہ الہامیہ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۴۳ تا ۴۵)

ان کو جو تیری پیروی کرنا چاہتے ہیں یہ کہہ دے کہ (میری نماز اور) میری قربانی اور میرا امرنا اور میرا زندہ رہنا سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے یعنی جو میری پیروی کرنا چاہتا ہے وہ بھی اس قربانی کو ادا کرے۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۳۶۸)

اے نبی! لوگوں کو کہہ دے کہ میں صرف خدا کا پرستار ہوں دوسری کسی چیز سے میرا تعلق نہیں اور میرا زندہ رہنا اور میرا امرنا صرف اس خدا کے لیے ہے جو تمام عالموں کا پروردگار ہے۔ دیکھو اس آیت میں کیسی ماسوا اللہ سے بے تعلقی ظاہر کی گئی ہے۔

چنان زندگی کن کہ باصدا عیال نداری بدل غیر آن ذوالجلال

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۰۱)

صحابہ کرامؓ کے تعلقات بھی تو آخردنیا سے تھے ہی، جائیدادیں تھیں، مال تھا، زرتھا مگر ان کی زندگی پر کس قدر

انقلاب آیا کہ سب کے سب ایک ہی دفعہ دستبردار ہو گئے اور فیصلہ کیا کہ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ہمارا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے۔ اگر اس قسم کے لوگ ہم میں ہو جائیں تو کون سی آسمانی برکت اس سے بزرگ تر ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۴ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اسی کو یگانہ و یکتا معبود سمجھو۔ جب تک انسان ایمان نہیں لاتا کچھ نہیں اور ایسا ہی نماز و روزہ میں اگر دنیا کو کوئی حصہ دیتا ہے تو وہ نماز و روزہ اسے منزل مقصود تک نہیں لے جا سکتا بلکہ محض خدا کے لیے ہو جاوے۔ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کا سچا مصداق ہو تب مسلمان کہلائے گا۔ ابراہیم کی طرح صادق اور وفادار ہونا چاہیے جس طرح پر وہ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اسی طرح انسان ساری دنیا کی خواہشوں اور آرزوؤں کو جب تک قربان نہیں کر دیتا کچھ نہیں بنتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو ایک جذبہ پیدا ہو جاوے اس وقت اللہ تعالیٰ خود اس کا متکفل اور کارساز ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کبھی بدظنی نہیں کرنی چاہیے اگر نقص اور خرابی ہوگی تو ہم میں ہوگی۔ پس یاد رکھو کہ جب تک انسان خدا کا نہ ہو جاوے بات نہیں بنتی اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جاتا ہے اس میں شباب کاری نہیں رہتی۔ مشکل یہی ہے کہ لوگ جلد گھبرا جاتے ہیں اور پھر شکوہ کرنے لگتے ہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۰)

الہی قرب کی نسبت یوں فرمایا: قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ یعنی لوگوں کو اطلاع دے دے کہ میری یہ حالت ہے کہ میں اپنے وجود سے بالکل کھویا گیا ہوں میری تمام عبادتیں خدا کے لئے ہو گئی ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر ایک انسان جب تک وہ کامل نہیں خدا کے لئے خالص طور پر عبادت نہیں کر سکتا بلکہ کچھ عبادت اس کی خدا کے لئے ہوتی ہے اور کچھ اپنے نفس کے لئے کیونکہ وہ اپنے نفس کی عظمت اور بزرگی چاہتا ہے جیسا کہ خدا کی عظمت اور بزرگی کرنی چاہئے اور یہی عبادت کی حقیقت ہے اور ایسا ہی ایک حصہ اس کی عبادت کا مخلوق کے لئے ہوتا ہے کیونکہ جس عظمت اور بزرگی اور قدرت اور تصرف کو خدا سے مخصوص کرنا چاہئے اس عظمت اور قدرت کا حصہ مخلوق کو بھی دیتا ہے۔ اس لئے جیسا کہ وہ خدا کی پرستش کرتا ہے نفس اور مخلوق کی بھی پرستش کرتا ہے بلکہ عام طور پر جمیع اسباب سفلیہ کو اپنی پرستش سے حصہ دیتا ہے کیونکہ خدا کے ارادہ اور تقدیر کے مقابل پر ان اسباب کو بھی کارخانہ محو اور اثبات میں ذلیل سمجھتا ہے۔ پس ایسا انسان خدا تعالیٰ کا سچا پرستار نہیں ٹھہر سکتا جو کبھی خدا کی

عظمت کا اپنے نفس کو شریک ٹھہراتا ہے اور کبھی مخلوق اور کبھی اسباب کو بلکہ سچا پرستار وہ ہے جو خدا کی تمام عظمتیں اور تمام بزرگیاں اور تمام تصرف خدا کو ہی دیتا ہے نہ کسی اور کو۔ اور جب اس مرتبہ توحید پر انسان کی پرستش پہنچ جائے تب اس وقت وہ حقیقی طور پر خدا کا پرستار کہلا سکتا ہے اور ایسا انسان جیسا کہ زبان سے کہتا ہے کہ خدا واحد لا شریک ہے ایسا ہی وہ اپنے فعل سے یعنی اپنی عبادت سے بھی خدا کی توحید پر گواہی دیتا ہے پس اسی مرتبہ کاملہ کی طرف اشارہ ہے جو آیت مذکورہ بالا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا کہ تو لوگوں کو کہہ دے کہ میری تمام عبادتیں خدا کے لئے ہیں یعنی نفس کو اور مخلوق کو اور اسباب کو میری عبادت میں سے کوئی حصہ نہیں۔

اور پھر بعد اس کے فرمایا کہ میری قربانی بھی خاص خدا کے لئے ہے اور میرا جینا بھی خدا کے لئے اور میرا مرنا بھی خدا کے لئے۔ یاد رہے کہ نَسِيْدٌ كَه لَغْتِ عَرَبٍ میں قربانی کو کہتے ہیں اور لَفْظُ نُسْكَ جو آیت میں موجود ہے اُس کی جمع ہے اور نیز دوسرے معنی اس کے عبادت کے بھی ہیں پس اس جگہ ایسا لفظ استعمال کیا گیا۔ جس کے معنی عبادت اور قربانی دونوں پر اطلاق پاتے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کامل عبادت جس میں نفس اور مخلوق اور اسباب شریک نہیں ہیں درحقیقت ایک قربانی ہے اور کامل قربانی درحقیقت کامل عبادت ہے اور پھر بعد اس کے جو فرمایا کہ میرا جینا بھی خدا کے لئے ہے اور میرا مرنا بھی خدا کے لئے یہ آخری فقرہ قربانی کے لفظ کی تشریح ہے تا کوئی اس وہم میں نہ پڑے کہ قربانی سے مراد بکرے کی قربانی یا گائے کی قربانی یا اونٹ کی قربانی ہے اور تا اس لفظ سے کہ میرا جینا اور میرا مرنا خاص خدا کے لئے ہے صاف طور پر سمجھا جائے کہ اس قربانی سے مراد روح کی قربانی ہے اور قربانی کا لفظ قرب سے لیا گیا ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کا قرب تب حاصل ہوتا ہے کہ جب تمام نفسانی قوی اور نفسانی جنبشوں پر موت آجائے غرض یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب تام پر ایک بڑی دلیل ہے اور یہ آیت بتلا رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خدا میں گم اور محو ہو گئے تھے کہ آپ کی زندگی کے تمام انفس اور آپ کی موت محض خدا کے لئے ہو گئی تھی اور آپ کے وجود میں نفس اور مخلوق اور اسباب کا کچھ حصہ باقی نہیں رہا تھا۔ اور آپ کی روح خدا کے آستانہ پر ایسے اخلاص سے گری تھی کہ اس میں غیر کی ایک ذرہ آمیزش نہیں رہی تھی پس اس طرح پر آپ نے اس شرط کے ایک حصہ کو پورا کیا جو شفع کے لئے ایک لازمی شرط ہے اور آخری فقرہ آیت مذکورہ بالا کا یہ ہے کہ میرا جینا اور مرنا اس خدا کے لئے ہے جو تمام جہان کی پرورش میں لگا

ہوا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ میری قربانی بھی تمام جہان کی بھلائی کے لئے ہے۔  
(عصمتِ انبیاء علیہم السلام، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۶۶۲ تا ۶۶۳)

لَا شَرِيكَ لَكَ ۚ وَبَدَّلَكَ امْرَأَتًا ۖ وَآنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۳۶﴾

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو اول المسلمین ٹھہرے تو اس کا یہی باعث ہوا کہ اوروں کی نسبت علوم معرفت الہی میں علم ہیں یعنی علم ان کا معارف الہیہ کے بارے میں سب سے بڑھ کر ہے اس لیے ان کا اسلام بھی سب سے اعلیٰ ہے اور وہ اول المسلمین ہیں۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۸۶، ۱۸۷)

قُلْ اَعْيَبَ اللّٰهُ اَنْبِیَّ رَبًّا ۗ وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ۗ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۗ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی ۗ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فِیَنْبِئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

آیت اور حدیث میں باہم تعارض واقع ہونے کی حالت میں اصول مفسرین و محدثین یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حدیث کے معنوں میں تاویل کر کے اس کو قرآن کریم کے مطابق کیا جائے جیسا کہ صحیح بخاری کے کتاب الجنائز صفحہ ۱۷۲ میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے حدیث: اِنَّ الْمَيِّتَ یُعَذَّبُ بِبَعْضِ بِنْدَآءِ اَهْلِهِ کو قرآن کریم کی اس آیت سے کہ: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی معارض و مخالف پا کر حدیث کی یہ تاویل کر دی کہ یہ مومنوں کے متعلق نہیں بلکہ کفار کے متعلق ہے جو متعلقین کے جزع فزع پر راضی تھے بلکہ وصیت کر جاتے تھے۔

قرآن کوئی لعنتی قربانی پیش نہیں کرتا بلکہ ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ ایک کا گناہ یا ایک کی لعنت کسی دوسرے پر ڈالی جائے چہ جائیکہ کروٹا لوگوں کی لعنتیں اکٹھی کر کے ایک کے گلے میں ڈال دی جائیں۔ قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی۔ یعنی ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا۔ لیکن قبل اس کے جو میں مسئلہ نجات کے متعلق قرآنی ہدایت بیان کروں مناسب دیکھتا ہوں کہ عیسائیوں کے اس اصول کی غلطی لوگوں پر ظاہر کر دوں تا وہ شخص جو اس مسئلہ میں قرآن اور انجیل کی تعلیم کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے وہ آسانی سے مقابلہ کر سکے۔

پس واضح ہو کہ عیسائیوں کا یہ اصول کہ خدا نے دنیا سے پیار کر کے دنیا کو نجات دینے کے لئے یہ انتظام کیا کہ نافرمانوں اور کافروں اور بدکاروں کا گناہ اپنے پیارے بیٹے یسوع پر ڈال دیا اور دنیا کو گناہ سے چھڑانے کیلئے اس کو لعنتی بنایا اور لعنت کی لکڑی سے لٹکایا۔ یہ اصول ہر ایک پہلو سے فاسد اور قابل شرم ہے۔ اگر میزان عدل کے لحاظ سے اس کو جانچا جائے تو صریح یہ بات ظلم کی صورت میں ہے کہ زید کا گناہ بکر پر ڈال دیا جائے۔ انسانی کائنات اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ ایک مجرم کو چھوڑ کر اس مجرم کی سزا غیر مجرم کو دی جائے۔ اور اگر روحانی فلاسفی کے رو سے گنہ کی حقیقت پر غور کی جائے تو اس تحقیق کے رو سے بھی یہ عقیدہ فاسد ٹھہرتا ہے کیونکہ گناہ درحقیقت ایک ایسا زہر ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان خدا کی اطاعت اور خدا کی پر جوش محبت اور محبتاً نہ یاد الہی سے محروم اور بے نصیب ہو اور جیسا کہ ایک درخت جب زمین سے اکھڑ جائے اور پانی چوسنے کے قابل نہ رہے تو وہ دن بدن خشک ہونے لگتا ہے اور اس کی تمام سرسبزی برباد ہو جاتی ہے۔ یہی حال اس انسان کا ہوتا ہے جس کا دل خدا کی محبت سے اکھڑا ہوا ہوتا ہے۔ پس خشکی کی طرح گناہ اس پر غلبہ کرتا ہے۔ سو اس خشکی کا علاج خدا کے قانون قدرت میں تین طور سے ہے؛ (۱) ایک محبت (۲) استغفار جس کے معنی ہیں دبانے اور ڈھانکنے کی خواہش کیونکہ جب تک مٹی میں درخت کی جڑ جمی رہے تب تک وہ سرسبزی کا امیدوار ہوتا ہے۔ (۳) تیسرا علاج توبہ ہے۔ یعنی زندگی کا پانی کھینچنے کے لئے تذلل کے ساتھ خدا کی طرف پھرنا اور اس سے اپنے تئیں نزدیک کرنا اور معصیت کے حجاب سے اعمال صالحہ کے ساتھ اپنے تئیں باہر نکالنا اور توبہ صرف زبان سے نہیں ہے بلکہ توبہ کا کمال اعمال صالحہ کے ساتھ ہے۔ تمام نیکیاں توبہ کی تکمیل کے لئے ہیں کیونکہ سب سے مطلب یہ ہے کہ ہم خدا سے نزدیک ہو جائیں۔ دعا بھی توبہ ہے کیونکہ اس سے بھی ہم خدا کا قرب ڈھونڈتے ہیں۔ اسی لئے خدا نے انسان کی جان کو پیدا کر کے اس کا نام روح رکھا کیونکہ اس کی حقیقی راحت اور آرام خدا کے اقرار اور اس کی محبت اور اس کی اطاعت میں ہے۔ اور اس کا نام نفس رکھا ☆ کیونکہ وہ خدا سے اتحاد پیدا کر نیوالا ہے۔ خدا سے دل لگانا ایسا ہوتا ہے جیسا کہ باغ میں وہ درخت ہوتا ہے جو باغ کی زمین سے خوب پیوستہ ہوتا ہے۔ یہی انسان کا جنت ہے اور جس طرح درخت زمین کے پانی کو چوستا اور اپنے اندر کھینچتا اور اس سے اپنے زہریلے بخارات باہر نکالتا ہے اسی طرح انسان کے دل کی حالت ہوتی ہے کہ وہ خدا کی محبت کا پانی چوس کر زہریلے مواد کے نکالنے پر قوت پاتا ہے

اور بڑی آسانی سے ان مواد کو دفع کرتا ہے اور خدا میں ہو کر پاک نشوونما پاتا جاتا ہے اور بہت پھیلتا اور خوشنما سرسبز دکھاتا اور اچھے پھل لاتا ہے۔ مگر جو خدا میں پیوستہ نہیں وہ نشوونما دینے والے پانی کو چوس نہیں سکتا اس لئے دم بدم خشک ہوتا چلا جاتا ہے۔ آخر پتے بھی گر جاتے ہیں اور خشک اور بد شکل ٹھنیاں رہ جاتی ہیں۔ پس چونکہ گناہ کی خشکی بے تعلقی سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس خشکی کے دور کرنے کے لئے سیدھا علاج مستحکم تعلق ہے۔ جس پر قانون قدرت گواہی دیتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہ اشارہ کر کے فرماتا ہے: يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطَهَّرَةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّاتِي (الفجر: ۲۸ تا ۳۱)۔ یعنی اے وہ نفس جو خدا سے آرام یافتہ ہے اپنے رب کی طرف واپس چلا آ وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت کے اندر آ۔

غرض گناہ کے دور کرنے کا علاج صرف خدا کی محبت اور عشق ہے۔ لہذا وہ تمام اعمال صالحہ جو محبت اور عشق کے سرچشمہ سے نکلتے ہیں گناہ کی آگ پر پانی چھڑکتے ہیں کیونکہ انسان خدا کیلئے نیک کام کر کے اپنی محبت پر مہر لگاتا ہے۔ خدا کو اس طرح پرمان لینا کہ اس کو ہر ایک چیز پر مقدم رکھنا یہاں تک کہ اپنی جان پر بھی۔ یہ وہ پہلا مرتبہ محبت ہے جو درخت کی اس حالت سے مشابہ ہے جبکہ وہ زمین میں لگایا جاتا ہے۔ اور پھر دوسرا مرتبہ استغفار جس سے یہ مطلب ہے کہ خدا سے الگ ہو کر انسانی وجود کا پردہ نہ کھل جائے۔ اور یہ مرتبہ درخت کی اس حالت سے مشابہ ہے جبکہ وہ زور کر کے پورے طور پر اپنی جڑ زمین میں قائم کر لیتا ہے۔ اور پھر تیسرا مرتبہ توبہ جو اس حالت کے مشابہ ہے کہ جب درخت اپنی جڑیں پانی سے قریب کر کے بچہ کی طرح اس کو چوستا ہے۔ غرض گناہ کی فلاسفی یہی ہے کہ وہ خدا سے جدا ہو کر پیدا ہوتا ہے لہذا اس کا دور کرنا خدا کے تعلق سے وابستہ ہے۔ پس وہ کیسے نادان لوگ ہیں جو کسی کی خودکشی کو گناہ کا علاج کہتے ہیں۔

یہ ہنسی کی بات ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے سردرد پر رحم کر کے اپنے سر پر پتھر مار لے۔ یا دوسرے کے بچانے کے خیال سے خودکشی کر لے۔ میرے خیال میں ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا دانا نہیں ہوگا کہ ایسی خودکشی کو انسانی ہمدردی میں خیال کر سکے۔ بیشک انسانی ہمدردی عمدہ چیز ہے اور دوسروں کے بچانے کیلئے نکالیف اٹھانا بڑے بہادروں کا کام ہے۔ مگر کیا ان تکلیفوں کے اٹھانے کی یہی راہ ہے جو یسوع کی نسبت بیان کیا جاتا ہے۔ کاش اگر یسوع خودکشی سے اپنے تئیں بچاتا اور دوسروں کے آرام کیلئے معقول طور پر عقلمندوں کی طرح تکلیفیں اٹھاتا تو اس کی ذات سے دنیا کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ مثلاً اگر ایک غریب آدمی گھر کا محتاج ہے اور

معمار لگانے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس صورت میں اگر ایک معمار اس پر رحم کر کے اس کا گھر بنانے میں مشغول ہو جائے اور بغیر لینے اُجرت کے چند روز سخت مشقت اٹھا کر اس کا گھر بنا دیوے تو بیشک یہ معمار تعریف کے قابل ہوگا۔ اور بیشک اس نے ایک مسکین پر احسان بھی کیا ہے جس کا گھر بنا دیا۔ لیکن اگر وہ اس شخص پر رحم کر کے اپنے سر پر پتھر مار لے تو اس غریب کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا۔ افسوس! دنیا میں بہت تھوڑے لوگ ہیں جو نیکی اور رحم کرنے کے معقول طریقوں پر چلتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ یسوع نے اس خیال سے کہ میرے مرنے سے لوگ نجات پا جائیں گے درحقیقت خودکشی کی ہے تو یسوع کی حالت نہایت ہی لائق رحم ہے اور یہ واقعہ پیش کرنے کے لائق نہیں بلکہ چھپانے کے لائق ہے۔

اور اگر ہم عیسائیوں کے اس اصول کو لعنت کے مفہوم کے رو سے جانچیں جو مسیح کی نسبت تجویز کی گئی ہے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس اصول کو قائم کر کے عیسائیوں نے یسوع مسیح کی وہ بے ادبی کی ہے جو دنیا میں کسی قوم نے اپنے رسول یا نبی کی نہیں کی ہوگی کیونکہ یسوع کا لعنتی ہو جانا گو وہ تین دن کے لئے ہی سہی عیسائیوں کے عقیدہ میں داخل ہے۔ اور اگر یسوع کو لعنتی نہ بنایا جائے تو مسیحی عقیدہ کے رو سے کفارہ اور قربانی وغیرہ سب باطل ہو جاتے ہیں۔ گویا اس تمام عقیدہ کا شہتیر لعنت ہی ہے۔

اور یہ باتیں جو یسوع نوع انسان کی محبت کیلئے دنیا میں بھیجا گیا اور نوع انسان کی خاطر اس نے اپنے تئیں قربان کیا۔ یہ تمام کارروائی عیسائیوں کے خیال میں اس شرط سے مفید ہے کہ جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یسوع اول دنیا کے گناہوں کے باعث ملعون ہوا اور لعنت کی لکڑی پر لٹکا یا گیا۔ اسی لئے ہم پہلے اشارہ کر آئے ہیں کہ یسوع مسیح کی قربانی لعنتی قربانی ہے۔ گناہ سے لعنت آئی اور لعنت سے صلیب ہوئی۔ اب تنقیح طلب یہ امر ہے کہ کیا لعنت کا مفہوم کسی راستباز کی طرف منسوب کر سکتے ہیں؟ سو واضح ہو کہ عیسائیوں نے یہ بڑی غلطی کی ہے کہ یسوع کی نسبت لعنت کا اطلاق جائز رکھا۔ گو وہ تین دن تک ہی ہو یا اس سے بھی کم۔ کیونکہ لعنت ایک ایسا مفہوم ہے جو شخص ملعون کے دل سے تعلق رکھتا ہے اور کسی شخص کو اس وقت لعنتی کہا جاتا ہے جبکہ اس کا دل خدا سے بالکل برگشتہ اور اس کا دشمن ہو جائے۔ اسی لئے لعین شیطان کا نام ہے اور اس بات کو کون نہیں جانتا کہ لعنت قرب کے مقام سے رد کرنے کو کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جس کا دل خدا کی محبت اور اطاعت سے دور جا پڑے اور درحقیقت وہ خدا کا دشمن ہو جائے۔ لفظ لعنت کے یہی معنی ہیں جس پر تمام اہل لغت نے اتفاق کیا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ اگر درحقیقت یسوع مسیح پر لعنت

پڑ گئی تھی تو اس سے لازم آتا ہے کہ درحقیقت وہ مورد غضب الہی ہو گیا تھا اور خدا کی معرفت اور اطاعت اور محبت اس کے دل سے جاتی رہی تھی اور خدا اس کا دشمن اور وہ خدا کا دشمن ہو گیا تھا اور خدا اس سے بیزار اور وہ خدا سے بیزار ہو گیا تھا جیسا کہ لعنت کا مفہوم ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ وہ لعنت کے دنوں میں درحقیقت کافر اور خدا سے برگشتہ اور خدا کا دشمن اور شیطان کا حصہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ پس یسوع کی نسبت ایسا اعتقاد کرنا گویا نعوذ باللہ! اس کو شیطان کا بھائی بنانا ہے اور میرے خیال میں ایک راستباز نبی کی نسبت ایسی بے باکی کوئی خدا ترس نہیں کرے گا۔ جز اس شخص کے جو خبیث طبع اور ناپاک طبع ہو۔

پس جبکہ یہ بات باطل ہوئی کہ حقیقی طور پر یسوع مسیح کا دل مورد لعنت ہو گیا تھا۔ پس ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایسی لعنتی قربانی بھی باطل اور نادان لوگوں کا اپنا منصوبہ ہے۔ اگر نجات اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ اول یسوع کو شیطان اور خدا سے برگشتہ اور خدا سے بیزار ٹھہرایا جائے تو لعنت ہے ایسی نجات پر!!! اس سے بہتر تھا کہ عیسائی اپنے لئے دوزخ قبول کر لیتے لیکن خدا کے ایک مقرب کو شیطان کا لقب نہ دیتے۔ افسوس کہ ان لوگوں نے کیسی بیہودہ اور ناپاک باتوں پر بھروسہ کر رکھا ہے۔ ایک طرف تو خدا کا بیٹا اور خدا سے نکلا ہوا اور خدا سے ملا ہوا فرض کرتے ہیں اور دوسری طرف شیطان کا لقب اس کو دیتے ہیں۔ کیونکہ لعنت شیطان سے مخصوص ہے اور لعین شیطان کا نام ہے اور لعنتی وہ ہوتا ہے جو شیطان سے نکلا اور شیطان سے ملا ہوا اور خود شیطان ہے۔ پس عیسائیوں کے عقیدہ کے رو سے یسوع میں دو قسم کی تثلیث پائی گئی۔ ایک رحمانی اور ایک شیطانی۔ اور نعوذ باللہ! یسوع نے شیطان میں ہو کر شیطان کے ساتھ اپنا وجود ملا یا اور لعنت کے ذریعہ سے شیطانی خواص اپنے اندر لئے۔ یعنی یہ کہ خدا کا نافرمان ہو۔ خدا سے بیزار ہو۔ خدا کا دشمن ہو۔ اب میاں سراج الدین آپ انصاف فرمادیں کہ کیا یہ مشن جو مسیح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کوئی روحانی یا معنوی پاکیزگی اپنے اندر رکھتا ہے؟ کیا دنیا میں اس سے بدتر کوئی اور عقیدہ بھی ہوگا کہ ایک راستباز کو اپنی نجات کے لئے خدا کا دشمن اور خدا کا نافرمان اور شیطان قرار دیا جائے؟ خدا کو جو قادر مطلق اور رحیم و کریم تھا اس لعنتی قربانی کی کیا ضرورت پڑی؟

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۳۲۷ تا ۳۳۳)

خدا ایک کے گناہ کے لیے دوسرے کو ہلاک نہیں کرتا۔ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۷۱۶)

اور یہ خیال کہ تناسخ کے طور پر حضرت مسیح بن مریم دنیا میں آئیں گے سب سے زیادہ ردی اور شرم کے

لائق ہے۔ تنازع کے ماننے والے تو ایسے شخص کا دنیا میں دوبارہ آنا تجویز کرتے ہیں جس کے تزکیہ نفس میں کچھ کسر رہ گئی ہو لیکن جو لوگ بگلی مراحل کمالات طے کر کے اس دنیا سے سفر کرتے ہیں وہ بزعم اُن کے ایک مدت دراز کے لئے ملکی خانہ میں داخل کئے جاتے ہیں۔ ماسوائے اس کے ہمارے عقیدہ کے موافق خدائے تعالیٰ کا بہشتیوں کے لئے یہ وعدہ ہے کہ وہ کبھی اس سے نکالے نہیں جائیں گے پھر تعجب کہ ہمارے علماء کیوں حضرت مسیح کو اس فردوسِ بریں سے نکالنا چاہتے ہیں آپ ہی یہ قصے سناتے ہیں کہ حضرت ادریس جب فرشتہ ملک الموت سے اجازت لے کر بہشت میں داخل ہوئے تو ملک الموت نے چاہا کہ پھر باہر آویں لیکن حضرت ادریس نے باہر آنے سے انکار کیا اور یہ آیت سنادی: وَمَا هُمْ بِمُخْرَجِينَ (الحجر: ۴۹) اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا حضرت مسیح اس آیت سے فائدہ حاصل کرنے کے مستحق نہیں ہیں کیا یہ آیت اُن کے حق میں منسوخ کا حکم رکھتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس لئے اس تنزیل کی حالت میں بھیجے جائیں گے کہ بعض لوگوں نے انہیں ناحق خدا بنایا تھا تو یہ اُن کا تصور نہیں ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۲ تا ۱۴)

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخم کاری سے مجروح ہوئے تو صہیب رضی اللہ عنہ روتے ہوئے ان کے پاس گئے کہ ہائے میرے بھائی! ہائے میرے دوست! عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے صہیب! مجھ پر تو روتا ہے کیا تجھے یاد نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میت پر اس کے اہل کے رونے سے عذاب کیا جاتا ہے پھر جب حضرت عمرؓ وفات پا گئے تو حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب حال حدیث پیش کرنے کا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ خدا عمر پر رحم کرے بخدا کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا بیان نہیں فرمایا کہ مومن پر اس کے اہل کے رونے سے عذاب کیا جاتا ہے اور فرمایا کہ تمہارے لئے قرآن کافی ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ یعنی حضرت عائشہ صدیقہ نے باوجود محدود علم کے فقط اس لئے قسم کھائی کہ اگر اس حدیث کے ایسے معنی کئے جائیں کہ خواہ نخواہ ہر ایک میت اس کے اہل کے رونے سے معذب ہوتی ہے تو یہ حدیث قرآن کے مخالف اور معارض ٹھہرے گی اور جو حدیث قرآن کے مخالف ہو وہ قبول کے لائق نہیں۔ (الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۰۹ احاشیہ)

قرآن شریف پر حدیث کو قاضی بنانا سخت غلطی ہے اور قرآن شریف کی بے ادبی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک بڑھیا نے حدیث پیش کی تو انہوں نے یہی کہا کہ میں ایک بڑھیا کے لیے قرآن نہیں چھوڑ

سکتا۔ ایسا ہی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے کسی نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے ماتم کرنے سے مردہ کو تکلیف ہوتی ہے تو انہوں نے یہی کہا کہ قرآن میں تو آیا ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ۔ پس قرآن پر حدیث کو قاضی.... بنانے میں اہل حدیث نے سخت غلطی کھائی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

میں یہ تعلیم کبھی دینا نہیں چاہتا اور نہ اسلام نے دی کہ تم اپنے گناہوں کی گٹھڑی کسی دوسرے کی گردن پر لا دو اور خود اباحت کی زندگی بسر کرنے لگو۔ قرآن شریف نے صاف فیصلہ کر دیا ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ۔ ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور نہ دنیا میں اس کی کوئی نظیر خدا تعالیٰ کے عام قانون قدرت میں ملتی ہے کبھی نہیں دیکھا جاتا کہ زید مثلاً سکھ یا کھالیوے اور اسی سکھ یا کھالیوے کا اثر بکر پر ہو جاوے اور وہ مر جاوے یا ایک مریض ہو اور وہ دوسرے آدمی کے دو کھالینے سے اچھا ہو جاوے بلکہ ہر ایک بجائے خود متاثر ہوگا پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک شخص ساری عمر گناہ کرتا رہے اور دیر ہی کے ساتھ خدا تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا رہے اور لکھ دے کہ میرے گناہوں کا بوجھ دوسرے شخص کی گردن پر ہے، جو شخص ایسی امید کرتا ہے وہ

دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست

کا مصداق ہے۔ پس اسلام کسی سہارے پر رکھنا نہیں چاہتا کیونکہ سہارے پر رکھنے سے ابطال اعمال لازم آجاتا ہے لیکن جب انسان سہارے کے بغیر زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے اس وقت اس کو اعمال کی ضرورت پڑتی ہے اور کچھ کرنا پڑتا ہے اسی لیے قرآن شریف نے فرمایا ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّهَا فَلَا فَلَاحَ وَهِيَ پاتا ہے جو اپنا تزکیہ کرتا ہے۔ خود اگر انسان ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو بات نہیں بنتی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

یہ کہنا کہ انسانی رنج و محن حوا کے سیب کھانے کی وجہ سے ہیں اسلام کا یہ عقیدہ نہیں۔ ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ۔ زید کے بدلے بکر کو سزا نہیں مل سکتی اور نہ ہی اس سے کچھ فائدہ متصور ہے۔ حوا کی سیب خوری ان مشکلات اور رنج و سزا کا باعث نہیں ہے بلکہ ان کے وجوہات قرآن نے کچھ اور ہی بیان فرمائے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۶ مورخہ ۲ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## تفسیر سورة الاعراف

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿۲﴾

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ کیسے فیصلہ کرنے والی آیت ہے جس سے صریح اور صاف طور پر صاف ثابت ہوتا ہے کہ اول تو جو مومن کی قرآن کریم کی طرف ہونی چاہیے پھر اگر اس توجہ کے بعد کسی حدیث یا قول من دونہ میں داخل دیکھے تو اس سے منہ پھیر لیوے۔ (الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۴۱، ۴۲)

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱﴾

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ.... اس دن اعمال تو لے جائیں گے۔ (ست پچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۳۱)

قَالَ مَا مَنَّكَ إِلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۗ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۗ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ  
وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ﴿۱۳﴾

شیطان نے جو تکبر کیا تو اس کی یہ بناء تھی جو وہ اپنے تئیں نجیب الخلق سمجھتا تھا اور خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ کا

دم مار کر حضرت صلی اللہ پر خَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ کی نکتہ چینی کرتا تھا۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۵۹۹)

یاد رکھو تکبر شیطان سے آیا ہے اور شیطان بنا دیتا ہے۔ جب تک انسان اس سے دور نہ ہو یہ قبول حق اور فیضان الوہیت کی راہ میں روک ہو جاتا ہے۔ کسی طرح سے بھی تکبر نہیں کرنا چاہیے نہ علم کے لحاظ سے، نہ دولت کے لحاظ سے، نہ وجاہت کے لحاظ سے، نہ ذات اور خاندان اور حسب نسب کی وجہ سے، کیونکہ زیادہ تر انہیں باتوں سے یہ تکبر پیدا ہوتا ہے اور جب تک انسان ان گھمنڈوں سے اپنے آپ کو پاک صاف نہ کرے گا اس وقت تک وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک برگزیدہ نہیں ہو سکتا اور وہ معرفت جو جذبات کے موادر ڈیہ کو جلا دیتی ہے اس کو عطا نہیں ہوتی کیونکہ یہ شیطان کا حصہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ شیطان نے بھی تکبر کیا تھا اور آدم سے اپنے آپ کو بہتر سمجھا اور کہہ دیا: اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۗ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَ خَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خدا تعالیٰ کے حضور سے مردود ہو گیا اور آدم لغزش پر (چونکہ اسے معرفت دی گئی تھی) اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے لگا اور خدا تعالیٰ کے فضل کا وارث ہوا وہ جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے دعا کی: رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ۗ وَاِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (الاعراف: ۲۴)۔

یہی وہ سر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا کہ اے نیک استاد۔ تو انہوں نے کہا کہ تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے۔ اس پر آج کل کے نادان عیسائی تو یہ کہتے ہیں کہ ان کا مطلب اس فقرہ سے یہ تھا کہ تو مجھے خدا کیوں نہیں کہتا حالانکہ حضرت مسیح نے بہت ہی لطیف بات کہی تھی جو انبیاء علیہم السلام کی فطرت کا خاصہ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ حقیقی نیکی تو خدا تعالیٰ ہی سے آتی ہے وہی اس کا چشمہ ہے اور وہیں سے وہ اترتی ہے۔ وہ جس کو چاہے عطا کرے اور جب چاہے سلب کر لے مگر ان نادانوں نے ایک عمدہ اور قابل قدر بات کو معیوب بنا دیا اور حضرت عیسیٰ کو متکبر ثابت کیا!!! حالانکہ وہ ایک متکسر المزاج انسان تھے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

توریت میں ممالک مغربیہ کی بعض قوموں کو یا جوج ماجوج قرار دیا ہے اور ان کا زمانہ مسیح موعود کا زمانہ ٹھہرایا ہے۔ قرآن شریف نے اس قوم کے لیے ایک نشانی یہ لکھی ہے کہ مِنْ كُلِّ حَادٍ يَنْسِلُوْنَ (الانبیاء: ۹۷) یعنی ہر ایک فوج ارضی ان کو حاصل ہو جائے گی اور ہر ایک قوم پر وہ فتیاب ہو جائیں گے۔ دوسرے اس نشانی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ آگ کے کاموں میں ماہر ہوں گے یعنی آگ کے ذریعہ سے ان کی لڑائیاں

ہوں گی اور آگ کے ذریعہ سے ان کے انجن چلیں گے اور آگ سے کام لینے میں وہ بڑی مہارت رکھیں گے۔ اسی وجہ سے ان کا نام یا جوج ماجوج ہے کیونکہ انج آگ کے شعلہ کو کہتے ہیں اور شیطان کے وجود کی بناوٹ بھی آگ سے ہے جیسا کہ آیت: خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ سے ظاہر ہے اس لیے قوم یا جوج ماجوج سے اس کو ایک فطرتی مناسبت ہے۔ اسی وجہ سے یہی قوم اس کے اسم اعظم کی تجلی کے لیے اور اس کا مظہر اتم بننے کے لیے موزوں ہے۔ (تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷، صفحہ ۲۷۶، ۲۷۷)

تکبر ایسی بلا ہے کہ انسان کا پچھپھا نہیں چھوڑتی۔ یاد رکھو تکبر شیطان سے آتا ہے اور تکبر کرنے والے کو شیطان بنا دیتا ہے۔ جب تک انسان اس راہ سے قطعاً دور نہ ہو قبول حق و فیضان الوہیت ہرگز پانہیں سکتا کیونکہ یہ تکبر اس کی راہ میں روک ہو جاتا ہے پس کسی طرح سے بھی تکبر نہیں کرنا چاہیے۔ علم کے لحاظ سے نہ دولت کے لحاظ سے، نہ وجاہت کے لحاظ سے، نہ ذات اور خاندان اور حسب نسب کی وجہ سے کیونکہ زیادہ تر تکبر انہیں باتوں سے پیدا ہوتا ہے جب تک انسان اپنے آپ کو ان گھمنڈوں سے پاک و صاف نہ کرے گا اس وقت تک وہ اللہ جلشائے کے نزدیک پسندیدہ و برگزیدہ نہیں ہو سکتا اور وہ معرفت الہی جو جذبات نفسانی کے موادِ ردیہ کو جلا دیتی ہے اس کو عطا نہیں ہوتی کیونکہ یہ گھمنڈ شیطان کا حصہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا شیطان نے بھی یہی گھمنڈ کیا اور اپنے آپ کو آدم علیہ السلام سے بڑا سمجھا اور کہہ دیا: اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَ خَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۲۳ پ ۱۴ (میں اس سے اچھا ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اس کو مٹی سے) نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بارگاہ الہی سے مردود ہو گیا اس لیے ہر ایک کو اس سے بچنا چاہیے جب تک انسان کو کامل معرفت الہی حاصل نہ ہو وہ لغزش کھاتا ہے اور اس سے متنہ نہیں ہوتا مگر معرفت الہی جس کو حاصل ہو جائے اگرچہ اس سے کوئی لغزش ہو بھی جاوے تب بھی اللہ تعالیٰ اس کی محافظت کرتا ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے اپنی لغزش پر اپنی کمزوری کا اعتراف کیا اور سمجھ لیا کہ سوائے فضل الہی کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے دعا کر کے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا وارث ہوا: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ (الاعراف: ۲۴) (اے رب ہمارے! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تیری حفاظت ہمیں نہ بچاوے اور تیرا رحم ہماری دستگیری نہ کرے تو ہم ضرور ٹوٹے والوں میں سے ہو جاویں۔)

(تقریر جلسہ سالانہ ۲۹ دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۹، ۲۰)

## قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۱۵﴾ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿۱۶﴾

قرآن شریف اُس شخص کو جس کا نام حدیثوں میں دجال ہے شیطان قرار دیتا ہے جیسا کہ وہ شیطان کی طرف سے حکایت کر کے فرماتا ہے: قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۱۵﴾ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿۱۶﴾ یعنی شیطان نے جناب الہی میں عرض کی کہ میں اُس وقت تک ہلاک نہ کیا جاؤں جب تک کہ وہ مردے جن کے دل مر گئے ہیں دوبارہ زندہ ہوں۔ خدا نے کہا کہ میں نے تجھے اُس وقت تک مہلت دی۔ سو وہ دجال جس کا حدیثوں میں ذکر ہے وہ شیطان ہی ہے جو آخر زمانہ میں قتل کیا جائے گا۔ جیسا کہ دنیا میں نے بھی یہی لکھا ہے اور بعض حدیثیں بھی یہی کہتی ہیں اور چونکہ مظہر اتم شیطان کا نصرانیت ہے اس لئے سورۃ فاتحہ میں دجال کا تو کہیں ذکر نہیں مگر نصاریٰ کے شر سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ اگر دجال کوئی الگ مفسد ہوتا تو قرآن شریف میں بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا: وَلَا الظَّالِمِينَ یہ فرمانا چاہئے تھا کہ: وَلَا الدَّجَالَ۔ اور آیت: إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ سے مراد جسمانی بعث نہیں کیونکہ شیطان صرف اُس وقت تک زندہ ہے جب تک کہ بنی آدم زندہ ہیں۔ ہاں! شیطان اپنے طور سے کوئی کام نہیں کرتا بلکہ بذریعہ اپنے مظاہر کے کرتا ہے سو وہ مظاہر یہی انسان کو خدا بنانے والے ہیں اور چونکہ وہ گروہ ہے اس لئے اُس کا نام دجال رکھا گیا ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں دجال گروہ کو بھی کہتے ہیں۔ اور اگر دجال کو نصرانیت کے گمراہ واعظوں سے الگ سمجھا جائے تو ایک مخدور لازم آتا ہے وہ یہ کہ جن حدیثوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ آخری دنوں میں دجال تمام زمین پر محیط ہو جائے گا انہیں حدیثوں سے یہ پتہ بھی لگتا ہے کہ آخری دنوں میں کلیسیا کی طاقت تمام مذاہب پر غالب آجائے گی۔ پس یہ تناقض، بجز اس کے کیوں کر دور ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۱)

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ

الْخٰسِرِينَ ﴿۱۷﴾

بہت لوگ ہیں کہ خدا پر شکوہ کرتے ہیں اور اپنے نفس کو نہیں دیکھتے۔ انسان کے اپنے نفس کے ہی ظلم ہوتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ رحیم اور کریم ہے۔ بعض آدمی ایسے ہیں کہ ان کو گناہ کی خبر ہوتی ہے اور بعض ایسے کہ ان کو گناہ کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے استغفار کا التزام کرایا ہے کہ انسان ہر ایک

گناہ کے لیے خواہ وہ ظاہر کا ہو خواہ باطن کا خواہ اسے علم ہو یا نہ ہو اور ہاتھ اور پاؤں اور زبان اور ناک اور کان اور آنکھ اور سب قسم کے گناہوں سے استغفار کرتا رہے آج کل آدم علیہ السلام کی دعا پڑھنی چاہیے: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ۔ یہ دعا اول ہی قبول ہو چکی ہے۔

(البدردجلد ۱ نمبر ۹ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۶)

دعا ایسی شے ہے کہ جب آدم کا شیطان سے جنگ ہو تو اس وقت سوائے دعا کے اور کوئی حربہ کام نہ آیا آخر شیطان پر آدم نے فتح بذریعہ دعا کے پائی: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ۔

(بدرجلد ۲ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۷)

ہمارا اعتقاد ہے کہ خدا نے جس طرح ابتدا میں دعا کے ذریعہ سے شیطان کو آدم کے ذریعہ زیر کیا تھا اسی طرح اب آخری زمانہ میں بھی دعا ہی کے ذریعہ سے غلبہ اور تسلط عطا کرے گا نہ تلواریں سے..... آدم اڈل کو شیطان پر فتح دعا ہی سے ہوئی تھی: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ..... الخ اور آدم ثانی کو بھی جو آخری زمانہ میں شیطان سے آخری جنگ کرتا ہے۔ اسی طرح دعا ہی کے ذریعہ فتح ہوگی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

اگر خدا پر تمہارا کامل ایمان ہو تو پھر تو تمہارا یہ مذہب ہونا چاہیے کہ

۔ ہر چہ از دوست میر سدا نیکوست۔

اور اس ایمان والے کے شیطان قریب بھی نہیں آتا وہ بھی تو وہاں ہی آجاتا ہے جہاں اس کو تھوڑی سی بھی گنجائش مل جاتی ہے جب خدا کو مقدم رکھا جائے تو برکات کا نزول ہوتا ہے..... یہ باتیں اور کامل ایمان حاصل ہوتا ہے تو بہ استغفار سے۔ اس کی کثرت کرو اور رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ پڑھا کرو اور اس کی کثرت کرو۔

(البدردجلد ۳ نمبر ۲۵، ۲۴ مورخہ ۲۳ تا یکم نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ ۚ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۰﴾

”تمہارے فرار کی جگہ زمین ہی رہے گی پھر کیوں کر ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی فرار گاہ صد ہا برس سے

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۳۰۰ حاشیہ)

آسمان ہو۔“

(تحفہ گولڈویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۹۱)

یعنی تمہارا فرار گاہ زمین ہی رہے گی۔

## قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿٢١﴾

قرآن شریف صاف اور صریح لفظوں میں فرماتا ہے کہ کوئی انسان بجز زمین کے کسی اور جگہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے: فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُونَ یعنی تم زمین میں ہی زندہ رہو گے اور زمین میں ہی مرو گے اور زمین سے ہی نکالے جاؤ گے۔ مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ ”نہیں اس زمین اور کرہ ہوا سے باہر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ جیسا کہ اب تک جو قریباً انیسویں صدی گذرتی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں“۔ حالانکہ زمین پر جو قرآن کے رو سے انسانوں کے زندہ رہنے کی جگہ ہے باوجود زندگی کے قائم رکھنے کے سامانوں کے کوئی شخص انیس سو برس تک ابتدا سے آج تک کبھی زندہ نہیں رہا تو پھر آسمان پر انیس سو برس تک زندگی بسر کرنا باوجود اس امر کے کہ قرآن کے رو سے ایک قدر قلیل بھی بغیر زمین کے انسان زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کس قدر خلاف نصوص صریح قرآن ہے جس پر ہمارے مخالف ناحق اصرار کر رہے ہیں۔ (کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴ حاشیہ)

اگر حضرت ادریس معہ جسم عنصری آسمان پر گئے ہوتے تو بموجب نص صریح آیت: فِيهَا تَحْيَوْنَ جیسا کہ حضرت مسیح کا آسمانوں پر سکونت اختیار کر لینا ممنوع تھا ایسا ہی ان کا بھی آسمان پر ٹھہرنا ممنوع ہے کیونکہ خدا تعالیٰ اس آیت میں قطعی فیصلہ دے چکا ہے کہ کوئی شخص آسمان پر زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ تمام انسانوں کے لئے زندہ رہنے کی جگہ زمین ہے۔

علاوہ اس کے اس آیت کے دوسرے فقرہ میں جو فِيهَا تَحْيَوْنَ ہے یعنی زمین پر ہی مرو گے صاف فرمایا گیا ہے کہ ہر ایک شخص کی موت زمین پر ہوگی۔ پس اس سے ہمارے مخالفوں کو یہ عقیدہ رکھنا بھی لازم آیا کہ کسی وقت حضرت ادریس بھی آسمان پر سے نازل ہوں گے۔ حالانکہ دنیا میں یہ کسی کا عقیدہ نہیں اور طرفہ یہ کہ زمین پر حضرت ادریس کی قبر بھی موجود ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ کی قبر موجود ہے۔

(کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۲۳۸ حاشیہ)

کیا تم قرآن کریم کا انکار کرتے ہو یا جزا سزا کے دن کو بھول

گئے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا

تَمُوتُونَ (کہ تم زمین پر ہی زندگی بسر کرو گے اور زمین پر ہی

مرو گے۔) پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر دو ہزار سال

أَتَكْفُرُ بِالْقُرْآنِ أَوْ نَسِيتَ يَوْمَ

الْمَجَازَاتِ؟ وَقَدْ قَالَ اللَّهُ: فِيهَا

تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ فَكَيْفَ عَاشَ

عِيسَى إِلَى الْأَلْفَيْنِ فِي السَّمَاءِ.

مَا لَكُمْ لَا تَفَكَّرُونَ؟

سے کیسے زندہ ہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم سوچتے نہیں؟

(الهدای والتبصرة لمن یزی، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۳۶۵)

(ترجمہ از مرتب)

اگر وہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ ناقل) مع جسم عنصری آسمان پر ہیں اور بموجب تصریح اس آیت کے قیامت کے دن تک زمین پر نہیں اتریں گے تو کیا وہ آسمان پر ہی مریں گے اور آسمان میں ہی ان کی قبر ہوگی؟ لیکن آسمان پر مرنا آیت: **فِيهَا تَهْوُونَ** کے برخلاف ہے۔ پس اس سے تو یہی ثابت ہوا کہ وہ آسمان پر مع جسم عنصری نہیں گئے بلکہ مکر گئے اور جس حالت میں کتاب اللہ نے کمال تصریح سے یہ فیصلہ کر دیا تو پھر کتاب اللہ کی مخالفت کرنا اگر معصیت نہیں تو اور کیا ہے۔ (الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَهْوُونَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُونَ** یعنی تم زمین پر ہی زندگی بسر کرو گے اور زمین پر ہی مرو گے اور زمین سے ہی نکالے جاؤ گے پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ایک شخص صد ہا برس تک آسمان پر زندگی بسر کرے۔ (برائین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۳۰۰ حاشیہ)

خدا تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ وعدہ کے برخلاف کسی بشر کو آسمان پر چڑھاوے حالانکہ وہ وعدہ کر چکا ہے کہ تمام بشر زمین پر ہی اپنی زندگی بسر کریں گے لیکن حضرت مسیح کو خدا نے آسمان پر مع جسم چڑھا دیا اور اس وعدہ کا کچھ پاس نہ کیا جیسا کہ فرمایا تھا: **فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَهْوُونَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُونَ**۔

(لیکچر سیالکوٹ، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۲۲۰)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کافروں نے قسمیں کھا کر بار بار سوال کیا کہ آپ مع جسم عنصری آسمان پر چڑھ کر دکھائیے، ہم ابھی ایمان لائیں گے۔ ان کو جواب دیا گیا: **قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا مَّرْسُولًا** (بنی اسرائیل: ۹۴) یعنی ان کو کہہ دے کہ میرا خدا عہد شکنی سے پاک ہے اور بموجب اس قول کے مع جسم عنصری آسمان پر نہیں جاسکتا۔ کیونکہ یہ امر خدا کے وعدہ کے برخلاف ہے وجہ یہ کہ وہ فرماتا ہے کہ: **فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَهْوُونَ**۔ (چشمہ مستحی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۸۷ حاشیہ)

ایک اور دلیل حضرت عیسیٰ کی وفات پر قرآن شریف کی یہ آیت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَهْوُونَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُونَ** (ترجمہ) تم (اے بنی آدم) زمین میں ہی زندگی بسر کرو گے اور زمین میں ہی مرو گے اور زمین میں سے ہی نکالے جاؤ گے۔ پس باوجود اس قدر نص صریح کے کیوں کر ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بجائے زمین پر رہنے کے قریباً دو ہزار برس اس سے بھی زیادہ کسی نامعلوم مدت تک

آسمان پر رہیں ایسی صورت میں تو قرآن شریف کا ابطال لازم آتا ہے۔

(برائین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۳۹۳، ۳۹۴)

قرآن شریف میں کئی جگہ صاف فرمایا ہے کہ کوئی شخص مع جسم عنصری آسمان پر نہیں جائے گا بلکہ تمام زندگی زمین پر بسر کریں گے یہ خدا کا وعدہ ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے: فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُونَ یعنی زمین پر ہی تم زندہ رہو گے اور زمین پر ہی تم مرو گے اور زمین میں سے ہی تم نکالے جاؤ گے۔ پس اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کا مع جسم عنصری آسمان پر جانا اس وعدہ کے برخلاف ہے اور خدا پر تخلف وعدہ جائز نہیں اور اس وعدہ میں کوئی استثناء نہیں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۲۸)

اللہ جل شانہ کا قرآن شریف میں فرمانا: فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کرہ زمین کے سوا دوسری جگہ نہ زندگی بسر کر سکتا ہے اور نہ مر سکتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح یعنی نبی سیاح ہونا بھی ان کی موت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ سیاحت زمین کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ صلیب سے نجات پا کر زمین پر ہی رہے ہوں ورنہ بجز اس زمانہ کے جو صلیب سے نجات پا کر ملکوں کا سیر کیا ہو اور کوئی زمانہ سیاحت ثابت نہیں ہو سکتا۔ صلیب کے زمانہ تک نبوت کا زمانہ صرف ساڑھے تین برس تھے یہ زمانہ تبلیغ کے لیے بھی تھوڑا تھا چہ جائیکہ اس میں تمام ملک کی سیاحت کرتے۔ ایسا ہی مرہم عیسیٰ جو قریباً طب کی ہزار کتاب میں لکھی ہے ثابت کرتی ہے کہ صلیب کے واقعہ کے وقت حضرت عیسیٰ آسمان پر نہیں اٹھائے گئے بلکہ اپنے زخموں کا اس مرہم کے ساتھ علاج کراتے رہے اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا کہ زمین پر ہی رہے اور زمین پر ہی فوت ہوئے۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۲۷۳)

درحقیقت حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام برطبق آیت: فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ زمین پر ہی اپنی جسمانی زندگی کے دن بسر کر کے فوت ہو چکے ہیں اور قرآن کریم کی سولہ آیتوں اور بہت سی حدیثوں بخاری اور مسلم اور دیگر صحاح سے ثابت ہے کہ فوت شدہ لوگ پھر آباد ہونے اور بسنے کے لیے دنیا میں بھیجے نہیں جاتے اور نہ حقیقی اور واقعی طور پر د موتیں کسی پر واقع ہوتی ہیں اور نہ قرآن کریم میں واپس آنے والوں کے لیے کوئی قانون وراثت موجود ہے۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۰۲)

وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى: "فِيهَا تَحْيَوْنَ"  
فَقَضَّصَ حَيَاةَ النَّاسِ بِالْأَرْضِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فِيهَا تَحْيَوْنَ (کہ تم اسی زمین میں زندہ رہو گے) پس اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی زندگی کو زمین سے

مخصوص فرمایا ہے جس طرح ان کی موت کو مٹی سے خاص کر دیا۔ اے لوگو! کیا تم اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے نبی کی شہادت کو چھوڑ کر دوسری باتوں کی اتباع کرتے ہو۔ ظالموں کا بدلہ نہایت ہی برا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس راز سے آگاہ فرمایا ہے اور مجھے وہ کچھ سکھایا ہے جس کا تم کو علم نہیں اور مجھے تمہاری طرف حکم و عدل بنا کر بھیجا ہے تاکہ تم پر وہ باتیں کھولوں جو پہلے تم پر پوشیدہ تھیں۔ پس شک نہ کرو اور نہ جھگڑا کرو۔ (ترجمہ از مرتب)

كَمَا خَصَّصَ مَوْتَهُمْ بِالْأَثَرِى. اَتَتَوَكُّوْنَ  
كَلَامَ اللّٰهِ وَ شَهَادَةَ نَبِيِّهِ وَ تَتَّبِعُوْنَ  
اَقْوَالًا اٰخَرَ بِئْسَ لِلظَّالِمِيْنَ بَدَلًا. اَيُّهَا  
النَّاسِ قَدْ اَعْتَرَنِي اللّٰهُ عَلَى هَذَا السَّبِيْرِ وَ  
عَلَّمَنِي مَا لَمْ تَعْلَمُوْا وَ اُرْسَلَنِي اِلَيْكُمْ  
حَكَمًا عَدْلًا. لَّا كُشِفَ عَلَيْكُمْ مَا كَانَ  
عَلَيْكُمْ مُّسْتَتِرًا. فَلَا تُمَارَوْا وَلَا  
تُجَادِلُوْا.

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۲۳۳، ۲۳۴)

زمین پر یہی تم زندگی بسر کرو گے۔ اب دیکھو اگر کوئی آسمان پر جا کر بھی کچھ حصہ زندگی کا بسر کر سکتا ہے تو اس سے اس آیت کی تکذیب لازم آتی ہے۔

(تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۹۰، ۹۱)

اگر مان لیا جاوے کہ حضرت مسیح زندہ جسم عنصری آسمان پر تشریف لے گئے۔ تو پھر آیت: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيَّ (المائدہ: ۱۱۸) کیوں کر صحیح ٹھہر سکتی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت مسیح کی وفات کے بعد عیسائی بگڑ گئے۔ جب تک کہ وہ زندہ تھے عیسائی نہیں بگڑے اور پھر اس آیت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ کہ زمین پر ہی تم زندگی بسر کرو گے اور زمین پر ہی مرو گے کیا وہ شخص جو اٹھارہ سو برس سے آسمان پر بقول مخالفین زندگی بسر کر رہا ہے وہ انسانوں کی قسم میں سے نہیں ہے اگر مسیح انسان ہے تو نعوذ باللہ مسیح کے اس مدت دراز تک آسمان پر ٹھہرنے سے یہ آیت جھوٹی ٹھہرتی ہے اور اگر ہمارے مخالفوں کے نزدیک انسان نہیں ہے بلکہ خدا ہے تو ایسے عقیدہ سے وہ خود مسلمان نہیں ٹھہر سکتے۔ (تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۳۰۹، ۳۱۰)

بعض نادان کہتے ہیں کہ یہ بھی تو عقیدہ اہل اسلام کا ہے کہ الیاس اور خضر زمین پر زندہ موجود ہیں اور اوریس آسمان پر مگر ان کو معلوم نہیں کہ علماء محققین ان کو زندہ نہیں سمجھتے کیونکہ بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ آج سے ایک سو برس کے گزرنے پر زمین پر کوئی زندہ نہیں رہے گا۔ پس جو شخص خضر اور الیاس کو زندہ جانتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کذب ہے اور ادریس کو اگر آسمان پر زندہ مانیں تو پھر ماننا پڑے گا

کہ وہ آسمان پر ہی مرے گی کیونکہ ان کا دوبارہ زمین پر آنا نصوص سے ثابت نہیں اور آسمان پر مرنا آیت  
فِيهَا تَمُوتُونَ کے منافی ہے۔

قرآن شریف کی آیت: فِيهَا تَحْيَوْنَ سے موت ثابت ہوئی اور پھر قرآن شریف کی آیت: وَ لَكُمْ فِي  
الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ (البقرة: ۳۷) سے موت ثابت ہوئی کیونکہ ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ آسمان پر  
جسمانی زندگی اور قراگاہ کسی انسان کا نہیں ہو سکتا۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۳۸۵)

واضح رہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات نصوص قطعہ  
یقینیہ سے ثابت ہے اور اگر تم اس بات کا ثبوت قرآن  
سے طلب کرو تو تم اس میں یہ آیات پاؤ گے: لِيُعْبَدِيَ  
إِنِّي مُتَوَقِّئُكَ اور آیت: فَلَمَّا تَوَقَّيْتَنِي اور آیت: كَانَا  
يَا كُلِّنِ الطَّعَامِ اور آیت: مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ  
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اور آیت: فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ  
فِيهَا تَمُوتُونَ۔ اس آخری آیت کا مضمون اس بات پر  
صریحاً دلالت کرتا ہے کہ بنی آدم خاص طور پر زمین میں  
ہی زندگی گزاریں گے اور (یہ کہ) وہ آسمان پر اپنے  
جسم عنصری کے ساتھ صعود نہیں کریں گے۔ یہ اس لیے  
کہ لفظ فِيهَا جو تَحْيَوْنَ پر مقدم ہے زمین پر ہی حیات  
کی تخصیص کرتا اور انسانی زندگی کو زمین سے مقید کر دیتا  
ہے۔ اور اس آیت میں ان لوگوں کے خیال کی تردید  
ہے جو کہتے ہیں کہ کیوں کسی انسان کا جسم عنصری کے  
ساتھ آسمان پر جانا جائز نہیں اور (یہ کہ) وہ وہاں اس  
عرصہ تک زندہ رہے جب تک کہ منشاء الہی ہے۔ اور  
ان لوگوں پر تعجب ہے جو ہم پر افترا کرتے اور ہمارے

إِعْلَمُ أَنَّ وَفَاةَ عَيْسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ  
ثَابِتٌ بِالنُّصُوصِ الْقَطْعِيَّةِ الْيَقِينِيَّةِ،  
وَإِنْ تَطْلُبِ الثُّبُوتَ مِنَ الْقُرْآنِ فَتَجِدُ  
فِيهِ آيَةَ لِيُعْبَدِيَ إِنِّي مُتَوَقِّئُكَ<sup>۱</sup>، وَآيَةَ فَلَمَّا  
تَوَقَّيْتَنِي<sup>۲</sup>، وَآيَةَ كَانَا يَا كُلِّنِ الطَّعَامِ<sup>۳</sup>،  
مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ<sup>۴</sup> قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ  
الرُّسُلُ<sup>۵</sup>، وَآيَةَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا  
تَمُوتُونَ. وَهَذِهِ الْآيَةُ الْأَخِيرَةُ تَدُلُّ  
بِمَنْطِقِهَا عَلَى أَنَّ بَنِي آدَمَ يَحْيَوْنَ فِي  
الْأَرْضِ خَاصَّةً وَلَا يَصْعَدُونَ إِلَى السَّمَاءِ  
بِحِسْبِهِمُ الْعُنْصُرِيِّ، لِأَنَّ لَفْظَ فِيهَا الَّذِي  
هُوَ مُقَدَّمٌ عَلَى لَفْظِ تَحْيَوْنَ يُوجِبُ  
تَخْصِيصَ الْحَيَاةِ بِالْأَرْضِ وَيَقْيِدُ بِهَا،  
وَفِيهِ رَدٌّ عَلَى الَّذِينَ يَقُولُونَ لِمَ لَا يَجُوزُ  
أَنْ يُرْفَعَ أَحَدٌ بِجِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ إِلَى  
السَّمَاءِ وَيَحْيَى فِيهَا إِلَى مَدَّةٍ أَرَادَهَا اللَّهُ؟  
وَالْعَجَبُ مِنْهُمْ أَنَّهُمْ يَقْتَرُونَ عَلَيْنَا

متعلق گمان کرتے ہیں کہ ہم نے مسیح کے جسمِ غضری کے ساتھ آسمان پر جانے سے متعلق نصوصِ قرآنیہ کو ترک کر دیا ہے۔ پس عقلمندوں کو اس مقام پر غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم نے اس عقیدہ سے متعلق قرآن کریم اور اس کی نصوص کو چھوڑ دیا ہے یا ہمارے مخالفین خود ترک کرنے والے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ عز و جل نے فرمایا: بَلْ زَفَعَهُ اللَّهُ اور وہ اس آیت سے مسیح کے جسم کے اٹھائے جانے پر استدلال کرتے ہیں اور وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اگر بات اسی طرح ہی ہو تو (اس صورت میں) دونوں آیات میں تعارض پیدا ہو جاتا ہے یعنی آیت: بَلْ زَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ اور آیت: فِيهَا تَجْيُونَ فِيهَا تَجْيُونَ واقف ہو کہ قرآن تعارض اور تخالف سے پاک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے متعلق فرماتا ہے: وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ (اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے) پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ قرآن میں ہرگز اختلاف نہیں پایا جاتا اور اس کی شان اس سے بہت ارفع ہے کہ جو اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں اختلاف پایا جائے۔ پس جبکہ یہ امر ثابت ہو گیا کہ کتاب اللہ اختلافات سے پاک و منزہ ہے تو ہم پر ضروری ٹھہرا کہ اس کی تفسیر کے سلسلہ میں کوئی ایسا طریق اختیار نہ کریں جو تعارض اور تناقض پیدا کرنے کا موجب ہو۔ (ترجمہ از مرتب)

وَيَحْسَبُونَ كَأَنَّا تَرَكْنَا التُّصُوصَ الْقُرْآنِيَّةَ فِي رَفْعِ الْمَسِيحِ بِجَسَمِهِ الْعُنْصُرِيِّ، فَلْيَتَدَبَّرِ الْعَاقِلُ هَهُنَا أَكُنْ تَرَكْنَا الْقُرْآنَ وَنُصُوصَهُ فِي هَذِهِ الْعَقِيدَةِ أَمْ هُمْ كَانُوا تَارِكِينَ؟ وَقَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ قَالَ: بَلْ زَفَعَهُ اللَّهُ<sup>۱</sup>، وَيَحْتَجُّونَ بِهَذِهِ الْآيَةِ عَلَى رَفْعِ جَسَمِ الْمَسِيحِ، وَلَا يَتَدَبَّرُونَ أَنَّ الْأَمْرَ لَوْ كَانَ كَذَا لِكَانَ لَتَعَارُضِ الْآيَتَيْنِ۔ أَعْنِي آيَةَ بَلْ زَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَ آيَةَ فِيهَا تَجْيُونَ۔ وَأَنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ الْقُرْآنَ مُنَزَّهٌ عَنِ التَّعَارُضِ وَالتَّخَالُفِ، وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى: وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا<sup>۲</sup>، فَأَشَارَ فِي هَذِهِ الْآيَةِ أَنَّ الْاِخْتِلَافَ لَا يُوْجَدُ فِي الْقُرْآنِ، وَهُوَ كِتَابُ اللَّهِ وَشَأْنُهُ أَرْفَعُ مِنْ هَذَا، وَإِذَا ثَبَتَ أَنَّ كِتَابَ اللَّهِ مُنَزَّهٌ عَنِ الْاِخْتِلَافَاتِ فَوَجَبَ عَلَيْنَا أَلَّا نَخْتَارَ فِي تَفْسِيرِهِ طَرِيقًا يُوجِبُ التَّعَارُضَ وَالتَّخَالُفَ۔

(حمامۃ البشیری، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۵۳ تا ۲۵۶ حاشیہ)

سچی اور بالکل سچی اور صاف بات یہی ہے کہ اجسام ضرور ملتے ہیں لیکن یہ غضری اجسام یہاں ہی رہ جاتے

ہیں یہ اوپر نہیں جاسکتے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے جواب میں فرمایا: قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا (بنی اسرائیل: ۹۴)۔ یعنی ان کو کہہ دے میرا رب اس سے پاک ہے جو اپنے وعدوں کے خلاف کرے جو وہ پہلے کر چکا ہے۔ میں تو صرف ایک بشر رسول ہوں۔ سبحان کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ سابق جو وعدے ہو چکے ہیں ان کی خلاف ورزی وہ نہیں کرتا۔ وہ وعدہ کیا ہے؟ وَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَ مَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (الاعراف: ۲۷) اور ایسا ہی فرمایا: أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا (البرسولات: ۲۶) اور پھر: فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ۔ ان سب آیتوں پر اگر یکجا کی نظر کی جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جسم جو کھانے پینے کا محتاج ہے آسمان پر نہیں جاتا۔

يَبْنِيْ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُؤَارِي سُوَاتِكُمْ وَرِيشًا ۗ وَ لِبَاسٍ التَّقْوَىٰ ۗ

ذٰلِكَ خَيْرٌ ۗ ذٰلِكَ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا هُمْ نَمُورُ لِبَاسٍ اُتَارَا۔ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۴۵ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے: قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا اور پھر فرمایا: اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ نِيْزًا فَرْمَايَا: وَ اَنْزَلْ لَكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ اَنْزٰلًا مِّنْ سَمٰوٰتٍ مَّوْجِدٰتٍ ۗ وَ لِبَاسٍ التَّقْوَىٰ ۗ وَ لِبَاسٍ التَّقْوَىٰ ۗ

اخر: ثُمَّ اَنْظُرْ اِنَّهٗ تَعَالٰى قَالَ فِي مَقَامٍ اٰخَرَ: قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا، وَقَالَ: اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ، وَ اَنْزَلْ لَكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ اَنْزٰلًا مِّنْ سَمٰوٰتٍ مَّوْجِدٰتٍ ۗ، وَمَعْلُوْمٌ اَنَّ هٰذِهِ الْاَشْيَاءُ لَا تَنْزِلُ مِنَ السَّمٰوٰتِ فَمَا عَزَاها اللّٰهُ اِلَيْهَا اِلَّا اِشَارَةً اِلَى اَنَّ الْعِلَّةَ الْاُولٰى مِنَ الْعِلَلِ النَّبِيّ قَدَّرَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِخَلْقِ تِلْكَ الْاَشْيَاءِ وَ تَوَلٰىهَا وَ تَكُوْنُهَا تَاثِيْرَاتٍ فَلِكَيْفِيَّةٍ وَ شَمْسِيَّةٍ وَ قَمْرِيَّةٍ وَ مُجُوْمِيَّةٍ، وَ اَشَارَ عَزَّ وَ جَلَّ فِي هٰذِهِ الْاٰيٰتِ اِلَى اَنَّ الْاَرْضَ كَامْرَاةٍ وَ السَّمٰوٰتِ كَبَعْلِهَا، وَ لَا تَتِيْمُ فَعُلْ اِحْدَاهُمَا اِلَّا بِالْاٰخِرَىٰ،

اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزیں آسمان سے نہیں اترتیں۔ ہاں! اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان کی طرف یہ اشارہ کرنے کے لیے منسوب کیا ہے کہ ان اسباب میں سے جو اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کی تخلیق اور تکوین اور پیدا کرنے کے لیے مقدر فرمائے ہیں ان میں سے پہلی علت آسمان، سورج، چاند اور ستاروں کی تاثیرات ہیں اور ان آیات میں اللہ عزوجل نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ زمین عورت کی مانند ہے اور آسمان اس کے خاوند کی مانند ہے ان میں سے ایک کا کام دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ پس ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے

فَزَوَّجَهُمَا حِمْلَهُمَا مِنْ عِنْدِهِ وَكَانَ اللَّهُ  
عَلِيمًا حَكِيمًا۔  
والا اور حکمت والا ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

(حصامۃ البشری، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۸۹)

نزول سے مراد عزت و جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۷)  
خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں تقویٰ کو لباس کے نام سے موسوم کیا ہے چنانچہ لباس التقویٰ قرآن شریف  
کا لفظ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روحانی خوبصورتی اور روحانی زینت تقویٰ سے ہی پیدا ہوتی  
ہے اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان خدا کی تمام امانتوں اور ایمانی عہد اور ایسا ہی مخلوق کی تمام امانتوں اور عہد کی حتی  
الوسع رعایت رکھے یعنی ان کے دقیق در دقیق پہلوؤں پر تامل و فکر کا بند ہو جائے۔

(براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۱۰)

تقویٰ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو شریعت کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں اور اگر شریعت کو مختصر طور پر بیان کرنا  
چاہیں تو مغز شریعت تقویٰ ہی ہو سکتا ہے۔ تقویٰ کے مدارج اور مراتب بہت ہیں لیکن اگر طالب صادق ہو کر  
ابتدائی مراتب اور مراحل کو استقلال اور خلوص سے طے کرے تو وہ اس راستی اور طلب صدق کی وجہ سے  
اعلیٰ مدارج کو پالیتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّهَا يَتَّقِبَلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (المائدہ: ۲۸)..... ہماری  
جماعت کو لازم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر ایک ان میں سے تقویٰ کی راہوں پر قدم مارے تاکہ قبولیت دعا  
کا سرور اور حظ حاصل کرے اور زیادتی ایمان کا حصہ لے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۳)  
تقویٰ خلاصہ ہے تمام صحف مقدسہ اور توریت و انجیل کی تعلیمات کا۔ قرآن کریم نے ایک ہی لفظ  
میں خدا تعالیٰ کی عظیم الشان مرضی اور پوری رضا کا اظہار کر دیا ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۳ جون ۱۸۹۹ء صفحہ ۷)

تقویٰ ایک تریاق ہے جو اسے استعمال کرتا ہے تمام زہروں سے نجات پاتا ہے مگر تقویٰ کامل ہونا  
چاہیے۔ تقویٰ کی کسی شاخ پر عمل پیرا ہونا ایسا ہے جیسے کسی کو بھوک لگی ہو اور وہ دانہ کھالے۔ ظاہر ہے کہ اس کا  
کھانا اور نہ کھانا برابر ہے ایسا ہی پانی کی پیاس ایک قطرہ سے نہیں سمجھ سکتی۔ یہی حال تقویٰ کا ہے۔ کسی ایک  
شاخ پر عمل موجب ناز نہیں ہو سکتا۔ بس تقویٰ وہی ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ  
اتَّقَوْا (النحل: ۱۳۹) خدا تعالیٰ کی معیت بتا دیتی ہے کہ یہ متقی ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

اگر بار بار اللہ کریم کا رحم چاہتے ہو تو تقویٰ اختیار کرو اور وہ سب باتیں جو خدا تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہیں چھوڑ دو۔ جب تک خوفِ الہی کی حالت نہ ہو تب تک حقیقی تقویٰ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کوشش کرو کہ متقی بن جاؤ۔ جب وہ لوگ ہلاک ہونے لگتے ہیں جو تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ تب وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو متقی ہوتے ہیں۔ ایسے وقت ان کی نافرمانی انہیں ہلاک کر دیتی ہے اور ان کا تقویٰ انہیں بچا لیتا ہے۔ انسان اپنی چالاکیوں، شرارتوں اور غداریوں کے ساتھ اگر بچنا چاہے تو ہرگز بچ نہیں سکتا۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

یاد رکھو کہ دعائیں منظور نہ ہوں گی جب تک تم متقی نہ ہو اور تقویٰ اختیار کرو۔ تقویٰ کی دو قسم ہیں۔ ایک علم کے متعلق دوسرا عمل کے متعلق۔ علم کے متعلق تو میں نے بیان کر دیا کہ علوم دین نہیں آتے اور حقائق معارف نہیں کھلتے جب تک متقی نہ ہو اور عمل کے متعلق یہ ہے کہ نماز، روزہ اور دوسری عبادات اس وقت تک ناقص رہتی ہیں جب تک متقی نہ ہو۔

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿۱۰﴾

اسلام کی ظاہری اور جسمانی صورت میں بھی ضعف آ گیا ہے وہ قوت اور شوکت اسلامی سلطنت کی نہیں اور دینی طور پر بھی وہ بات جو مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ میں سکھائی گئی تھی اس کا نمونہ نظر نہیں آتا ہے اندرونی طور پر اسلام کی حالت بہت ضعیف ہو گئی ہے اور بیرونی حملہ آور چاہتے ہیں کہ اسلام کو نابود کر دیں ان کے نزدیک مسلمان کتوں اور خنزیروں سے بدتر ہیں ان کی غرض اور ارادے یہی ہیں کہ وہ اسلام کو تباہ کر دیں اور مسلمانوں کو ہلاک کریں..... اب خدا کی کتاب کے بغیر اور اس کی تائید اور روشن نشانوں کے سوا ان کا مقابلہ ممکن نہیں اور اسی غرض کے لیے خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

اس وقت اسلام جس چیز کا نام ہے اس میں فرق آ گیا ہے۔ تمام اخلاق ذمہ بھر گئے ہیں اور وہ اخلاص جس کا ذکر مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ میں ہوا ہے۔ آسمان پر اٹھ گیا ہے خدا کے ساتھ صدق و فاداری اخلاص محبت اور خدا پر توکل کا عدم ہو گئے ہیں۔ اب خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ پھر نئے سرے سے ان قوتوں کو

زندہ کرے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

اب یہ زمانہ ہے کہ اس میں ریا کاری، عجب، خود بینی، تکبر، نخوت، رعونت، وغیرہ صفات رذیلہ تو ترقی کر گئے ہیں اور مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وغیرہ صفات حسنہ جو تھے وہ آسمان پر اُٹھ گئے۔ توکل، تفویض وغیرہ سب باتیں کالعدم ہیں اب خدا کا ارادہ ہے کہ ان کی عمر یزی ہو۔ (البدرد جلد ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

اعمال کے لیے اخلاص شرط ہے جیسا کہ فرمایا: مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ یہ اخلاص ان لوگوں میں ہوتا ہے جو ابدال ہیں۔ یہ لوگ ابدال ہو جاتے ہیں اور وہ اس دنیا کے نہیں رہتے ان کے ہر کام میں ایک خلوص اور اہلیت ہوتی ہے۔۔۔ یہ خوب یاد رکھو کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے لیے ہو جاوے خدا تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۶ء صفحہ ۵ و ۶ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

(ایک شخص نے سوال کیا کہ نماز میں کھڑے ہو کر اللہ جل شانہ کا کس طرح کا نقشہ پیش نظر ہونا چاہیے؟ فرمایا:)

مولیٰ بات ہے قرآن شریف میں لکھا ہے: اُدْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ، اخلاص سے خدا تعالیٰ کو یاد کرنا چاہیئے اور اس کے احسانوں کا بہت مطالعہ کرنا چاہیئے۔ چاہیئے کہ اخلاص ہو، احسان ہو اور اس کی طرف ایسا رجوع ہو کہ بس وہی ایک رب اور حقیقی کارساز ہے۔ عبادت کے اصول کا خلاصہ اصل میں یہی ہے کہ اپنے آپ کو اس طرح سے کھڑا کرے کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے اور یہ کہ خدا سے دیکھ رہا ہے۔ ہر قسم کی ملونی اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو جاوے اور اسی کی عظمت اور اسی کی ربوبیت کا خیال رکھے، ادعیہ ماثورہ اور دوسری دعائیں خدا سے بہت مانگے اور بہت توبہ و استغفار کرے اور بار بار اپنی کمزوری کا اظہار کرے تا کہ تزکیہ نفس ہو جاوے اور خدا سے سچا تعلق ہو جاوے اور اس کی محبت میں محو ہو جاوے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۸ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

يٰۤاَيُّهَا اٰدَمُ خُذْ وَاٰزِيْنَتَكَ مَعَكَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۗ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

واضح ہو کہ قرآن شریف کے رو سے انسان کی طبعی حالتوں کو اس کی اخلاقی اور روحانی حالتوں سے نہایت ہی شدید تعلقات واقع ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کے کھانے پینے کے طریقے بھی انسان کی اخلاقی اور روحانی حالتوں پر اثر کرتے ہیں۔ اور اگر ان طبعی حالتوں سے شریعت کی ہدایت کے موافق کام لیا جائے تو جیسا کہ

نمک کی کان میں پڑ کر ہر ایک چیز نمک ہی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ تمام حالتیں اخلاقی ہی ہو جاتی ہیں اور روحانیت پر نہایت گہرا اثر کرتی ہیں۔ اسی واسطے قرآن شریف نے تمام عبادات اور اندرونی پاکیزگی کے اغراض اور خشوع اور خضوع کے مقاصد میں جسمانی طہارتوں اور جسمانی آداب اور جسمانی تعدیل کو بہت ملحوظ رکھا ہے اور غور کرنے کے وقت یہی فلاسفی نہایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جسمانی اوضاع کا روح پر بہت قوی اثر ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے طبعی افعال کو بظاہر جسمانی ہیں مگر ہماری روحانی حالتوں پر ضرور ان کا اثر ہے مثلاً جب ہماری آنکھیں رونا شروع کریں اور گو تکلف سے ہی روویں مگر فی الفور ان آنسوؤں کا ایک شعلہ اٹھ کر دل پر جا پڑتا ہے۔ تب دل بھی آنکھوں کی پیروی کر کے غمگین ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی جب ہم تکلف سے ہنسنا شروع کریں تو دل میں بھی ایک انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جسمانی سجدہ بھی روح میں خشوع اور عاجزی کی حالت پیدا کرتا ہے۔ اس کے مقابل پر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب ہم گردن کو اونچی کھینچ کر اور چھاتی کو ابھار کر چلیں تو یہ وضع رفتار ہم میں ایک قسم کا تکبر اور خود بینی پیدا کرتی ہے۔ تو ان نمونوں سے پورے انکشاف کے ساتھ کھل جاتا ہے کہ بے شک جسمانی اوضاع کا روحانی حالتوں پر اثر ہے۔

ایسا ہی تجربہ ہم پر ظاہر کرتا ہے کہ طرح طرح کی غذاؤں کا بھی دماغی اور دلی قوتوں پر ضرور اثر ہے۔ مثلاً ذرا غور سے دیکھنا چاہئے کہ جو لوگ کبھی گوشت نہیں کھاتے رفتہ رفتہ ان کی شجاعت کی قوت کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ نہایت بزدل<sup>۱</sup> ہو جاتے ہیں اور ایک خداداد اور قابل تعریف قوت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کی شہادت خدا کے قانون قدرت سے اس طرح پر بھی ملتی ہے کہ چار پایوں میں سے جس قدر گھاس خور جانور ہیں کوئی بھی ان میں سے وہ شجاعت نہیں رکھتا جو ایک گوشت خور جانور رکھتا ہے۔ پرندوں میں بھی یہی بات مشاہدہ ہوتی ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ اخلاق پر غذاؤں کا اثر ہے۔ ہاں! جو لوگ دن رات گوشت خوری پر زور دیتے ہیں اور نباتی غذاؤں سے بہت ہی کم حصہ رکھتے ہیں وہ بھی حلم اور انکسار کے خلق میں کم ہو جاتے ہیں اور میانہ روش کو اختیار کرنے والے دونوں خلق کے وارث ہوتے ہیں۔ اسی حکمت کے لحاظ سے خدائے تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے: **كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا** یعنی گوشت بھی کھاؤ اور دوسری چیزیں بھی کھاؤ مگر کسی چیز کی حد سے زیادہ کثرت نہ کرو تا اس کا اخلاقی حالت پر بد اثر نہ پڑے اور تا یہ کثرت مضر صحت بھی نہ ہو اور جیسا کہ جسمانی افعال اور اعمال کا روح پر اثر پڑتا ہے ایسا ہی کبھی روح کا اثر بھی جسم پر جا

پڑتا ہے۔ جس شخص کو کوئی غم پہنچے آخروہ چشم پر آب ہو جاتا ہے اور جس کو خوشی ہو آخروہ تبسم کرتا ہے۔ جس قدر ہمارا کھانا، پینا، سونا، جاگنا، حرکت کرنا، آرام کرنا، غسل کرنا وغیرہ افعال طبعیہ ہیں یہ تمام افعال ضروری ہماری روحانی حالت پر اثر کرتے ہیں۔ ہماری جسمانی بناوٹ کا ہماری انسانیت سے بڑا تعلق ہے۔ دماغ کے ایک مقام پر چوٹ لگنے سے یکلخت حافظ جاتا رہتا ہے اور دوسرے مقام پر چوٹ لگنے سے ہوش و حواس رخصت ہوتے ہیں۔ وباء کی ایک زہریلی ہوا کس قدر جلدی سے جسم میں اثر کر کے پھر دل میں اثر کرتی ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ اندرونی سلسلہ جس کے ساتھ تمام نظام اخلاق کا ہے درہم برہم ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان دیوانہ سا ہو کر چند منٹ میں گذر جاتا ہے۔ غرض جسمانی خدمات بھی عجیب نظارہ دکھاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ روح اور جسم کا ایک ایسا تعلق ہے کہ اس راز کو کھولنا انسان کا کام نہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۱۹ تا ۳۲۱)

مومنوں کو کَلُوا وَاَشْرَبُوا کا حکم دیا۔۔۔۔۔ کَلُوا ایک امر ہے جب مومن اس کو امر سمجھ کر بجلا دے تو اس کا ثواب ہوگا۔

گوشت دال وغیرہ سب چیزیں جو پاک ہوں بیشک کھاؤ۔ مگر ایک طرف کی کثرت مت کرو اور اسراف اور زیادہ خوری سے اپنے پیئیں بچاؤ۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳۶، ۳۳۷)

یہ خدا تعالیٰ کا ان (عرب کے لوگوں۔ ناقل) پر اور تمام دنیا پر احسان تھا کہ حفظانِ صحت کے قواعد مقرر فرمائے یہاں تک کہ یہ بھی فرما دیا کہ: کَلُوا وَاَشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا یعنی بے شک کھاؤ پیو مگر کھانے پینے میں بے جا طور پر کوئی زیادت کیفیت یا کمیت کی مت کرو۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۳۲)

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۖ وَالْأَلْمَمَ ۖ وَالْبَغْيَ ۖ بِغَيْرِ  
الْحَقِّ ۖ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا  
تَعْلَمُونَ ﴿۳۲﴾

خدا نے ظاہری اور اندرونی گناہ دونوں حرام کر دیئے۔ اب میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ عمدہ تعلیم بھی انجیل میں موجود نہیں کہ تمام عضووں کے گناہوں کا ذکر کیا ہو اور عزیمت اور خطرات میں فرق کیا ہو اور ممکن نہ تھا کہ انجیل میں یہ تعلیم ہو سکتی کیونکہ یہ تعلیم نہایت لطیف اور حکیمانہ اصولوں پر مبنی ہے اور انجیل تو ایک موٹے خیالات

کا مجموعہ ہے جس سے اب ہر ایک محقق نفرت کرتا جاتا ہے۔ (نور القرآن نمبر ۲، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۴۲۸)

يٰۤاَيُّهَا  
رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ آيٰتِيْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۳۷  
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۸

متقی بننے کے واسطے یہ ضروری ہے کہ بعد اس کے کہ موٹی باتوں جیسے زنا، چوری، تلف حقوق، ریا، عجب، حقارت، بخل کے ترک میں پکا ہو تو اخلاق رذیلہ سے پرہیز کر کے ان کے بالمقابل اخلاق فاضلہ میں ترقی کرے، لوگوں سے مروت، خوش خلقی، ہمدردی سے پیش آئے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا و فافا اور صدق دکھلاوے۔ خدمات کے مقام محمود تلاش کرے۔ ان باتوں سے انسان متقی کہلاتا ہے اور جو لوگ ان باتوں کے جامع ہوتے ہیں وہی اصل متقی ہوتے ہیں (یعنی اگر ایک ایک خلق فرداً فرداً کسی میں ہو تو اسے متقی نہ کہیں گے جب تک بحیثیت مجموعی اخلاق فاضلہ اس میں نہ ہوں) اور ایسے ہی شخصوں کے لیے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ہے اور اس کے بعد ان کو کیا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ایسوں کا متولی ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ فرماتا ہے وَهُوَ يَتَوَكَّلُ الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف: ۱۹۷) حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ ہو جاتا ہے جس سے وہ پکڑتے ہیں ان کی آنکھ ہو جاتا ہے جس سے وہ دیکھتے ہیں ان کے کان ہو جاتا ہے جن سے وہ سنتے ہیں ان کے پاؤں ہو جاتا ہے جن سے وہ چلتے ہیں اور ایک اور حدیث میں ہے کہ جو میرے ولی کی دشمنی کرتا ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ میرے مقابلہ کے لیے تیار ہو ایک جگہ فرمایا ہے کہ جب کوئی خدا کے ولی پر حملہ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس پر ایسے جھپٹ کر آتا ہے جیسے ایک شیرنی سے کوئی بچہ اس کا چھینے تو وہ غضب سے جھپٹتی ہے۔ (البدلہ جلد ۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۸)

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيٰتِهِ ۗ أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمُ نَصِيْبُهُمْ  
مِّنَ الْعَذَابِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۗ قَالُوا إِنَّا مِمَّنْ كُنْتُمْ تَدْعُونَ مِن  
دُونِ اللَّهِ ۗ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلٰىٰ أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كٰفِرِيْنَ ۝۳۸

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا پر افترا کرنے والا سب کافروں سے بڑھ کر کافر ہے جیسا کہ فرماتا ہے کہ  
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيٰتِهِ (الانعام: ۲۲) یعنی بڑے کافر وہی ہیں ایک خدا

پر افترا کرنے والا دوسرا خدا کی کلام کی تکذیب کرنے والا۔ پس جبکہ میں نے ایک مکذب کے نزدیک خدا پر افترا کیا ہے اس صورت میں نہ صرف میں کافر بلکہ بڑا کافر ہوا اور اگر میں مفتری نہیں تو بلاشبہ وہ کفر اس پر پڑے گا۔

ظالم سے مراد اس جگہ کافر ہے اس پر فریضہ یہ ہے کہ مفتری کے مقابل پر مکذب کتاب اللہ کو ظالم ٹھہرایا ہے اور بلاشبہ وہ شخص جو خدا تعالیٰ کے کلام کی تکذیب کرتا ہے کافر ہے سو جو شخص مجھے نہیں مانتا وہ مجھے مفتری قرار دے کر مجھے کافر ٹھہراتا ہے اس لیے میری تکفیر کی وجہ سے آپ کافر بنتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۶۷ حاشیہ)

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلْبِغَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۗ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۱﴾

ایک اور طرح آنا جاننا روحوں کا قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بدکاروں کی روحوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھلتے اور پھر وہ زمین کی طرف رد کیے جاتے ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ وَلَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ۔

(ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۰۸ حاشیہ)

تمام مومنوں اور رسولوں اور نبیوں کا مرنے کے بعد رفع روحانی ہوتا ہے اور کافر کا رفع روحانی نہیں ہوتا چنانچہ آیت: لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ کا اسی طرف اشارہ ہے۔

(کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۲۳۷ حاشیہ)

کافر کے لیے حکم ہے کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ یعنی ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے یعنی ان کا رفع نہیں ہوگا۔ (برابین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۵۵)

یہودیوں کا ہرگز یہ اعتقاد نہیں کہ جو شخص مع جسم عنصری آسمان پر نہ جاوے وہ مومن نہیں بلکہ وہ تو آج تک اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ جس کا رفع روحانی نہ ہو اور اس کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں وہ مومن نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرآن شریف بھی فرماتا ہے: وَلَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ یعنی کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۰)

یہ خوب یاد رہے کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر روح بلا جسم ہرگز نہیں مانتے، ہم مانتے ہیں کہ وہ وہاں جسم ہی کے ساتھ ہیں۔ ہاں! فرق اتنا ہے کہ یہ لوگ جسم عنصری کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ وہ جسم وہی جسم ہے جو دوسرے رسولوں کو دیا گیا ہے۔ دوزخیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا تُفْتَحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ یعنی کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاویں گے اور مومنوں کے لیے فرماتا ہے: مُفْتَتِحَةً لَهُمُ الْآبْوَابُ (ص: ۵۱)۔ اب ان آیات میں لُفْتٌ کا لفظ اجسام کو چاہتا ہے۔ تو کیا یہ سب کے سب پھر اس جسم عنصری کے ساتھ جاتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں، جسم تو ہوتے ہیں مگر وہ جسم ہیں جو مرنے کے بعد دیئے جاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸۹)

مسلمانوں اور یہود کا متفقہ اور مسلم اعتقاد اس پر ہے کہ خدا کے نیک بندوں کا بعد وفات رفع روحانی ہوا کرتا ہے اور یہی قابل بڑائی بات ہے۔ رفع جسمانی کے یہ نہ قائل ہیں اور نہ کوئی فضیلت اس میں مد نظر ہے۔ چنانچہ قرآن شریف بھی اسی اصول کو یوں بیان فرماتا ہے کہ مُفْتَتِحَةً لَهُمُ الْآبْوَابُ (ص: ۵۱)۔ یعنی جو خدا کے نزدیک متقی اور برگزیدہ انسان ہوتے ہیں خدا ان کے لیے آسمانی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے اور ان کا رفع روحانی بعد الموت کیا جاتا ہے اور ان کے مقابل میں جو لوگ بدکار اور خدا سے دور ہوتے ہیں اور ان کو خدا سے کوئی تعلق صدق و اخلاص نہیں ہوتا ان کے واسطے آسمانی دروازے نہیں کھولے جاتے جیسا کہ فرمایا: لَا تُفْتَحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلْبِغَ الْجَمَلُ فِي سِوِّ الْخِيَاطِ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلْبِغَ الْجَمَلُ فِي سِوِّ الْخِيَاطِ یعنی کفار جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گذر جائے۔ مفسرین اس کا مطلب ظاہری طور پر لیتے ہیں مگر میں یہی کہتا ہوں کہ نجات کے طلب گار کو خدا تعالیٰ کی راہ میں نفس کے شتر بے مہار کو مجاہدات سے ایسا دبا کر دینا چاہیے کہ وہ سوئی کے ناکے میں سے گذر جائے جب تک نفس دنیوی لڈانڈ و شوہوانی حظوظ سے موٹا ہوا ہوا ہے تب تک یہ شریعت کے پاک راہ سے گذر کر بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دنیوی لذات پر موت وارد کرو اور خوف و خشیت الہی سے دبلے ہو جاؤ تب تم گذر سکو گے اور یہی گذرنا تمہیں جنت میں پہنچا کر نجات اخروی کا موجب ہوگا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴)

شریعت نے دو طرفوں کو مانا ہے ایک خدا کی طرف اور وہ اونچی ہے جس کا مقام انتہائے عرش ہے اور

دوسری شیطان کی اور وہ بہت نیچی ہے اور اس کا انتہا زمین کا پاتال ہے غرض یہ تینوں شریعتوں کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ مومن مرکر خدا کی طرف جاتا ہے اور اس کے لیے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں جیسا کہ آیت: اِرْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ (الفجر: ۲۹) اس کی شاہد ہے اور کافر نیچے کی طرف جو شیطان کی طرف ہے جاتا ہے جیسا کہ آیت: وَلَا تُفْتَحْ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاۗءِ اس کی گواہ ہے خدا کی طرف جانے کا نام رفع ہے اور شیطان کی طرف جانے کا نام لعنت ہے۔ ان دونوں لفظوں میں تقابل اضداد ہے۔ نادان لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر رفع کے معنی مع جسم اٹھانا ہے تو اس کے مقابل کا لفظ کیا ہوا جیسا کہ رفع روحانی کے مقابل پر لعنت ہے۔ (تحفہ گوٹڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹)

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ اِلَآ نَهْرٌ ۚ وَقَالُوا الْحٰمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدٰنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ ۗ لَقَدْ جَاۗءَتْ رُسُلٌ رَّبِّنَا بِالْحَقِّ ۗ وَنُودُوۡا اَنْ تَكْفُرُوۡا بِالْحَقِّ ۗ اُوۡرِثْتُمُوۡهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوۡنَ ﴿۸﴾

یہ تو شیعوں کا مذہب ہے کہ صحابہ کے درمیان آپس میں ایسی سخت دشمنی تھی، یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ اس کی تردید میں فرماتا ہے کہ: نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ برادر یوں کے درمیان آپس میں دشمنیاں ہوا کرتی ہیں۔ مگر شادی، مرگ کے وقت وہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اخیر میں خونیں دشمنی کبھی نہیں ہوتی۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

اس طرح آزمائش کرو کہ خدا اور رسول کی راہ میں کس نے صدق دکھلایا، آپس کی رنجشیں خاگی امور ہوتے ہیں ان کا اثر ان (صحابہ) پر نہیں پڑ سکتا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيۡنَ (الحجر: ۴۸)۔ یہ ایک پیشگوئی ہے کہ آئندہ زمانہ میں آپس میں رنجشیں ہوں گی لیکن غِلِّ ان کے سینوں میں سے کھینچ لیویں گے، وہ بھائی ہوں گے تختوں پر بیٹھنے والے۔ اب شیعوں سے پوچھو کہ اس وقت زمانہ نبوی میں تو کوئی رنجش نہ تھی اور اگر ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت آپس میں صلح کروا دیتے۔ آخر یہ بات آئندہ زمانہ میں ہونے والی تھی ورنہ اس طرح پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حرف آتا ہے کہ انہوں نے صلح کی کوشش تو کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ یہ بات شیعہ پر بڑی دلیل ہے وہ صرف دو آدمیوں کا نام لیتے ہیں جو کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ہوئے، ہم کہتے کہ آیت تو پیغمبر خدا پر

اتری تھی نہ علیؑ پر اور نہ کسی اور پر۔ اگر کہو کہ اس وقت ہی غیلؑ تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ! صحابہ ایسے سخت دل تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار کہا اور سمجھا یا مگر کسی نے آپ کا کہنا نہ مانا۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ تو بڑی بے ادبی ہے۔ اس کا پتہ لگتا ہے کہ یہ بعد کی خبر ہے مگر خدا کے سامنے یہ کوئی شے نہیں اسی لیے فرماتا ہے کہ تم اس پر خیال نہ کرو یہ بشریت کے اختلاف ہیں ہم ان کو بھائی بھائی بنا دیں گے۔ خدا تعالیٰ ہی نے یہ پیشگوئی کی کہ ایسا ہوگا بعض آپس میں لڑیں گے۔ (الہدیر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵)

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ صالحین کے درمیان ایسے طریق پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ فاسقوں کے معاملات کا اس طریق پر فیصلہ نہیں فرماتا۔ کیونکہ وہ (صحابہ - ناقل) سب کے سب اس کے دوست۔ اس کے محب اور اس کے مقبول ہیں اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے جھگڑوں کے انجام سے اطلاع دی اور اس نے جو اصدق الصادقین ہے فرمایا: وَ نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غَيْلٍ اِخْوَانًا عَلٰی سُرِّ مَقْتَلِبِلَيْنِ اور ہم ان کے دلوں سے جو بھی کینے ہیں نکال باہر کریں گے۔ بھائی بھائی بنتے ہوئے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے اور یہی صحیح اصل اور حق صریح ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

وَقَدْ جَرَتْ سُنَّتُهُ اِنَّهُ يَفْضِلُ  
بَيْنَ الصَّالِحِيْنَ عَلَى طَرِيْقٍ لَا يَفْضِلُ  
عَلَيْهِمْ قَضَايَا الْفَاسِقِيْنَ، فَاِنَّهُمْ  
كُلُّهُمْ اَحْبَاؤُهُ وَكُلُّهُمْ مِّنَ الْمُحِبِّيْنَ  
الْمَقْبُوْلِيْنَ، وَلَا اَجَلَ ذٰلِكَ اَحْبَرْنَا  
رَبَّنَا عَنْ مَّالٍ نِّزَاعِهِمْ وَقَالَ وَهُوَ  
اَصْدَقُ الْقَائِلِيْنَ۔ نَزَعْنَا مَا فِي  
صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غَيْلٍ اِخْوَانًا عَلٰی سُرِّ  
مَقْتَلِبِلَيْنِ ۗ هٰذَا هُوَ الْاَصْلُ الصَّحِيْحُ  
وَالْحَقُّ الصَّرِيْحُ

(سورۃ الخلافۃ، روحانی خزائن جلد ۸ صفحہ ۳۴۷، ۳۴۸)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ سَبَّ تَعْرِيفِيْسُ خدَا كُوْهِيْسُ  
نے جنت کی طرف ہم کو آپ راہبری کی اور ہم کیا چیز تھے کہ خود بخود منزل مقصود تک پہنچ جاتے اگر خدا راہبری نہ کرتا۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۶۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ۔ یعنی سب تعریف اس خدا کو جس نے ہمیں بہشت میں داخل ہونے کے لیے آپ ہی سب تو فوق بخشی، آپ ہی ایمان بخشا، آپ ہی نیک عمل کرائے، آپ ہی ہمارے دلوں کو پاک کیا اگر وہ خود مدد نہ کرتا تو ہم آپ کو کچھ بھی چیز نہ تھے۔

(ست چکن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲)

سب حمدیں اس خداوند تعالیٰ کے لیے جس نے ہم کو دارالسلام کی ہدایت کی اور ہم کیا چیز تھے جو خود بخود یہاں تک پہنچتے اگر وہ ہدایت نہ دیتا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

وَلَقَدْ جَعَلْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۷﴾

وہ (قرآن کریم) مفصل کتاب ہے.... یہ عظیمیں اور خوبیاں کہ جو قرآن کریم کی نسبت بیان فرمائی گئیں احادیث کی نسبت کی ایسی تعریفوں کا کہاں ذکر ہے؟ پس میرا مذہب ”فرقہ ضالہ نیچریہ“ کی طرح یہ نہیں ہے کہ میں عقل کو مقدم رکھ کر قال اللہ اور قال الرسول پر کچھ نکتہ چینی کروں۔ ایسے نکتہ چینی کرنے والوں کو ملحد اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔ بلکہ میں جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہم کو پہنچایا ہے اس سب پر ایمان لاتا ہوں۔ صرف عاجزی اور انکسار کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ قرآن کریم ہر ایک وجہ سے احادیث پر مقدم ہے اور احادیث کی صحت و عدم صحت پر کھنے کے لیے وہ محک ہے اور مجھ کو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی اشاعت کے لیے مامور کیا ہے تا میں جو ٹھیک ٹھیک منشا قرآن کریم کا ہے لوگوں پر ظاہر کروں۔ (الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۳۰ حاشیہ)

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَىٰ الْعَرْشِ ۚ يُغْشَىٰ بِاللَّيْلِ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا ۚ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۵۸﴾

قرآن شریف میں لفظ عرش کا جہاں جہاں استعمال ہوا ہے اس سے مراد خدا کی عظمت اور جبروت اور بلندی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مخلوق چیزوں میں داخل نہیں کیا اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور جبروت کے مظہر چار ہیں جو وید کے رو سے چار دیوتے کہلاتے ہیں مگر قرآنی اصطلاح کی رو سے ان کا نام فرشتے بھی ہے اور وہ یہ ہیں؛ اکاش جس کا نام اندر بھی ہے۔ سورج دیوتا جس کو عربی میں شمس کہتے ہیں۔ چاند جس کو عربی میں قمر کہتے ہیں۔ دھرتی جس کو عربی میں ارض کہتے ہیں۔ یہ چاروں دیوتا جیسا کہ ہم اس رسالہ میں بیان کر چکے ہیں خدا کی چار صفتوں کو جو اس کے جبروت اور عظمت کا اتم مظہر ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں عرش کہا جاتا ہے اٹھارہ ہیں یعنی عالم پر یہ ظاہر کر رہے ہیں تصریح کی حاجت نہیں۔ اس بیان کو ہم مفصل لکھ آئے ہیں اور

قرآن شریف میں تین قسم کے فرشتے لکھے ہیں؛

(۱) ذرات اجسام ارضی اور روحوں کی قوتیں۔

(۲) اکاش، سورج، چاند، زمین کی قوتیں جو کام کر رہی ہیں۔

(۳) ان سب پر اعلیٰ طاقتیں جو جبرائیل و میکائیل و عزرائیل وغیرہ نام رکھتی ہیں جن کو وید میں جم لکھا ہے مگر اس جگہ فرشتوں سے یہ چار دیوتے مراد ہیں یعنی اکاش اور سورج وغیرہ جو خدا تعالیٰ کی چار صفتوں کو اٹھا رہے ہیں۔ یہ وہی صفتیں ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں عرش کہا گیا ہے۔ اس فلسفہ کا وید کو بھی اقرار ہے مگر یہ لوگ خوب وید دان ہیں جو اپنے گھر کے مسئلہ سے بھی انکار کر رہے ہیں۔

غرض وید کے یہ چار دیوتے یعنی اکاش، سورج، چاند، دھرتی خدا کے عرش کو جو صفت ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت اور مالک یوم الدین ہے اٹھا رہے ہیں اور فرشتہ کا لفظ قرآن شریف میں عام ہے ہر ایک چیز جو اس کی آواز سنتی ہے وہ اس کا فرشتہ ہے۔ پس دنیا کا ذرہ ذرہ خدا کا فرشتہ ہے کیونکہ وہ اس کی آواز سنتے ہیں اور اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور اگر ذرہ ذرہ اُس کی آواز سننا نہیں تو خدا نے زمین آسمان کے اجرام کو کس طرح پیدا کر لیا اور یہ استعارہ جو ہم نے بیان کیا ہے اس طرح خدا کے کلام میں بہت سے استعارات ہیں جو نہایت لطیف علم اور حکمت پر مشتمل ہیں۔

واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے اس سورۃ (سورۃ فاتحہ۔ ناقل) میں ان چار صفتوں کو اپنی الوہیت کا مظہر اتم قرار دیا ہے اور اسی لئے صرف اس قدر ذکر پر یہ نتیجہ مترتب کیا ہے کہ ایسا خدا کہ یہ چار صفتیں اپنے اندر رکھتا ہے وہی لائق پرستش ہے اور درحقیقت یہ صفتیں بہر وجہ کامل ہیں اور ایک دائرہ کے طور پر الوہیت کے تمام لوازم اور شرائط پر محیط ہیں کیونکہ ان صفتوں میں خدا کی ابتدائی صفات کا بھی ذکر ہے اور درمیانی زمانہ کی رحمانیت اور رحیمیت کا بھی ذکر ہے اور پھر آخری زمانہ کی صفت مجازات کا بھی ذکر ہے اور اصولی طور پر کوئی فعل اللہ تعالیٰ کا ان چار صفتوں سے باہر نہیں۔ پس یہ چار صفتیں خدا تعالیٰ کی پوری صورت دکھلاتی ہیں۔ سو درحقیقت استواء علی العرش کے یہی معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی یہ صفات جب دنیا کو پیدا کر کے ظہور میں آگئیں تو خدا تعالیٰ ان معنوں سے اپنے عرش پر پوری وضع استقامت سے بیٹھ گیا کہ کوئی صفت صفت لازمہ الوہیت سے باہر نہیں رہی اور تمام صفات کی پورے طور پر تجلی ہوگی جیسا کہ جب اپنے تخت پر بادشاہ بیٹھتا ہے تو تخت نشینی کے وقت اس کی ساری شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک طرف شاہی ضرورتوں کے لئے طرح طرح کے

سامان طیار ہونے کا حکم ہوتا ہے اور وہ فی الفور ہو جاتے ہیں اور وہی حقیقت ربوبیت عامہ ہیں۔ دوسری طرف خسروانہ فیض سے بغیر کسی عمل کے حاضرین کو جو دو سخاوت سے مالا مال کیا جاتا ہے۔ تیسری طرف جو لوگ خدمت کر رہے ہیں ان کو مناسب چیزوں سے اپنی خدمات کے انجام کے لئے مدد دی جاتی ہے۔ چوتھی طرف جزاسزا کا دروازہ کھولا جاتا ہے کسی کی گردن ماری جاتی ہے اور کوئی آزاد کیا جاتا ہے۔ یہ چار صفتیں تخت نشینی کے ہمیشہ لازم حال ہوتی ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کا ان ہر چہار صفتوں کو دنیا پر نافذ کرنا گویا تخت پر بیٹھنا ہے جس کا نام عرش ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اس کے کیا معنی ہیں کہ اس تخت کو چار فرشتے اٹھا رہے ہیں۔ پس اس کا بھی جواب ہے کہ ان چار صفتوں پر چار فرشتے موکل ہیں جو دنیا پر یہ صفات خدا تعالیٰ کی ظاہر کرتے ہیں اور ان کے ماتحت چار ستارے ہیں جو چار رب النوع کہلاتے ہیں جن کو وید میں دیوتا کے نام سے پکارا گیا ہے۔ پس وہ ان چاروں صفتوں کی حقیقت کو دنیا میں پھیلاتے ہیں گویا اس روحانی تخت کو اٹھا رہے ہیں۔ بت پرستوں کا جیسا کہ وید سے ظاہر ہے صاف طور پر یہ خیال تھا کہ یہ چار صفتیں مستقل طور پر دیوتاؤں کو حاصل ہیں۔ اسی وجہ سے وید میں جاہان کی استت اور مہا کی گئی اور ان سے مرادیں مانگی گئیں۔ پس خدا تعالیٰ نے استعارہ کے طور پر سمجھایا کہ یہ چار دیوتا جن کو بت پرست اپنا معبود قرار دیتے ہیں یہ مخدوم نہیں ہیں بلکہ یہ چاروں خادم ہیں اور خدا تعالیٰ کے عرش کو اٹھا رہے ہیں یعنی خادموں کی طرح ان الہی صفات کو اپنے آئینوں میں ظاہر کر رہے ہیں اور عرش سے مراد لوازم صفات تخت نشینی ہیں جیسا کہ ابھی میں نے بیان کر دیا ہے۔

(نسیم دعوت، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۴۵۵ تا ۴۵۸ حاشیہ)

قرآن شریف میں ایک طرف تو یہ بیان کیا کہ خدا کا اپنی مخلوق سے شدید تعلق ہے اور وہ ہر ایک جان کی جان ہے اور ہر ایک ہستی اسی کے سہارے سے ہے۔ پھر دوسری طرف اس غلطی سے محفوظ رکھنے کے لئے کہ تا اس کے تعلق سے جو انسان کے ساتھ ہے کوئی شخص انسان کو اس کا عین ہی نہ سمجھ بیٹھے جیسا کہ ویدانت والے سمجھتے ہیں۔ یہ بھی فرما دیا کہ وہ سب سے برتر اور تمام مخلوقات سے وراء الوراء مقام پر ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں عرش کہتے ہیں اور عرش کوئی مخلوق چیز نہیں ہے صرف وراء الوراء مرتبہ کا نام ہے نہ یہ کہ کوئی ایسا تخت ہے جس پر خدا تعالیٰ کو انسان کی طرح بیٹھا ہوا تصور کیا جائے بلکہ جو مخلوق سے بہت دور اور تنزہ اور تقدس کا مقام ہے اس کو عرش کہتے ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ سب کے ساتھ خالقیت

اور مخلوقیت کا تعلق قائم کر کے پھر عرش پر قائم ہو گیا یعنی تمام تعلقات کے بعد الگ کا الگ رہا اور مخلوق کے ساتھ مخلوط نہیں ہوا۔

غرض خدا کا انسان کے ساتھ ہونا اور ہر ایک چیز پر محیط ہونا یہ خدا کی تشبیہی صفت ہے۔ اور خدا نے قرآن شریف میں اس لئے اس صفت کا ذکر کیا ہے کہ تا وہ انسان پر اپنا قرب ثابت کرے اور خدا کا تمام مخلوقات سے وراء الوراہ ہونا اور سب سے برتر اور اعلیٰ اور دُور تر ہونا اور اس تنزّہ اور تقدّس کے مقام پر ہونا جو مخلوقیت سے دُور ہے جو عرش کے نام سے پکارا جاتا ہے اُس صفت کا نام تنزیہی صفت ہے اور خدا نے قرآن شریف میں اس لئے اس صفت کا ذکر کیا تا وہ اس سے اپنی توحید اور اپنا وحدہ لا شریک ہونا اور مخلوق کی صفات سے اپنی ذات کا منزه ہونا ثابت کرے۔ دوسری قوموں نے خدا تعالیٰ کی ذات کی نسبت یا تو تنزیہی صفت اختیار کی ہے یعنی زرگن کے نام سے پکارا ہے اور یا اس کو سرگن مان کر ایسی تشبیہ قرار دی ہے کہ گویا وہ عین مخلوقات ہے اور ان دونوں صفات کو جمع نہیں کیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں ان دونوں صفات کے آئینہ میں اپنا چہرہ دکھلایا ہے اور یہی کمال توحید ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۹۸، ۹۹)

تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے چھ ۶ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور پھر عرش پر قرار پکڑا یعنی اوّل اس نے اس دُنیا کے تمام اجرام سماوی اور ارضی کو پیدا کیا اور چھ دن میں سب کو بنایا (چھ دن سے مراد ایک بڑا زمانہ ہے) اور پھر عرش پر قرار پکڑا یعنی تنزّہ کے مقام کو اختیار کیا۔ یاد رہے کہ استواء کے لفظ کا جب علی صلہ آتا ہے تو اُس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ایک چیز کا اس مکان پر قرار پکڑنا جو اس کے مناسب حال ہو جیسا کہ قرآن شریف میں یہ بھی آیت ہے۔ **وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ** یعنی نوح کی کشتی نے طوفان کے بعد ایسی جگہ پر قرار پکڑا جو اُس کے مناسب حال تھا یعنی اُس جگہ زمین پر اترنے کے لئے بہت آسانی تھی سواسی لحاظ سے خدا تعالیٰ کے لئے استواء کا لفظ اختیار کیا یعنی خدا نے ایسی وراء الوراہ جگہ پر قرار پکڑا جو اس کی تنزّہ اور تقدّس کے مناسب حال تھی چونکہ تنزّہ اور تقدّس کا مقام ماسوی اللہ کے فنا کو چاہتا ہے سو یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جیسے خدا بعض اوقات اپنی خالقیت کے اسم کے تقاضا سے مخلوقات کو پیدا کرتا ہے پھر دوسری مرتبہ اپنی تنزّہ اور وحدت ذاتی کے تقاضا سے اُن سب کا نقش ہستی مٹا دیتا ہے۔ غرض عرش پر قرار پکڑنا مقام تنزّہ کی طرف اشارہ ہے تا ایسا نہ ہو کہ خدا اور مخلوق کو باہم مخلوط سمجھا جائے۔ پس کہاں سے معلوم ہوا کہ خدا

عرش پر یعنی اُس واء الوراء مقام پر مقید کی طرح ہے اور محدود ہے۔ قرآن شریف میں تو جا بجا بیان فرمایا گیا ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۱۹)

مضمون پڑھنے والے نے قرآن شریف پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں لکھا ہے کہ خدا عرش پر گرسی نشین ہے۔ اس لغو اعتراض کا جواب پہلے ہم مبسوط اور مفصل طور پر لکھ آئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے عاجز انسانوں کو اپنی کامل معرفت کا علم دینے کے لئے اپنی صفات کو قرآن شریف میں دورنگ پر ظاہر کیا ہے۔ (۱) اول اس طور پر بیان کیا ہے جس سے اُس کی صفات استعارہ کے طریق پر مخلوق کی صفات کی ہم شکل ہیں جیسا کہ وہ کریم رحیم ہے محسن ہے اور وہ غضب بھی رکھتا ہے اور اُس میں محبت بھی ہے اور اُس کے ہاتھ بھی ہیں اور اُس کی آنکھیں بھی ہیں اور اس کی ساقین بھی ہیں اور اُس کے کان بھی ہیں اور نیزیہ کہ قدیم سے سلسلہ مخلوق کا اُس کے ساتھ چلا آیا ہے مگر کسی چیز کو اُس کے مقابل پر قدامت شخصی نہیں۔ ہاں! قدامت نوعی ہے اور وہ بھی خدا کی صفت خلق کے لئے ایک لازمی امر نہیں کیونکہ جیسا کہ خَلْق یعنی پیدا کرنا اُس کی صفات میں سے ہے ایسا ہی کبھی اور کسی زمانہ میں تجلی وحدت اور تجرد اس کی صفات میں سے ہے اور کسی صفت کے لئے تعطل دائمی جائز نہیں ہاں تعطل میعادی جائز ہے۔

غرض چونکہ خدا نے انسان کو پیدا کر کے اپنی اُن تشبیہی صفات کو اس پر ظاہر کیا جن صفات کے ساتھ انسان بظاہر شراکت رکھتا ہے جیسے خالق ہونا کیونکہ انسان بھی اپنی حد تک بعض چیزوں کا خالق یعنی موجد ہے۔ ایسا ہی انسان کو کریم بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حد تک کرم کی صفت بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور اسی طرح انسان کو رحیم بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حد تک قوت رحم بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور قوت غضب بھی اُس میں ہے اور ایسا ہی آنکھ، کان وغیرہ سب انسان میں موجود ہیں پس ان تشبیہی صفات سے کسی کے دل میں شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ گویا انسان ان صفات میں خدا سے مشابہ ہے اور خدا انسان سے مشابہ ہے اس لئے خدا نے ان صفات کے مقابل پر قرآن شریف میں اپنی تنزیہی صفات کا بھی ذکر کر دیا یعنی ایسی صفات کا ذکر کیا جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی ذات اور صفات میں کچھ بھی شراکت انسان کے ساتھ نہیں اور نہ انسان کو اس کے ساتھ کچھ مشارکت ہے۔ نہ اُس کا خَلْق یعنی پیدا کرنا انسان کے خَلْق کی طرح ہے نہ اُس کا رحم انسان کے رحم کی طرح ہے نہ اُس کا غضب انسان کے غضب کی طرح ہے نہ اُس کی محبت انسان کی محبت کی طرح ہے نہ وہ انسان کی طرح کسی مکان کا محتاج ہے۔.....

فرماتا ہے: إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ - (ترجمہ) تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا پھر اُس نے عرش پر قرار پکڑا یعنی اُس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کر کے اور تشبیہی صفات کا ظہور فرما کر پھر تیز بہی صفات کے ثابت کرنے کے لئے مقام تیز اور تجرّد کی طرف رُخ کیا جو وراء الوراہ مقام اور مخلوق کے قرب و جوار سے دور تر ہے وہی بلند تر مقام ہے جس کو عرش کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ پہلے تو تمام مخلوق حیّز عدم میں تھی اور خدا تعالیٰ وراء الوراہ مقام میں اپنی تجلیات ظاہر کر رہا تھا جس کا نام عرش ہے یعنی وہ مقام جو ہر ایک عالم سے بلند تر اور برتر ہے اور اسی کا ظہور اور پرتو تھا اور اُس کی ذات کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اُس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا اور جب مخلوق ظاہر ہوئی تو پھر اُس نے اپنے تئیں مخفی کر لیا اور چاہا کہ وہ ان مصنوعات کے ذریعہ سے شناخت کیا جائے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ دائمی طور پر تعطل صفات الہیہ کبھی نہیں ہوتا اور بجز خدا کے کسی چیز کے لئے قدامت شخصی تو نہیں مگر قدامت نوعی ضروری ہے اور خدا کی کسی صفت کے لئے تعطل دائمی تو نہیں مگر تعطل میعاد کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ صفت ایجاد اور صفت اِفناء باہم متضاد ہیں اس لئے جب اِفناء کی صفت کا ایک کامل دور آ جاتا ہے تو صفت ایجاد ایک میعاد تک معطل رہتی ہے۔ غرض ابتدا میں خدا کی صفت وحدت کا دور تھا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس دور نے کتنی دفعہ ظہور کیا بلکہ یہ دور قدیم اور غیر متناہی ہے بہر حال صفت وحدت کے دور کو دوسری صفت پر تقدّم زمانی ہے پس اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں خدا اکیلا تھا اور اُس کے ساتھ کوئی نہ تھا اور پھر خدا نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا اور اسی تعلق کی وجہ سے اُس نے اپنے یہ اسماء ظاہر کئے کہ وہ کریم اور رحیم ہے اور غفور اور توبہ قبول کرنے والا ہے مگر جو شخص گناہ پر اصرار کرے اور باز نہ آوے اُس کو وہ بے سزا نہیں چھوڑتا اور اُس نے اپنا یہ اسم بھی ظاہر کیا کہ وہ توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے اور اُس کا غضب صرف انہیں لوگوں پر بھڑکتا ہے جو ظلم اور شرارت اور معصیت سے باز نہیں آتے اور اُس نے اپنی یہ صفات اپنی کتاب میں بیان فرمائیں کہ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور محبت کرتا ہے اور غضب کرتا ہے اور اپنے ہاتھ اور پیر اور آنکھ اور کان کا بھی ذکر کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اُس کا دیکھنا انسان کے دیکھنے کی طرح نہیں اور اُس کا سننا انسان کے سننے کی طرح نہیں اور اس کا محبت کرنا انسان کے محبت کرنے کی طرح نہیں اور اُس کا غضب انسان کے غضب کی طرح نہیں اور اُس کے ہاتھ، پیر اور آنکھ، کان مخلوق کے اعضاء کی طرح نہیں بلکہ

وہ ہر ایک بات میں بے مثل ہے اور بار بار صاف فرمادیا کہ یہ اُس کی تمام صفات اُس کی ذات کے مناسب حال ہیں انسان کی صفات کی مانند نہیں اور اُس کی آنکھ وغیرہ جسم اور جسمانی نہیں اور اُس کی کسی صفت کو انسان کی کسی صفت سے مشابہت نہیں مثلاً انسان اپنے غضب کے وقت پہلے غضب کی تکلیف آپ اُٹھاتا ہے اور جوش و غضب میں فوراً اُس کا سرور دور ہو کر ایک جلن سی اُس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور ایک مادہ سوداوی اُس کے دماغ میں چڑھ جاتا ہے اور ایک تغیر اس کی حالت میں پیدا ہو جاتا ہے مگر خدا ان تغیرات سے پاک ہے اور اُس کا غضب ان معنوں سے ہے کہ وہ اس شخص سے جو شرارت سے باز نہ آوے اپنا سایہ حمایت اٹھالیتا ہے اور اپنے قدیم قانون قدرت کے موافق اُس سے ایسا معاملہ کرتا ہے جیسا کہ ایک غضبناک انسان کرتا ہے لہذا استعارہ کے رنگ میں وہ معاملہ اُس کا غضب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی اُس کی محبت انسان کی محبت کی طرح نہیں کیونکہ انسان غلبہ محبت میں بھی دکھ اٹھاتا ہے اور محبوب کے علیحدہ اور جدا ہونے سے اُس کی جان کو تکلیف پہنچتی ہے مگر خدا ان تکالیف سے پاک ہے ایسا ہی اُس کا قرب بھی انسان کے قرب کی طرح نہیں کیونکہ انسان جب ایک کے قریب ہوتا ہے تو اپنے پہلے مرکز کو چھوڑ دیتا ہے مگر وہ باوجود قریب ہونے کے دور ہوتا ہے اور باوجود دور ہونے کے قریب ہوتا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی ہر ایک صفت انسانی صفات سے الگ ہے اور صرف اشتراک لفظی ہے اس سے زیادہ نہیں اسی لئے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوری: ۱۲) یعنی کوئی چیز اپنی ذات یا صفات میں خدا تعالیٰ کے برابر نہیں۔

اب ناظرین باانصاف پر ظاہر ہو کہ اسی مطلب کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ اَللّٰهُ اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یعنی خدا وہ ہے جس نے سب کچھ چھ دن میں پیدا کر کے پھر اپنے مقام وراء الوراہ کی طرف توجہ کی اور عرش پر قرار پکڑا۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ عرش سے مراد قرآن شریف میں وہ مقام ہے جو تشبیہی مرتبہ سے بالاتر اور ہر ایک عالم سے برتر اور نہاں در نہاں اور تقدس اور تترّہ کا مقام ہے وہ کوئی ایسی جگہ نہیں کہ پتھر یا اینٹ یا کسی اور چیز سے بنائی گئی ہو اور خدا اُس پر بیٹھا ہوا ہے اسی لئے عرش کو غیر مخلوق کہتے ہیں اور خدا تعالیٰ جیسا کہ یہ فرماتا ہے کہ کبھی وہ مومن کے دل پر اپنی تجلّی کرتا ہے۔ ایسا ہی وہ فرماتا ہے کہ عرش پر اُس کی تجلّی ہوتی ہے اور صاف طور پر فرماتا ہے کہ ہر ایک چیز کو میں نے اٹھایا ہوا ہے یہ کہیں نہیں کہا کہ کسی چیز نے مجھے بھی اٹھایا ہوا ہے۔ اور عرش جو ہر ایک عالم سے برتر مقام ہے وہ اُس کی تترّہی صفت کا مظہر ہے اور ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ ازل سے اور قدیم سے خدا میں دو صفتیں

ہیں؛ ایک صفت تشبیہی، دوسری صفت تنزیہی اور چونکہ خدا کے کلام میں دونوں صفات کا بیان کرنا ضروری تھا یعنی ایک تشبیہی صفت اور دوسری تنزیہی صفت اس لئے خدا نے تشبیہی صفات کے اظہار کے لئے اپنے ہاتھ، آنکھ، محبت، غضب وغیرہ صفات قرآن شریف میں بیان فرمائے اور پھر جب کہ احتمال تشبیہ کا پیدا ہوا تو بعض جگہ لیس کی مثلہ کہہ دیا اور بعض جگہ **لَقَدْ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ الرَّعْدُ** (۳) کہہ دیا جیسا کہ سورہ رعد جزو نمبر ۱۱ میں بھی یہ آیت ہے **اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا لَقَدْ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ الرَّعْدُ** (۳) (ترجمہ) تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اور پھر اُس نے عرش پر قرار پکڑا۔ اس آیت کے ظاہری معنی کے رُو سے اس جگہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے خدا کا عرش پر قرار نہ تھا۔ اس کا یہی جواب ہے کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے بلکہ وراء الوراہ ہونے کی ایک حالت ہے جو اُس کی صفت ہے پس جبکہ خدا نے زمین و آسمان اور ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور ظلی طور پر اپنے نور سے سورج چاند اور ستاروں کو نور بخشا اور انسان کو بھی استعارہ کے طور پر اپنی شکل پر پیدا کیا اور اپنے اخلاق کریمہ اس میں پھونک دیئے تو اس طور سے خدا نے اپنے لئے ایک تشبیہ قائم کی مگر چونکہ وہ ہر ایک تشبیہ سے پاک ہے اس لئے عرش پر قرار پکڑنے سے اپنے تنزّہ کا ذکر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ سب کچھ پیدا کر کے پھر مخلوق کا عین نہیں ہے بلکہ سب سے الگ اور وراء الوراہ مقام پر ہے اور پھر سورہ طہ جزو نمبر ۱۶ میں یہ آیت ہے؟ **الَّذِينَ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ** (طہ: ۲) (ترجمہ) خدا رحمن ہے جس نے عرش پر قرار پکڑا اس قرار پکڑنے سے یہ مطلب ہے کہ اگرچہ اُس نے انسان کو پیدا کر کے بہت سا قرب اپنا اُس کو دیا مگر یہ تمام تجلیات مختص الزمان ہیں یعنی تمام تشبیہی تجلیات اُس کی کسی خاص وقت میں ہیں جو پہلے نہیں تھیں مگر ازلہ طور پر قرار گاہ خدا تعالیٰ کی عرش ہے جو تنزیہ کا مقام ہے کیونکہ جو فانی چیزوں سے تعلق کر کے تشبیہ کا مقام پیدا ہوتا ہے وہ خدا کی قرار گاہ نہیں کہلا سکتا وجہ یہ کہ وہ معرض زوال میں ہے اور ہر ایک وقت میں زوال اُس کے سر پر ہے بلکہ خدا کی قرار گاہ وہ مقام ہے جو فنا اور زوال سے پاک ہے پس وہ مقام عرش ہے۔

اس جگہ ایک اور اعتراض مخالف لوگ پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ قرآن شریف کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائیں گے جس سے اشارۃً انص کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں چار فرشتے عرش کو اٹھاتے ہیں اور اب اس جگہ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ تو اس بات سے پاک اور برتر ہے کہ کوئی اُس کے عرش کو اٹھاوے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی تم سن چکے ہو کہ عرش کوئی

جسمانی چیز نہیں ہے جو اٹھائی جائے یا اٹھانے کے لائق ہو بلکہ صرف تنزّہ اور تقدّس کے مقام کا نام عرش ہے اسی لئے اس کو غیر مخلوق کہتے ہیں۔ ورنہ ایک مجسم چیز خدا کی خالقیت سے کیوں کر باہر رہ سکتی ہے اور عرش کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب استعارات ہیں۔ پس اسی سے ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسا اعتراض محض حماقت ہے۔ اب ہم فرشتوں کے اٹھانے کا اصل نکتہ ناظرین کو سناتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے تنزّہ کے مقام میں یعنی اس مقام میں جب کہ اُس کی صفت تنزّہ اُس کی تمام صفات کو روپوش کر کے اُس کو وراء الوراء اور نہاں در نہاں کر دیتی ہے۔ جس مقام کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں عرش ہے تب خدا عقول انسانہ سے بالاتر ہو جاتا ہے اور عقل کو طاقت نہیں رہتی کہ اُس کو دریافت کر سکے تب اُس کی چار صفتیں جن کو چار فرشتوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو دُنیا میں ظاہر ہو چکی ہیں اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہیں۔

(۱) اوّل ربوبیت جس کے ذریعہ سے وہ انسان کی روحانی اور جسمانی تکمیل کرتا ہے چنانچہ روح اور جسم کا ظہور ربوبیت کے تقاضا سے ہے اور اسی طرح خدا کا کلام نازل ہونا اور اُس کے خارق عادت نشان ظہور میں آنا ربوبیت کے تقاضا سے ہے (۲) دوم خدا کی رحمانیت جو ظہور میں آچکی ہے یعنی جو کچھ اُس نے بغیر پاداش اعمال بیشمار نعمتیں انسان کے لئے میسر کی ہیں یہ صفت بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (۳) تیسری خدا کی رحیمیت ہے اور وہ یہ کہ نیک عمل کرنے والوں کو اوّل تو صفت رحمانیت کے تقاضا سے نیک اعمال کی طاقتیں بخشتا ہے اور پھر صفت رحیمیت کے تقاضا سے نیک اعمال اُن سے ظہور میں لاتا ہے اور اس طرح پر اُن کو آفات سے بچاتا ہے۔ یہ صفت بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (۴) چوتھی صفت مَلِکِ یَوْمِ الدِّینِ ہے یہ بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ نیکیوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے۔ یہ چاروں صفتیں ہیں جو اُس کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں یعنی اُس کے پوشیدہ وجود کا ان صفات کے ذریعہ سے اس دنیا میں پتہ لگتا ہے اور یہ معرفت عالم آخرت میں دو چند ہو جائے گی گویا بجائے چار کے آٹھ فرشتے ہو جائیں گے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۷۲ تا ۲۷۹)

اس آیت سے مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنی تشبیہی صفات کا اظہار فرما کر پھر اس مقام کی طرف توجہ کی جو بے مثل و مانند ہونے کا مقام ہے جس کو زبان شرع میں عرش کہتے ہیں جو تمام عالموں سے برتر اور وہم و خیال سے بلند تر ہے اور عرش کوئی مخلوق چیز نہیں ہے بلکہ محض وراء الوراء مقام کا نام عرش ہے جس سے مخلوق کو کوئی اشتراک نہیں۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۷۶ تا ۲۷۷)

خدا تعالیٰ نے تمام اجرام سماوی وارضی پیدا کر کے پھرا اپنے وجود کو وراء الوراہ مقام میں مخفی کیا جس کا نام عرش ہے اور یہ ایسا نہاں در نہاں مقام ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی چار صفات ظہور پذیر نہ ہوتیں جو سورۃ فاتحہ کی پہلی آیات میں ہی درج ہیں تو اس کے وجود کا کچھ پتہ نہ لگتا یعنی ربوبیت، رحمانیت، رحمتیت، مالک یوم الجزاء ہونا۔ سو یہ چاروں صفات استعارہ کے رنگ میں چار فرشتے خدا کی کلام میں قرار دیئے گئے ہیں جو اس کے عرش کو اٹھا رہے ہیں یعنی اس وراء الوراہ مقام میں جو خدا ہے اس مخفی مقام سے اس کو دکھلا رہے ہیں ورنہ خدا کی شناخت کے لئے کوئی ذریعہ نہ تھا۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۷۹ حاشیہ)

عرش کا کلمہ خدا تعالیٰ کی عظمت کے لیے آتا ہے۔ کیونکہ وہ سب اونچوں سے زیادہ اونچا اور جلال رکھتا ہے یہ نہیں کہ وہ کسی انسان کی طرح کسی تخت کا محتاج ہے۔ خود قرآن میں ہے کہ ہر ایک چیز کو اس نے تھاما ہوا ہے اور وہ قیوم ہے جس کو کسی چیز کا سہارا نہیں۔ (استفتاء، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۱۱۶، ۱۱۷)

خدا تعالیٰ نے یونانیوں کی محدود کی طرح اپنے عرش کو قرار نہیں دیا اور نہ اس کو محدود قرار دیا۔ ہاں! اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ ایک طبقہ قرار دیا ہے جس سے باعتبار اس کی کیفیت اور کمیت کے اور کوئی اعلیٰ طبقہ نہیں ہے اور یہ امر ایک مخلوق اور موجود کے لیے ممنوع اور محال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ نہایت قریب قیاس ہے کہ جو طبقہ عرش اللہ کہلاتا ہے وہ اپنی وسعتوں میں خدائے غیر محدود کے مناسب حال اور غیر محدود ہو۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹ حاشیہ در حاشیہ)

اور عرش کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کا اس پر مستوی ہونا الہی اسرار میں سے ایک بہت بڑا سر ہے اور ایک مبلغ حکمت اور روحانی معنی پر مشتمل ہے اور اس کا نام عرش اس لیے رکھا گیا ہے۔ تا اس جہان کے اہل عقل کو اس کا مفہوم سمجھایا جائے اور اس بات کا سمجھنا ان کی استعدادوں کے قریب کر دیا جائے اور وہ (عرش) الہی فیض اور اللہ تعالیٰ کی رحمانی تجلی کو ملائکہ تک پہنچانے میں واسطہ ہے اور اسی طرح ملائکہ سے رسولوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

(ترجمہ از مرتب)

وَحَقِيقَةُ الْعَرْشِ وَاسْتِوَاءُ اللَّهِ عَلَيْهِ سِرٌّ عَظِيمٌ مِنْ أَسْرَارِ اللَّهِ تَعَالَى وَحِكْمَةٌ بَالِغَةٌ وَمَعْنَى رُوحَانِيٌّ وَسُجُودِيٌّ عَرَشًا لِتَفْهِيمِ عُقُولِ هَذَا الْعَالَمِ وَلِتَقْرِيْبِ الْأَمْرِ إِلَى اسْتِعْدَادَاتِهِمْ وَهُوَ وَاسِطَةٌ فِي وُصُولِ الْفَيْضِ الْإِلَهِيِّ وَالْتَجَلِّيِ الرَّحْمَانِيِّ مِنْ حَضْرَةِ الْحَقِّ إِلَى الْمَلَائِكَةِ وَمِنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَى الرُّسُلِ۔

(کرامات الصادقین، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۱۲۹)

ہم لوگ جو خدا تعالیٰ کو رب العرش کہتے ہیں تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ جسمانی اور جسم ہے اور عرش کا محتاج ہے بلکہ عرش سے مراد وہ مقدس بلندی کی جگہ ہے جو اس جہان اور آنے والے جہان سے برابر نسبت رکھتی ہے اور خدا تعالیٰ کو عرش پر کہنا درحقیقت ان معنوں سے مترادف ہے کہ وہ مالک الکونین ہے اور جیسا کہ ایک شخص اونچی جگہ بیٹھ کر یا کسی نہایت اونچے محل پر چڑھ کر یمن و یسار نظر رکھتا ہے۔ ایسا ہی استعارہ کے طور پر خدا تعالیٰ بلند سے بلند تخت پر تسلیم کیا گیا ہے جس کی نظر سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں نہ اس عالم کی اور نہ اس دوسرے عالم کی۔ ہاں! اس مقام کو عام سمجھوں کے لئے اوپر کی طرف بیان کیا جاتا ہے کیونکہ جبکہ خدا تعالیٰ حقیقت میں سب سے اوپر ہے اور ہر ایک چیز اس کے پیروں پر گری ہوئی ہے تو اوپر کی طرف سے اس کی ذات کو مناسبت ہے مگر اوپر کی طرف وہی ہے جس کے نیچے دونوں عالم واقع ہیں اور وہ ایک انتہائی نقطہ کی طرح ہے جس کے نیچے سے دو عظیم الشان عالم کی دو شاخیں نکلتی ہیں اور ہر ایک شاخ ہزار ہا عالم پر مشتمل ہے جن کا علم بجز اس ذات کے کسی کو نہیں جو اس نقطہ انتہائی پر مستوی ہے جس کا نام عرش ہے اس لئے ظاہری طور پر بھی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ بلندی جو اوپر کی سمت میں اس انتہائی نقطہ میں متصور ہو۔ جو دونوں عالم کے اوپر ہے وہی عرش کے نام سے عندالشرع موسوم ہے اور یہ بلندی باعتبار جامعیت ذاتی باری کی ہے تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ مبداء ہے ہر ایک فیض کا اور مرجع ہے ہر ایک چیز کا اور مسجود ہے ہر ایک مخلوق کا اور سب سے اونچا ہے اپنی ذات میں اور صفات میں اور کمالات میں ورنہ قرآن فرماتا ہے کہ وہ ہر ایک جگہ ہے جیسا کہ فرمایا:

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَوَجْهُ اللّٰهِ (البقرة: ۱۱۶) جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے اور فرماتا ہے: هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحديد: ۵) یعنی جہاں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور فرماتا ہے: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَدْيِ (ق: ۱۷) یعنی ہم انسان سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ نزدیک ہیں یہ تینوں تعلیموں کا نمونہ ہے۔

(سنت بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۰)

عرش اللہ تعالیٰ کی جلالی و جمالی صفات کا مظہر اتم ہے۔ عرش کے مخلوق یا غیر مخلوق کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا۔ اس کی تفصیل حوالہ بخدا کرنی چاہیے۔ جنہوں نے مخلوق کہا ہے انہوں نے بھی غلطی کھائی ہے کیونکہ پھر اس سے وہ محدود لازم آتا ہے اور جو غیر مخلوق کہتے ہیں وہ توحید کے خلاف کہتے ہیں کیونکہ الَّذِي خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ اگر یہ غیر مخلوق ہو تو پھر اس سے باہر رہ جاتا ہے۔ مومن موحد اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہتے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جیسے افطر و اصومہ یا خطی و اصیب فرمایا

ہے۔ اللہ تعالیٰ استعارات کے ذریعہ کلام کرتا ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی کیفیت کو حوالہ بخدا کرتے ہیں۔ پس ہمارا مذہب عرش کے متعلق یہی ہے کہ اس کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث میں دخل نہ دو۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کی جلالی و جمالی تجلیات کا مظہر ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۴، ۱۵، مورخہ ۱۳۰ اپریل و ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

عرش کی نسبت مخلوق اور غیر مخلوق کا جھگڑا عبث ہے۔ احادیث سے اس کا جسم کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ ایک قسم کے علو کے مقام کا اظہار عرش کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ اگر اسے جسم کہو تو پھر خدا کو بھی جسم کہنا چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کو علو جسمانی نہیں کہ جس کا تعلق جہات سے ہو بلکہ یہ روحانی علو ہے۔

عرش کی نسبت مخلوق اور غیر مخلوق کی بحث بھی ایک بدعت ہے۔ جو کہ پیچھے ایجاد کی گی۔ صحابہؓ نے اس کو مطلق نہیں چھیڑا۔ تو اب یہ لوگ چھیڑ کر نافرمانی لوگوں کو اپنے گلے ڈالتے ہیں۔ لیکن عرش کے اصل معنی اس وقت سمجھ آسکتے ہیں جبکہ خدا تعالیٰ کی دوسری تمام صفات پر بھی ساتھ ہی نظر ہو۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵، ۲۶، مورخہ ۳۱ جولائی۔ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۴)

بعض لوگ ناسمجھی سے عرش کو جو ایک مخلوق چیز مانتے ہیں تو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ عرش کوئی ایسی چیز نہیں جس کو مخلوق کہہ سکیں وہ تو تقدس اور تنزہ کا ایک وراء الوراہ مقام ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جیسے ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ ویسے ہی خدا بھی عرش پر جلوہ گر ہے۔ جس سے لازم آتا ہے کہ محدود ہے لیکن ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں اس بات کا ذکر تک نہیں کہ عرش ایک تخت کی طرح ہے جس پر خدا بیٹھا ہے کیونکہ نعوذ باللہ! اگر عرش سے مراد ایک تخت لیا جاوے جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ تو پھر ان آیات کا کیا ترجمہ کیا جاوے گا جہاں لکھا ہے کہ خدا ہر ایک چیز پر محیط ہے اور جہاں تین ہیں وہاں چوتھا ان کا خدا اور جہاں چار ہیں وہاں پانچواں ان کا خدا۔ اور پھر لکھا ہے: **وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَدْيِ** ۱۶/۲۶ اور **وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ** ۱۷/۲۷ غرض اس بات کو اچھی طرح سے یاد رکھنا چاہیے کہ کلام الہی میں استعارات بہت پائے جاتے ہیں چنانچہ ایک جگہ دل کو بھی عرش کہا گیا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی تجلی بھی دل پر ہوتی ہے اور ایسا ہی عرش اس وراء الوراہ مقام کو کہتے ہیں جہاں مخلوق کا نقطہ ختم ہو جاتا ہے۔ اہل علم اس بات کو جانتے ہیں کہ ایک تو تشبیہ ہوتی ہے اور ایک تنزیہ ہوتی ہے مثلاً یہ بات کہ جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جہاں پانچ ہوں وہاں چھٹا ان کا خدا ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کی تشبیہ ہے جس سے دھوکا لگتا ہے کہ کیا

خدا پھر محدود ہے؟ اس لئے اس دھوکا کے دور کرنے کے لئے بطور جواب کے کہا گیا ہے کہ وہ تو عرش پر ہے۔ جہاں مخلوقات کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ کوئی اس قسم کا تخت نہیں ہے جو سونے چاندی وغیرہ کا بنا ہوا ہو اور اس پر جواہرات وغیرہ جڑے ہوئے ہوں بلکہ وہ تو ایک اعلیٰ ارفع اور وراء الوراہ مقام ہے اور اس قسم کے استعارات قرآن مجید میں بکثرت پائے جاتے ہیں جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ اَعْلَىٰ فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْلَىٰ وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل: ۳۷) ۱۸/۱۵ ظاہراً تو اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اس جگہ اندھے ہیں وہ آخرت کو بھی اندھے ہی رہیں گے مگر یہ معنی کون قبول کرے گا۔ جبکہ دوسری جگہ پر صاف طور پر لکھا ہے کہ خواہ کوئی سو جا کھا ہو۔ خواہ اندھا جو ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ جاوے گا وہ تو پینا ہوگا۔ لیکن جو اس جگہ ایمانی روشنی سے بے نصیب رہے گا اور خدا کی معرفت حاصل نہیں کر لے گا وہ آخر کو بھی اندھا ہی رہے گا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

عرش الہی ایک وراء الوراہ مخلوق ہے۔ جو زمین سے اور آسمان سے بلکہ تمام جہات سے برابر ہے۔ یہ نہیں کہ نعوذ باللہ! عرش الہی آسمان سے قریب اور زمین سے دور ہے یعنی ہے وہ شخص جو ایسا اعتقاد رکھتا ہے۔ عرش مقام تزیہ ہے اور اسی لئے خدا ہر جگہ حاضر ناظر ہے جب کہ فرماتا ہے: هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحديد: ۵) اور مَا يَكُوْنُ مِنْ تَجْوِيْ ثَلَاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَاٰهُمْ (المجادلة: ۱۷) اور فرماتا ہے کہ وَ لَحْنٌ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق: ۱۷)۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

(ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ كَمَا سَأَلْتُمْ فِي الْاٰخِرَةِ) کے متعلق سوال کے جواب میں فرمایا

اس (عرش) کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ کوئی تو اسے مخلوق کہتا ہے اور کوئی غیر مخلوق لیکن اگر ہم غیر مخلوق نہ کہیں تو پھر استوی باطل ہوتا ہے اس میں شک نہیں ہے کہ عرش کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث ہی عبث ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ درجے کی بلندی کو بیان کیا ہے۔ یعنی ایک ایسا مقام جو کہ ہر ایک جسم اور ہر ایک نقص سے پاک ہے اور اس کے مقابلہ پر یہ دنیا اور تمام عالم ہے کہ جس کی انسان کو پوری پوری خبر بھی نہیں ہے ایسے مقام کو قدیم کہا جا سکتا ہے لوگ اس میں حیران ہیں اور غلطی سے اسے ایک مادی شے خیال کرتے ہیں اور قدامت کے لحاظ سے جو اعتراض لفظ ثمة کا آتا ہے تو بات یہ ہے کہ قدامت میں ثمة آجاتا ہے جیسے قلم ہاتھ میں ہے تو جیسے قلم حرکت کرتا ہے ویسے ہاتھ حرکت کرتا ہے مگر ہاتھ کو تقدم ہوتا ہے آریہ لوگ خدا کی قدامت کے متعلق اہل اسلام پر اعتراض کرتے ہیں

کہ ان کا خدا چھ سات ہزار برس سے چلا آتا ہے یہ ان کی غلطی ہے اس مخلوق کو دیکھ کر خدا کی عمر کا اندازہ کرنا نادانی ہے ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ آدم سے اول کیا تھا اور کس قسم کی مخلوق تھی۔ اس وقت کی بات وہی جانے کُلُّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن: ۳۰) وہ اور اس کی صفات قدیم ہی سے ہیں مگر اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہر ایک صفت کا علم ہم کو دے دیوے اور نہ اس کے کام اس دنیا میں سما سکتے ہیں خدا کے کلام میں دقیق نظر کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور مخلوقات کی ترتیب اس کے ازلی ہونے کی مخالف نہیں ہے اور استعارات کو ظاہر پر حمل کر کے مشہودات پر لانا بھی ایک نادانی ہے۔ اس کی صفت ہے لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (الانعام: ۱۰۴)۔ ہم عرش اور استویٰ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی حقیقت اور کنہ کو خدا تعالیٰ کے حوالہ کرتے ہیں۔ جب دنیا وغیرہ نہ تھی عرش تب بھی تھا جیسے لکھا ہے۔ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (ہود: ۸)۔

اس کے متعلق خوب سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک مجہول الکنا امر ہے اور خدا تعالیٰ کی تجلیات کی طرف اشارہ ہے وہ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (الروم: ۲۳) چاہتی تھی اس لیے اول وہ ہو کر نُفُثٌ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ہوا۔ اگر چہ توریت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے مگر وہ اچھے الفاظ میں نہیں ہے اور لکھا ہے کہ خدا...مانہ ہو کر تھک گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک انسان کسی کام میں مصروف ہوتا ہے تو اس کے چہرہ اور خدو خال وغیرہ اور دیگر اعضاء کا پورا پورا پتہ نہیں لگتا مگر جب وہ فارغ ہو کر ایک تخت یا چار پائی پر آرام کی حالت میں ہو تو اس کے ہر ایک عضو کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح استعارہ کے طور پر خدا کی صفات کے ظہور کو نُفُثٌ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ سے بیان کیا ہے کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کے بعد صفاتِ الہیہ کا ظہور ہوا صفات اس کے ازلی ابدی ہیں مگر جب مخلوق ہو تو خالق کو شناخت کرے اور محتاج ہوں تو رازق کو پہچانیں۔ اسی طرح اس کے علم اور قادر مطلق ہونے کا پتہ لگتا ہے: نُفُثٌ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ خدا کی اس تجلی کی طرف اشارہ ہے جو خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (الروم: ۲۳) کے بعد ہوئی۔

اسی طرح اس تجلی کے بعد ایک اور تجلی ہوگی جب کہ ہر شے فنا ہوگی پھر ایک اور تیسری تجلی ہوگی کہ احیاء اموات ہوگا۔ غرضیکہ یہ ایک لطیف استعارہ ہے جس کے اندر داخل ہونا روا نہیں ہے، صرف ایک تجلی سے اسے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قرآن شریف سے پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عرش کو اپنی صفات میں داخل کیا ہے جیسے ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ (البروج: ۱۶)۔ گویا خدا تعالیٰ کے کمالِ علو کو دوسرے معنوں میں عرش سے بیان کیا

ہے اور وہ کوئی مادی اور جسمانی شے نہیں ہے ورنہ زمین و آسمان وغیرہ کی طرح عرش کی پیدائش کا ذکر بھی ہوتا۔ اس لیے شبہ گزرتا ہے کہ ہے تو شے مگر غیر مخلوق اور یہاں سے دھوکہ کھا کر آریوں کی طرف انسان چلا جاتا ہے کہ جیسے وہ خدا کے وجود کے علاوہ اور اشیاء کو غیر مخلوق مانتے ہیں۔ ویسے ہی یہ عرش کو ایک شے غیر مخلوق جزاز خدا ماننے لگتا ہے یہ گمراہی ہے اصل میں یہ کوئی شے خدا کے وجود سے باہر نہیں ہے۔ جنہوں نے اسے ایک شے غیر مخلوق قرار دیا وہ اسے اتم اور اکمل نہیں مانتے اور جنہوں نے مادی مانا وہ گمراہی پر ہیں کہ خدا کو ایک مجسم شے کا محتاج مانتے ہیں کہ ایک ڈولہ کی طرح فرشتوں نے اسے اٹھایا ہوا ہے لَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ (البقرة: ۲۵۶)۔

چار ملائک کا عرش کو اٹھانا یہ بھی ایک استعارہ ہے رب، رحمان رحیم اور مالک یوم الدین یہ صفات الہی کے مظہر ہیں اور اصل میں ملائکہ ہیں اور یہی صفات جب زیادہ جوش سے کام میں ہوں گے تو ان کو (آٹھ) ملائک سے تعبیر کیا گیا ہے جو شخص اسے بیان نہ کر سکے وہ یہ کہے کہ یہ ایک مجہول الکنہ حقیقت ہے ہمارا اس پر ایمان ہے اور حقیقت خدا کے سپرد کرے اطاعت کا طریق یہی ہے کہ خدا کی باتیں خدا کے سپرد کرے اور ان پر ایمان رکھے اور اس کی اصل حقیقت یہی ہے کہ خدا کی تجلیات ثلاثہ کی طرف اشارہ ہے۔

كَانَ عَرْشُهُ عَلَى السَّمَاءِ (هود: ۸) یہ بھی ایک تجلی تھی اور ماء کے معنی یہاں پانی بھی نہیں کر سکتے۔ خدا معلوم کہ اس کے نزدیک ماء کے کیا معنی ہیں۔ اس کی کنہ خدا کو معلوم ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷، ۳۸، ۳)

مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ عرش کوئی جسمانی اور مخلوق چیز ہے جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ تمام قرآن شریف کو اول سے آخر تک پڑھو اس میں ہرگز نہیں پاؤ گے کہ عرش بھی کوئی چیز محدود اور مخلوق ہے خدا نے بار بار قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ ہر ایک چیز جو کوئی وجود رکھتی ہے اس کا میں ہی پیدا کرنے والا ہوں۔ میں ہی زمین، آسمان اور روحوں اور ان کی تمام قوتوں کا خالق ہوں۔ میں اپنی ذات میں آپ قائم ہوں اور ہر ایک چیز میرے ساتھ قائم ہے۔ ہر ایک ذرہ اور ہر ایک چیز جو موجود ہے وہ میری ہی پیدائش ہے مگر کہیں نہیں فرمایا کہ عرش بھی کوئی جسمانی چیز ہے جس کا میں پیدا کرنے والا ہوں۔ اگر کوئی آریہ قرآن شریف میں سے نکال دے کہ عرش کوئی جسمانی اور مخلوق چیز ہے تو میں اس کو قبل اس کے جو قادیان سے باہر جائے ایک ہزار روپیہ انعام دوں گا۔ میں اس خدا کی قسم کھاتا ہوں جس کی جھوٹی قسم کھانا لعنتی کا کام ہے کہ میں قرآن شریف کی وہ آیت دکھاتے ہی ہزار روپیہ حوالہ کروں گا۔ ورنہ میں بادب کہتا ہوں کہ ایسا شخص خود لعنت کامل ہوگا جو خدا پر جھوٹ بولتا ہے۔

(نسیم دعوت، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۴۵۳، ۴۵۴)

جب خدائے تعالیٰ کسی چیز کو اس طور سے پیدا کرے کہ پہلے اس چیز کا کچھ بھی وجود نہ ہو تو ایسے پیدا کرنے کا نام اصطلاح قرآنی میں امر ہے اور اگر ایسے طور سے کسی چیز کو پیدا کرے کہ پہلے وہ چیز کسی اور صورت میں اپنا وجود رکھتی ہو تو اس طرز پیدائش کا نام خلق ہے خلاصہ کلام یہ کہ بسیط چیز کا عدم محض سے پیدا کرنا عالم امر میں سے ہے اور مرکب چیز کو کسی شکل یا ہیئت خاص سے متشکل کرنا عالم خلق سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ دوسرے مقام میں قرآن شریف میں فرماتا ہے: **أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ** یعنی بساط کا عدم محض سے پیدا کرنا اور مرکبات کو ظہور خاص میں لانا دونوں خدا کا فعل ہیں اور بسیط اور مرکب دونوں خدائے تعالیٰ کی پیدائش ہے... یہ کیسی اعلیٰ اور عمدہ صداقت ہے جس کو ایک مختصر آیت اور چند معدود لفظوں میں خدائے تعالیٰ نے ادا کر دیا۔

(سرمد چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۱۷۵، ۱۷۶)

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۗ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۱﴾

إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ یعنی رحیمیت الہی انہیں لوگوں سے قریب ہے جو نیکو کار ہیں۔  
(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا نِّقَالًا سَقَنَّهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۗ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۵۲﴾

خدائے تعالیٰ وہ ذات کریم و رحیم ہے جس کا قدیم سے یہ قانون قدرت ہے کہ وہ ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے یعنی بارش سے پہلے چلاتا ہے یہاں تک کہ جب ہوائیں بھاری بدلیوں کو اٹھالاتی ہیں تو ہم کسی مردہ شہر کی طرف یعنی جس ضلع میں باعثِ امساکِ باراں زمین مردہ کی طرح خشک ہوگئی ہو، ان ہواؤں کو ہانک دیتے ہیں پھر اس سے پانی اتارتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے قسم قسم کے میوے پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح روحانی مردوں کو موت کے گڑھے سے نکالا کرتے ہیں اور یہ مثال اس لیے بیان کی گئی تا کہ تم دھیان کرو اور اس بات کو سمجھ جاؤ کہ جیسا کہ ہم امساکِ باراں کی شدت کے وقت مردہ زمین کو زندہ کر دیا کرتے ہیں ایسا ہی ہمارا قاعدہ ہے کہ جب سخت درجہ پر گمراہی پھیل جاتی ہے اور دل جو زمین سے مشابہ

ہیں مرجاتے ہیں تو ہم ان میں زندگی کی روح ڈال دیتے ہیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۲۸ تا ۶۳۰)

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِأَذْنِ رَبِّهِ ۗ وَالَّذِي خَبَثَ لَآ يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۗ  
كَذٰلِكَ نَصْرَفُ الْاٰلِيَّتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۱﴾

اور جو زمین پاکیزہ ہے اس کی تو کھیتی اللہ کے اذن سے جیسی کہ چاہیے نکلتی ہے اور جو خراب زمین ہے اس کی صرف تھوڑی سی کھیتی نکلتی ہے اور عمدہ کھیتی نہیں نکلتی۔ اسی طرح سے ہم پھیر پھیر کرتے ہیں تا جو شکر کرنے والے ہیں شکر کریں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۳۰، ۶۳۱)

یہ عام محاورہ قرآن شریف کا ہے کہ زمین کے لفظ سے انسانوں کے دل اور ان کی باطنی قوی مراد ہوتی ہیں۔

(ازالہ ابہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۶۸)

وَمِنْ عَلَامَاتِهِمْ أَنَّكَ تَرَاهُمْ فِي سُبُلِ اللّٰهِ مُسَارِعِينَ كَالَّذِى كَفَّ يَدَيْهِ عَنْهَا وَآمَّا أُمُورُ الدُّنْيَا فَيَتَزَخَّرُونَ عَنْهَا وَلَا يُؤْتِرُونَهَا إِلَّا بِالْكَرَاهَةِ، وَيُظْهِرُ اللّٰهُ بِهِمْ مَا صَلَحَ مِنْ أَحْوَاقِ النَّاسِ وَمَا كَانَ كَالَّذِى الدَّفِينِ، فَيُشَاطِرُونَ مَطَرًا يُظْهِرُ حَوَاصَّ الْأَرْضِينَ، وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِأَذْنِ رَبِّهِ ۗ وَالَّذِي خَبَثَ لَآ يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا، كَذٰلِكَ صَرَفَ اللّٰهُ مَثَلًا لِلْمُؤْمِنِينَ وَالْفَاسِقِينَ.

اور ان کی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ تو انہیں اللہ تعالیٰ کی راہوں پر ایک تیز رفتار اونٹنی کی مانند دوڑتا ہوا دیکھتا ہے لیکن جہاں تک دنیاوی امور کا تعلق ہے وہ اس سے پرہیز کرتے ہیں اور انہیں ترجیح نہیں دیتے مگر حقارت کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ لوگوں کے عمدہ اخلاق کو ظاہر کرتا ہے اور ان کی اندرونی بیماری کو بھی ظاہر کرتا ہے اور وہ ایک ایسی بارش کی مانند ہیں جو زمینوں کے خواص ظاہر کرتی ہے اور پاکیزہ شہر کی نباتات اللہ کے اذن سے نکلتی ہے اور وہ جو ناپاک ہے (اس کی نباتات) ردی صورت میں نکلتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور فاسقوں کے لیے مثال بیان کی ہے۔ (ترجمہ از مرتب)

(سیرۃ الابدال، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۳۱)

قرآن شریف نے انبیاء و رسل کی بعثت کی مثال میں سے دی ہے: وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ

بِأَذْنِ رَبِّهِ ۗ وَالَّذِي خَبْتُ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا - یہ تمثیل اسلام کی ہے جب کوئی رسول آتا ہے تو انسانی فطرتوں کے سارے خواص ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان کے ظہور کا یہ خاصہ اور علامات ہیں کہ مخلص سعید الفطرت اور مستعد طبیعت کے لوگ اپنے اخلاص اور ارادت میں ترقی کرتے ہیں اور شریر شرارت میں بڑھ جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

وَالَّذِي خَبْتُ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا - نہیں نکلتی کھیتی اس کی مگر تھوڑی۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۱۹)

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۗ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ

يَتَطَهَّرُونَ ﴿۱۲﴾

لوط کی قوم نے فسق و فجور میں جبر تک نوبت پہنچائی اور جب ان کو سمجھایا گیا تو لوط اور اس کے اصحاب کی نسبت انہوں نے اپنے رفیقوں کو وہ کہا جو قرآن شریف میں درج ہے اور وہ یہ ہے - أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۗ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ یعنی ان لوگوں کو اپنے گاؤں سے باہر نکالو۔ یہ تو طہارت اور تقویٰ لیے پھرتے ہیں یعنی ہمارے مخالف اور اور باتیں لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس خدا کا غضب انہیں قوموں پر بھڑکا اور ان کو صفحہ زمین سے ناپدید کر دیا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

وَالِى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يُقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنِّ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۗ

قَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ فَافُؤُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ

أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَفْسُدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۗ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ

مُؤْمِنِينَ ﴿۱۳﴾

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ ..... اور کسی طور سے لوگوں کو ان کے مال کا نقصان نہ پہنچاؤ۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴)

قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّصْنَا اللَّهُ مِنْهَا ۗ وَمَا

يَكُونُ لَنَا أَنْ نُعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبَّنَا وَسِعَ رَبَّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَيَّ  
اللَّهُ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ﴿۳۰﴾

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَالْحَقِّ اے ہمارے خدا! ہم میں اور ہماری قوم میں سچا فیصلہ کر اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (مسیح ہندوستان میں، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۳)

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ۔ اے ہمارے خدا! ہم میں اور ہماری قوم میں سچا سچا فیصلہ کر اور تو ہی ہے جو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

(اعجاز احمدی، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۱۰۷)

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَنَهُمْ  
يَضْرَعُونَ ﴿۳۱﴾

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ہم نے ان کو انکار کی حالت میں قحط اور وبا کے ساتھ پکڑا۔ تا اس طرح پر وہ عاجزی کریں۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۹ و پیغام صلح، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۷۷)

تِلْكَ الْقُرَى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِهَا ۗ وَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۗ  
فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۗ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿۳۲﴾

پہلی امتوں میں جب ان کے نبیوں نے نشان دکھلائے تو ان نشانوں کو دیکھ کر بھی لوگ ایمان نہ لائے کیونکہ وہ نشان دیکھنے سے پہلے تکذیب کر چکے تھے اسی طرح خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو اس قسم کے کافر ہیں جو نشان سے پہلے ایمان نہیں لاتے۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۳۳)

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَتْنَا ۗ رَبَّنَا أفرغ علينا  
صَبْرًا ۗ وَتَوَكَّلْنَا مُسْلِمِينَ ﴿۳۳﴾

اے خدا! اس مصیبت میں ہمارے دل پر وہ سکینت نازل کر جس سے صبر آجائے اور ایسا کر کہ ہماری

موت اسلام پر ہو۔ جانا چاہئے کہ دکھوں اور مصیبتوں کے وقت میں خدا تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کے دل پر ایک نور اتارتا ہے جس سے وہ قوت پا کر نہایت اطمینان سے مصیبت کا مقابلہ کرتے ہیں اور حلاوت ایمانی سے ان زنجیروں کو بوسہ دیتے ہیں جو اس کی راہ میں ان کے پیروں میں پڑیں۔ جب باخدا آدمی پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور موت کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے رب کریم سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع نہیں کرتا کہ مجھے ان بلاؤں سے بچا کیونکہ اس وقت عافیت کی دعا میں اصرار کرنا خدا تعالیٰ سے لڑائی اور موافقت تامہ کے مخالف ہے۔ بلکہ سچا محب بلا کے اترنے سے اور آگے قدم رکھتا ہے اور ایسے وقت میں جان کو ناچیز سمجھ کر اور جان کی محبت کو الوداع کہہ کر اپنے مولیٰ کی مرضی کا بالکل تابع ہو جاتا ہے اور اس کی رضا چاہتا ہے۔ اسی کے حق میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے: **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعَبَادِ** (البقرة: ۲۰۸) یعنی خدا کا پیارا بندہ اپنی جان خدا کی راہ میں دیتا ہے اور اس کے عوض میں خدا کی مرضی خرید لیتا ہے۔ وہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمت خاص کے موثر ہیں۔ غرض وہ استقامت جس سے خدامت ہے اس کی یہی روح ہے جو بیان کی گئی۔ جس کو سمجھنا ہو سمجھ لے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۰، ۴۲۱)

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَدْرُ مُوسَىٰ وَ قَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَ  
 وَيَذَرَكْ وَ الْهَتَكَ ۗ قَالَ سَنُقْتِلُ أَبْنَاءَهُمْ وَ نَسْتَحْيِ نِسَاءَهُمْ ۗ وَ إِنَّا فَوْقَهُمْ  
 قَاهِرُونَ ﴿۱۷۹﴾

فرعون نے کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھیں گے اور تحقیقاً ہم ان پر غالب ہیں۔ (شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۲۵)

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَ اصْبِرُوا ۗ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ ۗ يُورِثُهَا مَن  
 يَشَاءُ ۗ مَن عِبَادِهِ ۗ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۸۰﴾

موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو، زمین خدا کی ہے جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام بخیر پر ہمیزگاروں کا ہی ہوتا ہے۔

(شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۲۵)

جو لوگ حیوانات کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ جب ان کو پکڑتا بھی ہے تو پھر جان لینے ہی کے لیے پکڑتا ہے مگر مومن کے حق میں اس کی یہ عادت نہیں ہے ان کی تکالیف کا انجام اچھا ہوتا ہے اور انجام کار متقی کے لیے ہی ہے۔ جیسے فرمایا: **وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ**۔ ان کو جو تکالیف اور مصائب آتے ہیں وہ بھی ان کی ترقیوں کا باعث بنتی ہیں تاکہ ان کو تخریب ہو جاوے۔ اللہ تعالیٰ پھر ان کے دن پھیر دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

ہم اپنے مخالفوں کی مخالفت کی کیا پروا کریں۔ یہ مخالف نوبت بہ نوبت اپنے فرض منصبی کو سرانجام دیتے ہیں، ابتداء ان کی ہوتی ہے اور انجام متقیوں کا **وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ**۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

ہر قسم کے حسد، کینہ، بغض، غیبت، اور کبر اور رعوت، اور فسق فجور کی ظاہری اور باطنی راہوں اور کسل اور غفلت سے بچو اور خوب یاد رکھو کہ انجام کار ہمیشہ متقیوں کا ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ**۔ اس لیے متقی بننے کی فکر کرو۔

یہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ حکم خواتیم پر ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ: **وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ**۔ سنت اللہ اسی طور پر جاری ہے کہ صادق لوگ اپنے انجام سے شناخت کیے جاتے ہیں۔ یہ عاجز خوب جانتا ہے کہ جس کام کو میں نے اٹھایا ہے ابھی وہ لوگوں پر بہت مشتبہ ہے اور شاید اس بات میں کچھ مبالغہ نہ ہو کہ ہنوز ایسی حالت ہے کہ بجائے فائدہ کے آثار و علامت نقصان کے نظر آتے ہیں۔ یعنی بجائے ہدایت کے ضلالت و بدظنی سہل لگتی ہے۔ مگر میں جب ایک طرف آیات قرآنی پڑھتا ہوں کیونکہ اوائل میں نبیوں پر ایسے سخت زلازل آئے کہ مدتوں تک کوئی صورت کامیابی کی دکھلائی نہ دی اور پھر انجام کار نسیم نصرت الہی کا چلنا شروع ہوا اور دوسری طرف مواعید صادقہ حضرت احدیت سے بشارتیں پاتا ہوں تو میرا غم دور اور بالکل دور ہو جاتا ہے اور اس بات پر تازہ ایمان آتا ہے **كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ لَنْ يَنْفَكَنَّ اَنَّكُمْ رُسُلِي (المجادلة: ۲۲)**۔

(مکتوبات احمد جلد دوم صفحہ ۹۲)

(مباحثہ کے ذکر پر فرمایا)

درحقیقت تو ہم نے فتح پالی ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ وہ دیہات کے لوگ تھے ان کو ان باریک باتوں کی سمجھ نہیں آئی مجھے خوشبو آتی ہے کہ آخر کار فتح ہماری ہے دسمبر کے آخر تک جو نشان ظاہر ہونے والے ہیں

شاید یہ بھی ان میں سے ایک عظیم الشان نشان ہو جاوے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے جیسے فرمایا: **الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی (تیرہ) برس تک مکروہات ہی پہنچتے رہے۔

(الہدٰی جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۰)

**قَالُوا أَوْزِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِينَا وَ مِنْ بَعْدِ مَا جَعَلْنَا قَالِ عَلِي رُبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدَاؤَكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝**

موسیٰ کی قوم نے اس کو جواب دیا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے جاتے تھے اور تیرے آنے کے بعد بھی ستائے گئے تو موسیٰ نے اُن کے جواب میں کہا کہ قریب ہے کہ خُدا تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور زمین پر تمہیں خلیفے مقرر کر دے اور پھر دیکھے کہ تم کس طور کے کام کرتے ہو۔

اب ان آیات میں صریح اور صاف طور پر وہی لوگ مخاطب ہیں جو حضرت موسیٰ کی قوم میں سے اُن کے سامنے زندہ موجود تھے اور انہوں نے فرعون کے ظلموں کا شکوہ بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے گئے اور تیرے آنے کے بعد بھی اور انہیں کو خطاب کر کے کہا تھا کہ تم ان تکلیفات پر صبر کرو خدا تمہاری طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگا اور تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تم کو زمین پر خلیفے بنا دے گا لیکن تاریخ دانوں پر ظاہر ہے اور یہودیوں اور نصاریٰ کی کتابوں کو دیکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ گواس قوم کا دشمن یعنی فرعون اُن کے سامنے ہلاک ہوا مگر وہ خود تو زمین پر نہ ظاہری خلافت پر پہنچے نہ باطنی خلافت پر۔ بلکہ اکثر ان کی نافرمانیوں سے ہلاک کئے گئے اور چالیس برس تک بیابان لُق و دق میں آوارہ رہ کر جان بحق تسلیم ہوئے پھر بعد ان کی ہلاکت کے ان کی اولاد میں ایسا سلسلہ خلافت کا شروع ہوا کہ بہت سے بادشاہ اس قوم میں ہوئے اور داؤد اور سلیمان جیسے خلیفۃ اللہ اسی قوم میں سے پیدا ہوئے یہاں تک کہ آخر یہ سلسلہ خلافت کا چودھویں صدی میں حضرت مسیح پر ختم ہوا پس اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم موجودہ کو مخاطب کرنے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خطاب قوم موجودہ تک ہی محدود رہے بلکہ قرآن کریم کا تو یہ بھی محاورہ پایا جاتا ہے کہ بسا اوقات ایک قوم کو مخاطب کرتا ہے مگر اصل مخاطب کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جو گذر گئے یا آئندہ آنے والے ہیں۔

(شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۲۵، ۳۲۶)

موسیٰ نے ظاہر ہو کر تین بڑے کھلے کھلے کام کئے جو دنیا پر روشن ہو گئے ایسے ہی کھلے کھلے تین کام جو دنیا

پر بدیہی طور پر ظاہر ہو گئے ہوں جس نبی سے ظہور میں آئے ہوں وہی نبی مثیل موسیٰ ہوگا اور وہ کام یہ ہیں (۱) اول یہ کہ موسیٰ نے اُس دشمن کو ہلاک کیا جو اُن کی اور اُن کی شریعت کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا (۲) دوسرے یہ کہ موسیٰ نے ایک نادان قوم کو جو خدا اور اس کی کتابوں سے ناواقف تھی اور وحشیوں کی طرح چار سو برس سے زندگی بسر کرتے تھے کتاب اور خدا کی شریعت دی یعنی توریت عنایت کی اور ان میں شریعت کی بنیاد ڈالی (۳) تیسرے یہ کہ بعد اس کے کہ وہ لوگ ذلت کی زندگی بسر کرتے تھے ان کو حکومت اور بادشاہت عنایت کی اور اُن میں سے بادشاہ بنائے۔ ان تینوں انعامات کا قرآن شریف میں ذکر ہے۔ جیسا کہ فرمایا: قَالَ عَلِيُّ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔ دیکھو سورۃ الاعراف الجزء نمبر ۹۔ اور پھر دوسری جگہ فرمایا: فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا (النساء: ۵۵)۔ دیکھو سورۃ النساء الجزء نمبر ۵۔ اب سوچ کر دیکھ لو کہ ان تینوں کاموں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ذرہ بھی مناسبت نہیں۔ نہ وہ پیدا ہو کر یہودیوں کے دشمنوں کو ہلاک کر سکے اور نہ وہ اُن کے لئے کوئی نئی شریعت لائے اور نہ انہوں نے بنی اسرائیل یا اُن کے بھائیوں کو بادشاہت بخشی۔ انجیل کیا تھی وہ صرف توریت کے چند احکام کا خلاصہ ہے جس سے پہلے یہود بے خبر نہیں تھے گو اس پر کار بند نہ تھے۔ یہود گو حضرت مسیح کے وقت میں اکثر بدکار تھے مگر پھر بھی اُن کے ہاتھ میں توریت تھی۔ پس انصاف ہمیں اس گواہی کے لئے مجبور کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کچھ مماثلت نہیں رکھتے۔ اور یہ کہنا کہ جس طرح حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہاتھ سے نجات دی اسی طرح حضرت عیسیٰ نے اپنے تابعین کو شیطان کے ہاتھ سے نجات دی یہ ایسا یہودہ خیال ہے کہ کوئی شخص گو کیسا ہی اغماض کرنے والا ہو اس خیال پر اطلاع پا کر اپنے تئیں ہنسنے سے روک نہیں سکے گا۔ مخالف کے سامنے اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ عیسیٰ نے ضرور اپنے پیروؤں کو شیطان سے اسی طرح نجات دے دی جیسا کہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہاتھ سے نجات دی۔ موسیٰ کا بنی اسرائیل کو فرعون کے ہاتھ سے نجات دینا ایک تاریخی امر ہے جس سے نہ کوئی یہودی منکر ہو سکتا ہے نہ عیسائی نہ مسلمان نہ گبر نہ ہندو کیونکہ وہ دنیا کے واقعات میں سے ایک واقعہ مشہور ہے مگر عیسیٰ کا اپنے تابعین کو شیطان کے ہاتھ سے نجات دینا صرف اعتقادی امر ہے جو محض نصاریٰ کے خیالات میں ہے خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں جس کو دیکھ کر ہر ایک شخص بدیہی طور پر قائل ہو سکے کہ ہاں یہ لوگ درحقیقت شیطان اور ہر ایک بدکاری سے نجات پا گئے ہیں اور ان کا

گروہ ہر ایک بدی سے پاک ہے۔۔۔ اس پیشگوئی کا تو یہ مطلب ہے کہ وہ نبی موسیٰ کی طرح بنی اسرائیل کو یا ان کے بھائیوں کو ایک عذاب سے نجات دے گا اسی طرح جیسا کہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو عذاب سے نجات دی تھی۔ اور نہ صرف نجات دے گا بلکہ ان کو ایامِ ذلت کے بعد سلطنت بھی عطا کرے گا جیسا کہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو چار سو برس کی ذلت کے بعد نجات دی اور پھر سلطنت عطا کی اور پھر اس وحشی قوم کو موسیٰ کی طرح ایک نئی شریعت سے تہذیب یافتہ کرے گا۔ اور وہ قوم بنی اسرائیل کے بھائی ہوں گے۔ اب دیکھو کہ کیسی صفائی اور روشنی سے یہ پیشگوئی سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پوری ہو گئی ہے اور ایسی صفائی سے پوری ہو گئی ہے کہ اگر مثلاً ایک ہندو کے سامنے بھی جو عقل سلیم رکھتا ہو یہ دونوں تاریخی واقعات رکھے جائیں یعنی جس طرح موسیٰ نے اپنی قوم کو فرعون کے ہاتھ سے نجات دی اور پھر سلطنت بخشی اور پھر ان وحشی لوگوں کو جو غلامی میں بسر کر رہے تھے ایک شریعت بخشی۔ اور جس طرح سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غریبوں اور کمزوروں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے عرب کے خونخوار دندوں سے نجات دی اور سلطنت عطا کی اور پھر اس وحشیانہ حالت کے بعد ان کو ایک شریعت عطا کی تو بلاشبہ وہ ہندو دونوں واقعات کو ایک ہی رنگ میں سمجھے گا اور ان کی مماثلت کی گواہی دے گا۔ اور خود ہم جبکہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تابعین کو عرب کے خون ریز ظالموں کے ہاتھ سے بچا کر اپنے پروں کے نیچے لے لیا۔ اور پھر ان لوگوں کو جو صد ہا سال سے وحشیانہ حالت میں بسر کر رہے تھے ایک نئی شریعت عطا فرمائی اور بعد ایامِ ذلت اور غلامی کے سلطنت عطا فرمائی تو بلا تکلف موسیٰ کے زمانہ کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور پھر ذرہ اور غور کر کے جب حضرت موسیٰ کے سلسلہ خلفاء پر نظر ڈالتے ہیں جو چودہ سو برس تک دنیا میں قائم رہا تو اس کے مقابل پر سلسلہ محمدیہ بھی اسی مقدار پر ہمیں نظر آتا ہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کے سلسلہ خلفاء کے آخر میں ایک مسیح ہے جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے ایسا ہی اس سلسلہ کے آخر میں بھی جو مقدار اور مدت میں سلسلہ موسوی کی مانند ہے ایک مسیح دکھائی دیتا ہے اور دونوں سلسلے ایک دوسرے کے مقابل پر ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ جس طرح ایک انسان کی دو ٹانگیں ایک دوسری کے مقابل پر ہوتی ہیں۔ پس اس سے بڑھ کر مماثلت کے کیا معنی ہیں اور یہی حقیقت یہ آیت ظاہر فرماتی ہے کہ: **إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (المزمل: ۱۶)**

قرآن شریف کی رو سے سلسلہ محمدیہ سلسلہ موسویہ سے ہر ایک نیکی اور بدی میں مشابہت رکھتا ہے۔ اسی کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے کہ ایک جگہ یہود کے حق میں لکھا ہے: **فَيَنْظُرْ كَيْفَ تَعْمَلُونَ**۔ دوسری جگہ مسلمانوں کے حق میں لکھا ہے۔ **لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ** (یونس: ۱۵)۔ ان دونوں آیتوں کے یہ معنی ہیں کہ خدا تمہیں خلافت اور حکومت عطا کر کے پھر دیکھے گا کہ تم راستبازی پر قائم رہتے ہو یا نہیں۔ ان آیتوں میں جو الفاظ یہود کے لئے استعمال کئے ہیں وہی مسلمانوں کے لئے۔ یعنی ایک ہی آیت کے نیچے ان دونوں کو رکھا ہے۔ پس ان آیتوں سے بڑھ کر اس بات کے لئے اور کون سا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خدا نے بعض مسلمانوں کو یہود قرار دے دیا ہے اور صاف اشارہ کر دیا ہے کہ جن بدیوں کے یہود مرتکب ہوئے تھے یعنی علماء اُن کے۔ اس اُمت کے علماء بھی انہیں بدیوں کے مرتکب ہوں گے۔ اور اسی مفہوم کی طرف آیت **عَلَيْهِمْ** (الفاتحہ: ۷) میں بھی اشارہ ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۳)

یہودیوں کے بادشاہوں کے اُن مشیوں کا جو اسلام میں پیدا ہوئے جیسا کہ ان دو بالمقابل آیتوں سے جن کے الفاظ باہم ملتے ہیں سمجھا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں:-

اسلام کے بادشاہوں کی نسبت

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلِيفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ  
بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔

(یونس: ۱۵)

الجز ونمبر ۱۱ سورۃ یونس صفحہ ۳۳۵

یہودیوں کے بادشاہوں کی نسبت

قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ  
وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ  
تَعْمَلُونَ (الاعراف: ۱۳۰)

الجز ونمبر ۹ سورۃ الاعراف صفحہ ۱۶۵

یہ دو فقرے یعنی **فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ** جو یہودیوں کے بادشاہوں کے حق میں ہے اور اُس کے مقابل پر دوسرا فقرہ یعنی **لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ** جو مسلمانوں کے بادشاہوں کے حق میں ہے صاف بتلا رہے ہیں کہ ان دونوں قوموں کے بادشاہوں کے واقعات بھی باہم متشابہ ہوں گے۔ سو ایسا ہی ظہور میں آیا اور جس طرح یہودی بادشاہوں سے قابل شرم خانہ جنگیاں ظہور میں آئیں اور اکثر کے چال چلن بھی خراب ہو گئے یہاں تک کہ بعض اُن میں سے بدکاری، شراب نوشی، خونریزی اور سخت بے رحمی میں ضرب المثل ہو گئے۔ یہی طریق اکثر مسلمانوں کے بادشاہوں نے اختیار کئے۔ ہاں! بعض یہودیوں کے نیک اور عادل بادشاہوں کی

طرح نیک اور عادل بادشاہ بھی بنے جیسا کہ عمر بن عبد العزیز۔

(تحفہ گوڑویہ، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۳۰۶، ۳۰۷)

ایک جگہ مسلمانوں کے آخری زمانہ کے لیے قرآن شریف نے وہ لفظ استعمال کیا ہے جو یہود کے لیے استعمال کیا تھا یعنی فرمایا فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ تم کو خلافت اور سلطنت دی جائے گی مگر آخری زمانہ میں تمہاری بد اعمالی کی وجہ سے وہ سلطنت تم سے چھین لی جائے گی جیسا کہ یہودیوں سے چھین لی گئی تھی۔

(لیکچر سیالکوٹ، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۳)

حضرت اقدس نے فرمایا:

وَيَسْتَخْلِفُكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔ یہ آیتیں بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں ایک ان میں سے اہل اسلام کی نسبت ہے اور ایک یہود کی نسبت۔ پس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر طرح کا انعام کروں گا اور پھر دیکھوں گا کہ کس طرح شکر کرتے ہو۔ اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اہل یہود کو کون سی بڑی مصیبت تھی تو وہ دو بڑی مصیبتیں ہیں ایک یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا گیا اور ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا گیا پس مماثلت کے لحاظ سے مسلمانوں کے لیے بھی وہی دوا انکار لکھے تھے۔ مگر وہاں شمار میں الگ الگ دو وجود تھے اور یہاں نام الگ الگ ہیں مگر وہ وجود جس میں ان دونوں کا بروز ہو ایک ہی ہے ایک بروز عیسوی اور ایک محمدی اور صرف نام کے لحاظ سے اہل اسلام یہود کے بروز اس طرح سے قرار پائے کہ انہوں نے مسیح اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا اور وہ مماثلت پوری ہو گئی اور آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس امت میں بروزی طور پر وہی کرتوت یہودیوں والی پوری ہوئی تھی اور یہ اس طرف اشارہ کرتی تھیں کہ آنے والا دور نگ لے کر آوے گا اسی لیے مہدی اور مسیح کے زمانہ کی علامات ایک ہی ہیں اور ان دونوں کا فعل بھی ایک ہی (ہے)۔

(البدرد جلد ۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۵۸، ۳۵۹)

فَإِذَا جَاءَتْهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَذِهِ ۗ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَتَّخِذُوا  
بِمُوسَى وَمَنْ مَعَهُ ۗ أَلَا إِنَّمَا طَرِفْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۱﴾

بعض آدمیوں نے کہا کہ یہ طاعون گویا ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہے یہ آواز کوئی نئی آواز نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی کہا گیا تھا تطیرنا بموسى مگر مجھے یہ تعجب ہے کہ یہ لوگ طاعون کو ہماری شامت اعمال

کا نتیجہ بتاتے ہیں لیکن بتلا خود ہوتے ہیں حالانکہ اگر ہماری شامت اعمال تھی تو چاہیے تھا کہ طاعون کی خبر تم کو دی جاتی مگر یہ کیا ہوا کہ خبر بھی ہم کو دی گئی اور موتیں تم میں ہوتی ہیں برخلاف اس کے کہ ہماری حفاظت کا وعدہ کیا جاتا اور اسے ایک نشان ٹھہرایا جاتا ہے۔ کچھ تو خدا سے ڈرو۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۷۳ مورخہ ۱۷/۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۳)

وَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً ۖ وَاتَّبَعَهَا بِعَشْرِ فِتْنَةٍ مِّيقَاتٍ رَبِّهِ ۗ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي ۖ وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۳﴾

پھر ہم کہتے ہیں کہ جس حالت میں وعدہ کی تاریخ ملنا نصوص قرآنیہ قطعہ یقینیہ سے ثابت ہے جیسا کہ آیت: وَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً اس کی شاہد ناطق ہے تو وعید کی تاریخیں جو نزول عذاب پر دال ہوتی ہیں جس کا ملنا اور رد بلا ہونا توبہ اور استغفار اور صدقات سے باتفاق جمیع انبیاء علیہم السلام ثابت ہے پس ان تاریخوں کا ملنا بوجہ اولیٰ ثابت ہوا اور اس سے انکار کرنا صرف سفیہ اور نادان کا کام ہے نہ کسی صاحب بصیرت کا۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ ۗ قَالَ رَبِّ أَرِنِي ۙ أَنْظُرْ إِلَيْكَ ۗ قَالَ لَنْ تَرِنِي ۚ وَلَكِنِ انْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي ۚ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا ۚ فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ ۖ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۴﴾

فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا..... پس جب کہ خدا نے پہاڑ پر تجلی کی تو اس کو پاش پاش کر دیا یعنی مشکلات کے پہاڑ آسان ہوئے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۱۵، ۶۱۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

جب خدا مشکلات کے پہاڑ پر تجلی کرے گا تو انہیں پاش پاش کر دے گا۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۶۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

اور تجلی کی اس کے رب نے پہاڑ پر یعنی مشکلات کے پہاڑ پر اور کرد یا اس کو پاش پاش اور گراموسیٰ بیہوش ہو کر۔ یعنی ایسی تجلی ہیبت ناک تھی کہ اس کی ہیبت کا اثر موسیٰ پر بھی پڑا۔

(الہد ر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جب خدا پہاڑ پر تجلی کرے گا تو اس کو پارہ پارہ کر دے گا۔ (تبلغ رسالت مجموعہ اشہارات جلد ۱۰ صفحہ ۹۲، ۹۱)

جب طالب کمال وصال کا خدا کے لیے اپنے تمام وجود سے الگ ہو جاتا ہے اور کوئی حرکت اور سکون اس کا اپنے لیے نہیں رہتا بلکہ سب کچھ خدا کے لیے ہو جاتا ہے تو اس حالت میں اس کو ایک روحانی موت پیش آتی ہے جو بقا کو مستلزم ہے پس اس حالت میں گویا وہ بعد موت کے زندہ کیا جاتا ہے اور غیر اللہ کا وجود اس کی آنکھ میں باقی نہیں رہتا یہاں تک کہ غلبہ مشہود ہستی الہی سے وہ اپنے وجود کو بھی نابود ہی خیال کرتا ہے پس یہ مقام عبودیت و فناء اتم ہے جو غایت سیر اولیاء ہے اور اسی مقام میں غیب باذن اللہ ایک نور سالک کے قلب پر نازل ہوتا ہے جو تقریر اور تحریر سے باہر ہے۔

غلبہ شہود کی ایک ایسی حالت ہے کہ جو علم الیقین اور عین الیقین کے مرتبہ سے برتر ہے۔ صاحب شہود تام کو ایک علم تو ہے مگر ایسا علم جو اپنے ہی نفس پر وارد ہو گیا ہے جیسے کوئی آگ میں جل رہا ہے۔ سو اگر چہ وہ بھی جلنے کا ایک علم رکھتا ہے مگر وہ علم الیقین اور عین الیقین سے برتر ہے۔ کبھی شہود تام بے خبری تک بھی نوبت پہنچا دیتا اور حالت سکر اور بیہوشی کی غلبہ کرتی ہے اس حالت سے یہ آیت مشابہ ہے: فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَبْحًا لِّكَيْنَ حَالَتَامِ وَهُوَ هِيَ جَسْمَانِ كِي طَرَفِ اِشَارَهٗ: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ (النجم: ۱۸)

یہ حالت اہل جنت کے نصیب ہوگی۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸ حاشیہ)

موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بیہوش ہو کر گرنا ایک واقعہ نورانی تھا جس کا موجب کوئی جسمانی ظلمت نہ تھی بلکہ تجلیات صفات الہیہ جو بغایت انشراق ظہور میں آئی تھیں۔ وہی اس کا موجب اور باعث تھیں جن کے انشراق تام کی وجہ سے ایک عاجز بندہ عمران کا بیٹا بیہوش ہو کر گر پڑا اور اگر عنایت الہیہ اس کا تدارک نہ کرتی تو اسی حالت میں گزر ہو کر نابود ہو جاتا۔ مگر یہ مرتبہ ترقیات کا ملہ کا انتہائی درجہ نہیں ہے۔ انتہائی درجہ وہ ہے جس کی نسبت لکھا ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ۔ (الحکم جلد ۲ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۹۸ء صفحہ ۳)

وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ ۗ اَلَمْ يَرَوْا

أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۚ اتَّخَذُوا وَاوَابِدًا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۚ لَئِن لَّمْ يَنتَهِ عَمَلُهُمْ شُكْرًا فَسَآءَ مَا يَكْتُمُونَ ﴿۲۳۷﴾

جب لکھرام نے نہایت اصرار کے ساتھ اپنی موت کے لئے مجھ سے پیشگوئی چاہی تو مجھے دعا کے بعد یہ الہام ہوا: عَجَلٌ جَسَدُهُ خُوَارٌ۔ لَہٗ نَصَبٌ وَعَذَابٌ یعنی یہ ایک بے جان گوسالہ ہے جس میں مارے جانے کے وقت گوسالہ کی طرح ایک آواز نکلے گی اور اس میں جان نہیں اور اس کے لئے نصب اور عذاب ہے۔ لسان العرب میں جو لغت عرب میں ایک پرانی اور معتبر کتاب ہے لفظ نصب کے معنی علاوہ اور کئی معنوں کے ایک یہ بھی لکھے ہیں کہ جب کہا جائے نَصَبَ فُلَانٍ لِفُلَانٍ تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کسی شخص نے اس شخص پر جان لینے کے لئے حملہ کیا اور دشمنی کی راہ سے اس کے فنا کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ لسان العرب کے اس مقام میں اپنے لفظ یہ ہیں: نَصَبَ فُلَانٍ لِفُلَانٍ نَصَبًا إِذَا قَصَدَلَهُ وَعَادَاةً وَتَجَرَّدَ لَهُ۔ جس کے یہی معنی ہیں جو اوپر کئے گئے۔ دیکھو لسان العرب لفظ نصب صفحہ ۲۵۸ سطر نمبر ۲ اور خوار کا لفظ لغت عرب میں گوسالہ کی آواز کے لئے آتا ہے۔ لیکن جب انسان پر اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں تو اُس موقع پر کرتے ہیں جبکہ کوئی مقتول قتل ہونے کے وقت گوسالہ کی طرح آواز نکالتا ہے جیسا کہ اُسی لسان العرب میں خوار کے لفظ کے بیان میں صفحہ ۳۴۵ میں ان معنوں کی تصدیق کے لئے ایک حدیث لکھی ہے اور وہ یہ ہے: وَفِي حَدِيثٍ مَقْتُلِ أَبِي بَنٍ خَلْفٍ فَخَرَّ يَخْوَرُ كَمَا يَخْوَرُ الثَّوْرُ یعنی جب اُبی بن خلف قتل کیا گیا تو یوں آواز نکالتا تھا جیسا کہ بیل آواز نکالتا ہے اور کبھی خوار کا لفظ عرب کی زبان میں اُس ہتھیار کی آواز پر بولا جاتا ہے جو چلایا جاتا ہے۔ چنانچہ لسان العرب کے اُسی صفحہ ۳۴۵ میں ایک نامی شاعر عرب کا اس محاورہ کے حوالہ میں ایک شعر لکھا ہے اور وہ یہ ہے:

يَخْرَنُ إِذَا انْفُذْنَ فِي سَاقِطِ النَّدَى

وَإِنْ كَانَ يَوْمًا ذَا أَهَاضِيبٍ مُخْضِلًا

یعنی اُن تیروں میں سے جو چلائے جاتے ہیں اور پھر نکالے جاتے ہیں گوسالہ کی آواز کی طرح ایک آواز آتی ہے۔ اگرچہ ایسا دن ہو جس میں متواتر بارش ہوئی ہو اور ہر ایک چیز کو تر کر دیتا ہو۔.... غرض اس نہایت معتبر کتاب سے جو لسان العرب ہے ثابت ہوتا ہے کہ خور اور خوار کے لفظ کو انسان پر اُس حالت میں بھی بولتے ہیں کہ جب وہ قتل ہونے کے وقت فریاد کرتا ہے اور قتل کرنے کے وقت جو ہتھیار کی آواز ہوتی

ہے اُس کا نام بھی خوار ہے۔ (تزیاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۷۹ تا ۳۸۱)

خروج باب ۳۲ سے ثابت ہوتا ہے کہ گوسالہ سامری کے نیست و نابود کرنے کا ارادہ یہود کی عید کے دن میں کیا گیا تھا مگر آگ میں جلانا اور باریک پینا اور غبار کی مانند بنانا جیسا کہ ۳۲ خروج میں لکھا ہے یہ فرصت طلب کام تھا اس برے کام نے ضرور رات کا کچھ حصہ لیا ہوگا کیونکہ حضرت موسیٰ اس وقت اترے تھے جب گوسالہ پرستی کا میلہ خوب گرم ہو گیا تھا اور یہ وقت غالباً دوپہر کے بعد میں ہوگا اور پھر کچھ عرصہ ناراضگی اور غضب میں گذرا۔ لہذا یہ قطعی امر ہے کہ سونے کا جلانا اور خاک کی طرح کرنا کچھ حصہ رات تک جو دوسرے دن میں محسوب ہوتے ہی ختم ہوا ہوگا۔ (سراج منیر، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۶۸ حاشیہ)

یہ گوسالہ بے جان ہے جس میں سے مہل آواز آرہی ہے پس اس کے لئے دکھ کی مار اور عذاب ہے۔

(استفتاء، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۱۱۸)

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعُجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ

الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿۵۲﴾

جنہوں نے گوسالہ پرستی کی ان پر غضب کا عذاب پڑے گا اور دنیا کی زندگی میں ان کو ذلت پہنچے گی اور اسی طرح ہم دوسرے مفتزیوں کو سزا دیں گے اور یہ ایک لطیف اشارہ ان گوسالہ پرستوں کی طرف بھی ہے جو اس دوسرے گوسالہ یعنی لیکھرام کی پرستش کرنے میں ظلم اور خوریزی کے ارادوں تک پہنچ گئے خدا تعالیٰ کے علم سے کوئی شے باہر نہیں وہ خوب جانتا تھا کہ ہندو بھی لیکھرام کی پرستش کر کے اس کو گوسالہ بنا لیں گے اس لیے اس نے کذالک کے لفظ سے لیکھرام کے قصہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ تورات خروج باب ۳۲ آیت ۳۵ سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر گوسالہ پرستی کے سبب سے موت بھیجی تھی یعنی ایک وبان میں پڑ گئی تھی جس سے وہ مر گئے تھے اور اس عذاب کی خبر کے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جو لوگ ایمان لائیں گے میں ان کو نجات دوں گا جیسا کہ فرماتا ہے: **وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ** یعنی جنہوں نے گوسالہ پرستی کی دھن میں برے کام کیے پھر بعد اس کے توبہ کی اور ایمان لائے تو خدا تعالیٰ ایمان کے بعد ان کے گناہ بخش دے گا اور ان پر رحم کرے گا کیونکہ وہ غفور اور رحیم ہے۔ (سراج منیر، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۷۰)

جنہوں نے گو سالہ کو عزت دی اور اس کی پرستش کی۔ ان پر غضب آئے گا اور ذلت کی مار ان پر پڑے گی سو دنیا میں غضب نازل ہونے سے مراد طاعون ہے۔ (نزول المسیح روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۵۳۳)

جو لوگ خدا تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں۔ عنقریب خدا تعالیٰ کا غضب ان پر وارد ہوگا۔ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۳۳۶)

جو لوگ عداوت سے باز نہیں آتے۔ عنقریب ان پر غضب الہی نازل ہوگا۔

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۷۱۹)

وَ اَكْتُبُ لَكُمْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الْآخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ ط قَالَ عَدَايَ  
اُصِيبُ بِهِ مَنْ اَشَاءُ ؕ وَ رَحْمَتِي وَ سِعَتُ كُلِّ شَيْءٍ ط فَسَاكُنْتُمْهَا لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَ  
يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَ الَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۵﴾

عَدَايَ اُصِيبُ بِهِ مَنْ اَشَاءُ ؕ وَ رَحْمَتِي وَ سِعَتُ كُلِّ شَيْءٍ یعنی میں اپنا عذاب جس کو لائق اس کے دیکھتا ہوں پہنچاتا ہوں اور میری رحمت نے ہر ایک چیز کو گھیر رکھا ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۴۳۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

میں جس کو چاہتا ہوں عذاب پہنچاتا ہوں اور میری رحمت نے ہر چیز پر احاطہ کر رکھا ہے سو میں ان کے لیے جو ہر ایک طرح کے شرک اور کفر اور فواحش سے پرہیز کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور نیز ان کے لیے جو ہماری نشانیوں پر ایمان کامل لاتے ہیں اپنی رحمت لکھوں گا۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۶۴)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمت عام اور وسیع ہے اور غضب یعنی صفت عدل بعد کسی خصوصیت کے پیدا ہوتی ہے یعنی یہ صفت قانون الہی سے تجاوز کرنے کے بعد اپنا حق پیدا کرتی ہے اور اس کے لیے ضرور ہے کہ اوّل قانون الہی ہو اور قانون الہی کی خلاف ورزی سے گناہ پیدا ہو اور پھر یہ صفت ظہور میں آتی ہے اور اپنا تقاضا پورا کرنا چاہتی ہے۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۰۷)

وعید میں دراصل کوئی وعدہ نہیں ہوتا۔ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی قدوسیت کی وجہ سے تقاضا فرماتا ہے کہ شخص مجرم کو سزا دے اور بسا اوقات اس تقاضا سے اپنے ملہمین کو اطلاع بھی دے دیتا ہے پھر جب شخص مجرم توبہ اور استغفار اور تضرع اور زاری سے اس تقاضا کا حق پورا کر دیتا ہے تو رحمت الہی کا تقاضا

غضب کے تقاضا پر سبقت لے جاتا ہے اور اس غضب کو اپنے اندر محبوب و مستور کر دیتا ہے یہی معنی ہیں اس آیت کے کہ: عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۗ لِيَعْنِي رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ۔ اگر یہ اصول نہ مانا جائے تو تمام شریعتیں باطل ہو جاتی ہیں۔

(تحفہ غزنویہ، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۷۳۷)

عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۗ لِيَعْنِي عَذَابٌ تُوْمِرُ اِخْلَاصَ صُوْرَتُوْنَ مِيْنْ جَسَدِيْ كُوْچَا هَتَا هُوْنَ دِيْتَا هُوْنَ مَگْر مِيْرِي رَحْمَتٌ هَرَا يَكُ چِيْز تَكُ پِيْنِيْج رَهِيْ هِيْ۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۵)

آریہ وغیرہ جو اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ کو غضب ناک کہا گیا ہے۔ یہ ان کی صریح غلطی ہے ان کو چاہیے تھا کہ قرآن مجید کی دوسری جگہوں پر نظر کرتے۔ وہاں تو صاف طور پر لکھا ہے: عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۗ۔ خدا کی رحمت تو کل چیزوں کے شامل حال ہے۔ مگر ان کو وقت ہے تو یہ ہے کہ خدا کی رحمت کے تو وہ قائل ہی نہیں۔ ان کے مذہبی اصول کے بموجب اگر کوئی شخص بصد مشکل مکتی حاصل کر بھی لے تو آخر پھر وہاں سے نکلنا ہی پڑے گا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲ مورخہ ۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ  
فِي التَّوْرَةِ وَ الْاِنْجِيْلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ  
الطَّيِّبَاتِ وَ يَحْرِمُهُمُ الْعَجَلِيَّتِ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ  
عَلَيْهِمْ ۗ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهِ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْ اُنزِلَ مَعَهٗ  
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۷﴾

چالاکي سے علوم القرآن نہیں آتے۔ دماغی قوت اور ذہنی ترقی قرآنی علوم کو جذب کرنے کا اکیلا باعث نہیں ہو سکتا۔ اصل ذریعہ تقویٰ ہی ہے، متقی کا معلم خدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیوں پر اہمیت غالب ہوتی ہے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے امی بھیجا کہ باوجود یہ کہ آپ نے نہ کسی مکتب میں تعلیم پائی اور نہ کسی کو استاد بنایا۔ پھر آپ نے وہ معارف اور حقائق بیان کئے جنہوں نے دنیوی علوم کے ماہروں کو دنگ اور

حیران کر دیا۔ قرآن شریف جیسی پاک، کامل کتاب آپ کے لبوں پر جاری ہوئی۔ جس کی فصاحت و بلاغت نے سارے عرب کو خاموش کر دیا۔ وہ کیا بات تھی جس کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علوم میں سب سے بڑھ گئے۔ وہ تقویٰ ہی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مطہر زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف جیسی کتاب وہ لائے۔ جس کے علوم نے دنیا کو حیران کر دیا ہے۔

آپ کا اُٹی ہونا ایک نمونہ اور دلیل ہے اس امر کی کہ قرآنی علوم یا آسمانی علوم کے لیے تقویٰ مطلوب ہے

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۲، ۳)

نہ نبوی چالاکیاں۔

يَا مَرْهُمُ بِأَنَّمَعْرُوفٍ وَيُنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۗ فَاَلَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُبْلِحُونَ..... (یہ نبی) ان باتوں کے لیے حکم دیتا ہے جو خلاف عقل نہیں ہیں اور ان باتوں سے منع کرتا ہے جن سے عقل بھی منع کرتی ہے اور پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک کو حرام ٹھہراتا ہے۔ اور قوموں کے سر پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جس کے نیچے وہ دبی ہوئی تھیں اور ان گردنوں کے طوقوں سے وہ رہائی بخشتا ہے جن کی وجہ سے گردنیں سیدھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے۔ اور اپنی شمولیت کے ساتھ اس کو قوت دیں گے اور اس کی مدد کریں گے۔ اور اس نور کی پیروی کریں گے جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہ دنیا اور آخرت کی مشکلات سے نجات پائیں گے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۲۰)

وہ وہی لوگ ہیں جو اس رسول نبی پر ایمان لاتے ہیں کہ جس میں ہماری قدرت کاملہ کی دو نشانیاں ہیں ایک تو بیرونی نشانی کہ توریت اور انجیل میں اس کی نسبت پیشین گوئیاں موجود ہیں جن کو وہ آپ بھی اپنی کتابوں میں موجود پاتے ہیں دوسری وہ نشانی کہ خود اس نبی کی ذات میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ باوجود امی اور ناخواندہ ہونے کے ایسی ہدایت کامل لایا ہے کہ ہر ایک قسم کی حقیقی صداقتیں جن کی سچائی کو عقل و شرع شناخت کرتی ہے اور جو صفحہء دنیا پر باقی نہیں رہی تھیں لوگوں کی ہدایت کے لیے بیان فرماتا ہے اور ان کو اس کے بجالانے کے لیے حکم کرتا ہے اور ہر ایک نامعقول بات سے کہ جس کی سچائی سے عقل و شرع انکار کرتی ہے منع کرتا ہے اور پاک چیزوں کو پاک اور پلید چیزوں کو پلید ٹھہراتا ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں کے سر پر سے وہ بھاری بوجھ اتارتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے تھے اور جن طوقوں میں وہ گرفتار تھے ان سے خلاصی بخشتا

ہے سو جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کو قوت دیں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کی بکلی متابعت اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ وہی لوگ نجات یافتہ ہیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۶۳، ۵۶۶)

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۖ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَ  
الْأَرْضِ ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي  
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَتِهِ ۗ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۶﴾

یہ سو اس کہ خدا نے اپنی کتاب امیوں اور بدوؤں کے لیے بھیجی ہے (ان کی سمجھ کے موافق چاہیے) ٹھیک نہیں ہے۔ اول تو اس میں یہ جھوٹ ہے کہ وہ کلام نرا امیوں کی تعلیم کے لیے نازل ہوا ہے خدا نے تو آپ ہی فرما دیا ہے کہ تمام دنیا اور مختلف طبائع کی اصلاح کے لیے یہ کتاب نازل ہوئی ہے جیسے امی اس کتاب میں مخاطب ہیں ایسے ہی عیسائی اور یہودی اور مجوسی اور صابئین اور لامذہب اور دہریہ وغیرہ تمام فرقے مخاطب ہیں اور سب کے خیالات فاسدہ کا اس میں رد موجود ہے اور سب کو سنایا گیا ہے: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ الجز ونمبر ۹ پھر جبکہ ثابت ہے کہ قرآن شریف کو تمام دنیا کے طبائع سے کام پڑا تو تم خود ہی سوچو کہ اس صورت میں لازم تھا یا نہیں کہ وہ ہر ایک طور کی طبیعت پر اپنی عظمت اور حقانیت کو ظاہر کرتا اور ہر ایک طور کے شبہات کو مٹاتا۔ ماسوا اس کے اگرچہ اس کلام میں امی بھی مخاطب ہیں مگر یہ تو نہیں کہ خدا امیوں کو امی ہی رکھنا چاہتا تھا بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ جو طاقنتیں انسانیت اور عقل کی ان کی فطرت میں موجود ہیں وہ مکمن قوت سے چیز فعل میں آجائیں۔ اگر نادان کو ہمیشہ کے نادان ہی رکھنا ہے تو پھر تعلیم کا کیا فائدہ ہوا خدا نے تو علم اور حکمت کی طرف آپ ہی رغبت دے دی ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۴۹۳ تا ۴۹۸)

لوگوں کو کہہ دے کہ میں خدا کی طرف سے تم سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ وہ خدا جو بلا شرکت الغیری آسمان اور زمین کا مالک ہے جس کے سوا اور کوئی خدا اور قابل پرستش نہیں۔ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے پس اس خدا پر اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہے ایمان لاؤ۔ وہ نبی جو اللہ اور اس کے کلموں پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو تا تم ہدایت پاؤ۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۶۶، ۵۶۷)

یہ ہرگز سچ نہیں کہ جو کچھ قرآن کریم کے معارف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ان سے زیادہ قرآن کریم میں کچھ بھی نہیں۔ یہ اقوال ہمارے مخالفوں کے صاف دلائل کر رہے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی غیر محدودہ عظمتوں اور خوبیوں پر ایمان نہیں لاتے اور ان کا یہ کہنا کہ قرآن کریم ایسوں کے لیے اترا ہے جو امی تھے اور بھی اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ وہ قرآن شناسی کی بصیرت سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محض امیوں کے لیے نہیں بھیجے گئے بلکہ ہر ایک رتبہ اور طبقہ کے انسان ان کی امت میں داخل ہیں اللہ جل شانہ فرماتا ہے: **قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا**۔ پس اس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن کریم ہر ایک استعداد کی تکمیل کے لیے نازل ہوا ہے اور درحقیقت آیت: **وَلَكِنَّ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ** (الاحزاب: ۴۱) میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(کرامات الصادقین، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۶۱)

وہ قانون جو عام عدل اور احسان اور ہمدردی کے لیے دنیا میں آیا وہ صرف قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا**۔ یعنی کہہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول کر کے بھیجا گیا ہوں۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۷۱-۳)

**قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا** (الجزو نمبر ۹)۔ لوگوں کو کہہ دے کہ میں تم سب کی طرف پیغمبر ہو کر آیا ہوں۔ (نور القرآن نمبر روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۳۳۴)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں نہیں کہا کہ میں صرف عرب کے لیے بھیجا گیا ہوں بلکہ قرآن شریف میں یہ ہے: **قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا** یعنی لوگوں سے کہہ دے کہ میں تمام دنیا کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ (پیغام صلح، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۶۹-۴)

قرآن شریف میں یہ نہیں لکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف قریش کے لیے بھیجے گئے ہیں بلکہ لکھا ہے کہ وہ تمام دنیا کے لیے بھیجے گئے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے: **قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا** یعنی لوگوں کو کہہ دے کہ میں تمام دنیا کے لیے بھیجا گیا ہوں نہ صرف ایک قوم کے لیے ہوں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۸۷، ۸۸-۳)

اے تمام انسانو! جو زمین پر رہتے ہو۔ میں سب کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں نہ کسی خاص قوم کی طرف اور سب کی ہمدردی میرا مقصد ہے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۹۵-۳)

اس وقت کے تمام مخالف مولویوں کو ضروریہ بات ماننی پڑے گی کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے اور آپ کی شریعت تمام دنیا کے لئے عام تھی اور آپ کی نسبت فرمایا گیا تھا: **وَلَكِنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَخَاتَمَهُ الدِّيْنِ** (الاحزاب: ۴۱) اور نیز آپ کو یہ خطاب عطا ہوا تھا: **قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا** سو اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد حیات میں وہ تمام متفرق ہدایتیں جو حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ تک تھیں قرآن شریف میں جمع کی گئیں لیکن مضمون آیت: **قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عملی طور پر پورا نہیں ہو سکا کیونکہ کامل اشاعت اس پر موقوف تھی کہ تمام ممالک مختلفہ یعنی ایشیا اور یورپ اور افریقہ اور امریکہ اور آبادی دنیا کے انتہائی گوشوں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی تبلیغ قرآن ہو جاتی اور یہ اس وقت غیر ممکن تھا بلکہ اس وقت تک تو دنیا کی کئی آبادیوں کا ابھی پتہ بھی نہیں لگا تھا اور دور دراز سفروں کے ذرائع ایسے مشکل تھے کہ گویا معدوم تھے۔ بلکہ اگر وہ ساٹھ برس الگ کر دیئے جائیں جو اس عاجز کی عمر کے ہیں تو ۱۲۵ ہجری تک بھی اشاعت کے وسائل کاملہ گویا کالعدم تھے اور اس زمانہ تک امریکہ کل اور یورپ کا اکثر حصہ قرآنی تبلیغ اور اس کے دلائل سے بے نصیب رہا ہوا تھا بلکہ دُور دُور ملکوں کے گوشوں میں تو ایسی بے خبری تھی کہ گویا وہ لوگ اسلام کے نام سے بھی ناواقف تھے غرض آیت موصوفہ بالا میں جو فرمایا گیا تھا کہ اے زمین کے باشندو! میں تم سب کی طرف رسول ہوں عملی طور پر اس آیت کے مطابق تمام دنیا کو ان دنوں سے پہلے ہرگز تبلیغ نہیں ہو سکی اور نہ اتمام حجت ہوا کیونکہ وسائل اشاعت موجود نہیں تھے اور نیز زبانوں کی اجنبیت سخت روک تھی اور نیز یہ کہ دلائل حقانیت اسلام کی واقفیت اس پر موقوف تھی کہ اسلامی ہدایتیں غیر زبانوں میں ترجمہ ہوں اور یا وہ لوگ خود اسلام کی زبان سے واقفیت پیدا کر لیں اور یہ دنوں امر اس وقت غیر ممکن تھے لیکن قرآن شریف کا یہ فرمانا کہ: **وَمَنْ بَلَغْ (الانعام: ۲۰۰)** یہ امید دلاتا تھا کہ ابھی اور بہت سے لوگ ہیں جو ابھی تبلیغ قرآنی اُن تک نہیں پہنچی۔ ایسا ہی آیت: **وَ اٰخِرِيْنَ مِنْهُمْ لَبَّآ يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعة: ۴)** اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہدایت کا ذخیرہ کامل ہو گیا مگر ابھی اشاعت ناقص ہے اور اس آیت میں جو **مِنْهُمْ** کا لفظ ہے وہ ظاہر کر رہا تھا کہ ایک شخص اس زمانہ میں جو تکمیل اشاعت کے لئے موزوں ہے مبعوث ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں ہوگا اور اس کے دوست مخلص صحابہ کے رنگ میں ہوں گے۔ ..... اس وقت حسب منطوق آیت: **وَ اٰخِرِيْنَ مِنْهُمْ لَبَّآ يَلْحَقُوْا بِهِمْ** اور نیز حسب منطوق

آیت: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے بعثت کی ضرورت ہوئی اور ان تمام خادموں نے جو ریل اور تار اور آگن بوٹ اور مطابع اور احسن انتظام ڈاک اور باہمی زبانوں کا علم اور خاص کر ملک ہند میں اردو نے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک زبان مشترک ہو گئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بزبان حال درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تمام خدام حاضر ہیں اور فرض اشاعت پورا کرنے کیلئے بدل و جان سرگرم ہیں۔ آپ تشریف لائے اور اس اپنے فرض کو پورا کیجیے کیونکہ آپ کا دعویٰ ہے کہ میں تمام کا فہناس کیلئے آیا ہوں اور اب یہ وہ وقت ہے کہ آپ اُن تمام قوموں کو جو زمین پر رہتی ہیں قرآنی تبلیغ کر سکتے ہیں اور اشاعت کو کمال تک پہنچا سکتے ہیں اور تمام حجت کے لئے تمام لوگوں میں دلائل حقانیت قرآن پھیلا سکتے ہیں تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت نے جواب دیا کہ دیکھو میں بروز کے طور پر آتا ہوں \* مگر میں ملک ہند میں آؤں گا کیونکہ جوش مذاہب و اجتماع جمیع ادیان اور مقابلہ جمیع ملل و نحل اور امن اور آزادی اسی جگہ ہے اور نیز آدم علیہ السلام اسی جگہ نازل ہوا تھا۔ پس ختم دور زمانہ کے وقت بھی وہ جو آدم کے رنگ میں آتا ہے اسی ملک میں اس کو آنا چاہئے تا آخر اور اول کا ایک ہی جگہ اجتماع ہو کر دائرہ پورا ہو جائے۔ (تحفہ گولڈویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۲۶۰ تا ۲۶۳)

قرآن کا مقصد تھا وحشیانہ حالت سے انسان بنانا، انسانی آداب سے مہذب انسان بنانا، تا شرعی حدود اور احکام کے ساتھ مرحلہ طے ہو، اور پھر با خدا انسان بنانا۔ یہ لفظ مختصر ہیں مگر ان کے ہزار ہا شعبے ہیں۔ چونکہ یہودیوں، طبعیوں، آتش پرستوں اور مختلف اقوام میں روشنی کی روح کام کر رہی تھی۔ اس لیے

★ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا فرض منصبی جو تکمیل اشاعت ہدایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بوجہ عدم وسائل اشاعت غیر ممکن تھا اس لئے قرآن شریف کی آیت: **وَآخِرِينَ مِنْهُمْ لَبَّأً يَأْتِ حَقُّوَابِهِمْ** (الجمعة: ۴) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ثانی کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اس وعدہ کی ضرورت اسی وجہ سے پیدا ہوئی کہ تا دوسرا فرض منصبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یعنی تکمیل اشاعت ہدایت دین جو آپ کے ہاتھ سے پورا ہونا چاہئے تھا اُس وقت باعث عدم وسائل پورا نہیں ہوا سو اس فرض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آمد ثانی سے جو بروزی رنگ میں تھی ایسے زمانہ میں پورا کیا جبکہ زمین کی تمام قوموں تک اسلام پہنچانے کیلئے وسائل پیدا ہو گئے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باعلام الہی سب کو مخاطب کر کے کہا: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا۔ اس لیے ضروری تھا کہ قرآن شریف ان تمام تعلیمات کا جامع ہوتا جو وقتاً فوقتاً جاری رہ چکی تھیں اور ان تمام صدقاتوں کو اپنے اندر رکھتا جو آسمان سے مختلف اوقات میں مختلف نبیوں کے ذریعہ زمین کے باشندوں کو پہنچائی گئی تھیں۔ قرآن کریم کے مد نظر تمام نوع انسان تھانہ کوئی خاص قوم اور ملک اور زمانہ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۶)

قرآن شریف کے دوسرے مقامات پر غور کرنے سے پتہ لگا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اُمّی فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے آپ کا کوئی استاد نہ تھا مگر بایں ہمہ کہ آپ اُمّی تھے۔ حضور کے دین میں اُمّیُّوْنَ اوسط درجہ کے آدمیوں کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے فلاسفوں اور عالموں کو بھی کر دیا۔ جس سے قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا کے معنی نہایت ہی لطیف طور پر سمجھ میں آسکتے ہیں جَبِيْعًا کے دو معنی ہیں اول تمام بنی نوع انسان یا تمام مخلوق، دوم تمام طبقہ کے آدمیوں کے لیے یعنی متوسط ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کے فلاسفوں اور ہر ایک قسم کی عقل رکھنے والوں کے لیے۔ غرض ہر عقل اور ہر مزاج کا آدمی مجھ سے تعلق کر سکتا ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴)

ایک شخص جو کل دنیا کی اصلاح کے لیے آنے والا تھا کب ہو سکتا تھا کہ وہ ایک معمولی انسان ہوتا! جس قدر انبیاء علیہم السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آئے وہ سب ایک ایک خاص قوم کے لیے آئے تھے اس لیے کہ ان کی شریعت مختص القوم اور مختص الزمان تھی مگر ہمارے نبی وہ عظیم الشان نبی ہیں جن کے لیے حکم ہوا کہ: مَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۸)۔ اور قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا۔ اس لیے جس قدر عظمتیں آپ کی بیان ہوئی ہیں مصلحت الہیہ کا بھی یہی تقاضا تھا کیونکہ جس پر ختم نبوت ہونا تھا اگر وہ اپنے کمالات میں کوئی کمی رکھتا تو پھر وہی کمی آئندہ اُمت میں رہتی کیونکہ جس قدر کمالات اللہ تعالیٰ کسی نبی میں پیدا کرتا ہے اسی قدر اسی کی اُمت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جس قدر کمزور تعلیم وہ لاتا ہے اتنا ہی ضعف اس کی اُمت میں نمودار ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمت و استعداد اور عزم کا دائرہ چونکہ بہت ہی وسیع تھا اس لیے آپ کو جو کلام ملا وہ بھی اس پایہ اور رتبہ کا ہے کہ دوسرا کوئی شخص اس ہمت اور حوصلہ کا کبھی پیدا نہ ہوگا کیونکہ آپ کی دعوت کسی محدود وقت یا مخصوص قوم کے لیے نہ تھی جیسے آپ سے پہلے نبیوں کی ہوتی تھی بلکہ آپ کے لیے فرمایا

گیا: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا أَوْ مِمَّا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۸) جس شخص کی بعثت اور رسالت کا دائرہ اس قدر وسیع ہو اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

عادت اللہ اسی طرح پر ہے زمانہ ترقی کرتا ہے آخر وہ زمانہ آ گیا جو خاتم النبیین کا زمانہ تھا جو ایک ہی شخص تھا جس نے یہ کہا: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا کہنے کو تو یہ چند لفظ ہیں اور ایک اندھا کہہ سکتا ہے کہ معمولی بات ہے مگر جو دل رکھتا ہے وہ سمجھتا ہے اور جو کان رکھتا ہے وہ سنتا ہے جو آنکھیں رکھتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ یہ الفاظ معمولی الفاظ نہیں ہیں میں کہتا ہوں اگر یہ معمولی لفظ تھے تو بتلاؤ کہ موسیٰ علیہ السلام کو یا مسیح علیہ السلام یا کسی نبی کو بھی یہ طاقت کیوں نہ ہوئی کہ وہ یہ لفظ کہہ دیتا۔ اصل یہی ہے جس کو یہ قوت یہ منصب نہیں ملا وہ کیوں کر کہہ سکتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ کسی نبی کو یہ شوکت یہ جلال نہ ملا جو ہمارے نبی کریم کو ملا۔ بکری کو اگر ہر روز گوشت کھلاؤ تو وہ گوشت کھانے سے شیر نہ بن سکے گی شیر کا بچہ ہی شیر ہوگا۔ پس یاد رکھو یہی بات سچ ہے کہ اس نام کا مستحق اور واقعی حقدار ایک تھا جو محمدؐ کہلایا۔ یہ داد الہی ہے جس کے دل و دماغ میں چاہے یہ قوتیں رکھ دیتی ہے۔ اور خدا خوب جانتا ہے کہ ان قوتوں کا مکمل اور موقع کون ہے ہر ایک کا کام نہیں کہ اس راز کو سمجھ سکے اور ہر ایک کے منہ میں وہ زبان نہیں جو یہ کہہ سکے کہ: إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا جب تک روح القدس کی خاص تائید نہ ہو یہ کام نہیں نکل سکتا۔ رسول اللہ میں وہ ساری قوتیں اور طاقتیں رکھی گئی تھیں جو محمدؐ بنا دیتی ہیں تاکہ بالقوہ باتیں بالفعل میں بھی آجائیں اس لیے آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ: إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا۔

ایک قوم کے ساتھ جو مشقت کرنی پڑتی ہے تو کس قدر مشکلات پیش آتی ہیں ایک خدمتگار شریر ہو تو اس کا درست کرنا مشکل ہو جاتا ہے آخر تنگ اور عاجز آ کر اس کو بھی نکال دیتا ہے لیکن وہ کس قدر قابل تعریف ہوگا جو اسے درست کر لے اور پھر وہ تو بڑا ہی مرد میدان ہے جو اپنی قوم کو درست کر سکے حالانکہ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں مگر وہ جو مختلف قوموں کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا سوچو تو سہی کس قدر کامل اور زبردست قومی کا مالک ہوگا..... اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کی طرف غور کرو تو پھر کیسا روشن طور پر معلوم ہوگا کہ آپ ہی اس قابل تھے کہ محمدؐ نام سے موسوم ہوتے اور اس دعویٰ کو جیسا کہ زبان سے کیا گیا تھا کہ: إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا اپنے عمل سے بھی کر کے دکھاتے چنانچہ وہ وقت آ گیا کہ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ

وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (النصر: ۲، ۳)۔ اس میں اس امر کی طرف صریح اشارہ ہے کہ آپ اس وقت دنیا میں آئے جب دین اللہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا اور عالمگیر تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور گئے اس وقت کہ جبکہ اس نظارہ کو دیکھ لیا کہ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (النصر: ۳)۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

جب دل میں پاکیزگی اور طہارت پیدا ہوتی ہے تو اس میں ترقی کے لیے ایک خاص طاقت اور قوت پیدا ہو جاتی ہے پھر اس کے لیے ہر قسم کے سامان مہیا ہو جاتے ہیں اور وہ ترقی کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ بالکل اکیلے تھے اور اس بیکسی کی حالت میں دعویٰ کرتے ہیں: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا۔ کون اس وقت خیال کر سکتا تھا کہ یہ دعویٰ ایسے بے یار و مددگار شخص کا بار آور ہوگا پھر ساتھ ہی اس قدر مشکلات آپ کو پیش آئے کہ ہمیں تو ان کا ہزارواں حصہ بھی نہیں آئے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۰)

قرآن شریف نے ہی کھلے طور پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کے لیے آیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا۔ یعنی تمام لوگوں کو کہہ دے کہ میں تم سب کے لیے رسول ہو کر آیا ہوں اور پھر فرماتا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۸) یعنی میں نے تمام عالموں کے لیے تجھے رحمت کر کے بھیجا ہے اور پھر فرماتا ہے: لِيَكُونَ لِّلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان: ۲) یعنی ہم نے اس لیے بھیجا ہے کہ تمام دنیا کو ڈراوے لیکن ہم بڑے زور سے کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے پہلے دنیا کی کسی الہامی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہر ایک نے اپنی رسالت کو اپنی قوم تک ہی محدود رکھا یہاں تک کہ جس نبی کو عیسائیوں نے خدا قرار دیا اس کے منہ سے بھی یہی نکلا کہ ”میں اسرائیل کی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا“ اور زمانہ کے حالات نے بھی گواہی دی کہ قرآن شریف کا یہ دعویٰ تبلیغ عام کا عین موقعہ پر ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت تبلیغ عام کا دروازہ کھل گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے بعد نزول اس آیت کے کہ: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيْعًا۔ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کی طرف دعوت اسلام کے خط لکھے تھے کسی اور نبی نے غیر قوموں کے بادشاہوں کی طرف دعوت دین کے ہرگز خط نہیں لکھے کیونکہ وہ دوسری قوموں کی دعوت کے لیے مامور نہ تھے۔ یہ عام دعوت کی تحریک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ

سے ہی شروع ہوئی اور مسیح موعود کے زمانہ میں اس کے ہاتھ سے کمال تک پہنچی۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۷۶، ۷۷)

نہ حضرت عیسیٰ نے اور نہ حضرت موسیٰ نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ وہ تمام دنیا کے واسطے رسول ہو کر آئے تھے بلکہ وہ تو صرف اسرائیلی بھٹیروں تک ہی اپنی تعلیم محدود کرتے ہیں ان کا اپنا اقرار موجود ہے۔ پس بلحاظ ضرورت کے ان کو جو کتاب ملی وہ بھی ایک قانون مختص الزمان اور مختص القوم تھا۔

اب ظاہر ہے کہ ایک چیز جو ایک خاص ضرورت کے لیے ایک خاص زمانے اور مکان کے واسطے آئی تھی، اس کو زبردستی اور خواہ نخواہ تمام دنیا پر محیط ہونے کے واسطے کھینچ تان کی جائے گی تو اس کا لازماً یہی نتیجہ ہوگا کہ وہ اس کام سے عاری رہے گی۔ اور اس بوجھ کے اٹھانے کے واسطے وہ وضع ہی نہیں کی گئی اس کی کیسے متحمل ہو سکے گی؟ اور یہی وجہ ہے کہ ان تعلیمات میں موجودہ زمانہ کے حالات کے ماتحت نقص ہیں مگر قرآن مجید مختص الزمان نہیں، مختص القوم نہیں اور نہ ہی مختص مکان ہے بلکہ اس کامل اور مکمل کتاب کے لانے والے کا دعویٰ ہے کہ: **إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيعًا** اور ایک دوسری آیت میں یوں بھی آیا ہے: **لَا تَنْزِلُكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ** (ہود: ۵۶) یعنی لازمی ہوگا کہ جس کو قرآنی تعلیم پہنچے وہ خواہ کہیں بھی ہو اور کوئی بھی ہو اس تعلیم کی پیروی کو اپنی گردن پر اٹھائے۔

(رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے) ”جیسے یہ دعویٰ کیا تھا کہ: **إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيعًا** اس دعویٰ کے مناسب حال یہ ضروری تھا کہ کل دنیا کے مکروم کا یہ متفق طور پر آپ کی مخالفت میں کیے جاتے۔ آپ نے کس حوصلہ اور دلیری کے ساتھ مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا کہ **فَكَيْدٌ وَنِي جَبِيعًا** (ہود: ۵۶) یعنی کوئی دقیقہ مکر کا باقی نہ رکھو سارے فریب مکر استعمال کرو قتل کے منصوبے کرو اور قید کی تدبیریں کرو مگر یاد رکھو: **سَيَهْزَمُ الْجَبِيعُ وَيَوْلُونَ الدُّبُرَ** (القہر: ۲۶) آخر فتح میری ہے تمہارے سارے منصوبے خاک میں مل جاویں گے تمہاری ساری جماعتیں منتشر اور پراگندہ ہو جاویں گی اور پیٹھ دے نکلیں گی جیسے وہ عظیم الشان دعویٰ: **إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِيعًا** کسی نے نہیں کیا اور جیسے: **فَكَيْدٌ وَنِي جَبِيعًا** کہنے کو کسی کی ہمت نہ ہوئی یہ بھی کسی کے منہ سے نہ نکلا **سَيَهْزَمُ الْجَبِيعُ وَيَوْلُونَ الدُّبُرَ**۔“ یہ الفاظ اسی منہ سے نکلے جو خدا تعالیٰ کے سائے کے نیچے

لے بدر سے: چنانچہ حضرت عیسیٰ نے خود کہا کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھٹیروں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا قرآن مجید سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے: **رَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ** (آل عمران: ۵۰)۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

الوہیت کی چادر میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)  
یعنی آپ تمام جہان کے رسول ہیں۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

وَ اِذْ تَاذَنَ رَبُّكَ لِيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۗ وَاِنَّكَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۳۷﴾

خدا نے یہود کے لئے ہمیشہ کے لئے یہ وعدہ کیا ہے کہ ایسے بادشاہ اُن پر مقرر کرتا رہے گا جو انواع و اقسام کے عذاب ان کو دیتے رہیں گے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑی وجہ یہود کے مغضوب علیہم ہونے کی یہی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سخت ایذا دی، اُن کی تکفیر کی، اُن کی تفسیق کی، اُن کی توہین کی، اُن کو مصلوب قرار دیا تا وہ نعوذ باللہ! لعنتی قرار دیئے جائیں اور ان کو اس حد تک دکھ دیا کہ حسب منطق آیت: وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا (النساء: ۱۵۷) اُن کی ماں پر بھی سخت بہتان لگایا۔ غرض جس قدر ایذا کی قسمیں ہو سکتی ہیں کہ تکذیب کرنا، گالیاں دینا اور افترا کے طور پر کئی تہمتیں لگانا اور کفر کا فتویٰ دینا اور ان کی جماعت کو متفرق کرنے کے لئے کوشش کرنا اور حکام کے حضور میں ان کی نسبت جھوٹی خبریاں کرنا اور کوئی دقیقہ توہین کا نہ چھوڑنا اور بالآخر قتل کیلئے آمادہ ہونا یہ سب کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہود بد قسمت سے ظہور میں آیا اور آیت: وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (ال عمران: ۵۶) کو غور سے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آیت: صُورَتٌ عَلَيْهِمُ الدَّلَالَةُ وَ الْمَسْكَنَةُ (البقرة: ۶۲) کی سزا بھی حضرت مسیح کی ایذا کی وجہ سے ہی یہود کو دی گئی ہے۔ کیونکہ آیت موصوفہ بالا میں یہود کے لئے یہ دائمی وعید ہے کہ وہ ہمیشہ محکومیت میں جو ہر ایک عذاب اور ذلت کی جڑ ہے زندگی بسر کریں گے جیسا کہ اب بھی یہود کی ذلت کے حالات کو دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب تک خدا تعالیٰ کا وہ غصہ نہیں اُتر ا جو اُس وقت بھڑکا تھا جبکہ اُس وجہی نبی کو گرفتار کرنا مصلوب کرنے کے لئے کھوپری کے مقام پر لے گئے تھے اور جہاں تک بس چلا تھا ہر ایک قسم کی ذلت پہنچائی تھی اور کوشش کی گئی تھی کہ وہ مصلوب ہو کر توریہ کی نصوص صریحہ کے رُو سے ملعون سمجھا جائے اور اُس کا نام اُن میں لکھا جائے جو مرنے کے بعد تحت الثریٰ کی طرف جاتے ہیں اور خدا کی طرف اُن کا رُفیع نہیں ہوتا۔ (تحفہ گوڑویہ، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۱۹۷-۲۰۰)

وَالَّذِينَ يَمْسُكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نَضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ﴿۷۱﴾

اور جو لوگ محکم پکڑتے ہی کتاب کو اور نماز کو قائم کرتے ہیں ان کے ہم اجر ضائع نہیں کرتے۔

(برائین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۰ پیغام صلح، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۷۸)

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ  
أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۗ شَهِدْنَا ۗ أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ  
هَذَا غَافِلِينَ ﴿۷۲﴾

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ۔ الجزء نمبر ۹ ہر ایک روح نے ربوبیت الہیہ کا اقرار کیا۔ کسی نے انکار نہ کیا۔ یہ بھی فطرتی اقرار کی طرف اشارہ ہے۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

ایسی چیز جو مظہر جمیع عجائبات صنعت الہی ہے مصنوع اور مخلوق ہونے سے باہر نہیں رہ سکتی بلکہ وہ سب چیزوں سے اول درجہ پر مصنوعیت کی مہر اپنے وجود پر رکھتی ہے اور سب سے زیادہ تر اور کامل تر صانع قدیم کے وجود پر دلالت کرتی ہے سو اس دلیل سے روحوں کی مخلوقیت صرف نظری طور پر ثابت نہیں بلکہ درحقیقت اجلی بدیہات ہے۔ ماسوا اس کے دوسری چیزوں کو اپنی مخلوقیت کا علم نہیں مگر روحوں فطرتی طور پر اپنی مخلوقیت کا علم رکھتی ہیں۔ ایک جنگلی آدمی کی روح بھی اس بات پر راضی نہیں ہو سکتی کہ وہ خود بخود ہے، اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ یعنی روحوں سے میں نے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب (پیدا کنندہ) نہیں ہوں تو انہوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں یہ سوال وجواب حقیقت میں اس بیوند کی طرف اشارہ ہے جو مخلوق کو اپنے خالق سے قدرتی طور پر متحقق ہے جس کی شہادت روحوں کی فطرت میں نقش کی گئی ہے۔

(سمرہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۱۶۸)

اس مذہب کی خدا شناسی نہایت صاف صاف اور انسانی فطرت کے مطابق ہے اگر تمام مذہبوں کی کتابیں نابود ہو کر ان کے سارے تعلیمی خیالات اور تصورات بھی محو ہو جائیں تب بھی وہ خدا جس کی طرف قرآن رہنمائی کرتا ہے آئینہ قانون قدرت میں صاف صاف نظر آئے گا اور اس کی قدرت اور حکمت سے

بھری ہوئی صورت ہر ایک ذرہ میں چمکتی ہوئی دکھائی دے گی۔ غرض وہ خدا جس کا پتہ قرآن شریف بتلاتا ہے اپنی موجودات پر فقط قہری حکومت نہیں رکھتا بلکہ موافق آیت کریمہ: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۗ قَالُوا بَلٰی کے ہر ایک ذرہ ذرہ اپنی طبیعت اور روحانیت سے اس کا حکم بردار ہے۔ اس کی طرف جھکنے کے لئے ہر ایک طبیعت میں ایک کشش پائی جاتی ہے اس کشش سے ایک ذرہ بھی خالی نہیں اور یہ ایک بڑی دلیل اس بات پر ہے کہ وہ ہر ایک چیز کا خالق ہے کیونکہ نور قلب اس بات کو مانتا ہے کہ وہ کشش جو اس کی طرف جھکنے کیلئے تمام چیزوں میں پائی جاتی ہے وہ بلاشبہ اسی کی طرف سے ہے جیسا کہ قرآن شریف نے اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اِنَّ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا لَیْسَبِحُ بِحَمْدِہٖ (بنی اسرائیل: ۴۵) یعنی ہر ایک چیز اس کی پاکی اور اس کے محامد بیان کر رہی ہے اگر خدا ان چیزوں کا خالق نہیں تھا تو ان چیزوں میں خدا کی طرف کشش کیوں پائی جاتی ہے ایک غور کرنے والا انسان ضرور اس بات کو قبول کر لے گا کہ کسی مخفی تعلق کی وجہ سے یہ کشش ہے پس اگر وہ تعلق خدا کا خالق ہونا نہیں تو کوئی آریہ وغیرہ اس بات کا جواب دیں کہ اس تعلق کی وید وغیرہ میں کیا ماہیت لکھی ہے؟ اور اس کا کیا نام ہے؟ کیا یہی سچ ہے کہ خدا صرف زبردستی ہر ایک چیز پر حکومت کر رہا ہے اور ان چیزوں میں کوئی طبعی قوت اور شوق خدا تعالیٰ کی طرف جھکنے کا نہیں ہے؟ معاذ اللہ! ہرگز ایسا نہیں بلکہ ایسا خیال کرنا نہ صرف حماقت بلکہ پر لے درجہ کی خباثت بھی ہے مگر افسوس کہ آریوں کے وید نے خدا تعالیٰ کی خالقیت سے انکار کر کے اس روحانی تعلق کو قبول نہیں کیا جس پر طبعی اطاعت ہر ایک چیز کی موقوف ہے اور چونکہ دقیق معرفت اور دقیق گیان سے وہ ہزاروں کوس دور تھے لہذا یہ سچا فلسفہ ان سے پوشیدہ رہا ہے کہ ضرور تمام اجسام اور ارواح کو ایک فطرتی تعلق اس ذات قدیم سے پڑا ہوا ہے اور خدا کی حکومت صرف بناوٹ اور زبردستی کی حکومت نہیں بلکہ ہر ایک چیز اپنی روح سے اس کو سجدہ کر رہی ہے کیونکہ ذرہ ذرہ اس کے بے انتہا احسانوں میں مستغرق اور اس کے ہاتھ سے نکلا ہوا ہے۔

(ست پگن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۹۶، ۲۹۷)

ایک اور دلیل اپنی ہستی پر قرآن شریف میں پیش کرتا ہے: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۗ قَالُوا بَلٰی یعنی میں نے روجوں کو کہا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ قصہ کے رنگ میں روجوں کی اس خاصیت کو بیان فرماتا ہے جو ان کی فطرت میں اُس نے رکھی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی روح فطرت کی رو سے خدا تعالیٰ کا انکار نہیں کر سکتی۔ صرف منکروں کو اپنے خیال میں دلیل نہ ملنے کی وجہ سے انکار

ہے مگر باوجود اس انکار کے وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ ہر ایک حادث کے واسطے ضرور ایک محدث ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی نادان نہیں کہ اگر مثلاً بدن میں کوئی بیماری ظاہر ہو تو وہ اس بات پر اصرار کرے کہ در پردہ اس بیماری کے ظہور کی کوئی علت نہیں۔ اگر یہ سلسلہ دنیا کا علل اور معلول سے مربوط نہ ہوتا تو قبل از وقت یہ بتا دینا کہ فلاں تاریخ طوفان آئے گا یا آندھی آئے گی یا خسوف ہوگا یا کسوف ہوگا یا فلاں وقت بیمار جائے گا یا فلاں وقت تک ایک بیماری کے ساتھ فلاں بیماری لاحق ہو جائے گی۔ یہ تمام باتیں غیر ممکن ہو جائیں۔ پس ایسا محقق اگر چہ خدا کے وجود کا اقرار نہیں کرتا مگر ایک طور سے تو اس نے اقرار کر ہی دیا کہ وہ بھی ہماری طرح معلولات کے لئے علل کی تلاش میں ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا اقرار ہے اگرچہ کمال اقرار نہیں۔ ماسوا اس کے اگر کسی ترکیب سے ایک منکر وجود باری کو ایسے طور سے بے ہوش کیا جائے کہ وہ اس سفلی زندگی کے خیالات سے بالکل الگ ہو کر اور تمام ارادوں سے معطل رہ کر اعلیٰ ہستی کے قبضہ میں ہو جائے تو وہ اس صورت میں خدا کے وجود کا اقرار کرے گا۔ انکار نہیں کرے گا۔ جیسا کہ اس پر بڑے بڑے مجربین کا تجربہ شاہد ہے۔ سو ایسی حالت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اور مطلب آیت یہ ہے کہ انکار وجود باری صرف سفلی زندگی تک ہے ورنہ اصل فطرت میں اقرار بھرا ہوا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۷۱-۳)

نجات کا تمام مدار خدا تعالیٰ کی محبت ذاتیہ پر ہے اور محبت ذاتیہ اس محبت کا نام ہے جو روحوں کی فطرت میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مخلوق ہے۔ پھر جس حالت میں ارواح پر میشر کی مخلوق ہی نہیں ہیں تو پھر ان کی فطرتی محبت پر میشر سے کیوں کر ہو سکتی ہے اور کب اور کس وقت پر میشر نے ان کی فطرت کے اندر ہاتھ ڈال کر یہ محبت اس میں رکھ دی یہ تو غیر ممکن ہے۔ وجہ یہ کہ فطرتی محبت اُس محبت کا نام ہے جو فطرت کے ساتھ ہمیشہ سے لگی ہوئی ہو اور پیچھے سے لاحق نہ ہو جیسا کہ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ اس کا یہ قول ہے: **اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۗ قَالُوا بَلٰی لَیْسَ بِاِلٰہِ اِلَّا اللّٰہُ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا یُشْرکُونَ** یعنی میں نے روحوں سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا پیدا کنندہ نہیں ہوں تو روحوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ انسانی رُوح کی فطرت میں یہ شہادت موجود ہے کہ اس کا خدا پیدا کنندہ ہے پس رُوح کو اپنے پیدا کنندہ سے طبعاً و فطرتاً محبت ہے اس لئے کہ وہ اسی کی پیدائش ہے۔ (چشمہ مسیحی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۶۳، ۳۶۴)

انسانی رُوح میں بڑے بڑے عجیب و غریب خواص اور تغیرات رکھے گئے ہیں کہ وہ اجسام میں نہیں اور رُوحوں پر غور کر کے جلد تر انسان اپنے رب کی شناخت کر سکتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں بھی ہے کہ مَنْ

عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ یعنی جس نے اپنے نفس کو شناخت کر لیا اُس نے اپنے رب کو شناخت کر لیا۔ پھر ایک اور جگہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوا بَلٰی یعنی میں نے رُوحوں کو پوچھا کہ کیا میں تمہارا پیدا کرنے والا نہیں تو تمام رُوحوں نے یہی جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ رُوحوں کی فطرت میں یہی منقش اور مرکوز ہے کہ وہ اپنے پیدا کنندہ کی قائل ہیں اور پھر بعض انسان غفلت کی تاریکی میں پڑ کر اور پلید تعلیموں سے متاثر ہو کر کوئی دہریہ بن جاتا ہے اور کوئی آریہ اور اپنی فطرت کے مخالف اپنے پیدا کنندہ سے انکار کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے باپ اور ماں کی محبت رکھتا ہے یہاں تک کہ بعض بچے ماں کے مرنے کے بعد مر جاتے ہیں پھر اگر انسانی رُوحیں خدا کے ہاتھ سے نہیں نکلیں اور اس کی پیدا کردہ نہیں تو خدا کی محبت کا نمک کس نے اُن کی فطرت پر چھڑک دیا ہے اور کیوں انسان جب اُس کی آنکھ کھلتی ہے اور پردہ غفلت دُور ہوتا ہے تو دل اُس کا خدا کی طرف کھینچا جاتا ہے اور محبت الہی کا دریا اس کے صحن سینہ میں بہنے لگتا ہے آخر ان رُوحوں کا خدا سے کوئی رشتہ تو ہوتا ہے جو اُن کو محبت الہی میں دیوانہ کی طرح بنا دیتا ہے وہ خدا کی محبت میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ تمام چیزیں اس کی راہ میں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ عجیب تعلق ہے ایسا تعلق نہ ماں کا ہوتا ہے نہ باپ کا۔ پس اگر بقول آریوں کے رُوحیں خود بخود ہیں تو یہ تعلق کیوں پیدا ہو گیا اور کس نے یہ محبت اور عشق کی قوتیں خدا تعالیٰ کے ساتھ رُوحوں میں رکھ دیں یہ مقام سوچنے کا مقام ہے اور یہی مقام ایک سچی معرفت کی کنجی ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۶۶، ۱۶۷)

انسان تعبد ابدی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور طبعی طور پر اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موجود ہے پس اس وجہ سے انسان کی رُوح کو خدا تعالیٰ سے ایک تعلق ازلی ہے جیسا کہ آیت: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوا بَلٰی سے ظاہر ہوتا ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۰۰)

رُوحوں کے قوی جن میں خدا تعالیٰ کا عشق پیدا ہوا ہے بزبان حال گواہی دے رہے ہیں جو وہ خدا کے ہاتھ سے نکلے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۰)

انسان کی فطرت ہی میں اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوا بَلٰی نقش کیا گیا ہے۔ اور تثلیث سے کوئی مناسبت حیات انسانی اور تمام اشیائے عالم کو نہیں ایک قطرہ پانی کا دیکھو تو گول نکلتا ہے مثلث کی شکل میں نہیں نکلتا اس سے بھی صاف طور پر یہی پایا جاتا ہے کہ توحید کا نقش قدرت کی ہر چیز میں رکھا ہوا ہے خوب غور سے دیکھو کہ

پانی کا قطرہ گول ہوتا ہے اور کرومی شکل میں توحید ہی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وہ جہت کو نہیں چاہتی اور مثلث شکل جہت کو چاہتی ہے چنانچہ آگ کو دیکھو شکل بھی مخروطی ہے اور وہ بھی کرویت اپنے اندر رکھتی ہے اس سے بھی توحید کا نور چمکتا ہے۔ زمین کو لو اور انگریزوں ہی سے پوچھو کہ اس کی شکل کیسی ہے؟ کہیں گے گول! الغرض طبعی تحقیقاتیں جہاں تک ہوتی چلی جائیں گی وہاں توحید ہی توحید نکلتی چلی جائے گی۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۷۱)

(سوال پیش ہوا کہ جب ایک شخص نے ایک بات تحصیل کی ہے تو دوبارہ اسی کے تحصیل کرنے سے کیا

حاصل ہے؟ فرمایا)

ہم اس اصول کو لا نُسَلِّمُ کہتے ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ قرآن میں لکھا ہے: قَالَ اَلَسْتَ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلٰی یعنی جب روحوں سے خدا نے سوال کیا کہ میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو وہ بولیں کہ ہاں! تو اب سوال ہو سکتا ہے کہ روحوں کو علم تو تھا پھر انبیاء کو خدا نے کیوں بھیجا گیا تحصیل حاصل کرائی۔ یہ اصل میں غلط ہے۔ ایک تحصیل پھینکی ہوتی ہے ایک گاڑھی ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق ہوتا ہے وہ علم جو کہ نبیوں سے ملتا ہے اس کی تین اقسام ہیں: علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔ اس کی مثال یہ ہے جیسے ایک شخص دور سے دھواں دیکھے تو اسے علم ہوگا کہ وہاں آگ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جہاں آگ ہوتی ہے وہاں دھواں بھی ہوتا ہے اور ہر ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا علم ہے جس کا نام علم الیقین ہے۔ مگر اور نزدیک جا کر وہ اس آگ کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو اسے عین الیقین کہتے ہیں پھر اگر اپنا ہاتھ اس آگ پر کر کہ اس کی حرارت وغیرہ کو بھی دیکھ لیوے تو اسے کوئی شبہ اس کے بارے میں نہ رہے گا اور اس طرح سے جو علم اسے حاصل ہوگا اس کا نام حق الیقین ہوگا اب کیا ہم اسے تحصیل حاصل کہہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں!

(البدردجلد ۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۱۳)

خدا کے ساتھ تو انسان کا فطرتی تعلق ہے کیونکہ اس کی فطرت خدا تعالیٰ کے حضور میں اَلَسْتَ بِرَبِّكُمْ کے

جواب میں قَالُوا بَلٰی کا اقرار کر چکی ہوئی ہے۔

(البدردجلد ۲ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهَا اٰخَذَتْ اِلَى الْاَرْضِ وَاشْتَبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ  
كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ نَحِمْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرٰكُهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ

الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَاَقْصِصْ الْقِصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۴﴾

ابتدائی رویا یا الہام کے ذریعہ سے خدا بندہ کو بلانا چاہتا ہے مگر وہ اس کے واسطے کوئی حالت قابل تفتی نہیں ہوتی چنانچہ بلعم کو الہامات ہوتے تھے مگر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے کہ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ ثَابِت ہوتا ہے کہ اس کا رفع نہیں ہوا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور میں وہ کوئی برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ ابھی تک نہیں بنا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گر گیا۔ ان الہامات وغیرہ سے انسان کچھ بن نہیں سکتا۔ انسان خدا کا بن نہیں سکتا جب تک کہ ہزاروں موتیں اس پر نہ آویں اور بیضہ بشریت سے وہ نکل نہ آئے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۳۰ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۴)

نجات کامل خدا ہی کی طرف مرفوع ہو کر ہوتی ہے اور جس کا رفع نہ ہو وہ: أَخَذَكَ إِلَى الْأَرْضِ ہو جاتا ہے۔  
(الحکم جلد ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۷)

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ  
بِهَاءٍ وَ لَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَاءٍ وَ لَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَاءٍ ۗ أُولَٰئِكَ  
كَانُوا نَعَايِرٌ لِّمَنْ أَضَلَّ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿۱۵﴾

انسان اگر اللہ تعالیٰ کے لئے زندگی وقف نہیں کرتا تو وہ یاد رکھے کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہنم کو پیدا کیا ہے۔ اس آیت سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ بعض خام خیال کوتاہ فہم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ ہر ایک آدمی کو جہنم میں ضرور جانا ہوگا۔ یہ غلط ہے۔ ہاں! اس میں شک نہیں کہ تھوڑے ہیں جو جہنم کی سزا سے بالکل محفوظ ہیں اور یہ تعجب کی بات نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: قَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرُونَ (سبأ: ۱۴)۔

اب سمجھنا چاہیے کہ جہنم کیا چیز ہے؟ ایک جہنم تو وہ ہے جس کا مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وعدہ دیا ہے اور دوسرے یہ زندگی بھی اگر خدا تعالیٰ کے لیے نہ ہو تو جہنم ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے انسان کا تکلیف سے بچانے اور آرام دینے کے لیے متوتی نہیں ہوتا۔ یہ خیال مت کرو کہ کوئی ظاہری دولت یا حکومت یا مال و عزت اولاد کی کثرت کسی شخص کے لیے کوئی راحت یا اطمینان اور سکینت کا موجب ہو جاتی ہے اور وہ دم نقد بہشت میں

ہوتا ہے۔ ہرگز نہیں! وہ اطمینان اور وہ تسلی اور وہ تسکین جو بہشت کے انعامات میں سے ہے۔ ان باتوں سے نہیں ملتی وہ خدا ہی میں زندہ رہنے اور مرنے سے مل سکتی ہے جس کے لیے انبیاء علیہم السلام خصوصاً ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی بھی وصیت تھی کہ: لَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (البقرة: ۱۳۳)۔ لذات دنیا تو ایک قسم کی ناپاک حرص پیدا کر کے طلب اور پیاس کو بڑھا دیتی ہیں، استسقاء کے مریض کی طرح پیاس نہیں بجھتی یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ پس یہ بے جا آرزوؤں اور حسرتوں کی آگ بھی منجملہ اسی جہنم کی آگ کے ہے۔ جو انسان کے دل کو راحت اور قرار نہیں لینے دیتی بلکہ اس کو ایک تذبذب اور اضطراب میں غلطان بیچان رکھتا ہے اس لیے میرے دوستوں کی نظر سے یہ امر ہرگز پوشیدہ نہ رہے کہ انسان مال و دولت یا زین و فرزند کی محبت کے جوش اور نشے میں ایسا دیوانہ اور از خود درفتہ نہ ہو جاوے کہ اس میں اور خدا تعالیٰ میں ایک حجاب پیدا ہو جاوے مال اور اولاد اسی لیے توفتنہ کہلاتی ہے، ان سے بھی انسان کے لیے ایک دوزخ تیار ہوتا ہے اور جب وہ ان سے الگ کیا جاتا ہے تو سخت بے چینی اور گھبراہٹ ظاہر کرتا ہے اور اس طرح پر یہ بات کہ: نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْآفِئَةِ (الہمزہ: ۸، ۷)۔ منقولی رنگ میں نہیں رہتا بلکہ معقولی شکل اختیار کر لیتا ہے پس یہ آگ جو انسانی دل کو جلا کر کباب کر دیتی ہے اور ایک جملے ہوئے کو نکلے سے بھی سیاہ اور تار یک بنا دیتی ہے یہ وہی غیر اللہ کی محبت ہے۔

دو چیزوں کے باہم تعلق اور رگڑ سے ایک حرارت پیدا ہوتی ہے اسی طرح پر انسان کی محبت اور دنیا اور دنیا کی چیزوں کی محبت کی رگڑ سے الہی محبت جل جاتی ہے اور دل تار یک ہو کر خدا سے دور ہو جاتا اور ہر قسم کی بیقراری کا شکار ہو جاتا ہے لیکن جبکہ دنیا کی چیزوں سے جو تعلق ہو وہ خدا میں ہو کر ایک تعلق ہو اور ان کی محبت خدا کی محبت میں ہو کر ہو اس وقت باہمی رگڑ سے غیر اللہ کی محبت جل جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک روشنی اور نور بھر دیا جاتا ہے پھر خدا کی رضا اس کی رضا اور اس کی رضا خدا کی رضا کا منشاء ہو جاتا ہے اس حالت پر پہنچ کر خدا کی محبت اس کے لیے بمنزلہ جان ہوتی ہے اور جس طرح زندگی کے واسطے لوازم زندگی ہیں۔ اس کی زندگی کے واسطے خدا اور صرف خدا ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی خوشی اور راحت خدا ہی میں ہوتی ہے۔ پھر دنیا داروں کے نزدیک اگر اسے کوئی رنج اور کرب پہنچے تو پہنچے لیکن اصل یہی بات ہے کہ اس ہم و غم میں بھی وہ اطمینان اور سکینت سے الہی لذت لیتا ہے جو کسی دنیا دار کی نظر کے بڑے سے بڑے فارغ البال کو بھی نصیب نہیں۔

برخلاف اس کے جو کچھ حالت انسان کی ہے وہ جہنم ہے گویا خدا تعالیٰ کے سوا زندگی بسر کرنا یہ بھی جہنم ہے پھر حدیث شریف سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ تپ بھی حرارتِ جہنم ہی ہے، امراض اور مصائب جو مختلف قسم کے انسان کو لاحق حال ہوتے ہیں یہ بھی جہنم ہی کا نمونہ ہیں اور یہ اس لیے کہ تادوسرے عالم پر گواہ ہوں اور جزا و سزا کے مسئلے کی حقیقت پر دلیل ہوں اور کفارہ کے لغو مسئلہ کی تردید کریں۔ مثلاً جذام ہی کو دیکھو کہ اعضاء گر گئے ہیں اور رقیق مادہ اعضاء سے جاری ہے۔ آواز بیٹھ گئی ہے۔ ایک تو یہ بجائے خود جہنم ہے پھر لوگ نفرت کرتے ہیں اور چھوڑ جاتے ہیں۔ عزیز سے عزیز بیوی فرزند ماں باپ تک کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ بعض اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں بعض اور خطرناک امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پتھریاں ہو جاتی ہیں۔ اندر پیٹ میں رسولیاں ہو جاتی ہیں۔ یہ ساری بلائیں اس لیے انسان پر آتی ہیں کہ وہ خدا سے دور ہو کر زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے حضور شوخی اور گستاخی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی باتوں کی عزت اور پرواہ نہیں کرتا اس وقت ایک جہنم پیدا ہو جاتا ہے۔

اب میں پھر اصل مطلب کی طرف رجوع کر کے کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے جہنم کے لیے اکثر انسانوں اور جنوں کو پیدا کیا ہے اور پھر فرمایا کہ وہ جہنم انہوں نے خود ہی بنا لیا ہے ان کو جنت کی طرف بلایا جاتا ہے۔ پاک دل پاکیزگی سے باتیں سنتا ہے اور ناپاک خیال انسان اپنی کورانہ عقل پر عمل کر لیتا ہے پس آخرت کا جہنم بھی ہوگا اور دنیا کے جہنم سے بھی مخلصی اور رہائی نہ ہوگی کیونکہ دنیا کا جہنم تو اس جہنم کے لیے بطور دلیل اور ثبوت کے ہے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۷۶، ۷۷)

وہ لوگ جو صرف باپ دادے کی تقلید پر چلنے والے ہیں وہ دل تو رکھتے ہیں پر دلوں سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں بھی ہیں پر آنکھوں کو دیکھنے سے معطل چھوڑا ہوا ہے اور کان بھی رکھتے ہیں پر وہ بھی بیکار پڑے ہوئے ہیں یہ لوگ چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۹۰، ۹۱ حاشیہ نمبر ۵)

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ الْجَزُورِ ۙ يَعْنِي أَيْسَةَ هُنَّ جِيسَةَ چار پائے اور نور فطرتی ان کا اس قدر کم ہے کہ ان میں اور موبیشی میں کچھ تھوڑا ہی فرق ہے۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۸۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

وَاللَّهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا ۖ وَذُرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي

## اَسْمَاءِهِ طَسِيحُ جَزْوَنٍ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۷۸﴾

خدا کے تمام کامل نام اسی سے مخصوص ہیں اور ان میں شرکت غیر کی جائز نہیں سو خدا کو انہیں ناموں سے پکارو جو بلا شرکت غیر سے ہیں یعنی نہ مخلوقاتِ ارضی و سماوی کے نام خدا کے لیے وضع کرو اور نہ خدا کے نام مخلوق چیزوں پر اطلاق کرو اور ان لوگوں سے جدا ہو جو کہ خدا کے ناموں میں شرکتِ غیر جائز رکھتے ہیں۔ عنقریب وہ اپنے کاموں کا بدلہ پائیں گے۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد نمبر ۱ صفحہ ۵۲۲، ۵۲۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اَوْ لَمْ يَنْظُرُوا فِي مَكَلُوتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْ  
عَسٰى اَنْ يُّكُوْنَ قَدْ اَقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ؕ فَبِآيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ كٰيُومِ مَنُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

قرآن کریم کے بعد کس حدیث پر ایمان لاؤ گے اور ظاہر ہے کہ ہم مسلمانوں کے پاس وہ نص جو اول درجہ پر قطعی اور یقینی ہے قرآن کریم ہی ہے اکثر احادیث اگر صحیح بھی ہوں تو مفید ظن ہیں وَالظَّنُّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۵۳)

حسب آیت کریمہ فَبِآيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ كٰيُومِ مَنُوْنَ۔ اور بحسب آیت کریمہ فَبِآيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اَيْتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (الجماعیۃ: ۷) ہر ایک حدیث جو صریح آیت کے معارض پڑے رد کرنے کے لائق ہے اور آخری نصیحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تھی کہ تم نے تمسک بکتاب اللہ کرنا۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۱۰)

فَبِآيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اَيْتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ یعنی خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس حدیث پر ایمان لائیں گے۔ اس جگہ حدیث کے لفظ کی تکلیف جو فائدہ عموم کا دیتی ہے صاف بتلا رہی ہے کہ جو حدیث قرآن کے معارض اور مخالف پڑے اور کوئی راہ تطبیق کی پیدا نہ ہو۔ اس کو رد کر دو اور اس حدیث میں ایک پیشگوئی بھی ہے جو بطور اشارۃ النص اس آیت سے مترشح ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ آیت ممدوحہ میں اس بات کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ ایک ایسا زمانہ بھی اس اُمت پر آنے والا ہے کہ جب بعض افراد اس اُمت کے قرآن شریف کو چھوڑ کر ایسی حدیثوں پر بھی عمل کریں گے جن کے بیان کردہ بیان قرآن شریف کے بیانات سے مخالف اور معارض ہوں گے۔

(ریویو بر مباحثہ ثالوی و پکڑ الوی، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۰۷)

اللہ جل شانہ فرماتا ہے فَبِآيٍ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَآيَتِهِ يُؤْمِنُونَ (الجاثية: ۷) یعنی تم بعد اللہ اور اس کی آیات کے کس حدیث پر ایمان لاؤ گے؟ اس آیت میں صریح اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر قرآن کریم کسی امر کی نسبت قطعی اور یقینی فیصلہ دیوے یہاں تک کہ اس فیصلہ میں کسی طور سے شک باقی نہ رہ جاوے اور منشاء اچھی طرح سے کھل جائے تو پھر بعد اس کے کسی ایسی حدیث پر ایمان لانا جو صریح اس کے مخالف پڑی ہو مومن کا کام نہیں ہے۔ پھر فرماتا ہے: فَبِآيٍ حَدِيثٍ بَعْدَ كَايُومِنُونَ ان دونوں آیتوں کے ایک ہی معنی ہیں اس لئے اس جگہ تصریح کی ضرورت نہیں۔ سو آیات متذکرہ بالا کے رو سے ہر ایک مومن کا یہ ہی مذہب ہونا چاہئے کہ وہ کتاب اللہ کو بلا شرط اور حدیث کو شرطی طور پر حجت شرعی قرار دیوے اور یہی میرا مذہب ہے۔

..... جو امر قول یا فعل یا تقریر کے طور پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم اس امر کو بھی اسی حکم سے آزما لیں گے اور دیکھیں گے کہ حسب آیت شریفہ: فَبِآيٍ حَدِيثٍ بَعْدَ كَايُومِنُونَ وہ حدیث قولی یا فعلی قرآن کریم کی کسی صریح اور بین آیت سے مخالف تو نہیں۔ اگر مخالف نہیں ہوگی تو ہم بسر و چشم اس کو قبول کریں گے اور اگر بظاہر مخالف نظر آئے گی تو ہم حتی الوسع اس کی تطبیق اور توفیق کیلئے کوشش کریں گے اور اگر ہم باوجود پوری پوری کوشش کے اس امر تطبیق میں ناکام رہیں گے اور صاف صاف کھلے طور پر ہمیں مخالف معلوم ہوگی تو ہم افسوس کے ساتھ اس حدیث کو ترک کر دیں گے کیونکہ حدیث کا پایہ قرآن کریم کے پایہ اور مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ قرآن کریم وحی متلو ہے اور اس کے جمع کرنے اور محفوظ رکھنے میں وہ اہتمام بلوغ کیا گیا ہے کہ احادیث کے اہتمام کو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ اکثر احادیث غایت درجہ مفید ظن ہیں اور ظنی نتیجہ کی منج ہیں اور اگر کوئی حدیث تواتر کے درجہ پر بھی ہوتا ہم قرآن کریم کے تواتر سے اس کو ہرگز مساوات نہیں۔ (الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۲، ۱۳)

ہمارا ضرور یہ مذہب ہونا چاہئے کہ ہم ہر ایک حدیث اور ہر ایک قول کو قرآن کریم پر عرض کریں تا ہمیں معلوم ہو کہ وہ واقعی طور پر اسی مشکوٰۃ وحی سے نور حاصل کرنیوالے ہیں جس سے قرآن نکلا ہے یا اس کے مخالف ہیں۔ (الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۲۲)

بعد اللہ جل شانہ کی آیات کے کس حدیث پر ایمان لاؤ گے؟ اس آیت میں صریح اس بات کی طرف ترغیب ہے کہ ہر ایک قول اور حدیث کتاب اللہ پر عرض کر لینا چاہئے۔ اگر کتاب اللہ نے ایک امر کی نسبت ایک فیصلہ ناطق اور مؤید دے دیا ہے جو قابل تغیر اور تبدیل نہیں تو پھر ایسی حدیث دائرہ صحت سے خارج ہوگی

جو اس کے مخالف ہے۔ لیکن اگر کتاب اللہ فیصلہ مؤیدہ اور ناقابل تبدیل نہیں دیتی تو پھر اگر وہ حدیث قانون روایت کے رو سے صحیح ثابت ہو تو ماننے کے لائق ہے۔ (الحق مباحثہ لدھیانہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸)

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۗ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي ۚ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ۚ ثَقُلَتْ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ ۗ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۗ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾

تفصیلی کلام اس بارہ میں یوں ہے کہ قیامت کی نشانیوں کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ امارات صغریٰ۔ ۲۔ امارات کبریٰ۔ امارات صغریٰ کبھی کبھی اپنی ظاہری صورت پر بھی ظاہر ہو جاتی ہیں اور کبھی ان کا ظہور استعارات کے لباس میں ہوتا ہے لیکن امارات کبریٰ کبھی بھی ظاہری صورت میں ظاہر نہیں ہوتیں ان کے بارہ میں ضروری ہے کہ وہ استعارات اور مجازات کے رنگ میں ظاہر ہوں اور اس میں بھید یہ ہے کہ قیامت کا اچانک آنا مقدر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۗ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي ۚ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ۗ ثَقُلَتْ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ ۗ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۗ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔ (ترجمہ از مرتب)

وَالكَلَامُ الْمَفصَّلُ فِي ذَلِكَ أَنَّ أَمَارَاتِ الْقِيَامَةِ عَلَى قِسْمَيْنِ : الْأَمَارَاتُ الصُّغْرَى، وَالْأَمَارَاتُ الْكُبْرَى۔ أَمَّا الْأَمَارَاتُ الصُّغْرَى فَقَدْ تَبَدُّو وَتَظْهَرُ عَلَى صُورَتِهَا الظَّاهِرَةِ، وَقَدْ تَنكشِفُ وَجُودُهَا فِي حَلْلِ الْإِسْتِعَارَاتِ۔ وَلَكِنَّ الْأَمَارَاتِ الْكُبْرَى فَلَا تَظْهَرُ عَلَى صُورَتِهَا الظَّاهِرَةِ أَصْلًا، وَلَا بَدَّ فِيهَا أَنْ تَظْهَرُ فِي حَلْلِ الْإِسْتِعَارَاتِ وَالْمَجَازَاتِ۔ وَالسُّرُّ فِي هَذَا الْأَمْرِ أَنَّ السَّاعَةَ لَا تَأْتِي إِلَّا بَغْتَةً كَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۗ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي ۚ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ۗ ثَقُلَتْ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ ۗ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۗ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

(حماسة البشري، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۳۰۲، ۳۰۳)

(سوال پیش ہوا کہ جو لوگ لڑائیوں میں جاتے ہیں اور وہاں قتل کرتے ہیں کیا وہ قتل ان کا گناہ ہے یا نہیں؟)  
 (فرمایا: )عَلَيْهَا عِنْدَ رَبِّي فِي اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اس نے اچھا  
 کیا یا برا کیا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۰)

الْهَمُّ أَرْجُلٌ يَبْشُرُونَ بِهَا ۚ أَمْ لَهُمْ آعْيُنٌ  
 يُبْصِرُونَ بِهَا ۚ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ  
 كِيدُونِ فَلَا تُنظِرُونِ ﴿٩٦﴾

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں کیا ان کی  
 آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں؟

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ۗ اَلْح ان کو کہہ کہ تم میرے مغلوب کرنے کے لیے اپنے معبودوں سے کہ جو تمہارے  
 زعم میں خدا کے شریک ہیں مدد طلب کرو اور میرے ناکام رہنے کے لیے ہر ایک طور کا مکر کرو اور مجھے ذرا  
 مہلت مت دو۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ حاشیہ نمبر ۱۱)

حق کی یہ بھی ایک پہچان ہے اور اس کی شناخت کا یہ ایک عمدہ معیار ہے کہ دنیا اپنے سارے ہتھیاروں  
 سے اس کی مخالفت پر ٹوٹ پڑے، جان سے، مال سے، اعضاء سے، عزت سے اور اندرونی اور بیرونی لوگ  
 اور اپنے اور پرانے گویا سب ہی اس کی مخالفت پر کھڑے ہو جاویں اور پھر وہ (حق) آگے ہی آگے قدم رکھتا  
 جاوے اور کوئی روک اس کی ترقی کو روک نہ سکے چنانچہ قرآن شریف میں ہے فَكَيْدُ وُنِي جَبِيحًا ثُمَّ لَا  
 تُنظِرُونِ الخ سو اس معیار سے ہمارے سلسلہ کو پرکھا جائے تو ایک طالب حق کے واسطے کوئی شک و شبہ باقی  
 نہیں رہتا۔ دیکھ لو نہ ہمارا کوئی واعظ ہے، نہ کوئی لیکچرار اور دشمن بھی کیا اندرونی اور بیرونی سب اکٹھے ہو کر  
 ہمارے تباہ کرنے کی کوشش میں لگے رہے مگر اللہ تعالیٰ نے ہر میدان میں ہمیں کامیاب کیا اور دشمن ذلیل  
 ہوئے کفر کے فتویٰ لگائے، قتل کا مقدمہ کیا۔ غرض کہ انہوں نے کوئی دقیقہ ہماری بربادی کا اٹھانا نہ رکھا مگر کیا  
 خدا (تعالیٰ) سے کوئی جنگ کر سکتا ہے؟ ہماری ترقی کے خود مخالف ہی باعث اور محرک ہیں۔ بہت لوگوں نے  
 انہیں کے رسائل سے اطلاع پا کر ہماری بیعت کی اگر واعظ وغیرہ ہماری طرف سے ہوتے تو ہمیں ان کا بھی

مشکور ہونا پڑتا اور یہ بھی ایک شعبہ شرک کا ہو جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے بچایا ایک آپاشی اور تخم ریزی تو کسان کرتا ہے اور ایک خود خدا کرتا ہے ہم اور ہماری جماعت خدا (تعالیٰ) کی تخم ریزی اور آپاشی سے ہیں تو خدا کے لگائے ہوئے پودا کو کون اُکھاڑ سکتا ہے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷۷)

إِنَّ وَلِيََّ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۗ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ﴿۹۷﴾

میرا کارساز وہ خدا ہے جس نے اپنی کتاب کو نازل کیا ہے اور اس کا بھی قانون قدرت ہے کہ وہ صالحین کے کاموں کو آپ کرتا ہے اور ان کی مہمات کو خود متولیٰ ہوتا ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ حاشیہ نمبر ۱۱)

یہ بات سمجھ رکھو کہ میرا حامی اور ناصر اور کارساز وہ خدا ہے جس نے قرآن کو نازل کیا ہے اور وہ اپنے سچے اور صالح رسولوں کی آپ کارسازی کرتا ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۱۹ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

ایک مقام توکل ہے جس پر نہایت مضبوطی سے ان کو قائم کیا جاتا ہے اور ان کے غیر کو وہ چشمہ صافی ہرگز میسر نہیں آ سکتا بلکہ انہیں کے لیے وہ خوشگوار اور موافق کیا جاتا ہے اور نور معرفت ایسا ان کو تھا مے رہتا ہے کہ وہ بسا اوقات طرح طرح کی بے سامانی میں ہو کر اور اسباب عادیہ سے بکلی اپنے تئیں دور پا کر پھر بھی ایسی بشارت اور انشراح خاطر سے زندگی بسر کرتے ہیں اور ایسی خوشحالی سے دنوں کو کاٹتے ہیں کہ گویا ان کے پاس ہزار ہا خزائن ہیں ان کے چہروں پر تو نگری کی تازگی نظر آتی ہے اور صاحب دولت ہونے کی مستقل مزاجی دکھائی دیتی ہے اور تنگیوں کی حالت میں بکمال کشادہ دلی اور یقین کامل اپنے مولیٰ کریم پر بھروسہ رکھتے ہیں سیرت ایثار ان کا مشرب ہوتا ہے اور خدمت خلق ان کی عادت ہوتی ہے اور کبھی انقباض ان کی حالت میں راہ نہیں پاتا اگرچہ سارا جہان ان کا عیال ہو جائے اور فی الحقیقت خدا تعالیٰ کی ستاری مستوجب شکر ہے جو ہر جگہ ان کی پردہ پوشی کرتی ہے اور قبل اس کے جو کوئی آفت فوق الطاقت نازل ہو ان کو دامنِ عاطفت میں لے لیتی ہے کیونکہ ان کے تمام کاموں کا خدا متولی ہوتا ہے جیسا کہ اس نے آپ ہی فرمایا ہے: وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ۔ لیکن دوسروں کو دنیا داری کے دل آزار اسباب میں چھوڑا جاتا ہے اور خارق عادت سیرت جو خاص ان لوگوں کے ساتھ ظاہر کی جاتی ہے کسی دوسرے کے ساتھ ظاہر نہیں کی جاتی۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۳۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

خدا تعالیٰ متقی اور مومن کی زندگی کا ذمہ دار ہے ھُوَ یَتَوَكَّلُ الصَّالِحِينَ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی راہ سے دور اور چوپاؤں کے مشابہ ہیں ان کی زندگی کا کفیل نہیں۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

نیکوں کا وہ آپ والی بن جاتا ہے پس کون ہے جو مرد صالح کو ضرر دے سکے؟

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۴)

قرآن شریف اس قسم کی آیتوں سے بھرا ہوا ہے کہ وہ متقیوں کا متولی اور متکفل ہوتا ہے۔ تو پھر جب انسان اسباب پر تکیہ اور توکل کرتا ہے تو گویا خدا تعالیٰ کی ان صفات کا انکار کرتا ہے اور ان اسباب کو ان صفات سے حصہ دیتا ہے اور ایک اور خدا اپنے لیے ان اسباب کا تجویز کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

وَهُوَ یَتَوَكَّلُ الصَّالِحِينَ جیسے ماں اپنی اولاد کی والی ہوتی ہے ویسے ہی وہ نیکوں کا والی ہوتا ہے۔

(الہدیر جلد ۲ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۲)

جس طرح ماں بچے کی متولی ہوتی ہے اسی طرح پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں صالحین کا متکفل ہوتا ہوں اللہ تعالیٰ اس کے دشمنوں کو ذلیل کرتا ہے اور اس کے مال میں طرح طرح کی برکتیں ڈال دیتا ہے۔

(الہدیر جلد ۲ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۷)

جب تک انسان اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان نہیں رکھتا اور اس کے وعدوں پر سچا یقین نہیں کرتا اور ہر ایک مقصود کا دینے والا اسی کو نہیں سمجھتا اور کامل صلاح اور تقویٰ اختیار نہیں کر لیتا تو اس وقت تک وہ حقیقی راحت دستیاب نہیں ہو سکتی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَهُوَ یَتَوَكَّلُ الصَّالِحِينَ یعنی جو صلاحیت اختیار کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کا متولی ہو جاتا ہے۔ انسان جو متولی رکھتا ہے اس کے بہت بوجھ کم ہو جاتے ہیں بہت ساری ذمہ داریاں گھٹ جاتی ہیں۔ بچپن میں ماں بچے کی متولی ہوتی ہے تو بچے کو کوئی فکر اپنی ضروریات کا نہیں رہتا۔ وہ خود ہی اس کی ضروریات کی کفیل ہوتی ہے اس کے کپڑوں اور کھانے پینے کے خود ہی فکر میں لگی رہتی ہے اس کی صحت قائم رکھنے کا دھیان اسی کو رہتا ہے اس کو نہلاتی اور دھلاتی ہے اور کھلاتی اور پلاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض وقت اس کو مار کر کھانا کھلاتی اور پانی پلاتی اور کپڑا پہناتی ہے۔ بچہ اپنی ضرورتوں کو نہیں سمجھتا بلکہ ماں ہی اس کی ضرورتوں کو خوب سمجھتی اور ان کو پورا کرنے کے خیال میں لگی رہتی ہے اسی طرح جب ماں کی تولیت سے نکل آئے تو انسان کو بالطبع ایک متولی کی ضرورت پڑتی ہے طرح طرح سے اپنے متولی اور لوگوں کو بناتا ہے جو خود کمزور ہوتے ہیں اور اپنی ضروریات میں غلطان ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے کی خبر نہیں لے سکتے لیکن جو

لوگ ان سب سے منقطع ہو کر اس قسم کا تقویٰ اور اصلاح اختیار کرتے ہیں۔ ان کا وہ خود متولی ہو جاتا ہے اور ان کی ضروریات اور حاجات کا خود ہی کفیل ہو جاتا ہے۔ انہیں کسی بناوٹ کی ضرورت ہی نہیں رہتی وہ اس کی ضروریات کو ایسے طور سے سمجھتا ہے کہ یہ خود بھی اس طرح نہیں سمجھ سکتا اور اس پر اس طرح فضل کرتا ہے کہ انسان خود حیران رہتا ہے۔ گرنہ ستانی بہ ستم مے رس والی نوبت ہوتی ہے لیکن انسان بہت سے زمانے پالیتا ہے جب اس پر ایسا زمانہ آتا ہے کہ خدا اس کا متولی ہو جائے یعنی اس کو خدا تعالیٰ کی تولیت حاصل کرنے سے پہلے کئی متولیوں کی تولیت سے گزرنا پڑتا ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ۔ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ۔ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ پہلے حاجت ماں باپ کی پڑتی ہے پھر جب بڑا ہوتا ہے تو بادشاہوں اور حاکموں کی حاجت پڑتی ہے پھر جب اس سے آگے قدم بڑھاتا ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ جن کو میں نے متولی سمجھا ہوا تھا وہ خود ایسے کمزور تھے کہ ان کو متولی سمجھنا میری غلطی تھی کیونکہ انہیں متولی بنانے میں نہ تو میری ضروریات ہی حاصل ہو سکتی تھیں اور نہ ہی وہ میرے لیے کافی ہو سکتے تھے پھر وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور ثابت قدمی دکھانے سے خدا کو اپنا متولی پاتا ہے اس وقت اس کو بڑی راحت حاصل ہوتی ہے اور ایک عجیب طمانیت کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب خدا کسی کو خود کہے کہ میں تیرا متولی ہوا تو اس وقت جو راحت اور طمانیت اس کو حاصل ہوتی ہے وہ ایسی حالت پیدا کرتی ہے کہ جس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حالت تمام تلخیوں سے پاک ہوتی ہے۔ دنیاوی حالتوں میں انسان تلخی سے خالی نہیں ہو سکتا۔ دشتِ دنیا کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔

دشتِ دنیا جز و دو جز دام نیست

جز مخلوت گاہِ حق آرام نیست

جن کا اللہ تعالیٰ متولی ہو جاتا ہے وہ دنیا کے آلام سے نجات پا جاتے ہیں اور ایک سچی راحت اور طمانیت کی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ (الہدٰی جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴، ۵)

اولاد کا ابتلا بھی بہت بڑا ابتلا ہے اگر اولاد صالح تو پھر کس بات کی پروا ہو سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے: هُوَ يَتَوَكَّلُ الصَّالِحِينَ یعنی اللہ تعالیٰ آپ صالحین کا متولی اور متکفل ہوتا ہے۔ اگر بد بخت ہے تو خواہ لاکھوں روپیہ اس کے لیے چھوڑ جاؤ وہ بد کاریوں میں تباہ کر کے پھر قلاش ہو جائے گی اور ان مصائب اور

مشکلات میں پڑے گی جو اس کے لیے لازمی ہیں۔ جو شخص اپنی رائے کو خدا تعالیٰ کی رائے اور منشاء سے متفق کرتا ہے وہ اولاد کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ اسی طرح پر ہے کہ اس کی صلاحیت کے لیے کوشش کرے اور دعائیں کرے۔ اس صورت میں خود اللہ تعالیٰ اس کا تکفل کرے گا اور اگر بدچلن ہے تو جائے جہنم میں اس کی پرواہ تک نہ کرے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اور بھی صاف کرنے اور وضاحت سے دنیا پر کھول دینے کے لئے انبیاء علیہم السلام کا ایک سلسلہ دنیا میں قائم کیا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا اور قادر ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی قسم کی امداد کی ضرورت ان رسولوں کو باقی نہ رہنے دے مگر پھر بھی ایک وقت ان پر آتا ہے کہ وہ من انصاری الی اللہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیا وہ ایک ٹکر گدا فقیر کی طرح بولتے ہیں؟ نہیں من انصاری الی اللہ کہنے کی بھی ایک شان ہوتی ہے وہ دنیا کو ایک رعایت اسباب سکھانا چاہتے ہیں جو دعا کا ایک شعبہ ہے ورنہ اللہ تعالیٰ پر ان کو کامل ایمان اس کے وعدوں پر پورا یقین ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اِيك يٰقيني اور حتمی وعدہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بھلا اگر خدا کسی کے دل میں مدد کا خیال نہ ڈالے تو کوئی کیوں کر مدد کر سکتا ہے اصل بات یہی ہے کہ حقیقی معاون و ناصر وہی پاک ذات ہے جس کی شان ہے نعم المولى و نعم الوكيل و نعم النصير۔ دنیا اور دنیا کی مددیں ان لوگوں کے سامنے کالمہیت ہوتی ہیں اور مردہ کیڑے کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی ہیں لیکن دنیا کو دعا کا ایک موٹا طریق بتلانے کے لئے وہ یہ راہ بھی اختیار کرتے ہیں وہ حقیقت میں اپنے کاروبار کا متولی خدا تعالیٰ ہی کو جانتے ہیں اور یہ بات بالکل سچ ہے وَ هُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ۔ (ریویو آف ریلینجز جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۸)

وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَا لَّا اَنْفُسَهُمْ  
يَنْصُرُوْنَ ﴿۹۸﴾

جن چیزوں کو تم اپنی مدد کے لیے پکارتے ہو وہ ممکن نہیں ہے جو تمہاری مدد کر سکیں اور نہ کچھ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۱۹ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهٰدِیْ لَا يَسْبَعُوْا ۗ وَ تَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا  
يُبْصِرُوْنَ ﴿۹۹﴾

اس کا مرنا اور جینا اپنے لئے نہیں بلکہ خدا ہی کے لئے ہو جائے۔ تب وہ خدا جو ہمیشہ سے پیار کرنے

والوں کے ساتھ پیار کرتا آیا ہے اپنی محبت کو اس پر اتارتا ہے اور ان دونوں محبتوں کے ملنے سے انسان کے اندر ایک نور پیدا ہوتا ہے جس کو دنیا نہیں پہچانتی اور نہ سمجھ سکتی ہے اور ہزاروں صدیقیوں اور برگزیدوں کا اسی لئے خون ہوا کہ دنیا نے ان کو نہیں پہچانا۔ وہ اسی لئے مکار اور خود غرض کہلائے کہ دنیا ان کے نورانی چہرہ کو دیکھ نہ سکی جیسا کہ فرماتا ہے: **يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُونَ** یعنی وہ جو منکر ہیں تیری طرف دیکھتے تو ہیں مگر تو انہیں نظر نہیں آتا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۸۴)

تیری طرف وہ دیکھتے ہیں مگر تو انہیں دکھائی نہیں دیتا آخر وہ سب اندھے ہلاک ہو گئے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۲۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہ کے مراتب معلوم تھے اور ہر ایک کی نورانیت باطنی کا اندازہ اس قلب منور پر مکشوف تھا۔ ہاں! جو لوگ بیگانہ ہیں وہ یگانہ حضرت احدیت کو شناخت نہیں کر سکتے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُونَ** یعنی وہ تیری طرف (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ پر تو انہیں نظر نہیں آتا اور وہ تیری صورت کو دیکھ نہیں سکتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انوار روحانی کا سخت چمکارا بیگانہ بعض پر جا پڑتا ہے۔ جیسے ایک عیسائی نے جبکہ مباہلہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع حسنین و حضرت علیؓ و فاطمہ رضی اللہ عنہم عیسائیوں کے سامنے آئے۔ دیکھ کر اپنے بھائیوں کو کہا کہ مباہلہ مت کرو۔ مجھ کو پروردگار کی قسم ہے کہ میں ایسے منہ دیکھ رہا ہوں کہ اگر اس پہاڑ کو کہیں گے کہ یہاں سے اٹھ جا تو فی الفور اٹھ جائے گا۔ سو خدا جانے کہ اس وقت نور نبوت و ولایت کیسا جلال میں تھا کہ اس کا فر، بد باطن، سیاہ دل کو بھی نظر آ گیا۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۸۹۹ء صفحہ ۴)

### حٰذِ الْعَفْوَ وَ اٰمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝۷

مجھے ایک حکایت یاد آئی جو سعدی نے بوستان میں لکھی ہے کہ ایک بزرگ کو کتے نے کاٹا۔ گھر آیا تو گھر والوں نے دیکھا کہ اسے کتے نے کاٹ کھایا ہے۔ ایک بھولی بھالی چھوٹی لڑکی بھی تھی۔ وہ بولی آپ نے کیوں نہ کاٹ کھایا؟ اس نے جواب دیا۔ بیٹی انسان سے کتے پن نہیں ہوتا اسی طرح سے انسان کو چاہیے کہ جب کوئی شریر گالی دے تو مومن کو لازم ہے کہ اعراض کرے۔ نہیں تو وہی کتے پن کی مثال صادق آئے گی خدا کے مقربوں کو بڑی بڑی گالیاں دی گئیں، بہت بری طرح ستایا گیا مگر ان کو **اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ** کا ہی

خطاب ہوا۔ خود اس انسانِ کامل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بری طرح تکلیفیں دی گئیں اور گالیاں، بدزبانی اور شوخیاں کی گئیں مگر اس خلقِ مجسم ذات نے اس کے مقابلہ میں کیا کیا؟ ان کے لیے دعا کی اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر لیا تھا کہ جاہلوں سے اعراض کرے گا تو تیری عزت اور جان کو، صحیح و سلامت رکھیں گے اور یہ بازاری آدمی اس پر حملہ نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضور کے مخالف آپ کی عزت پر حرف نہ لاسکے اور خود ہی ذلیل و خوار ہو کر آپ کے قدموں پر گرے یا سامنے متباہ ہوئے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۹)

وَإِذْ لَمْ تَأْتِهِمْ بآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنَ رَبِّي ۚ هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۳۷﴾

اور جس دن تو ان کو کوئی آیت نہیں سناتا اس دن کہتے ہیں کہ آج تو نے کوئی آیت کیوں نہ گھڑی؟ ان کو کہہ کہ میں تو اسی کلام کی پیروی کرتا ہوں کہ جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر نازل ہو رہا ہے اپنے دل سے گھڑ لینا میرا کام نہیں اور نہ یہ ایسی باتیں ہیں کہ جن کو انسان اپنے افتراء سے گھڑ سکے۔ یہ تو میرے رب کی طرف سے بصائر ہیں یعنی اپنے منجانب اللہ ہونے پر آپ ہی روشن دلیلیں ہیں اور ایمانداروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۶، ۲۵۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

## تفسیر سورة الانفال

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یَسْعَوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۗ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۗ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاصْلِحُوْا ذَاتَ

بَیْنِكُمْ ۗ وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝۱

اصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ یعنی آپس میں صلح کاری اختیار کرو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۹)

وَ اِذْ یَعِدُّكُمْ اللّٰهُ اِحْدٰی الطّٰیِفَتَیْنِ اَنْهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ

الشُّوْكَۃِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ

الْکٰفِرِیْنَ ۝۱

وَ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ خدا کا یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ اپنے کلام سے

حق کو ثابت کرے اور کافروں کے عقائد باطلہ کو جڑ سے کاٹ دے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

## لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٩﴾

تا سچے مذہب کی سچائی اور جھوٹے مذہبوں کا جھوٹ ثابت کر کے دکھلا دے اگرچہ مجرم لوگ کراہت ہی کریں۔  
(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنْي مَعَكُمْ فَتُنَبِّئُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۖ سَأَلْتَنِي فِي قُلُوبِ  
الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَأَضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٣﴾

یعنی ان کو دلوں پر اثر انداز ہو جاؤ اور ان میں ثابت قدم رہنے کے کلمات ڈالو یعنی ان سے کہو کہ تم خوف نہ کھاؤ اور تم غم نہ کرو اور اسی قسم کے دوسرے کلمات جن کے ساتھ ان کے قلوب مطمئن ہو جائیں۔ پس یہ تمام آیات دلالت کرتی ہیں اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء سے کبھی کبھی کلام کرتا ہے اور ان سے مخاطب ہوتا ہے تا ان کا یقین اور بصیرت زیادہ ہو اور تا وہ اطمینان یافتہ ہو جائیں۔ (ترجمہ از مرتب)

أَنْي هَاتُوا قُلُوبَهُمْ وَأَلْقُوا فِيهَا  
كَلِمَاتِ التَّنْبِيئِ، يَعْنِي قُولُوا لَا  
تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَكَيْفَلَهُ مِنْ كَلِمَاتِ  
تَضْمِينِ بِهَا قُلُوبَهُمْ۔ فَهَذِهِ الْآيَاتُ  
كُلُّهَا تَدُلُّ عَلَى أَنَّ اللَّهَ قَدْ يُكَلِّمُ أَوْلِيَاءَهُ  
وَيُخَاطِبُهُمْ لِيَزِدَّادَ يَقِينَهُمْ وَبَصِيرَتَهُمْ  
وَلِيَكُونُوا مِنَ الْمُطْمَئِنِّينَ۔

(حسامة البشرى، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۲۹۹)

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ  
رَمَىٰ ۗ وَيُؤَيِّدُ الْبَلَاءَ حَسَنًا ۗ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٤﴾

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۗ تُوْنِي چلا یا۔ خدا نے ہی چلا یا جب کہ تو نے چلا یا۔

(سرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۲۷۶ حاشیہ)

ہمارے سید و مولیٰ سید الرسل حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں ایک سنگریزوں کی مٹھی کفار پر چلائی اور وہ مٹھی کسی دعا کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود اپنی روحانی طاقت سے چلائی مگر اس مٹھی نے خدائی طاقت دکھلائی اور مخالف کی فوج پر ایسا خارق عادت اُس کا اثر پڑا کہ کوئی ان میں سے ایسا نہ رہا کہ جس

کی آنکھ پر اس کا اثر نہ پہنچا ہو اور وہ سب اندھوں کی طرح ہو گئے اور ایسی سراپگی اور پریشانی ان میں پیدا ہو گئی کہ مدہوشوں کی طرح بھاگنا شروع کیا۔ اسی معجزہ کی طرف اللہ جل شانہ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ يَعْنِي جَب تَوْنِ اس مِثْلِي كُو پھینکا وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا تعالیٰ نے پھینکا یعنی در پردہ الہی طاقت کام کر گئی، انسانی طاقت کا یہ کام نہ تھا۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۶۵)

یاد رہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے دو ہاتھ جلالی و جمالی ہیں۔ اسی نمونہ پر چونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ جل شانہ کے مظہر اتم ہیں۔ لہذا خدا تعالیٰ نے آپ کو بھی وہ دونوں ہاتھ رحمت اور شوکت کے عطا فرمائے۔ جمالی ہاتھ کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے کہ قرآن شریف میں ہے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء: ۱۰۸) یعنی ہم نے تمام دنیا پر رحمت کر کے تجھے بھیجا ہے اور جلالی ہاتھ کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔

(ضمیمہ تحفہ گوڑویہ، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۶۸ حاشیہ واربعین نمبر ۳، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۲۱ حاشیہ)

اہل اللہ قرب الہی میں ایسے مقام پر جا پہنچتے ہیں جبکہ ربانی رنگ بشریت کے رنگ و بو کو تمام و کمال اپنے رنگ کے نیچے متواری کر لیتا ہے اور جس طرح آگ لوہے کو اپنے نیچے ایسا چھپا لیتی ہے کہ ظاہر میں بجز آگ کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا اور ظلی طور پر وہ صفات الہیہ کا رنگ اپنے اندر پیدا کرتا ہے اس وقت اس سے بدوں دعا و التماس ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر الوہیت کے خواص رکھتے ہیں اور وہ ایسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں جو جس طرح کہتے ہیں اسی طرح ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور زبان سے ایسے امور کے صدور کی بصراحت بحث ہے جیسا کہ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۱)

ذُكِرْكُمْ وَ أَنَّ اللَّهَ مُؤْمِنٌ كَيْدِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۹﴾

خدا تعالیٰ کافروں کے مکر کو مست کر دے گا اور ان کو مغلوب اور زلیل کر کے دکھلائے گا۔

(براہین احمدیہ چہار حص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۱۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْبَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْبَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَ هُمْ

## مُعْرُضُونَ ﴿۲۷﴾

اس میں بھی خدا تعالیٰ کی حکمت ہے کہ فلاں فلاں مسلمان عالم ہمارے سلسلہ میں داخل نہیں اگر یہ داخل ہوتے تو خدا جانے کیا کیا فتنے برپا کرتے۔ لَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْبَعَهُمْ۔  
(البدر جلد ۶، نمبر ۱۹، مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۚ وَاعْلَمُوا  
أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۲۷﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے ہاتھ پر مردے زندہ ہوتے ہیں  
لِمَا يُحْيِيكُمْ اور سب کو معلوم ہے کہ اس سے مراد روحانی مردوں کا زندہ ہونا ہے۔

(بدر جلد ۷، نمبر ۱۹، مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء، صفحہ ۵)

اور جانو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان آجاتا ہے یعنی جیسا کہ دور اور نزدیک ہونا اس کی صفت  
ہے ایسا ہی درمیان آجانا بھی اس کی صفت ہے۔

أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ یعنی خدا وہ ہے جو انسان اور اس کے دل میں حائل ہو جاتا ہے۔  
(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳، صفحہ ۹۷)

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا آمَاكُمُ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۗ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَكَ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۲۸﴾

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہما آمواکم و اولادکم فتنۃ اور مال انسان کے لیے فتنہ ہوتے  
ہیں۔ دیکھو! اگر خدا کسی کو کہے کہ تیری کل اولاد جو مر چکی ہے زندہ کر دیتا ہوں مگر پھر میرا تجھ سے کچھ تعلق نہ  
ہوگا، تو کیا اگر وہ عقلمند ہے اپنی اولاد کی طرف جانے کا خیال بھی کرے گا؟ پس انسان کی نیک بختی یہی ہے کہ  
خدا کو ہر ایک چیز پر مقدم رکھے جو شخص اپنی اولاد کی وفات پر برامنا ہے وہ بخیل بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ اس  
امانت کے دینے میں جو خدا نے اس کے سپرد کی تھی بخل کرتا ہے اور بخیل کی نسبت حدیث میں آتا ہے کہ اگر وہ  
جنگل کے دریاؤں کے برابر بھی عبادت کرے تو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

(الحکم جلد ۱۲، نمبر ۴۸، مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۰۸ء، صفحہ ۱، ۲)

أَنْبَاءَ أَمْوَالِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ فَتَنَّا - أَمْوَالِكُمْ میں عورتیں داخل ہیں۔ عورت چونکہ پردہ میں رہتی ہے اس لیے اس کا نام بھی پردہ ہی میں رکھا ہے اور اس لیے بھی کہ عورتوں کو انسان مال خرچ کر کے لاتا ہے، مال کا لفظ مائل سے لیا گیا ہے یعنی جس کی طرف طبعاً توجہ اور رغبت کرتا ہے عورت کی طرف بھی چونکہ طبعاً توجہ کرتا ہے اس لیے اس کو مال میں داخل فرمایا ہے۔ مال کا لفظ اس لیے رکھا تا کہ عام محبوبات پر حاوی نہ ہو ورنہ اگر صرف نساء کا لفظ ہوتا ہے تو اولاد اور عورت دو چیزیں قرار دی جاتیں اور اگر محبوبات کی تفصیل کی جاتی تو پھر دس جزو میں بھی ختم نہ ہوتا۔ غرض مال سے مراد کُلُّ مَا يَمِيلُ إِلَيْهِ الْقَلْبُ ہے۔ اولاد کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ انسان اولاد کو جگر کا ٹکڑا اور اپنا وارث سمجھتا ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے محبوبات میں ضد ہے دونوں باتیں یکجا جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس سے یہ مت سمجھو کہ پھر عورتیں ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو بہت ذلیل اور حقیر قرار دیا جاوے۔ نہیں! نہیں! ہمارے ہادی کامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جس کا اپنے اہل کے ساتھ عمدہ سلوک ہو۔ بیوی کے ساتھ جس کا عمدہ چال چلن اور معاشرت اچھی نہیں، وہ نیک کہاں؟ دوسرے کے ساتھ نیکی اور بھلائی تب کر سکتا ہے جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا ہو اور عمدہ معاشرت رکھتا ہو۔ نہ یہ کہ ہر ادنیٰ بات پر زرد و کوب کرے۔ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ بعض وقت ایک غصہ میں بھرا ہوا انسان بیوی سے ادنیٰ سی بات پر ناراض ہو کر اس کو مارتا ہے اور کسی نازک مقام پر چوٹ لگی ہے اور بیوی مر گئی ہے، اس لیے ان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ: عَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ ہاں! اگر وہ بے جا کام کرے تو تنبیہ ضروری چیز ہے۔

انسان کو چاہیے کہ عورتوں کے دل میں یہ بات جمادے کہ وہ کوئی ایسا کام جو دین اور شریعت کے خلاف ہو کبھی بھی پسند نہیں کر سکتا اور ساتھ ہی وہ ایسا جا بجا اور ستم شعار نہیں کہ اس کی کسی غلطی پر بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ  
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۳۰﴾

اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تم میں اور تمہارے غیر میں خدا ایک فرق رکھ دے گا اور

تمہیں پاک کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہارا خدا صاحبِ فضل بزرگ ہے۔

(پیغامِ صلح، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۷۸-۷۷)

روح القدس کے بارہ میں جو قرآن کریم میں آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے کامل مومنوں کو روح القدس دیا جاتا ہے مجملہ ان کے ایک یہ آیت ہے..... یعنی اے وے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو اور اللہ جل شانہ سے ڈرتے رہو تو خدا تعالیٰ تمہیں وہ چیز عطا کرے گا (یعنی روح القدس) جس کے ساتھ تم غیروں سے امتیاز ملے گا اور تمہارے لئے ایک نور مقرر کر دے گا (یعنی روح القدس) جو تمہارے ساتھ ساتھ چلے گا۔ قرآن کریم میں روح القدس کا نام نور ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۹۷، ۹۸)

اے ایمان لانے والو! اگر تم متقی ہونے پر ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے اتقاء کی صفت میں قیام اور استحکام اختیار کرو تو خدا تعالیٰ تم میں اور تمہارے غیروں میں فرق رکھ دے گا وہ فرق یہ ہے کہ تم کو ایک نور دیا جائے گا جس نور کے ساتھ تم اپنی تمام راہوں میں چلو گے یعنی وہ نور تمہارے تمام افعال اور اقوال اور قوی اور حواس میں آجائے گا تمہاری عقل میں بھی نور ہوگا اور تمہاری ایک اٹکل کی بات میں بھی نور ہوگا اور تمہاری آنکھوں میں بھی نور ہوگا اور تمہارے کانوں اور تمہاری زبانوں اور تمہارے بیانوں اور تمہاری ہر ایک حرکت اور سکون میں نور ہوگا اور جن راہوں میں تم چلو گے وہ راہ نورانی ہو جائیں گی۔ غرض جتنی تمہاری راہیں تمہارے قوی کی راہیں تمہارے حواس کی راہیں ہیں وہ سب نور سے بھر جائیں گی اور تم سراپا نور میں ہی چلو گے۔

اب اس آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تقویٰ سے جاہلیت ہرگز جمع نہیں ہو سکتی۔ ہاں! فہم اور ادراک حسب مراتب تقویٰ کم و بیش ہو سکتا ہے۔ اسی مقام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بڑی اور اعلیٰ درجہ کی کرامت جو اولیاء اللہ کو دی جاتی ہے جن کو تقویٰ میں کمال ہوتا ہے وہ یہی دی جاتی ہے کہ ان کے تمام حواس اور عقل اور فہم اور قیاس میں نور رکھا جاتا ہے اور ان کی قوت کشفی نور کے پانیوں سے ایسی صفائی حاصل کر لیتی ہے کہ جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی ان کے حواس نہایت باریک بین ہو جاتے ہیں اور معارف اور دقائق کے پاک چشمے ان پر کھولے جاتے ہیں اور فیض سائغ ربّانی ان کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح جاری ہو جاتا ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۷۷ تا ۷۸)

اے مومنو! اگر تم متقی بن جاؤ تو تم میں اور تمہارے غیر میں خدا تعالیٰ ایک فرق رکھ دے گا، وہ فرق کیا ہے کہ تمہیں ایک نور عطا کیا جائے گا جو تمہارے غیر میں ہرگز نہیں پایا جائے گا یعنی نور الہام اور نور اجابت دعا اور نور کرامات اصطفاء۔

قرآن شریف میں بار بار اور صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ قیامت تو مجازات کبریٰ کا وقت ہے مگر ایک قسم کی مجازات اسی دنیا میں شروع ہے جس کی طرف آیت: **يَجْعَلُ لَكُمْ فُرْقَانًا** اشارہ کرتی ہے۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۴۲)

اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تم میں اور تمہارے غیر میں خدا ایک فرق رکھ دے گا اور تمہیں پاک کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہارا خدا صاحب فضل بزرگ ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۱)

سیدنا محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی متابعت و پیروی و تصدیق رسالت اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے اور ان انعامات کا وارث جو اگلے برگزیدہ انبیاء پر ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام فرقان رکھا ہے چنانچہ فرمایا... یعنی وہ تمہیں ایک فرقان دے گا پس دوسرے مذاہب (اور) اس میں ایک ماہہ الامتیاز اسی جہان میں ہونا ضروری ہے۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

کامل پیروی کرنے والے کی روح القدس سے تائید کی جائے گی یعنی ان کے فہم اور عقل کو غیب سے ایک روشنی ملے گی اور ان کی کشفی حالت نہایت صفا کی جائے گی اور ان کے کلام اور کام میں تاثیر رکھی جائے گی اور ان کے ایمان نہایت مضبوط کیے جائیں گے اور پھر فرمایا کہ خدا ان میں اور ان کے غیر میں ایک فرق بیٹن رکھ دے گا یعنی بمقابل ان کے باریک معارف کے جو ان کو دیئے جائیں گے اور بمقابل ان کے کرامات اور خوارق کے جو ان کو عطا ہوں گی دوسری تمام قومیں عاجز رہیں گی۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۱۰)

وَ اِذْ يَبْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُبْنِتُوكَ اَوْ يَقْتُلُوكَ اَوْ يُخْرِجُوكَ ۗ وَيَبْكُرُونَ  
بِمَكْرُ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِيْنَ ۝

اور تو وہ وقت یاد کر کہ جب کافر لوگ تیرے قید کرنے یا قتل کرنے یا نکال دینے پر مکر کر کے منصوبے

باندھتے تھے اور مکر کر رہے تھے اور خدا بھی مکر کر رہا تھا اور خدا سب مکر کرنے والوں سے بہتر ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

اور اے پیغمبر! وہ وقت یاد کر جب کافر لوگ تجھ پر داؤ چلانا چاہتے تھے تاکہ تجھے گرفتار کر رکھیں یا تجھے مار ڈالیں اور یا تجھے جلا وطن کر دیں اور حال یہ تھا کہ کافر توفیق کے لیے اپنا داؤ کر رہے تھے اور خدا ان کو مغلوب کرنے کے لیے اپنا داؤ کر رہا تھا اور خدا سب داؤ کرنے والوں سے بہتر داؤ کرنے والا ہے جس کے داؤ میں سراسر مخلوق کی بھلائی ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۳۴، ۲۳۵)

خَيْرُ الْبَكْرِينَ یعنی ایسا مکر کرنے والا جس میں کوئی شر نہیں۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۲)

واضح رہے کہ اسلام کی لڑائیاں ایسے طور سے نہیں ہونیں کہ جیسے ایک زبردست بادشاہ کمزور لوگوں پر چڑھائی کر کے ان کو قتل کر ڈالتا ہے بلکہ صحیح نقشہ ان لڑائیوں کا یہ ہے کہ جب ایک مدت دراز تک خدا تعالیٰ کا پاک نبی اور اس کے پیرو مخالفوں کے ہاتھ سے دکھ اٹھاتے رہے چنانچہ ان میں سے کئی قتل کئے گئے اور کئی برے برے عذابوں سے مارے گئے یہاں تک کہ ہمارے نبی صلعم کے قتل کرنے کے لئے منصوبہ کیا گیا اور یہ تمام کامیابیاں ان کے بتوں کے معبود برحق ہونے پر حمل کی گئیں اور ہجرت کی حالت میں بھی آنحضرت صلعم کو امن میں نہ چھوڑا گیا بلکہ خود آٹھ پڑاؤ تک چڑھائی کر کے خود جنگ کرنے کے لئے آئے تو اس وقت ان کے حملہ کے روکنے کے لئے اور نیز ان لوگوں کو امن میں لانے کے لئے جو ان کے ہاتھ میں قیدیوں کی طرح تھے اور نیز اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ ان کے معبود جن کی تائید پر یہ سابقہ کامیابیاں حمل کی گئی ہیں لڑائیاں کرنے کا حکم ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يُقْتَلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۗ وَ يَمْكُرُوْنَ ۗ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ ۗ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْبَكْرِينَ ۗ**

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۴۴)

وَ اِذَا تُثَلِّي عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا قَالُوْا قَدْ سَبَعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا ۗ اِنْ هٰذَا

اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۷﴾

لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا کہ اگر ہم چاہیں تو اس کی مانند کہہ دیں۔

(نزل المسج، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۴۴۰)

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ  
يَسْتَغْفِرُونَ ﴿۳۰﴾

اے! مَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِعَذَابٍ كَامِلٍ | یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ ان کو کامل عذاب  
وَأَنْتَ سَاكِنٌ فِيهِمْ۔ | میں مبتلا کرے جب کہ تو ان میں سکونت پذیر ہے۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۶۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۱۱)

اور خدا ایسا نہیں جو ان کو عذاب پہنچا دے جب تک تو ان کے درمیان ہے یا جب وہ استغفار کریں۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۱۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

خدا ایسا نہیں کہ ملکہ والوں پر عذاب نازل کرے اور تو ان میں ہو کیونکہ وہ آفتاب تھا اور یہ غیر ممکن ہے کہ  
آفتاب کے ہوتے عذاب کی ظلمت نازل ہو۔ (انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۵۵)

اور خدا ایسا نہیں ہے کہ ان سب کو عذاب سے ہلاک کر دیتا حالانکہ تو انہیں میں رہتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۲۳۳)

استغفار عذاب الہی اور مصائب شدیدہ کے لیے سپر کام دیتا ہے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ ..... وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

یہ تمام اقوام کا مذہب ہے کہ صدقہ سے رد بلا ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ بھی فرماتا ہے: مَا كَانَ اللَّهُ

لِيُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ۔ استغفار عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ ہمارے تجربوں کی طرف کوئی

جائے تو ایک مندر امر صبح کو ہو تو شام کو منسوخ ہو جاتا ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

تمام انبیاء کرام کا اجماع مسئلہ ہے کہ صدقہ و استغفار سے رد بلا ہوتا ہے۔ بلا کیا چیز ہے یعنی وہ تکلیف دہ

امر جو خدا کے ارادہ میں مقدر ہو چکا ہے، اب اس بلا کی اطلاع جب کوئی نبی دے تو وہ پیشگوئی بن جاتی ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ رحم الراحمین ہے۔ وہ تضرع کرنے والوں پر اپنی رحمت سے رجوع کرتا ہے۔ اس لیے ہمارا یہ

عقیدہ نہیں کہ وعید کی پیشگوئیاں اٹل ہیں بلکہ وہ ٹل جاتی ہیں۔

(البدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَمَا لَهُمْ إِلَّا لِيَعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يُصِدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا

اُولِيَاءَهُ ۙ اِنَّ اُولِيَاءَ وَاِلاَّ الْمُتَّقُونَ وَلَكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۵﴾

اِنَّ اُولِيَاءَ وَاِلاَّ الْمُتَّقُونَ اللہ کے ولی وہ ہیں جو متقی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے دوست۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۵)

تقویٰ سے زینت اعمال پیدا ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب ملتا ہے اور اسی کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کا ولی بن جاتا ہے چنانچہ فرمایا ہے: اِنَّ اُولِيَاءَ وَاِلاَّ الْمُتَّقُونَ کمال طور پر جب تقویٰ کا کوئی مرحلہ باقی نہ رہے تو پھر یہ اولیاء اللہ میں داخل ہو جاتا ہے اور تقویٰ حقیقت میں اپنے کامل درجہ پر ایک موت ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۷ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

ولایت کا حصہ تقویٰ ہی پر ہے۔ خدا تعالیٰ سے ترساں اور لرزاں ہو کر اگر اسے حاصل کرو گے تو کمال تک

پہنچ جاؤ گے۔ (الہدیر جلد ۳ نمبر ۹ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَسَيَنْفِقُوْنَهَا

ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يَغْلِبُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى جَهَنَّمَ يَحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور وہ تمام کافر کہ جو دین اسلام کے روکنے اور بند کرنے کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کر رہے ہیں وہ جہاں تک ان کا بس چلے گا خرچ کریں گے پر آخر کار وہ تمام خرچ ان کے لیے تاسف اور حسرت کا موجب ہوگا اور پھر مغلوب ہو جائیں گے۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۶۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنُوْنَ فِتْنَةً ۙ وَ يَكُوْنِ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ ۚ فَاِنْ اَنْتُمْ اَوْ اَنْ

اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۷﴾

یعنی اس حد تک ان کا مقابلہ کرو کہ ان کی بغاوت دور ہو جائے اور دین کی روکیں اٹھ جائیں اور حکومت

اللہ کے دین کی ہو جائے۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۵۵)

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنُوْنَ فِتْنَةً ۙ وَ يَكُوْنِ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ یعنی عرب کے ان مشرکوں کو قتل کرو یہاں

تک کہ بغاوت باقی نہ رہ جاوے اور دین یعنی حکومت اللہ تعالیٰ کی ہو جائے۔ اس سے کہاں جبر نکلتا ہے اس

سے تو صرف اس قدر پایا جاتا ہے کہ اس حد تک لڑو کہ ان کا زور ٹوٹ جائے اور شرارت اور فساد اٹھ جائے اور بعض لوگ جیسے خفیہ طور پر اسلام لائے ہوئے ہیں ظاہر بھی اسلامی احکام ادا کر سکیں۔ اگر اللہ جلّ شانہ کا ایمان بالجبر منشا ہوتا جیسا کہ ڈپٹی صاحب سمجھ رہے ہیں تو پھر جزیہ اور صلح اور معاہدات کیوں جائز رکھے جاتے اور کیا وجہ تھی کہ یہود اور عیسائیوں کے لیے یہ اجازت دی جاتی کہ وہ جزیہ دے کر امن میں آجائیں اور مسلمانوں کے زیر سایہ امن کے ساتھ بسر کریں۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۶۳)

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ ۗ وَ  
 لَوْ تَوَاعَدْتُمْ لِاخْتِلَافِئُمْ فِي الْمَيْعِدِ ۗ وَ لَكِنَّ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ  
 لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ  
 عَلِيمٌ ﴿۳۷﴾

يَضَعُ الْحَرْبَ كَالْفِظِ هِيَ كَسْرُ صَلِيبٍ كِي حَقِيقَتِ كُو بَتَاتَا هِي كِه اَس سِه مِرَاد ..... لِكُرِّي يَادُوسِرِي چيزوں كِي  
 صَلِيبُوں كُو تُوڑ نَا نِهِيں بَلَكِه صَلِيبِي مَلَّت كِي شَكْسَت هِي اُور مَلَّت كِي شَكْسَت بَيْنِه اُور بَرَابَرِيں سِه هُو كِي جِيسَا كِه اللّٰهُ تَعَالَى  
 نِه فَر مَآ يَهِي: لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ - (الحكم جلد ۷ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)  
 لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ - جو ہلاک ہو وہ بھی بین آیات دیکھ کر  
 ہلاک ہو اور جو زندہ ہو وہ بھی بین آیات دیکھ کر زندہ ہو۔

(الہد جلد ۳ نمبر ۲۶ مورخہ ۸ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقَيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ  
 تُفْلِحُونَ ﴿۳۸﴾

انسانی فطرت میں ہے کہ جب تک بار بار ایک بات کو دہرائے نہیں! وہ یاد نہیں ہوتی۔ سُبْحَانَ رَبِّيَ  
 الْأَعْلَىٰ اور سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ بار بار کیوں کہلوا یا؟ ایک بار ہی کافی تھا۔ نہیں! اس میں یہی سر ہے کہ  
 کثرت تکرار اپنا ایک اثر ڈالتی ہے اور غافل سے غافل قوتوں میں بھی ایک بیداری پیدا کر دیتی ہے۔ اسی

لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ جس طرح پر ذہنی تعلق ہوتا ہے اور کثرت تکرار ایک بات کو حافظہ میں محفوظ کر دیتی ہے اسی طرح ایک روحانی تعلق بھی ہے اس میں بھی تکرار کی حاجت ہے۔ بدوں تکرار وہ روحانی پیوند اور رشتہ قائم نہیں رہتا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

وَ اذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا کے یہ معنی ہیں یعنی اس قدر ذکر کرو کہ گویا اللہ تعالیٰ کا نام کٹھ ہو جاوے۔ انبیاء علیہم السلام کے طرز کلام میں یہ بات عام ہوتی ہے کہ وہ ایک امر کو بار بار اور مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں ان کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ تا مخلوق کو نفع پہنچے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

وَ اَطِيعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اَصْبِرُوْا

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

اسلامی فرقوں میں دن بدن پھوٹ پڑتی جاتی ہے، پھوٹ اسلام کے لیے سخت مضر ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ۔ جب سے اسلام کے اندر پھوٹ پڑی ہے دم بدم تنزّل کرتا جاتا ہے۔ اس لیے خدا نے اس سلسلہ کو قائم کیا تا لوگ فرقہ بندیوں سے نکل کر اس جماعت میں شامل ہوں جو بے ہودہ مخالفتوں سے بالکل محفوظ ہے اور اس سیدھے رستے پر چل رہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطْرًا وَ رِغَاءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنِ

سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ وَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُّحِيْطٌ ﴿۳۸﴾

یعنی بہادروہ ہیں کہ.... جب دیکھتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ قرین مصلحت ہے تو نہ صرف جوش نفس سے بلکہ سچائی کی مدد کے لیے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں مگر نہ اپنے نفس کا بھروسہ کر کے بلکہ خدا پر بھروسہ کر کے بہادری دکھاتے ہیں اور ان کی شجاعت میں ریا کاری اور خود بینی نہیں ہوتی اور نہ نفس کی پیروی بلکہ ہر ایک پہلو سے خدا کی رضا مقدم ہوتی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۵۹)

كَذٰبِ اِلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ كَفَرُوْا بِآيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ  
بِذُنُوْبِهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۶﴾

جیسے فرعون کے خاندان اور اس سے پہلے کافروں کا حال ہوا کہ جب انہوں نے خدا کے نشانوں سے انکار کرنا اختیار کیا تو خدا نے ان سے ان کے گناہوں کا مواخذہ کیا اور بہ تحقیق خدا بڑا طاقت والا اور سزا دینے میں سخت ہے۔  
(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۳)

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيٰنَةً ۙ فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ  
الْخٰٓيْبِيْنَ ﴿۵۷﴾

خدا خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۷)

وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ ۙ وَ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُوْنَ بِهٖ  
عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوْكُمْ وَ اٰخِرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۗ وَ  
مَا تَنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفِّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تظَلْمُوْنَ ﴿۵۸﴾

وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ یعنی دینی دشمنوں کیلئے ہر ایک قسم کی طیاری جو کر سکتے ہو کر اور  
اعلاء کلمہ اسلام کیلئے جو قوت لگا سکتے ہو لگاؤ۔ اب دیکھو کہ یہ آیت کریمہ کس قدر بلند آواز سے ہدایت فرما رہی  
ہے کہ جو تدبیریں خدمت اسلام کیلئے کارگر ہوں سب بجالاؤ اور تمام قوت اپنے فکر کی اپنے بازو کی اپنی مالی  
طاقت کی اپنے احسن انتظام کی اپنی تدبیر شائستہ کی اس راہ میں خرچ کرو تا تم فتح پاؤ۔ اب نادان اور اندھے  
اور دشمن دین مولوی اس صرف قوت اور حکمت عملی کا نام بدعت رکھتے ہیں۔ اس وقت کے یہ لوگ عالم  
کہلاتے ہیں جن کو قرآن کریم کی ہی خبر نہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

اس آیت موصوفہ بالا پر غور کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ برطبق حدیث نبوی کہ اِنَّهَا اَلْاَعْمَالُ

بِالْيَقِيَاتِ كَوْنِي احسن انتظام اسلام کی خدمت کیلئے سوچنا بدعت اور ضلالت میں داخل نہیں ہے جیسے جیسے بوجہ تبدل زمانہ کے اسلام کو نئی نئی صورتیں مشکلات کی پیش آتی ہیں یا نئے نئے طور پر ہم لوگوں پر مخالفوں کے حملے ہوتے ہیں ویسی ہی ہمیں نئی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں پس اگر حالت موجودہ کے موافق ان حملوں کے روکنے کی کوئی تدبیر اور تدارک سوچیں تو وہ ایک تدبیر ہے بدعات سے اس کو کچھ تعلق نہیں اور ممکن ہے کہ باعث انقلاب زمانہ کے ہمیں بعض ایسی نئی مشکلات پیش آجائیں جو ہمارے سید و مولیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس رنگ اور طرز کی مشکلات پیش نہ آئی ہوں مثلاً ہم اس وقت کی لڑائیوں میں پہلی طرز کو جو مسنون ہے اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ اس زمانہ میں طریق جنگ و جدل بالکل بدل گیا ہے اور پہلے ہتھیار بیکار ہو گئے اور نئے ہتھیار لڑائیوں کے پیدا ہوئے۔ اب اگر ان ہتھیاروں کو پکڑنا اور اٹھانا اور ان سے کام لینا ملوک اسلام بدعت سمجھیں اور میاں رحیم بخش جیسے مولوی کی بات پر کان دھر کے ان اسلحہ جدیدہ کا استعمال کرنا ضلالت اور معصیت خیال کریں اور یہ کہیں کہ یہ وہ طریق جنگ ہے کہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا اور نہ صحابہ اور تابعین نے تو فرمائیے کہ بجز اس کے کہ ایک ذلت کے ساتھ اپنی ٹوٹی پھوٹی سلطنتوں سے الگ کئے جائیں اور دشمن فتح یاب ہو جائے کوئی اور بھی اس کا نتیجہ ہوگا۔ پس ایسے مقامات تدبیر اور انتظام میں خواہ وہ مشابہ جنگ و جدل ظاہری ہو یا باطنی اور خواہ تلوار کی لڑائی ہو یا قلم کی۔ ہماری ہدایت پانے کیلئے یہ آیت کریمہ موصوفہ بالا کافی ہے یعنی یہ کہ اَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ۔ اللہ جل شانہ! اس آیت میں ہمیں عام اختیار دیتا ہے کہ دشمن کے مقابل پر جو احسن تدبیر تمہیں معلوم ہو اور جو طرز تمہیں موثر اور بہتر دکھائی دے وہی طریق اختیار کرو۔ پس اب ظاہر ہے کہ اس احسن انتظام کا نام بدعت اور معصیت رکھنا اور انصار دین کو جو دن رات اعلاء کلمہ اسلام کے فکر میں ہیں جن کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حُبُّ الْأَنْصَارِ مِنَ الْإِيمَانِ ان کو مردود ٹھہرانا نیک طینت انسانوں کا کام نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کی روحانی صورتیں مسخ شدہ ہیں اور اگر یہ کہو کہ یہ حدیث کہ حُبُّ الْأَنْصَارِ مِنَ الْإِيمَانِ وَبُغْضُ الْأَنْصَارِ مِنَ الْإِيمَانِ یعنی انصار کی محبت ایمان کی نشانی اور انصار سے بغض رکھنا نفاق کی نشانی ہے یہ ان انصار کے حق میں ہے جو مدینہ کے رہنے والے تھے نہ عام اور تمام انصار۔ تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ جو اس زمانہ کے بعد انصار رسول اللہ ہوں ان سے بغض رکھنا جائز ہے، نہیں نہیں! بلکہ یہ حدیث گواہیک خاص گروہ کیلئے فرمائی گئی مگر اپنے اندر عموم کا فائدہ رکھتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اکثر آیتیں خاص گروہ

کے لئے نازل ہوئیں مگر ان کا مصداق عام قرار دیا گیا ہے..... نادان! یہ بھی نہیں جانتے کہ تدبیر اور انتظام کو بدعات کی مدین داخل نہیں کر سکتے۔ ہر ایک وقت اور زمانہ انتظامات جدیدہ کو چاہتا ہے۔ اگر مشکلات کی جدید صورتیں پیش آویں تو بجز جدید طور کی تدبیروں کے اور ہم کیا کر سکتے ہیں۔ پس کیا یہ تدبیریں بدعات میں داخل ہو جائیں گی، جب اصل سنت محفوظ ہو اور اسی کی حفاظت کیلئے بعض تدابیر کی ہمیں حاجت پڑے تو کیا وہ تدابیر بدعت کہلائیں گی؟ معاذ اللہ! ہرگز نہیں، بدعت وہ ہے جو اپنی حقیقت میں سنت نبویہ کے معارض اور نقیض واقع ہو اور آثار نبویہ میں اس کام کے کرنے کے بارے میں زجر اور تہدید پائی جائے اور اگر صرف جدت انتظام اور نئی تدبیر پر بدعت کا نام رکھنا ہے تو پھر اسلام میں بدعتوں کو گنتے جاؤ کچھ شمار بھی ہے۔ علم صرف بھی بدعت ہوگا اور علم نحو بھی اور علم کلام بھی اور حدیث کا لکھنا اور اس کا موبہ اور مرتب کرنا سب بدعات ہوں گے، ایسا ہی ریل کی سواری میں چڑھنا کلوں کا کپڑا پہننا ڈاک میں خط ڈالنا، تار کے ذریعہ سے کوئی خبر منگوانا اور بندوق اور توپوں سے لڑائی کرنا تمام یہ کام بدعات میں داخل ہوں گے بلکہ بندوق اور توپوں سے لڑائی کرنا نہ صرف بدعت بلکہ ایک گناہ عظیم ٹھہرے گا کیونکہ ایک حدیث صحیح میں ہے کہ آگ کے عذاب سے کسی کو ہلاک کرنا سخت ممنوع ہے۔ صحابہ سے زیادہ سنت کا قبیح کون ہو سکتا ہے مگر انہوں نے بھی سنت کے وہ معنی نہ سمجھے جو میاں رحیم بخش نے سمجھے۔ انہوں نے تدبیر اور انتظام کے طور پر بہت سے ایسے جدید کام کئے کہ جو نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے اور نہ قرآن کریم میں وارد ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی محدثات ہی دیکھو جن کا ایک رسالہ بنتا ہے۔ اسلام کیلئے بجز تاریخ انہوں نے مقرر کی اور شہروں کی حفاظت کیلئے کوتوال مقرر کئے اور بیت المال کیلئے ایک باضابطہ دفتر تجویز کیا۔ جنگی فوج کیلئے قواعد رخصت اور حاضری ٹھہرائے اور ان کے لڑنے کے دستور مقرر کئے اور مقدمات مال وغیرہ کے رجوع کیلئے خاص خاص ہدایتیں مرتب کیں اور حفاظت رعایا کیلئے بہت سے قواعد اپنی طرف سے تجویز کر کے شائع کئے اور خود کبھی کبھی اپنے عہد خلافت میں پوشیدہ طور پر رات کو پھرنا اور رعایا کا حال اس طرح سے معلوم کرنا اپنا خاص کام ٹھہرایا لیکن کوئی ایسا نیا کام اس عاجز نے تو نہیں کیا صرف طلب علم اور مشورہ امداد اسلام اور ملاقات انخوان کے لئے یہ جلسہ تجویز کیا۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۶۰۹ تا ۶۱۳)

اور سرحد پر اپنے گھوڑے باندھے رکھو کہ خدا کے دشمن اور تمہارے دشمن اس تمہاری تیاری اور استعداد

رباط ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جو دشمن کی سرحد پر باندھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحابہ کو اعداء کے مقابلہ کے لیے مستعد رہنے کا حکم دیتا ہے اور اس رباط کے لفظ سے انہیں پوری اور سچی تیاری کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان کے سپرد دو کام تھے۔ ایک ظاہری دشمنوں کا مقابلہ اور ایک وہ روحانی مقابلہ کرتے تھے اور رباط لغت میں نفس اور انسانی دل کو بھی کہتے ہیں اور یہ ایک لطیف بات ہے کہ گھوڑے وہی کام آتے ہیں جو سدھائے ہوئے اور تعلیم یافتہ ہوں آج کل گھوڑوں کی تعلیم و تربیت کا اسی انداز پر لحاظ رکھا جاتا ہے اور اسی طرح ان کو سدھایا، سکھایا جاتا ہے جس طرح بچوں کو سکولوں میں خاص احتیاط اور اہتمام سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر ان کو تعلیم نہ دی جائے اور وہ سدھائے نہ جائیں تو وہ بالکل نکلے ہوں اور بجائے مفید ہونے کے خوفناک اور مضر ثابت ہوں۔

یہ اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ انسانوں کے نفوس یعنی رباط بھی تعلیم یافتہ چاہئیں اور ان کے قوی اور طاقتیں ایسی ہونی چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کے نیچے نیچے چلیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اس حرب اور جدال کا کام نہ دے سکیں گے جو انسان اور اس کے خوفناک دشمن یعنی شیطان کے درمیان اندرونی طور پر ہر لحظہ اور ہر آن جاری ہے جیسا کہ لڑائی اور میدان جنگ میں علاوہ قوائے بدنی کے تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح اس اندرونی حرب اور جہاد کے لیے نفوسِ انسانی کی تربیت اور مناسب تعلیم مطلوب ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شیطان اس پر غالب آجائے گا اور وہ بہت بری طرح ذلیل اور رسوا ہوگا مثلاً اگر ایک شخص توپ و تفنگ، اسلحہ حرب بندوق وغیرہ تو رکھتا ہو لیکن اس کے استعمال اور چلانے سے ناواقف محض ہو تو وہ دشمن کے مقابلہ میں کبھی عہدہ برانہیں ہو سکتا اور تیر تفنگ اور سامان حرب بھی ایک شخص رکھتا ہو اور ان کا استعمال بھی جانتا ہو لیکن اس کے بازو میں طاقت نہ ہو تو بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتا اس سے معلوم ہوا کہ صرف طریق اور طرز استعمال کا سیکھ لینا بھی کارآمد اور مفید نہیں ہو سکتا جب تک کہ ورزش اور مشق کر کے بازو میں توانائی اور قوت پیدا نہ کی جاوے۔ اب اگر ایک شخص جو تلوار چلانا تو جانتا ہے لیکن ورزش اور مشق نہیں رکھتا تو میدان حرب میں جا کر جو نہی تین چار دفعہ تلوار کو حرکت دے گا اور دو ایک ہاتھ مارے گا۔ اس کے بازو نکلے ہو جائیں گے اور وہ تھک کر بالکل بیکار ہو جائے گا اور خود ہی آخر دشمن کا شکار ہو جائے گا۔

پس سمجھ لو اور خوب سمجھ لو کہ نرا علم و فن اور خشک تعلیم بھی کچھ کام نہیں دے سکتی جب تک کہ عمل اور مجاہدہ اور ریاضت نہ ہو۔ دیکھو! سرکار بھی فوجوں کو اسی خیال سے بیکار نہیں رہنے دیتی۔ عین امن و آرام کے دنوں میں بھی مصنوعی جنگ برپا کر کے فوجوں کو بیکار نہیں ہونے دیتی اور معمولی طور پر چاند ماری اور پریڈ وغیرہ تو

ہوتی رہتی ہے۔

جیسا ابھی میں نے بیان کیا کہ میدان کارزار میں کامیاب ہونے کے لیے جہاں ایک طرف طریق استعمال اسلحہ وغیرہ کی تعلیم اور واقفیت کی ضرورت ہے وہاں دوسری طرف ورزش اور محل استعمال کی بھی بڑی بھاری ضرورت ہے اور نیز حرب و ضرب میں تعلیم یافتہ گھوڑے چاہئیں۔ یعنی ایسے گھوڑے جو توپوں اور بندوقوں کی آواز سے نہ ڈریں اور گردوغبار سے پراگندہ ہو کر پیچھے نہ ہٹیں بلکہ آگے ہی بڑھیں۔ اسی طرح نفوس انسانی کامل ورزش اور پوری ریاضت اور حقیقی تعلیم کے بغیر اعداء اللہ کے مقابل میدان کارزار میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

لغت عرب بھی عجیب چیز ہے۔ مقابلہ بھی اسی پر ختم ہے۔ رباط کا لفظ جو آیت مذکورہ میں آیا ہے جہاں دنیاوی جنگ وجدل اور فنون جنگ کی فلاسفی پر مشتمل ہے۔ وہاں روحانی طور پر اندرونی جنگ اور مجاہدہ نفس کی حقیقت اور خوبی کو بھی ظاہر کرتا ہے یہ ایک عجیب سلسلہ ہے... اب دیکھو کہ یہی رباط کا لفظ جو ان گھوڑوں پر بولا جاتا ہے جو سرحد پر دشمنوں سے حفاظت کے لیے باندھے جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہ لفظ ان نفسوں پر بھی بولا جاتا ہے جو اس جنگ کی تیاری کے لیے تعلیم یافتہ ہوں جو انسان کے اندر ہی اندر شیطان سے ہر وقت جاری ہے۔ یہ بالکل ٹھیک بات ہے کہ اسلام کو دو قوتیں جنگ کی دی گئی تھیں ایک قوت وہ تھی جس کا استعمال صدر اول میں بطور مدافعت و انتقام کے ہوا یعنی مشرکین عرب نے جب ستایا اور تکلیفیں دیں تو ایک ہزار نے ایک لاکھ کفار کا مقابلہ کر کے شجاعت کا جوہر دکھایا اور ہر امتحان میں اس پاک قوت و شوکت کا ثبوت دیا۔ وہ زمانہ گزر گیا اور رباط کے لفظ میں جو فلاسفی ظاہر ہے قوت جنگ اور فنون جنگ کی مخفی تھی وہ ظاہر ہو گئی ہے۔

اب اس زمانہ میں جس میں ہم ہیں جنگ ظاہری کی مطلق ضرورت اور حاجت نہیں بلکہ آخری دنوں میں جنگ باطنی کے نمونے دکھانے مطلوب تھے اور روحانی مقابلہ زیر نظر تھا کیونکہ اس وقت باطنی ارتداد اور الحاد کی اشاعت کے لیے بڑے بڑے سامان اور اسلحہ بنائے گئے۔ اس لیے ان کا مقابلہ بھی اسی قسم کے اسلحوں سے ضروری ہے کیونکہ آج کل امن و امان کا زمانہ ہے اور ہم کو ہر طرح کی آسائش اور امن حاصل ہے۔ آزادی سے ہر آدمی اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ اور احکام کی بجا آوری کر سکتا ہے۔ پھر اسلام جو امن کا سچا حامی ہے بلکہ حقیقتاً امن اور سلم اور آشتی کا اشاعت کنندہ ہی اسلام ہے کیوں کہ اس زمانہ امن و آزادی میں اس پہلے نمونہ کو دکھانا پسند کر سکتا تھا پس آج کل وہی دوسرا نمونہ یعنی روحانی مجاہدہ مطلوب ہے کیونکہ

ع کہ حلوا چو یک بار خوردند و بس

ایک اور بات بھی ہے کہ اس پہلے نمونہ کے دکھانے میں ایک اور امر بھی ملحوظ تھا یعنی اس وقت اظہار شجاعت بھی مقصود تھا جو اس وقت کی دنیا میں سب سے زیادہ محمود اور محبوب وصف سمجھی جاتی تھی اور اس وقت تو حرب ایک فن ہو گیا ہے کہ دور بیٹھے ہوئے بھی ایک آدمی توپ اور بندوق چلا سکتا ہے۔ ان دنوں میں سچا بہادر وہ تھا جو تلواروں کے سامنے سینہ سپر ہوتا اور آج کل کا فن حرب تو بزدلوں کا پردہ پوش ہے۔ اب شجاعت کا کام نہیں بلکہ جو شخص آلات حرب جدید اور نئی توپیں وغیرہ رکھتا اور چلا سکتا ہے وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس حرب کا مدعا اور مقصد مومنوں کے مخفی مادہ شجاعت کا اظہار تھا اور خدا تعالیٰ نے جیسا چاہا خوب طرح اسے دنیا پر ظاہر کیا۔ اب اس کی حاجت نہیں رہی اس لیے کہ اب جنگ نے فن اور مکیدہ اور خدیع کی صورت اختیار کر لی ہے اور نئے نئے آلات حرب اور پیچیدار فنون نے اس قیمتی اور قابل فخر جوہر کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ابتدائے اسلام میں دفاعی لڑائیوں اور جسمانی جنگوں کی اس لیے بھی ضرورت پڑتی تھی کہ دعوت اسلام کرنے والے کا جواب ان دنوں دلائل و براہین سے نہیں بلکہ تلوار سے دیا جاتا تھا اس لیے لاچار جواب الجواب میں تلوار سے کام لینا پڑا لیکن اب تلوار سے جواب نہیں دیا جاتا بلکہ قلم اور دلائل سے اسلام پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے چاہا کہ سیف (تلوار) کا کام قلم سے لیا جائے اور تحریر سے مقابلہ کر کے مخالفوں کو پست کیا جاوے اسی لیے اب کسی کوشایاں نہیں کہ قلم کا جواب تلوار سے دینے کی کوشش کرے۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

اس وقت جو ضرورت ہے وہ یقیناً سمجھ لو! سیف کی نہیں بلکہ قلم کی ہے۔ ہمارے مخالفین نے اسلام پر جو شبہات وارد کیے ہیں اور مختلف سائنسوں اور مکاتد کی رو سے اللہ تعالیٰ کے سچے مذہب پر حملہ کرنا چاہا ہے، اس نے مجھے متوجہ کیا ہے کہ میں قلمی اسلحہ پہن کر اس سائنس اور علمی ترقی کے میدان کارزار میں اتروں اور اسلام کی روحانی شجاعت اور باطنی قوت کا کرشمہ بھی دکھاؤں۔ میں کب اس میدان کے قابل ہو سکتا تھا۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اس کی بے حد عنایت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میرے جیسے عاجز انسان کے ہاتھ سے اس کے دین کی عزت ظاہر ہو۔ میں نے ایک وقت ان اعتراضات اور حملات کو شمار کیا تھا جو اسلام پر ہمارے مخالفین نے کیے ہیں تو ان کی تعداد اس وقت میرے خیال اور اندازہ میں تین ہزار ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تو اور بھی تعداد بڑھ گئی ہوگی۔ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ اسلام کی بناء ایسی کمزور باتوں پر ہے کہ اس پر تین

ہزار اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ یہ اعتراضات تو کوتاہ اندیشوں اور نادانوں کی نظر میں اعتراض ہیں مگر میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ میں نے جہاں ان اعتراضات کو شمار کیا وہاں یہ بھی غور کیا ہے کہ ان اعتراضات کی تہہ میں دراصل بہت ہی نادر صدائیں موجود ہیں جو عدم بصیرت کی وجہ سے ان کو دکھائی نہیں دیں اور حقیقت میں یہ خدا تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جہاں ناپیدنا معترض آکر اٹکا ہے وہیں حقائق و معارف کا مخفی خزانہ رکھا ہے اور خدا تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے کہ میں ان خزانوں مدفونہ کو دنیا کو دکھاؤں اور ناپاک اعتراضات کا کیچڑ جو ان درخشاں جوہرات پر تھوپا گیا ہے اسے پاک صاف کروں۔ خدا تعالیٰ کی غیرت اس وقت بڑی جوش میں ہے کہ قرآن شریف کی ساحت عزت کو ہر ایک خبیث دشمن کے داغ اعتراض سے منزه و مقدس کرے۔

الغرض ایسی صورت میں کہ مخالفین قلم سے ہم پر وار کرنا چاہتے ہیں اور کرتے ہیں کس قدر بیوقوفی ہوگی کہ ہم ان سے لٹھم لٹھا ہونے کو تیار ہو جائیں۔ میں تمہیں کھول کر بتلاتا ہوں کہ ایسی صورت میں اگر کوئی اسلام کا نام لے کر جنگ و جدال کا طریق جواب میں اختیار کرے تو وہ اسلام کا بدنام کرنے والا ہوگا اور اسلام کا کبھی ایسا منشاء نہ تھا کہ بے مطلب اور بلا ضرورت تلوار اٹھائی جائے۔ اب لڑائیوں کی اغراض جیسا کہ میں نے کہا ہے فن کی شکل میں آکر دینی نہیں رہیں بلکہ دنیوی اغراض ان کا موضوع ہو گیا ہے۔ پس کس قدر ظلم ہوگا کہ اعتراض کرنے والوں کو جواب دینے کی بجائے تلوار دکھائی جائے۔ اب زمانہ کے ساتھ حرب کا پہلو بدل گیا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے اپنے دل اور دماغ سے کام لیں اور نفوس کا تزکیہ کریں راست بازی اور تقویٰ سے خدا تعالیٰ سے امداد اور فتح چاہیں یہ خدا تعالیٰ کا ایک اٹل قانون اور مستحکم اصول ہے کہ اگر مسلمان صرف قیل و قال اور باتوں سے مقابلہ میں کامیابی اور فتح پانا چاہیں تو یہ ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ لاف گزار اور لفظوں کو نہیں چاہتا۔ وہ تو حقیقی تقویٰ کو چاہتا اور سچی طہارت کو پسند کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۵ تا ۶۹)

وَأِنْ جَنَّحُوا لِلْإِسْلَامِ فَأَجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۗ إِنَّهُ هُوَ السَّبِيحُ الْعَلِيمُ ﴿۲۷﴾

جب وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ۔ (اسلام اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۹)

اور اگر مخالف لوگ صلح کے واسطے جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور خدا پر توکل کرو۔

(پیغام صلح، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۷۹-۸۰)

اصل میں مومن کو بھی تبلیغ دین میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔ جہاں نرمی کا موقعہ ہو وہاں سختی اور دہشتی نہ کرے اور جہاں بجز سختی کرنے کے کام ہو تا نظر نہ آوے وہاں نرمی کرنا بھی گناہ ہے۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندگی۔

دیکھو! فرعون بظاہر کیسا سخت کافر انسان تھا مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ کو یہی ہدایت ہوئی کہ قَوْلًا لَّهُ قَوْلًا لَّيِّنًا (ظہ: ۴۵) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے بھی قرآن شریف میں اسی قسم کا حکم ہے: وَإِنْ جَحَوْا لِّلْسُلْمِ فَاجْتَنِحْ لَهُمْ مَوَدَّةَ الْمُؤْمِنِينَ أُولَئِكَ يَكُونُ لَكُمْ عَدُوًّا وَلَئِنَّكُمْ لَتَكُونُونَ أَعْيُنَهُمْ فَانصِرْ لَهُمْ وَانصِرْ لِحُكْمِ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اللَّهُ يُدْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی ایسی ہی حالت بیان کی گئی جہاں فرمایا ہے کہ: مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (الفتح: ۳)۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۱۲/۱۴ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اور اگر مخالف لوگ صلح کے واسطے جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور خدا پر توکل کرو۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۲۱)

وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِذُنُوبِكُمْ  
بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۱﴾

اور اگر صلح کے وقت دل میں دغا رکھیں تو اس دغا کے تدارک کے لیے خدا تجھے کافی ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۲۱)

وَأَلْفَ بَيْنٍ قُلُوبِهِمْ ۗ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۗ  
لَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ ۗ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۱﴾

ہمارے ہادی اکمل کے صحابہ نے اپنے خدا اور رسول کے لیے کیا کیا جان نثاریاں کیں۔ جلاوطن ہوئے، ظلم اٹھائے، طرح طرح کے مصائب اٹھائے، جانیں دے دیں لیکن صدق و وفا کے ساتھ قدم مارے ہی گئے۔ پس وہ کیا بات تھی کہ جس نے انہیں ایسا جان نثار بنا دیا وہ سچی الہی محبت کا جوش تھا جس کی شعاع ان کے دل میں پڑ چکی تھی۔ سوخواہ کسی نبی کے ساتھ مقابلہ کر لیا جاوے۔ آپ کی تعلیم، تزکیہ نفس، پیروؤں کو دنیا

سے متفرک را دینا، شجاعت کے ساتھ صداقت کے لیے خون بہا دینا۔ اس کی نظیر کہیں نہ مل سکے گی۔ سو یہ مقام حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہؓ کا ہے اور ان میں جو آپس میں تالیف و محبت تھی اس کا نقشہ و فقروں میں بیان کیا ہے: **وَ اَلْفَ بَیِّنَ قُلُوْبِهِمْ ۗ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلْفَتْ بَیِّنَ قُلُوْبِهِمْ** (پ ۱۰) یعنی جو تالیف ان میں ہے۔ وہ ہرگز پیدا نہ ہوتی۔ خواہ سونے کا پہاڑ بھی دیا جاتا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۳-۵۵)

ہماری کوششیں تو بچوں کا کھیل ہے۔ نہ لوگوں کے دلوں سے ہم وہ گند نکال سکتے ہیں جو آج کل دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے، نہ کمال محبت الہی کا ان کے اندر بھر سکتے ہیں، نہ ان کے درمیان باہمی کمال الفت پیدا کر سکتے ہیں جس سے وہ سب مثل ایک وجود کے ہو جائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے چنانچہ قرن شریف میں صحابہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے: **هُوَ الَّذِیْ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهِ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَلْفَ بَیِّنَ قُلُوْبِهِمْ ۗ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلْفَتْ بَیِّنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لَکِنَّ اللّٰهَ اَلْفَ بَیِّنُهُمْ ۗ اِنَّہٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ**۔ وہ خدا جس نے اپنی نصرت سے اور مومنوں سے تیری تائید کی اور ان کے دلوں میں ایسے الفت ڈالی کہ اگر تو ساری زمین کے ذخیرے خرچ کرتا تو بھی ایسی الفت پیدا نہ کر سکتا لیکن خدا نے ان میں یہ الفت پیدا کر دی وہ غالب اور حکمتوں والا خدا ہے جس خدا نے پہلے یہ کام کیا وہ اب بھی کر سکتا ہے آئندہ بھی اسی پر توکل ہے۔ جو کام ہونے والا ہوتا ہے۔ اس میں خدا کے فضل کی روح پھونکی جاتی ہے جیسا کہ باغبان اپنے باغ کی آبپاشی کرتا ہے تو وہ تروتازہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ اپنے مرسلین کے سلسلہ کو ترقی اور تازگی عطا فرماتا ہے۔ جو فرقے صرف اپنی تدبیر سے بنتے ہیں ان کے درمیان چند روز میں ہی فرقے پیدا ہو جاتے ہیں جیسا کہ برہموتھوڑے دن تک ترقی کرتے کرتے آخر رک گئے اور دن بدن نابود ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ان کی بنا صرف انسانی خیال پر ہے۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت قوم عرب کے تمدن اور اخلاق اور روحانیت کا کیا حال تھا گھر گھر میں جنگ اور شراب نوشی اور زنا اور لوٹ مار غرض ہر ایک بدی موجود تھی۔ کوئی نسبت اور تعلق خدا کے ساتھ اور اخلاق فاضلہ کے ساتھ کسی کو حاصل نہ تھا۔ ہر ایک فرعون بنا پھرتا تھا لیکن آنحضرتؐ کے آنے سے جب اسلام میں داخل ہوئے تو ایسی محبت الہی اور وحدت کی روح ان میں پیدا ہو گئی کہ ہر ایک خدا کی راہ

میں مرنے کے لیے تیار ہو گیا، انہوں نے بیعت کی حقیقت کو ظاہر کر دیا اور اپنے عمل سے اس کا نمونہ دکھا دیا۔  
(بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

کیا کوئی اس قوم کی نسبت خیال کر سکتا تھا کہ یہ قوم باہم متحد ہوگی اور خدا تعالیٰ سے ایسا قوی تعلق پیدا کریں گے کہ باوجودیکہ یہ فرعون سیرت ہیں لیکن اس کی اطاعت میں ایسے مجبور فنا ہوں گے کہ جان عزیز کو بھی اس کی راہ میں دے دیں گے غور کرو کہ کیا یہ آسان امر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایک ایسی قوم میں ایسی محبت الہی کا پیدا کر دینا کہ وہ مرنے کو تیار ہو جائیں خود آپؐ کی اعلیٰ درجہ کی قوت قدسی کو ظاہر کرتا ہے۔  
(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

## تفسیر سورۃ التوبۃ

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فَسِیْحُوا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اَعْلَمُوْا اَنَّكُمْ غَیْبُ مُعْجِزِی اللّٰهِ لَا وَاَنَّ

اللّٰهُ مُخْزِی الْكٰفِرِیْنَ ①

وَاَعْلَمُوْا اَنَّكُمْ غَیْبُ مُعْجِزِی اللّٰهِ الخ اور تم یقیناً جانو کہ تم خدا کو اس کے کاموں میں کبھی عاجز نہیں کر سکتے۔ اور خدا تمہیں رسوا کرے گا۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۶۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجْرُهُ حَتّٰی یَسْمَعَ كَلِمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلَغُهُ

مَآمَنَةً ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا یَعْلَمُوْنَ ①

اگر تجھ سے اے رسول کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دے دو اور اُس وقت تک اُس کو اپنی پناہ میں رکھو کہ وہ اطمینان سے خدا کے کلام کو سن سمجھ لے اور پھر اُس کو اُس کے امن کی جگہ پر واپس پہنچا دو۔ یہ رعایت ان لوگوں کے حق میں اس وجہ سے کرنی ضرور ہے کہ یہ لوگ اسلام کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن شریف جبر کی تعلیم کرتا تو یہ حکم نہ دیتا کہ جو کافر قرآن شریف کو سننا چاہے تو جب وہ سن چکے اور مسلمان نہ ہو تو اُس کو اُس کے امن کی جگہ پر پہنچا دینا چاہئے بلکہ یہ حکم دیتا کہ جب ایسا کافر قابو میں آ جاوے تو وہیں اُس کو مسلمان کر لو۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۳۳)

اگر کوئی مشرک قرآن شریف کو سننا چاہے تو اس کو اپنی پناہ میں لے آؤ جب تک وہ کلام الہی کو سننے پھر اس کو اسی کے مامن میں پہنچا دو اور اس آیت کے آگے یہ آیت ہے ذَلِكْ بِاِنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ یعنی یہ رعایت اس لیے ہے کہ یہ قوم بے خبر ہے۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۶۳، ۲۶۴)

اگر لڑائی کے ایام میں کوئی شخص مشرکوں میں سے خدا کے کلام کو سننا چاہے تو اس کو پناہ دے دو جب تک کہ وہ خدا کے کلام کو سن لے اور پھر اس کو اپنے امن کی جگہ میں پہنچا دو کیونکہ وہ ایک جاہل قوم ہے اور نہیں جانتے کہ وہ کس سے لڑائی کر رہے ہیں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۹۳)

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عٰهَدْتُمْ  
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقْبِمُوا لَهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَحِبُّ  
الْمُتَّقِينَ ۝

کَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ ۚ جِس کا مطلب یہی ہے کہ بعد عہدوں کے توڑنے کے ان کے قول و اقرار کا کیا اعتبار رہا۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۶۴)

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ اِلَّا وَا لَا ذِمَّةً ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ ۝

یہ مشرک نہ کسی عہد کا پاس کرتے ہیں اور نہ کسی قرابت کا اور حد سے نکل جانے والے ہیں۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۶۴)

وَ اِنْ تَكَثَّرُوْا اَيْبَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَكَاتِبُوْا  
اَيْمَةَ الْكُفْرِ ۗ اِنَّهُمْ لَا اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ اَلَا تَقَاتِلُوْنَ قَوْمًا  
تَكَثَّرُوْا اَيْبَانَهُمْ وَ هُمُوْا بِاَخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۗ  
اَنْخَشُوْهُمْ ۗ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

یہ نہایت درجہ کا ظلم ہے کہ اسلام کو ظالم کہا جاتا ہے حالانکہ ظالم وہ خود ہیں جو تعصب کی وجہ سے بے سوچے سمجھے اسلام پر بے جا اعتراض کرتے ہیں اور باوجود بار بار سمجھانے کے نہیں سمجھتے کہ اسلام کے کل

جنگ اور مقابلے کفار مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر دفاعی رنگ میں حفاظت جان و مال کی غرض سے تھے اور کوئی بھی حرکت مسلمانوں کی طرف سے ایسی سرزد نہیں ہوئی جس کا ارتکاب اور ابتداء پہلے کفار کی طرف سے نہ ہوا ہو۔ بلکہ بعض قابل نفیر حرکات کا مقابلہ بتقاضائے وسعت اخلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمداً ترک کرنے کا حکم دے دیا تھا مثلاً کفار میں ایک سخت قابل نفرت رسم تھی جو کہ وہ مسلمان مردوں سے کیا کرتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیح فعل سے مسلمانوں کو قطعاً روک دیا۔

قرآن شریف میں بڑی بسط اور تفصیل سے اس امر کا ذکر موجود ہے مگر کوئی غور کرنے والا اور بے تعصب دل سچائی اور حق کی پیاس بھی اپنے اندر رکھتا ہو۔ قرآن شریف میں صاف طور سے اس امر کا ذکر آ گیا ہے۔

هُمۡ بَدَءُوۡكُمْۙ اَوَّلَۙ مَکُوۡتٍۙ لِّعَنٰیۙ ہر ایک شرارت اور فساد کا ابتداء پہلے کفار کی طرف سے ہوا ہے۔.....

اب جائے غور ہے کہ قرآن شریف نے جن اضطراری حالتوں میں جنگ کرنے کی اجازت دی ہے ان میں سے آج اس زمانہ میں کوئی بھی حالت موجود ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی جبر و تشدد کسی دینی معاملہ میں ہم پر نہیں کیا جاتا بلکہ ہر ایک کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے۔ اب نہ کوئی جنگ کرتا ہے کسی دینی غرض کے لیے اور نہ ہی لونڈی غلام کوئی بناتا ہے نہ کوئی نماز روزے اذان حج اور ارکان اسلام کی ادائیگی سے روکتا ہے تو پھر جہاد کیسا اور لونڈی غلام کیسے؟

اگر یہ مشرک توڑیں قسمیں اپنی بعد عہد کرنے کے اور تمہارے دین میں طعن کریں تو تم کفر کے سرداروں سے لڑو کیونکہ وہ اپنی قسموں پر قائم نہیں رہے تاکہ وہ باز آ جائیں کیا تم ایسے لوگوں سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا اور رسول کو نکال دینے کا قصد کیا اور انہوں نے ہی اڈل ایذا اور قتل کے لئے اقدام کیا۔ اب تمام ان آیات پر نظر غور ڈال کر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اس مقام سے جبر کو کچھ بھی تعلق نہیں بلکہ مشرکین عرب نے اپنے ایذا اور خونریزیوں کو یہاں تک پہنچا کر اپنے تئیں اس لائق کر دیا تھا کہ جیسا کہ انہوں نے مسلمانوں کے مردوں کو قتل کیا اور ان کی عورتوں کو سخت بے رحمی سے مارا اور ان کے بچوں کو قتل کیا۔ وہ اس لائق ٹھہر گئے تھے کہ حضرت موسیٰ کے قانون جہاد کے موافق ان کی عورتیں بھی قتل کی جائیں ان کے بچے بھی قتل کئے جائیں اور ان کے جوان و بڑھے سب تہ تیغ کئے جائیں اور ان کو اپنے وطنوں سے جلا وطن کر کے ان کے شہروں اور دیہات کو پھونکا جائے۔ لیکن ہمارے نبی صلعم نے ایسا نہ کیا بلکہ ہر طرح سے ان کو رعایت دی یہاں تک کہ باوجود ان کے واجب القتل ہونے کے جو اپنی

خونریزیوں کی وجہ سے وہ اس کے لائق ہو گئے تھے ان کو یہ بھی رعایت دی گئی کہ اگر کوئی ان میں سے اپنی مرضی سے دین اسلام اختیار کرے تو امن میں آجائے۔

اب اس نرم اور پُرِ حرم طریق پر اعتراض کیا جاتا ہے اور حضرت موسیٰ کی لڑائیوں کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ افسوس ہزار افسوس اگر اس وقت انصاف ہو تو اس فرق کا سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا۔ تعجب کہ وہ خدا جس نے حضرت موسیٰ کو حکم دے دیا کہ تم مصر سے ناحق بے موجب لوگوں کے برتن اور زیور مستعار طور پر لے کر اور دروغ گوئی کے طور پر ان چیزوں کو اپنے قبضہ میں کر کے پھر اپنا مال سمجھ لو اور دشمنوں کے مقابل پر ایسی بے رحمی کرو کہ کئی لاکھ بچے اُن کے قتل کر دو اور لوٹ کا مال لے لو اور ایک حصّہ خدا کا اُس میں سے نکالو اور حضرت موسیٰ جس عورت کو چاہیں اپنے لئے پسند کریں اور بعض صورتوں میں جزیہ بھی لیا جائے اور مخالفوں کے شہر اور دیہات چھوٹے جائیں۔ اور وہی خُدا ہمارے نبی صلعم کے وقت میں باوجود اپنی ایسی نرمیوں کے فرماتا ہے بچوں کو قتل نہ کرو، عورتوں کو قتل نہ کرو، راہبوں سے کچھ تعلق نہ رکھو، کھیتوں کو مت جلاؤ، گرجاؤں کو مسامرت کرو اور انہیں کا مقابلہ کرو جنہوں نے اول تمہارے قتل کرنے کے لئے پیش قدمی کی ہے اور پھر اگر وہ جزیہ دے دیں یا اگر عرب کے گروہ میں سے ہیں جو اپنی سابقہ خونریزیوں کی وجہ سے واجب القتل ہیں تو ایمان لانے پر اُن کو چھوڑ دو۔ اگر کوئی شخص کلام الہی سُننا چاہتا ہے تو اُس کو اپنی پناہ میں لے آؤ اور جب وہ سن چکے تو اس کو اُس کی امن کی جگہ میں پہنچا دو۔ افسوس کہ اب وہی خدا مورد اعتراض ٹھہرایا گیا ہے۔ افسوس کہ ایسی عُمده اور اعلیٰ تعلیم پر وہ لوگ اعتراض کر رہے ہیں جو توریث کی اُن خونریزیوں کو جن سے بچے بھی باہر نہیں رہے خدائے تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۶۶ تا ۲۶۷)

جہاد میں یعنی لڑنے میں اسلام سے ابتدا نہیں ہوئی جیسا کہ فرماتا ہے: وَ هُمْ بَدَءُكُمْ اَوَّلَ مَكَّةَ لَعِنِ اٰنہیں مخالفوں نے لڑنے میں ابتدا کی پھر جبکہ انہوں نے آپ ابتدا کی، وطن سے نکالا، صدمہ بے گناہوں کو قتل کیا، تعاقب کیا اور اپنے بتوں کی کامیابی کی شہرت دی تو پھر بجز ان کی سرکوبی کے اور کون سا طریق حق اور حکمت کے مناسب حال تھا۔ اس کے مقابل حضرت موسیٰ کی لڑائیاں دیکھئے جن لوگوں کے ساتھ ہوئیں کون سی تکلیفیں اور دکھ ان سے پہنچے تھے اور کیسی بے رحمی ان لڑائیوں میں کی گئی کہ کئی لاکھ بچے بے گناہ قتل کئے گئے۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۵۶)

اُس خدا نے جو اسلام کا بانی ہے یہ نہیں چاہا کہ اسلام دشمنوں کے حملوں سے فنا ہو جائے بلکہ اس نے

دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے اور حفاظت خود اختیاری کے طور پر مقابلہ کرنے کا اذن دے دیا ہے۔ جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے: **أَلَا تَقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ - وَإِنْ جَنَحُوا لِلْسَلْمِ فَاجْتَحِ لَهَا (الانفال: ۶۲)** دیکھو سورۃ الانفال الجزو نمبر ۱۰ (ترجمہ) کیا تم ایسی قوم سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور چاہا کہ رسول خدا کو جلا وطن کر دیں اور انہوں نے ہی پہلے تمہیں قتل کرنا شروع کیا۔ اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۹۴)

**قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿۱۰﴾**

یعنی ان کو کہہ دے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہاری برادری اور تمہارے وہ مال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور تمہاری سوداگری جس کے بندہ ہونے کا تمہیں خوف ہے اور تمہاری حویلیاں جو تمہارے دل پسند ہیں۔ خدا سے اور اس کے رسول سے اور خدا کی راہ میں اپنی جانوں کو لڑانے سے زیادہ پیارے ہیں تو تم اس وقت تک منتظر ہو کہ جب تک خدا اپنا حکم ظاہر کرے اور خدا بدکاروں کو کبھی اپنی راہ نہیں دکھائے گا۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی مرضی کو چھوڑ کر اپنے عزیزوں اور اپنے مالوں سے پیار کرتے ہیں وہ خدا کی نظر میں بدکار ہیں وہ ضرور ہلاک ہوں گے کیونکہ انہوں نے غیر کو خدا پر مقدم رکھا۔ یہی وہ تیسرا مرتبہ ہے جس میں وہ شخص با خدا بنتا ہے جو اس کے لئے ہزاروں بلائیں خریدے اور خدا کی طرف ایسے صدق اور اخلاص سے جھک جائے کہ خدا کے سوا کوئی اس کا نہ رہے گویا سب مر گئے۔ پس سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم خود نہ مریں زندہ خدا نظر نہیں آسکتا۔ خدا کے ظہور کا دن وہی ہوتا ہے کہ جب ہماری جسمانی زندگی پر موت آوے۔ ہم اندھے ہیں جب تک غیر کے دیکھنے سے اندھے نہ ہو جائیں۔ ہم مردہ ہیں جب تک خدا کے ہاتھ میں مردہ کی طرح نہ ہو جائیں۔ جب ہمارا منہ ٹھیک ٹھیک اس کے محاذات میں پڑے گا تب وہ واقعی

استقامت جو تمام نفسانی جذبات پر غالب آتی ہے ہمیں حاصل ہوگی اس سے پہلے نہیں اور یہی وہ استقامت ہے جس سے نفسانی زندگی پر موت آ جاتی ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۸۳)

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿١٩﴾

ان بے ایمانوں سے لڑو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے یعنی عملی طور پر فسق و فجور میں مبتلا ہیں اور حرام کو حرام نہیں جانتے اور سچائی کی راہیں اختیار نہیں کرتے جو اہل کتاب میں سے ہیں جب تک کہ وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے دیں اور وہ ذلیل ہوں۔ دیکھو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے اس سے تو یہی ثابت ہوا کہ جو اپنی بغاوتوں کی وجہ سے حق کے روکنے والے ہیں اور ناجائز طریقوں سے حق پر حملہ کرنے والے ہیں ان سے لڑو اور ان سے دین کے طالبوں کو نجات دو۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ یہ لڑائی ابتداءً بغیر ان کے کسی حملہ کے ہوئی تھی۔ لڑائیوں کے سلسلہ کو دیکھنا از بس ضروری ہے اور جب تک آپ سلسلہ کو نہ دیکھو گے اپنے تئیں عمداً یا سہواً بڑی غلطیوں میں ڈالو گے۔ سلسلہ تو یہ ہے کہ اول کفار نے ہمارے نبی صلعم کے قتل کا ارادہ کر کے آخر اپنے حملوں کی وجہ سے ان کو مکہ سے نکال دیا۔ اور پھر تعاقب کیا اور جب تکلیف حد سے بڑھی تو پہلا حکم جو لڑائی کے لئے نازل ہوا وہ یہ تھا: اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا ۗ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۗ اَلَّذِينَ اُخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَقُولُوا رَبَّنَا اللّٰهُ (الحج: ۴۰، ۴۱)۔۔۔ اہل کتاب... دعوت حق کے مزاحم ہوئے اور مشرکوں کو انہوں نے مددیں کیں اور ان کے ساتھ مل کر اسلام کو نابود کرنا چاہا جیسا کہ مفصل ذکر اس کا قرآن شریف میں موجود ہے تو پھر جبرل نے اور دفع حملہ کے اور کیا تدبیر تھی مگر پھر بھی ان کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ فرمایا: حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ یعنی اس وقت تک ان سے لڑو جب تک یہ جزیہ ذلت کے ساتھ دے دیں اور صاف طور پر فرما دیا یعنی جہاد میں یعنی لڑنے میں اسلام سے ابتدا نہیں ہوئی۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۵۴ تا ۲۵۶)

وہ اہل کتاب کہ جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ روز آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور نہ خدا اور اُس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ دیانت اور سچائی کی راہ کو اختیار کرتے ہیں اُن سے تم لڑو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں۔

یہ آیات ہیں جن سے نادان لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ جنگ کا حکم مسلمان کرنے کے لئے ہے لیکن ان آیات کو اخیر تک پڑھ کر دیکھ لو۔ ان آیات میں مسلمان کرنے کا کہیں بھی حکم نہیں بلکہ اگر تم ان آیات کو آیت اِنِّ عِدَّةَ الشُّهُورِ (التوبۃ: ۳۶) تک پڑھو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ ان اہل کتاب کا ذکر ہے کہ جو کھلے کھلے طور پر جرائم پیشہ ہو گئے تھے اور عیسائیت اور یہودیت صرف نام کے لئے تھی ورنہ ان کو خدا پر بھی ایمان نہیں رہا تھا۔..... ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عرب کے یہود اور عیسائی ایسے بڑ گئے تھے اور اس درجہ پر وہ بدچلن ہو گئے تھے کہ جو کچھ خدا نے ان کی کتابوں میں حرام کیا تھا یعنی یہ کہ چوری نہ کریں، لوگوں کا ناحق مال نہ کھادیں، ناحق کا خون نہ کریں، جھوٹی گواہی نہ دیں، خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں یہ تمام ناجائز کام ایسی دلی رغبت سے کرتے تھے کہ گویا ان بڑے کاموں کو انہوں نے اپنا مذہب قرار دے دیا تھا۔.... اور ملک کے لئے ان کا وجود خطرناک تھا اور ان کے مفاسد حد سے بڑھ گئے تھے..... پس ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ امن عامہ قائم کرنے کے لئے ایسے جرائم پیشہ لوگوں کا تدارک ضروری تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف پیغمبری کا عہدہ رکھتے تھے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک بادشاہ بااختیار کی طرح ملکی مصالح قائم رکھنے کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس صورت میں آپ کا فرض تھا کہ بحیثیت ایک بادشاہ اور والی ملک کے شریروں اور بد معاشوں کا قراوقعی بندوبست کریں اور مظلوموں کو جو ان کی شرارتوں سے تباہ ہو گئے تھے ان کے پنجے سے چھڑوائیں پس یوں سمجھنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کے دو عہدے تھے ایک عہدہ رسالت کہ جو کچھ خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ملتا تھا وہ لوگوں کو پہنچا دیتے تھے اور دوسرا عہدہ بادشاہت اور خلافت کا۔ جس عہد کی رو سے وہ ہر ایک مفسد اور مغل امن کو سزا دے کر امن عامہ کو ملک میں قائم کر دیتے تھے اور ملک عرب کا ان دنوں میں یہ حال تھا کہ ایک طرف تو خود عرب کے لوگ اکثر لٹیرے اور فزاق اور طرح طرح کے جرائم کرنے والے تھے اور دوسری طرف جو اہل کتاب کہلاتے تھے وہ بھی سخت بدچلن تھے اور ناجائز طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے تھے اگر عرب رات کو لوٹتے تھے تو یہ لوگ دن کو ہی غریب لوگوں کی گردن پر چھری پھیرتے تھے پس جبکہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک عرب کی بادشاہی دی تو بلاشبہ آنجناب کا یہ فرض تھا کہ بد معاشوں اور مجرموں اور چوروں اور ڈاکوؤں اور مفسدوں کا بندوبست کریں اور جو لوگ جرائم سے باز نہیں آتے ان کو سزا دیں اور ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ بادشاہ کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے کہ مثلاً اگر کسی بادشاہ کی رعایا پر لوگ ڈاکہ ماریں اور ان کا مال لوٹ کر لے جاویں یا نقب

لگا کر مال لے جاویں یا طبع نفسانی سے لوگوں کو قتل کریں تو کیا اس بادشاہ کا فرض نہیں ہوگا کہ ایسے مفسد لوگوں پر چڑھائی کرے اور ایسے مفسد لوگوں کو قرار واقعی سزا دے کر ملک میں امن قائم کر دے سو یہ لڑائی اہل کتاب سے اس وجہ سے نہیں تھی کہ ان کو مسلمان کیا جائے بلکہ اس وجہ سے تھی کہ ان کی شرارتوں سے ملک کو بچایا جائے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۳۸ تا ۲۴۱)

وَ قَالَتِ الْيَهُودُ عِزِّيُّ بْنُ اللَّهِ وَ قَالَتِ النَّصْرِيُّ الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِكِ  
قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهَوْنَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى  
يُؤْفَكُونَ ﴿۳۰﴾

اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ مسیح کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں یہ سب ان کے منہ کی باتیں ہیں جن کی صداقت پر کوئی حجت قائم نہیں کر سکتے بلکہ صرف پہلے زمانہ کے مشرکوں کی ریس کر رہے ہیں۔ ملعونوں نے سچائی کا راستہ کیسا چھوڑ دیا۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۴ حاشیہ نمبر ۳) کہا بعض یہود نے کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور کہا نصاریٰ نے مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں جن کا کوئی بھی ثبوت نہیں۔ ریس کرنے لگے ان لوگوں کی جو پہلے اس سے کافر ہو چکے یعنی جو انسانوں کو خدا اور خدا کے بیٹے قرار دے چکے۔ یہ ہلاک کیے جائیں۔ کیسے یہ تعلیم سے پھر گئے۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۶۷)

یہود نے کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ سب ان کے منہ کی باتیں ہیں یہ لوگ ان لوگوں کی ریس کرتے ہیں جو ان سے پہلے بعض انسانوں کو خدا بنا کر کافر ہو گئے۔ خدا کے ماروں نے کہاں سے کہاں پلٹا کھایا۔ سو یہ آیت صریح ہندوؤں اور یونانیوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور بتلا رہی ہے جو پہلے انسانوں کو انہیں لوگوں نے خدا قرار دیا۔ پھر عیسائیوں کی بد قسمتی سے یہ اصول ان تک پہنچ گئے۔ تب انہوں نے کہا کہ ہم ان قوموں سے کیوں پیچھے رہیں اور ان کی بدبختی سے تو ریت میں پہلے سے یہ محاورہ تھا کہ انسانوں کو بعض مقامات میں خدا کے بیٹے قرار دیا تھا بلکہ خدا کی بیٹیاں بھی بلکہ بعض گذشتہ لوگوں کو خدا بھی کہا گیا تھا۔ اس عام محاورہ کے لحاظ سے مسیح پر بھی انجیل میں ایسا ہی لفظ بولا گیا پس وہی لفظ نادانوں کے لئے زہر قاتل ہو گیا تمام بائبل دہائی دے رہی ہے کہ یہ لفظ ابن مریم سے کچھ خاص

نہیں ہر ایک نبی اور راستباز پر بولا گیا ہے بلکہ یعقوب نخست زادہ کہلایا ہے مگر بد قسمت انسان جب کسی پیچ میں پھنس جاتا ہے تو پھر اس سے نکل نہیں سکتا پھر عجیب تر یہ کہ جو کچھ مسیح کی خدائی کے لئے قواعد بیان کئے گئے ہیں کہ وہ خدا بھی ہے انسان بھی۔ یہ تمام قواعد کرشن اور رام چندر کے لیے ہندوؤں کی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں اور اس نئی تعلیم سے ایسے مطابق پڑے ہیں کہ ہم بجز اس کے اور کوئی بھی رائے ظاہر نہیں کر سکتے کہ یہ تمام ہندوؤں کے عقیدوں کی نقل کی گئی ہے۔ ہندوؤں میں ترے مورتی کا بھی عقیدہ تھا جس سے برہما۔ بشن۔ مہادیو کا مجموعہ مراد ہے۔ سوتیلیٹ ایسے عقیدے کا عکس کھینچا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ جو کچھ مسیح کے خدا بنانے کے لئے اور عقلی اعتراضوں سے بچنے کے لئے عیسائی لوگ جوڑ توڑ کر رہے ہیں اور مسیح کی انسانیت کو خدائی کے ساتھ ایسے طور سے پیوند دے رہے ہیں جس سے ان کی غرض یہ ہے کہ کسی طرح عقلی اعتراضوں سے بچ جائیں اور پھر بھی وہ کسی طرح بچ بھی نہیں سکتے اور آخر اسرار الہی میں داخل کر کے پیچھا چھوڑاتے ہیں بعینہ یہی نقشہ ان ہندوؤں کا ہے جو رام چندر اور کرشن کو ایشر قرار دیتے ہیں یعنی وہ بھی بعینہ وہی باتیں سناتے ہیں جو عیسائی سنایا کرتے ہیں اور جب ہر ایک پہلو سے عاجز آ جاتے ہیں۔ تب کہتے ہیں کہ یہ ایک ایشر کا بھید ہے اور انہیں پر کھلتا ہے جو جوگ کھاتے اور دنیا کو تیا گتے اور پتیا کرتے ہیں لیکن یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ بھید تو اسی وقت کھل گیا جبکہ ان جھوٹے خداؤں نے اپنی خدائی کا کوئی ایسا نمونہ نہ دکھلایا جو انسان نے نہ دکھلایا ہو۔ سچ ہے کہ گرتھوں میں یہ قصے بھرے پڑے ہیں کہ ان اوتاروں نے بڑی بڑی شکتی کے کام کئے ہیں مردے جلانے اور پہاڑوں کو سر پر اٹھالیا۔ لیکن اگر ہم ان کہانیوں کو سچ مان لیں تو یہ لوگ خود قائل ہیں کہ بعض ایسے لوگوں نے بھی کرشمے دکھلائے جنہوں نے خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ مثلاً ذرہ سوچ کر دیکھ لو کہ کیا مسیح کے کام موسیٰ کے کاموں سے بڑھ کر تھے بلکہ مسیح کے نشانوں کو تو تالاب کے قصہ نے خاک میں ملا دیا۔ کیا آپ لوگ معجزہ نماتا تالاب سے واقف نہیں جو اسی زمانہ میں تھا اور کیا اسرائیل میں ایسے نبی نہیں گزرے جن کے بدن کے چھونے سے مردے زندہ ہوئے پھر خدائی کی شیخی مارنے کے لئے کون سی وجوہات ہیں جائے شرم !!!

اور اگرچہ ہندوؤں نے اپنے اوتاروں کی نسبت شکتی کے کام بہت لکھے ہیں اور خواہ نخواہ ان کو پر میشر ثابت کرنا چاہا ہے مگر وہ قصے بھی عیسائیوں کے بے ہودہ قصوں سے کچھ کم نہیں ہیں اور اگر فرض بھی کریں کہ کچھ ان میں سے صحیح بھی ہے۔ تب بھی عاجز انسان جو ضعف اور ناتوانی کا خمیر رکھتا ہے۔ پر میشر نہیں ہو سکتا اور احیاء

حقیقی تو خود باطل اور الہی کتابوں کے مخالف۔ ہاں اعجازی احیاء جس میں دنیا کی طرف رجوع کرنا اور دنیا میں پھر آباد ہونا نہیں ہوتا۔ ممکن تو ہے مگر خدائی کی دلیل نہیں کیونکہ اس کے مدعی عام ہیں مردوں سے باتیں کرا دینے والے بہت گزرے ہیں مگر یہ طریق کشف قبور کے قسم میں سے ہے۔ ہاں ہندوؤں کو عیسائیوں پر ایک فضیلت بے شک ہے۔ اس کے بلاشبہ ہم قائل ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ ہندوں کو خدا بنانے میں عیسائیوں کے پیشرو ہیں۔ انہیں کے ایجاد کی عیسائیوں نے بھی پیروی کی۔ ہم کسی طرح اس بات کو چھپا نہیں سکتے کہ جو کچھ عیسائیوں نے عقلی اعتراضوں سے بچنے کے لئے باتیں بنائی ہیں یہ باتیں انہوں نے اپنے دماغ سے نہیں نکالیں بلکہ شاستروں اور گرتھوں میں سے چرائی ہیں یہ تمام تو وہ طوفان پہلے ہی سے برہمنوں نے کرشن اور رام چندر کے لئے بنا رکھا تھا جو عیسائیوں کے کام آیا پس یہ خیال بدیہی البطلان ہے کہ شاید ہندوؤں نے عیسائیوں کی کتابوں میں سے چرایا ہے کیونکہ ان کی یہ تحریریں اس وقت کی ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ کا وجود بھی دنیا میں نہیں تھا۔ پس ناچار ماننا پڑا کہ چور عیسائی ہی ہیں چنانچہ پوٹ صاحب بھی اس بات کے قائل ہیں کہ ”مثلیث افلاطون کے لئے ایک غلط خیال کی پیروی کا نتیجہ ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ یونان اور ہند اپنے خیالات میں مرایا متقابلہ کے طرح تھے۔ قریب قیاس یہ ہے کہ یہ شرک کے انبار پہلے ہند سے ویدودیا کی صورت میں یونان میں گئے۔ پھر وہاں سے نادان عیسائیوں نے چراچرا کر انجیل پر حاشیے چڑھائے اور اپنا نامہ اعمال درست کیا۔“ (نور القرآن، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۳۶۱ تا ۳۶۲)

اتَّخَذُواْ اٰحْبَادَهُمْ وُرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالسَّبِيْحِ ابْنَ مَرْيَمَ ؕ  
مَاْ اَمْرُوْا۟ اِلَّا لِيَعْبُدُوْا۟ اِلٰهًا وَّاحِدًا ؕ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

یعنی یہودیوں نے اپنے مولویوں اور درویشوں کو کہ جو مخلوق اور غیر خدا ہیں اپنے رب اور قاضی الحاجات ٹھہرا رکھے ہیں۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۳ تا ۶۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

ملعونوں نے سچائی کا رستہ کیسا جھوٹ دیا۔ اپنے فقیہوں اور درویشوں اور مریم کے بیٹے کو خدا ٹھہرا لیا ہے حالانکہ حکم یہ تھا کہ فقط خدائے واحد کی پرستش کرو خدا اپنی ذات میں کامل ہے۔ اس کو کچھ حاجت نہیں کہ بیٹا بناوے۔ کون سی کسر اس کی ذات میں رہ گئی تھی جو بیٹے کے وجود سے پوری ہوگئی۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۴ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

انہوں نے اپنے عالموں کو، اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا پروردگار ٹھہرا لیا اور ایسا ہی مسیح ابن مریم کو۔ حالانکہ ہم نے یہ حکم کیا تھا کہ تم کسی کی بندگی نہ کرو مگر ایک کی جو خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۶۷)

يُرِيدُونَ اَنْ يُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَقْوَاهِمُمْ وَيَاْبِىَ اللّٰهُ اِلَّا اَنْ يُّنۡزِلَ نُوْرًا وَّ كُوْرًا

الْكَفِرُوْنَ ﴿۳۱﴾

چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھائیں پر خدا اپنے کام سے ہرگز نہیں رکے گا جب تک اس نور کو کامل طور پر پورا نہ کرے اگرچہ کافر لوگ کراہت ہی کریں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۴۸ حاشیہ نمبر ۱۱)

چاہتے ہیں کہ اپنے مونہوں کی پھونکوں سے حق کو بجھادیں اور اللہ تعالیٰ باز نہیں رہے گا جب تک اپنے نور کو پورا نہ کرے اگرچہ کافر ناخوش ہوں۔

یہ لوگ اپنے منہ کی لاف گزاف سے بکتے ہیں کہ اس دین کو کبھی کامیابی نہ ہوگی یہ دین ہمارے ہاتھ سے تباہ ہو جاوے گا لیکن خدا کبھی اس دین کو ضائع نہیں کرے گا اور نہیں چھوڑے گا جب تک اس کو پورا نہ کرے

..... اب قرآن شریف موجود ہے حافظ بھی بیٹھے ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ کفار نے کس دعویٰ کے ساتھ اپنی رائیں ظاہر کیں کہ یہ دین ضرور معدوم ہو جائے گا اور ہم اس کو کالعدم کر دیں گے اور ان کے مقابل پر یہ پیشینگوئی کی

گئی جو قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہرگز تباہ نہیں ہوگا یہ ایک بڑے درخت کی طرح ہو جائے گا اور پھیل جائے گا اور اس میں بادشاہ ہوں گے۔

یہ شریک کافر اپنے منہ کی پھونکوں سے نور اللہ کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ اپنے نور کو کامل کرنے والا ہے۔ کافر برا مناتے رہیں۔

منہ کی پھونکیں کیا ہوتی ہیں۔ یہی کسی نے ٹھگ کہہ دیا۔ کسی نے دکاندار اور کافر بیدین کہہ دیا۔ غرض یہ لوگ ایسی باتوں سے چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو بجھادیں مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نور اللہ کو بجھاتے

بجھاتے خود ہی جل کر ذلیل ہو جاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ۗ وَ كُوْرًا

## کِرَہَ الْمَشْرِکُونَ ﴿۳۱﴾

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ..... یعنی خدا وہ ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کرے.... یہ آیات قرآنی الہامی پیرایہ میں اس عاجز کے حق میں ہیں اور رسول سے مراد مامور اور فرستادہ ہے جو دین اسلام کی تائید کے لیے ظاہر ہوا۔ اس پیشگوئی کا ما حاصل یہ ہے کہ خدا نے جو اس مامور کو مبعوث فرمایا ہے یہ اس لئے فرمایا کہ تا اس کے ہاتھ سے دین اسلام کو تمام دینوں پر غلبہ بخشنے اور ابتداء میں ضرور ہے کہ اس مامور اور اس کی جماعت پر ظلم ہو لیکن آخر میں فتح ہوگی اور یہ دین اس مامور کے ذریعہ سے تمام ادیان پر غالب آجائے گا اور دوسری تمام ملتیں بینہ کے ساتھ ہلاک ہو جائیں گی۔

دیکھو یہ کس قدر عظیم الشان پیشگوئی ہے اور یہ وہی پیشگوئی ہے جو ابتداء سے اکثر علماء کہتے آئے ہیں کہ مسیح موعود کے حق میں ہے اور اس کے وقت میں پوری ہوگی اور براہین احمدیہ میں سترہ برس سے مسیح موعود کے دعوے سے پہلے درج ہے تا خدا ان لوگوں کو شرمندہ کرے کہ جو اس عاجز کے دعویٰ کو انسان کا افترا خیال کرتے ہیں۔ براہین خود گواہی دیتی ہے کہ اس وقت اس عاجز کو اپنی نسبت مسیح موعود ہونے کا خیال بھی نہیں تھا اور پرانے عقیدہ پر نظر تھی لیکن خدا کے الہام نے اسی وقت گواہی دی تھی کہ تو مسیح موعود ہے۔ کیونکہ جو کچھ آثار نبویہ نے مسیح کے حق میں فرمایا تھا الہام الہی نے اس عاجز پر جمادیا تھا۔

(سراج منیر، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۴۲، ۴۳)

وہ خدا وہ قادر ذوالجلال ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لیے بھیجا ہے تا دنیا کے تمام دینوں پر اس کو غالب کرے اگرچہ مشرک لوگ کراہت ہی کریں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۴۸ حاشیہ نمبر ۱۱)

یعنی تا وہ دین اسلام کو حج قاطعہ اور براہین ساطعہ کے ساتھ اسلام کے علاوہ تمام ادیان پر غالب کرے یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم مومنوں کی ان کے دین کو غالب کر کے اور ان کی حجت کو تمام کر کے مد فرمائے (ترجمہ از مرتب)

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ..... أَيْ لِيُظْهِرَ دِينَ الْإِسْلَامِ بِالْحُجَجِ الْقَاطِعَةِ وَالْبَرَاهِينِ السَّاطِعَةِ عَلَى كُلِّ دِينٍ مَّا سِوَاهُ أَيْ يَنْصُرُ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْمَظْلُومِينَ بِأَشْرَاقِ دِينِهِمْ وَإِتْمَامِ حُجَّتِهِمْ -

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۶۵ حاشیہ نمبر ۱)

خدا وہ قادر ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچائی دین دے کر بھیجا تا سب دینوں پر حجت کی رو سے اس کو غالب کرے (یہ وہ پیشگوئی ہے جو پہلے سے قرآن شریف میں انہیں دنوں کے لیے لکھی گئی ہے۔) (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۹۳)

وہ وہی خدا ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا وہ دین سب دینوں پر غالب ہو جائے اگرچہ مشرک ناخوش ہوں۔

اب دیکھئے کہ ان آیات کریمہ میں اللہ جل شانہ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ عیسائیوں سے پہلے یہودی یعنی بعض یہودی بھی عزیز کو ابن اللہ قرار دے چکے اور نہ صرف وہی بلکہ مقدم زمانہ کے کافر بھی اپنے پیشواؤں اور اماموں کو یہی منصب دے چکے پھر ان کے پاس اس بات پر کیا دلیل ہے کہ وہ لوگ اپنے اماموں کو خدا ٹھہرانے میں جھوٹے تھے اور یہ سچے ہیں اور پھر اس بات کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ یہی خرابیاں دنیا میں پڑ گئی تھیں جن کی اصلاح کے لیے اس رسول کو بھیجا گیا تا کامل تعلیم کے ساتھ ان خرابیوں کو دور کرے کیونکہ اگر یہودیوں کے ہاتھ میں کوئی کامل تعلیم ہوتی تو وہ برخلاف توریت کے اپنے عالموں اور درویشوں کو ہرگز خدا نہ ٹھہراتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ کامل تعلیم کے محتاج تھے جیسا کہ حضرت مسیح نے بھی اس بات کا اقرار کیا کہ ابھی بہت سی باتیں تعلیم کی باقی ہیں کہ تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے یعنی جب وہ یعنی روح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دے گی اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن وہ جو کچھ سنے گی وہ کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی۔ حضرات عیسائی صاحبان اس جگہ روح حق سے روح القدس مراد لیتے ہیں اور اس طرف توجہ نہیں فرماتے کہ روح القدس تو ان کے اصول کے موافق خدا ہے تو پھر وہ کس سے سنے گا حالانکہ لفظ پیشگوئی کے یہ ہیں کہ جو کچھ وہ سنے گی وہ کہے گی۔ (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۶۷، ۱۶۸)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ  
بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا  
يُفْقَهُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَنُقَبِّسَهُنَّ لَهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝

مسلمانو! اہل کتاب کے اکثر عالم اور مشائخ لوگوں کے مال ناحق کھاتے ہیں یعنی ناجائز طور پر ان کا روپیہ اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے رہتے ہیں اور اس طرح پر ناجائز طور پر

لوگوں کے مال لے کر سونا اور چاندی جمع کر لیتے ہیں اور خدا کی راہ میں کچھ بھی خرچ نہیں کرتے سوان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔  
(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۴۱)

إِلَّا تَتَصَرَّوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي  
الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۚ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَ  
أَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَى ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ  
الْعُلْيَى ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٥٠﴾

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نیکیوں اور آپ کے خاص  
فضائل میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے سفر ہجرت کی مرافتت کے لیے خاص کیا گیا اور آپ کو  
سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مصائب میں شریک بنایا گیا  
اور آپ کو آغاز مصیبت میں ہی آپ کا دوست قرار دیا گیا تاکہ  
اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کا  
تخصص ثابت ہو اور اس کا راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ  
حضرت ابو بکر صدیق صحابہ میں سے بہادر ترین اور متقی ہیں اور  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب صحابہ سے زیادہ محبوب ہیں اور  
آپ (یعنی حضرت ابو بکر) بہادر ترین لوگوں میں سے ہیں اور آپ  
کی محبت میں فنا ہیں اور وہ قدیم سے اس بات کے عادی تھے کہ  
آپ کی ضروریات پوری کریں اور آپ کے کاموں کی نگرانی کریں۔  
پس اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر صدیق کے وجود کے ساتھ تنگی کے  
وقت اور شدت کی گھڑیوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
کو تسلی دی۔ حضرت ابو بکرؓ کو صدیق کے لقب اور رسول کریم صلی  
اللہ علیہ وسلم کے قرب سے خاص کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو

وَمِنْ حَسَنَاتِ الصِّدِّيقِ  
وَمَزَايَا الْخَاصَّةِ أَنَّهُ حُصَّ لِمِرْآفَقَةٍ  
سَفَرِ الْهَجْرَةِ، وَجُعِلَ شَرِيكَ  
مَصَافِقِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ وَأَنْبِيئِهِ  
الْخَاصِّ فِي بَاكُورَةِ الْمُصِيبَةِ  
لِيَثْبُتَ تَخَضُّعُهُ بِمُحَبَّبٍ  
الْحَضْرَةِ. وَيُرَدُّ ذَلِكَ أَنَّ اللَّهَ كَانَ  
يَعْلَمُ بِأَنَّ الصِّدِّيقِ أَشْجَعُ الصَّحَابَةِ  
وَمِنَ الثَّقَاتِ وَأَحَبُّهُمْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمِنَ الْكَمَائَةِ.  
وَكَانَ فَايِسًا فِي حُبِّ سَيِّدِ  
الْكَائِنَاتِ، وَكَانَ اعْتَادَ مِنَ الْقَدِيمِ  
أَنْ يَمُوتَهُ وَيُرَاعَى شُؤْنَهُ، فَأَسْأَلِي بِهِ  
اللَّهُ نَبِيَّتَهُ فِي وَقْتِ عَبُوسٍ وَعَبْثِ  
بُؤْسٍ. وَحُصَّ بِاسْمِ الصِّدِّيقِ وَقَرَّبَ  
نَبِيَّ الثَّقَلَيْنِ، وَأَفَاضَ اللَّهُ عَلَيْهِ

## خَلْعَةَ ثَانِيِ اثْنَيْنِ

ثانی اثنتین کا خلعت پہنایا۔ (ترجمہ از م مرتب)

(سنن الخلافۃ، روحانی خزائن جلد ۸ صفحہ ۳۳۸، ۳۳۹)

(حضرت) ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا صدق اس آگ کے وقت ظاہر ہوا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ کیا گیا۔ گو بعض کی رائے اخراج کی بھی تھی لیکن اصل قتل ہی تھا۔ ایسی حالت میں حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے صدق و صفا کا وہ نمونہ دکھایا جو ابد الآباد کے لیے نمونہ رہے گا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انتخاب ہی حضرت صدیقؓ کی فضیلت اور اعلیٰ وفاداری کی ایک زبردست دلیل ہے۔ دیکھو اگر وائسرائے ہند کسی شخص کو کسی خاص کام کے لیے انتخاب کرے تو وہ رائے بہتر اور صائب ہوگی یا ایک چوکیدار کی۔ ماننا پڑے گا کہ وائسرائے کا انتخاب بہر حال موزوں اور مناسب ہوگا کیونکہ جس حال میں سلطنت کی طرف سے وہ نائب السلطنت مقرر کیا گیا ہے تو اس کی وفاداری، فراست اور پختہ کاری پر سلطنت نے اعتماد کیا ہے تب زمام سلطنت اس کے ہاتھ میں دی ہے پھر اس کی صائب تدبیری اور معاملہ فہمی کو پس پشت ڈال کر ایک چوکیدار کے انتخاب اور رائے کو صحیح سمجھ لیا جاوے یہ نامناسب امر ہے۔

اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب تھا۔ اس وقت آپ کے پاس ۷۰-۸۰ صحابہؓ موجود تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کے پاس ہی تھے مگر آپ نے ان سب میں سے حضرت ابوبکرؓ ہی کو منتخب کیا۔ اس میں سر کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ نبی خدا تعالیٰ کی آنکھ سے دیکھتا ہے اس کا فہم خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کشف اور الہام سے بتا دیا تھا کہ اس کام کے لیے سب سے بہتر اور موزوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

حضرت ابوبکرؓ اس ساعت عمر میں آپ کے ساتھ ہوئے یہ وقت خطرناک آزمائش کا تھا۔ حضرت مسیحؓ پر جب اس قسم کا وقت آیا تو ان کے شاگردان کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور ایک نے سامنے ہی لعنت بھی کی۔ مگر صحابہ کرامؓ میں سے ہر ایک نے پوری وفاداری کا نمونہ دکھایا غرض حضرت ابوبکر صدیق نے آپ کا پورا ساتھ دیا اور ایک غار میں جس کو غارِ ثور کہتے ہیں۔ آپ جا چھپے۔ شریک فر جو آپ کی ایذا رسانی کے لیے منصوبے کر چکے تھے۔ تلاش کرتے ہوئے اس غار تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کی کہ اب تو یہ بالکل سر پر ہی آپنچے ہیں اور اگر کسی نے ذرا نیچے نگاہ کی تو وہ دیکھ لے گا اور ہم پکڑے جاویں گے۔ اس وقت آپ نے

فرمایا: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا کچھ غم نہ کھاؤ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اس لفظ پر غور کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں یہ فرمایا: إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا۔ مَعَنَا میں آپ دونوں شریک۔ یعنی تیرے اور میرے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک پلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رکھا اور دوسرے پر حضرت صدیق کو۔ اس وقت دونوں ابتلا میں ہیں کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے یا تو اسلام کی بنیاد پڑنے والی ہے یا خاتمہ ہو جانے والا ہے۔ دشمن غار پر موجود ہیں اور مختلف قسم کی رائے زبیاں ہو رہی ہیں بعض کہتے ہیں کہ اس غار کی تلاشی کرو کیونکہ نشان پایہاں تک ہی آ کر ختم ہو جاتا ہے لیکن ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ یہاں انسان کا گزر اور داخل کیسے ہوگا۔ کڑی نے جلاتنا ہوا ہے۔ کبوتر نے انڈے دیئے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی باتوں کی آوازیں اندر پہنچ رہی ہیں اور آپ بڑی صفائی سے ان کو سن رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دشمن آئے ہیں کہ وہ خاتمہ کرنا چاہتے ہیں اور دیوانے کی طرح بڑھے آئے ہیں لیکن آپ کی کمال شجاعت کو دیکھو کہ دشمن سر پر ہے اور آپ اپنے رفیق صادق صدیقؓ کو فرماتے ہیں: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا۔ یہ الفاظ بڑی صفائی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ نے زبان ہی سے فرمایا کیونکہ یہ آواز کو چاہتے ہیں اشارہ سے کام نہیں چلتا۔ باہر دشمن مشورہ کر رہے ہیں اور اندر غار میں خادم و مخدوم بھی باتوں میں لگے ہوئے ہیں اس امر کی پروا نہیں کی گئی کہ دشمن آواز سن لیں گے یہ اللہ تعالیٰ پر کمال ایمان اور معرفت کا ثبوت ہے خدا تعالیٰ کے وعدوں پر پورا بھروسہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت کے لیے تو یہ نمونہ کافی ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا اس معیت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں اور گویا کل جماعت آپ کی آگئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا بلکہ کہا: إِنَّ مَعِيَ رَبِّي (الشعراء: ۶۳) اس میں کیا سر تھا کہ انہوں نے اپنے ہی ساتھ معیت کا اظہار کیا اس میں یہ راز ہے کہ اللہ جامع جمع شیون کا ہے اور اسم اعظم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے ساتھ اسم اعظم کی معیت مع تمام صفات کے پائی جاتی ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام کی قوم شریر اور فاسق فاجر تھی۔ آئے دن لڑنے اور پتھر مارنے کو تیار ہو جاتی تھی۔ اس لیے ان کی طرف معیت کو منسوب نہیں کیا بلکہ اپنی ذات تک اسے رکھا ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علوم ارج کا اظہار مقصود ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی نظیر موجود ہے حالانکہ مکہ میں آپ کے وفادار اور جان نثار خدام

موجود تھے لیکن جب آپ نے ہجرت کی تو صرف حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے لیا مگر اس کے بعد جب آپ مدینے پہنچ گئے تو دوسرے اصحاب بھی یکے بعد دیگرے وہیں جا پہنچے۔ لکھا ہے کہ جب آپ ہجرت کر کے نکلے اور غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے تو دشمن بھی تلاش کرتے ہوئے وہاں جا پہنچے ان کی آہٹ پا کر حضرت ابو بکرؓ گھبرائے تو اللہ تعالیٰ نے وحی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا تَحْزَنُ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا۔ کہتے ہیں کہ وہ نیچے اتر کر اس کو دیکھنے بھی گئے مگر خدا کی قدرت ہے کہ غار کے منہ پر کڑی نے جالاتن دیا تھا اسے دیکھ کر ایک نے کہا کہ یہ جالاتو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی پہلے کا ہے اس لیے وہ واپس چلے آئے۔ یہی وجہ ہے جو اکثر اکابر عنکبوت سے محبت کرتے آئے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۰﴾

اصل مقصود کے پانے کے لیے خدا تعالیٰ نے مجاہدہ ٹھہرایا ہے یعنی اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی طاقتوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی جان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی عقل کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اس کو ڈھونڈا جائے جیسا کہ وہ فرماتا ہے: جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ..... یعنی اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور اپنے نفسوں کو مع ان کی تمام طاقتوں کے خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۱۸، ۴۱۹)

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۰﴾

ہمیں کوئی مصیبت ہرگز نہیں پہنچ سکتی بجز اس مصیبت کے جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دی ہے وہی ہمارا کارساز اور مولیٰ ہے اور مومنوں کو چاہیے کہ بس اسی پر بھروسہ رکھیں۔ (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۱) (مصر کے اخبار اللواء نے کشتی نوح کی کسی آیت پر اعتراض کیا تھا کہ یہ لوگ قرآن کو نہیں سمجھتے اور ان کو پتہ نہیں ہے کہ مَا مِنْ دَآءٍ إِلَّا وَ لَهُ دَوَآءٌ حدیث میں ہے یہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ آپؐ نے فرمایا:۔)

اس نے ہمارے مطلب کو نہیں سمجھا اور پہلی آیت کو دیکھ کر صرف اپنے اندرونی بغض کی وجہ سے ایک شاعرانہ مذاق پر مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ ہم دواؤں سے کب انکار کرتے ہیں۔ ہم تو قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک شے میں بعض فوائد رکھے چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس (طاعون) کے متعلق ہمیں قبل از وقت سوجھا دیا ہے کہ یہ اس کا حقیقی علاج ہے اور یہ امر اس نے ہمیں بطور نشان کے دیا ہے تو اب ہم نشان کو کیسے مشتبہ کریں۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی نشان دیوے تو اس کی بے قدری کرنا صرف معصیت ہی نہیں بلکہ کفر تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔

س ہر مرتبہ از وجود اثرے دارد گر حفظ مراتب نہ کنی زندیق  
(بدر جلد ۱ نمبر ۵، مورخہ ۲۸ نومبر ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۸)

وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كَسَالَىٰ وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كُرْهُونَ ﴿۵۳﴾

یعنی اس بات کا سبب جو کفار کے صدقات قبول نہیں کیے جاتے صرف یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول سے منکر ہیں۔ اب دیکھو ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ رسول پر ایمان نہیں لاتے ان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ خدا ان کو قبول نہیں کرتا اور پھر جب اعمال ضائع ہوئے تو نجات کیوں کر ہوگی۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۳۲)

یہ تمام آیات ان لوگوں کے متعلق ہیں جنہوں نے رسول کے وجود پر اطلاع پائی اور رسول کی دعوت ان کو پہنچ گئی اور جو لوگ رسول کے وجود سے بالکل بے خبر رہے اور نہ ان کو دعوت پہنچی۔ ان کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ان کے حالات کا علم خدا کو ہے۔ ان سے وہ معاملہ کرے گا جو اس کے رحم اور انصاف کا مقتضاء ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَبْدِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلَاةِ قُلُوبَهُمْ  
وَفِي الرِّقَابِ وَالْغُرَمِيِّنَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ  
عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۵۴﴾

خیرات اور صدقات وغیرہ پر جو مال دیا جائے اس میں یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ پہلے جس قدر محتاج ہیں ان کو

دیا جائے۔ ہاں جو خیرات کے مال کا تعہد کریں یا اس کے لیے انتظام و اہتمام کریں ان کو خیرات کے مال سے کچھ مال مل سکتا ہے اور نیز کسی کو بدی سے بچانے کے لیے بھی اس مال میں سے دے سکتے ہیں۔ ایسا ہی وہ مال غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے اور محتاج اور قرضداروں اور آفت زدہ لوگوں کی مدد کے لیے بھی اور دوسری راہوں میں جو محض خدا کے لیے ہوں خرچ ہوگا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۵۷، ۳۵۸)

الْمُ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ۗ  
ذَلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿۱۱﴾

کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جو شخص خدا اور رسول کی مخالفت کرے خدا اس کو جہنم میں ڈالے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ یہ ایک بڑی رسوائی ہے۔  
(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۳۳)

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ  
فِيهَا وَمَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۗ وَرِضْوَانٍ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرَ ۗ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ  
الْعَظِيمُ ﴿۱۲﴾

اعلیٰ درجہ کی خوشی خدا میں ملتی ہے جس سے پرے کوئی خوشی نہیں ہے جنت پوشیدہ کو کہتے ہیں۔ اور جنت کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ نعمتوں سے ڈھکی ہوئی ہے اصل جنت خدا ہے جس کی طرف تردد منسوب ہی نہیں ہوتا اس لیے بہشت کے اعظم ترین انعامات میں رِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ہی رکھا ہے۔ انسان انسان کی حیثیت سے کسی نہ کسی دکھ اور تڑپ میں ہوتا مگر جس قدر قرب الہی حاصل کرتا جاتا ہے اور تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ سے رنگین ہوتا جاتا ہے اسی قدر اصل سکھ اور آرام پاتا ہے جس قدر قرب الہی ہوگا، لازمی طور پر اسی قدر خدا کی نعمتوں سے حصہ لے گا اور رفع کے معنی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۷)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۗ وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ ۗ

## وَيَسْأَلُ الْمَصِيْرُ ﴿۳۱﴾

دشنام اور سب اور شتم فقط اس مفہوم کا نام ہے جو خلاف واقعہ اور دروغ کے طور پر محض آزار رسانی کی غرض سے استعمال کی جائے اور اگر ہر ایک سخت اور آزار دہ تقریر کو محض بوجہ اس کے مرارت اور تلخی اور ایذا رسانی کے دشنام کے مفہوم میں داخل کر سکتے ہیں تو پھر اقرار کرنا پڑے گا کہ سارا قرآن شریف گالیوں سے پُر ہے کیونکہ جو کچھ بتوں کی ذلت اور بت پرستوں کی حقارت اور ان کے بارہ میں لعنت ملامت کے سخت الفاظ قرآن شریف میں استعمال کیے گئے ہیں یہ ہرگز ایسے نہیں ہیں جن کے سننے سے بت پرستوں کے دل خوش ہوئے ہوں بلکہ بلاشبہ ان الفاظ نے ان کے غصہ کی حالت کی بہت تحریک کی ہوگی کیا خدائے تعالیٰ کا کفار مکہ کو مخاطب کر کے یہ فرمانا کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبٌ جَهَنَّمَ (الانبیاء: ۹۹) معترض کے من گھڑت قاعدہ کے موافق گالی میں داخل نہیں ہے کیا خدائے تعالیٰ کا قرآن شریف میں کفار کو شرابریہ قرار دینا اور تمام رذیل اور پلید مخلوقات سے انہیں بدتر ظاہر کرنا یہ معترض کے خیال کے رو سے دشنام دہی میں داخل نہیں ہوگا کیا خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ نَبِيًّا فرمایا۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۰۹)

غرض ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود خدا تعالیٰ نے بھی حفظ مراتب کا لحاظ رکھا ہے۔ مؤمنین اور ایمان داروں کے واسطے کیسی نرمی کا حکم ہے اور کفار میں سے بعض میں مادہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ ان کو سختی کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح سے بعض بیمار یوں یا زخموں میں ایک حکیم حاذق کو چیرا پھاڑی اور عمل جراحی سے کام لینا پڑتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۷۲ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلْفَ رَسُولِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوا اَنْ يُجَاهِدُوا  
بِأَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ  
اَشَدُّ حَرًّا لَّوْ كَانُوا يَفْقَهُوْنَ ﴿۳۲﴾

ہماری جماعت کا ایمان تو صحابہ والا چاہیے جنہوں نے اپنے سر خدا کی راہ میں کٹوا دیئے تھے۔ اگر آج ہماری جماعت کو یورپ اور امریکہ میں اشاعت اسلام کے لیے جانے کو کہا جاوے تو اکثر یہی کہہ دیں گے جی ہمارے

بال بچوں کو تکلیف ہوگی۔ ہمارے گھروں کا ایسا حال ہے یہ ہے وہ ہے إِنَّ بِيُوتِنَا عَوْرَةً (الاحزاب: ۱۴) اور ہم نے یہ تو نہیں کہنا کہ جا کر سر کٹوائیں بلکہ یہی ہے کہ دین کے لیے سفر کی تکالیف اور صدمے اٹھائیں مگر اکثر یہی کہہ دیں گے جی گرمی بہت ہے۔ زیادہ تکلیف کا اندیشہ ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ جہنم کی گرمی اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا۔ صحابہ کا نمونہ مسلمان بننے کے لیے پکا نمونہ ہے۔  
(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

### فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا ۖ وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۗ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۱۱﴾

دنیاوی تمتع کا حصہ انسانی زندگی میں بہت ہی کم ہونا چاہیے تاکہ فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا ۖ وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا یعنی ہنسوتھوڑا اور روؤ بہت کا مصداق بنو لیکن جس شخص کی دنیاوی تمتع کثرت سے ہیں اور وہ رات دن بیویوں میں مصروف ہے اس کو رقت اور رونا کب نصیب ہوگا۔ (البدرد جلد ۳ نمبر ۲۶ مورخہ ۸ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲) صوفیوں نے لکھا ہے کہ اگر چالیس دن تک رونا نہ آوے تو جانو کہ دل سخت ہو گیا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا ۖ وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا کہ ہنسوتھوڑا اور روؤ بہت مگر اس کے برعکس دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ہنستے بہت ہیں اب دیکھو کہ زمانہ کی کیا حالت ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان ہر وقت آنکھوں سے آنسو بہاتا رہے بلکہ جس کا دل اندر سے رو رہا ہے وہی روتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ دروازہ بند کر کے اندر بیٹھ کر خشوع اور خضوع سے دعا میں مشغول ہو اور بالکل عجز و نیاز سے خدا کے آستانہ پر گر پڑے تاکہ وہ اس آیت کے نیچے نہ آوے۔ جو بہت ہنستا ہے وہ مومن نہیں اگر سارے دن کا نفس کا محاسبہ کیا جاوے تو معلوم ہو کہ ہنسی اور تمسخر کی میزان زیادہ ہے اور رونے کی بہت کم ہے بلکہ اکثر جگہ بالکل ہی نہیں ہے۔ اب دیکھو کہ زندگی کس قدر غفلت میں گزر رہی ہے اور ایمان کی راہ کس قدر مشکل ہے گویا ایک طرح سے مرنا ہے اور اصل میں اسی کا نام ایمان ہے۔

وَمِنَ الْأَعْدَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُّ بِكُمُ الدَّوَائِرَ ۗ عَلَيْهِمُ

دَائِرَةُ السُّوءِ ۗ وَاللَّهُ سَبِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱﴾

(غلام دستگیر قصوری کے بارے میں ذکر تھا کہ بعض مخالفین کہتے ہیں اس نے کب مبالغہ کیا۔ حضور نے فرمایا:۔) بطریق تنزیل ہم مان لیتے ہیں کہ اس نے صرف ہمارے لیے بددعا کی مگر اب بتاؤ کہ اس کی دعا کا اثر

کیا ہوا؟ کیا وہ الفاظ جو میرے حق میں کہے اور وہ دعا جو میرے برخلاف کی اُلٹی اس پر ہی نہیں پڑی؟ اب بتاؤ کہ کیا مقبولانِ الہی کا یہی نشان ہے کہ جو دعا وہ نہایت تضرع و اجتہال سے کریں اس کا اُلٹا اثر ہو اور اثر بھی یہ کہ خود ہی ہلاک ہو کر اپنے کاذب ہونے پر مہر لگا جاویں۔ خصوصاً ایسے شخص کے مقابل میں جسے وہ مفتری اور کیا کیا سمجھتا ہے دراصل وہ مجمع البجا والے کی مثال دے کر خود اس کا قائم مقام بنا چاہتا تھا اور اگر مجھے کوئی نقصان پہنچ جاتا تو بڑے لمبے لمبے اشتہار شائع ہوتے لیکن خدا نے دشمن کو بالکل موقع نہ دیا کہ وہ کسی قسم کی خوشی منائے۔ اس بات کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے میرے خلاف بد دعا کی اور خدا سے میری جڑ کے کٹ جانے کی درخواست کی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی جڑ کٹ گئی اور مجھے روز افزوں ترقی حاصل ہوئی۔ کیا یہ متعصب مخالف کے لیے عبرت کا مقام نہیں افسوس کہ یہ لوگ ذرا بھی غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔

قرآن مجید کی وہ آیت یہاں کیسی صادق آ رہی ہے کہ **يَذَرُ بَصُ بِلَكُمْ الدَّوَابَّ عَلَيْهِمْ دَابِرَةُ السَّوْءِ**۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۷۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

خوب یاد رکھنا چاہیے کہ میری پیشگوئیوں میں کوئی بھی امر ایسا نہیں ہے جس کی نظیر پہلے انبیاء علیہم السلام کی پیشگوئیوں میں نہیں ہے۔ یہ جاہل اور بے تمیز لوگ چونکہ دین کے باریک علوم اور معارف سے بے بہرہ ہیں اس لیے قبل اس کے جو عاۃ اللہ سے واقف ہوں بخل کے جوش سے اعتراض کرنے کے لئے دوڑتے ہیں اور ہمیشہ ہر آیت کریمہ **يَذَرُ بَصُ بِلَكُمْ الدَّوَابَّ** میری کسی گردش کے منتظر ہیں اور **عَلَيْهِمْ دَابِرَةُ السَّوْءِ** کے مضمون سے بے خبر۔۔۔ یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی کے درمیانی حصوں میں انبیاء علیہم السلام بھی بلاؤں سے محفوظ نہیں رہے مگر انجام بخیر ہوا۔ اسی طرح اگر ہمیں بھی اس درمیانی مراحل میں کوئی غم پہنچے یا کوئی مصیبت پیش آوے تو اس کو خدا تعالیٰ کا اخیر حکم سمجھنا غلطی ہے۔ خدا تعالیٰ کا حتمی وعدہ ہے کہ وہ ہمارے سلسلہ میں برکت ڈالے گا اور اپنے اس بندہ کو بہت برکت دے گا یہاں تک کہ بادشاہ اس بندہ کے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے وہ ہر ایک ابتلا اور پیش آمدہ ابتلا کا بھی انجام بخیر کرے گا اور دشمنوں کے ہر ایک بہتان سے انجام کار بریت ظاہر کر دے گا۔

(حقیقۃ المہدی، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۴۲۲، ۴۲۳)

یعنی اے نبی! تیرے پر یہ بدبند دشمن طرح طرح کی گردشیں چاہتے ہیں۔ انہیں پر گردشیں پڑیں گی۔ پس اس آیت کریمہ کی رو سے یہ سنت اللہ ہے کہ جو شخص صادق پر کوئی بد دعا کرتا ہے وہی بد دعا اس پر پڑتی ہے یہ سنت اللہ نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ سے ظاہر ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۳۲۵)

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ ۗ  
رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ  
فِيهَا أَبَدًا ۗ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۰﴾

اصل میں صفات کل نیک ہوتے ہیں جب ان کو بے موقع اور ناجائز طور پر استعمال کیا جاوے تو وہ برے ہو جاتے ہیں اور ان کو گندہ کر دیا جاتا ہے لیکن جب انہی صفات کو افراط تفریط سے بچا کر محل اور موقعہ پر استعمال کیا جاوے تو ثواب کے موجب ہو جاتے ہیں قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا ہے: مَنْ شَرَّ حَاسِدًا إِذَا حَسَدَ (القلق: ۶) اور دوسری جگہ اَلسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ اب سبقت لے جانا بھی تو ایک قسم کا حسد ہی ہے۔ سبقت لے جانے والا کب چاہتا ہے کہ اس سے اور کوئی آگے بڑھ جاوے۔ یہ صفت بچپن ہی سے انسان میں پائی جاتی ہے۔ اگر بچوں کو آگے بڑھنے کی خواہش نہ ہو تو وہ محنت نہیں کرتے اور کوشش کرنے والے کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ سابقوں کو یا حسد ہی ہوتے ہیں لیکن اس جگہ حسد کا مادہ مصفیٰ ہو کر سابق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حسد ہی بہشت میں سبقت لے جاویں گے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰/۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱/۸۹)

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۗ إِنَّ  
صَلَوَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱﴾

سَكَنٌ لَّهُمْ یہ شفاعت کا فلسفہ ہے یعنی جو گناہوں میں نفسانیت کا جوش ہے وہ ٹھنڈا پڑ جاوے... تیری صلوة سے ان کو ٹھنڈا پڑ جاتی ہے اور جوش اور جذبات کی آگ سرد ہو جاتی ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰/۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲، ۳)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منافق کو کرتہ دیا اور اس کے جنازہ کی نماز پڑھی۔ ممکن ہے کہ اس نے غرغره کے وقت توبہ کر لی ہو۔ مومن کا کام ہے کہ حسن ظن رکھے۔ اس لیے نماز جنازہ کا جواز رکھا ہے کہ ہر ایک کی پڑھ لی جاوے ہاں اگر کوئی سخت معاند ہو یا فساد کا اندیشہ ہے تو پھر نہ پڑھنی چاہیے۔ ہماری جماعت کے سرپر فرضیت نہیں ہے بطور احسان کے ہماری جماعت دوسرے غیر از جماعت کا جنازہ پڑھ سکتی ہے۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۗ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ ۗ اس میں صلوة سے مراد جنازہ کی نماز ہے اور سَكَنٌ لَهُمْ دلالت کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا گنہگار کو سکینت اور ٹھنڈک بخشتی تھی۔

(الہدیر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۹)

ہمارا ایمان ہے کہ شفاعت حق ہے اور اس پر یہ نص صریح ہے وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۗ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ ۗ یہ شفاعت کا فلسفہ ہے یعنی جو گناہوں میں نفسانیت کا جوش ہے جو ٹھنڈا پڑ جاوے۔ شفاعت کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ گناہ کی زندگی پر ایک موت وارد ہو جاتی ہے اور نفسانی جوشوں اور جذبات میں ایک برودت آ جاتی ہے جس سے گناہوں کا صدور بند ہو کر ان کے بالمقابل نیکیاں شروع ہو جاتی ہیں پس شفاعت کے مسئلہ نے اعمال کو بے کار نہیں کیا۔ بلکہ اعمال حسنہ کی تحریک کی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

صدقہ صدق سے لیا گیا ہے جب کوئی شخص خدا کی راہ میں صدقہ دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ خدا سے صدق رکھتا ہے۔ دوسرا دعا۔ دعا کے ساتھ قلب پر سوز گداز اور رقت پیدا ہوتی ہے دعا بھی ایک قربانی ہے۔ صدق اور دعا اگر یہ دو باتیں میسر آ جاویں تو اکسیر ہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۲)

الْمُؤْمِنُونَ الْعَبْدُونَ الْحِمْدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّجِدُونَ  
الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالتَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَفِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ  
الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۴﴾

وہ لوگ خوش وقت ہیں جو سب کچھ چھوڑ کر خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور خدا کی پرستش میں مشغول ہوتے ہیں اور خدا کی تعریف میں لگے رہتے ہیں اور خدا کی راہ کی منادی کے لیے دنیا میں پھرتے ہیں اور خدا کے آگے جھکے رہتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں وہی مومن ہیں جن کو نجات کی خوش خبری دی گئی ہے۔  
(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۴۲)

إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَيُعْجِبُ وَيُيَبِّئُ ۗ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ  
وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۵﴾

مسیح کا باغ میں اپنے بیج جانے کے لئے ساری رات دعا کرنا اور دعا قبول بھی ہو جانا جیسا کہ عبرانیاں ۵۔ آیت ۷

میں لکھا ہے مگر پھر بھی خدا کا اُس کے چھڑانے پر قادر نہ ہونا یہ بزم عیسائیاں ایک دلیل ہو سکتی ہے کہ اُس زمانہ میں خدا کی بادشاہت زمین پر نہیں تھی مگر ہم نے اس سے بڑھ کر ابتلا دیکھے ہیں اور اُن سے نجات پائی ہے ہم کیوں کر خدا کی بادشاہت کا انکار کر سکتے ہیں کیا وہ خون کا مقدمہ جو میرے قتل کرنے کے لئے مارٹن کلا راک کی طرف سے عدالت کپتان ڈگلس میں پیش ہوا تھا وہ اُس مقدمہ سے کچھ خفیف تھا جو محض مذہبی اختلاف کی وجہ سے نہ کسی خون کے اتہام سے یہودیوں کی طرف سے عدالت پیلاطوس میں دائر کیا گیا تھا مگر چونکہ خدا زمین کا بھی بادشاہ ہے جیسا کہ آسمان کا اس لئے اُس نے اس مقدمہ کی پہلے سے مجھے خبر دے دی کہ یہ ابتلا آنے والا ہے اور پھر خبر دے دی کہ میں تم کو بری کروں گا اور وہ خبر صد ہا انسانوں کو قبل از وقت سنائی گئی اور آخر مجھے بری کیا گیا پس یہ خدا کی بادشاہت تھی جس نے اس مقدمہ سے مجھے بچا لیا جو مسلمانوں اور ہندوؤں اور عیسائیوں کے اتفاق سے مجھ پر کھڑا کیا گیا تھا ایسا ہی نہ ایک دفعہ بلکہ بیسیوں دفعہ میں نے خدا کی بادشاہت کو زمین پر دیکھا اور مجھے خدا کی اس آیت پر ایمان لانا پڑا کہ لَكَ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی زمین پر بھی خدا کی بادشاہت ہے اور آسمان پر بھی۔ (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۳۷، ۳۸)

### يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۹﴾

شریعت کی کتابیں حقائق اور معارف کا ذخیرہ ہوتی ہیں لیکن حقائق اور معارف پر کبھی پوری اطلاع نہیں مل سکتی جب تک صادق کی صحبت اور خلاص اور صدق سے اختیار نہ کی جاوے اسی لیے قرآن شریف فرماتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور ارتقاء کے مدارج کامل طور پر کبھی حاصل نہیں ہو سکتے جب تک صادق کی معیت اور صحبت نہ ہو کیونکہ اس کی صحبت میں رہ کر وہ اس کے انفاس طیبہ عقد ہمت اور توجہ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

انبیاء علیہم السلام تھوڑے ہوتے ہیں اور اپنے اپنے وقت پر آیا کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کو رسم اور عادت سے نجات دینے اور سچا اخلاص اور ایمان حاصل کرنے کی یہ راہ بتائی ہے کہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ یہ سچی بات ہے اس کو کبھی بھولنا نہیں چاہیے کہ جس نے نبی کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کر دیا۔ رسم اور عادت کی غلامی سے انسان اسی وقت نکل سکتا ہے جب وہ عرصہ دراز تک

صادقوں کی صحبت اختیار کرے اور ان کے نقش قدم پر چلے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

(خان صاحب نواب خاں صاحب جاگیر دار مالیر کوٹلہ نے ایک شخص کا ذکر کیا کہ وہ ارادت کا اظہار کرتا ہے مگر چاہتا ہے کہ اس کی توجہ نماز کی طرف ہو جاوے۔ فرمایا کہ)

یہ لوگ خدا تعالیٰ سے ایسی شرطیں کیوں کرتے ہیں پہلے خود کوشش کرنی چاہیے قرآن شریف میں اِنَّا كَ نَعْبُدُ مَقْدَمُ هُوَ۔ خدا تعالیٰ پر کسی کا حق واجب نہیں اگر وہ خود کوشش کرنا چاہتے ہیں تو مہینے تک یہاں آ کر رہیں خدا نے فرمایا ہے: كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یہاں وہ نماز پڑھنے والوں کو دیکھیں گے باتیں سنیں گے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

انسان کو انوار اور برکات سے حصہ نہیں مل سکتا۔ جب تک وہ اسی طرح عمل نہ کرے جس طرح خدا فرماتا ہے کہ كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ بات یہی ہے کہ خمیر سے خمیر لگتا ہے اور یہی قاعدہ ابتداء سے چلا آتا ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو آپ کے ساتھ برکات اور انوار تھے جن میں سے صحابہ نے بھی حصہ لیا پھر اسی طرح خمیر کی لاگ کی طرح آہستہ آہستہ ایک لاکھ تک ان کی نوبت آئی۔

(البدرد جلد ۱ نمبر ۴ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۱)

ملعون لوگ (یعنی جو خدا سے دور ہیں) جو زندگی بسر کرتے ہیں وہ کیا زندگی ہے۔ بادشاہ اور سلاطین کی کیا زندگیاں ہیں۔ مثل بہائم کے ہیں جب انسان مومن ہوتا ہے تو خود ان سے نفرت کرتا ہے۔ ایمان لانے اور خدا کی عظمت کے دل میں ہونے کی اول نشانی یہ ہے کہ انسان ان تمام کوشش کیڑوں کے خیال کرے ان کو دیکھ کر دل میں نہ تر سے کہ یہ فاخرہ لباس پہن کر گھوڑوں پر سوار ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کی قسمت بد اور کتوں کی سی زندگی ہے کہ مردار دنیا پر دانت مار رہے ہیں۔ انسان کو اگر دیکھنے کی آرزو ہو تو ان کو دیکھیں جو منقطعین ہیں اور خدا کی طرف آگئے ہیں اور خدا ان کو زندہ کرتا ہے۔ ان کی زیارت سے مصائب دور ہوتے ہیں جو شخص رحمت والے کے پاس آوے گا تو وہ رحمت کے قریب تر ہوگا۔ اور جو ایک لعنتی کے پاس جاوے گا وہ لعنت کے قریب تر ہوگا دنیا میں یہی بات غور کے قابل ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی اے بندو تمہارا بچاؤ اسی میں ہے کہ صادقوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

(البدرد جلد اول نمبر ۱۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۶)

یہاں کارہناتو ایک قسم کا آستانہ ایزدی پر رہنا ہے اس حوض کوثر سے وہ آب حیات ملتا ہے کہ جس کے

پینے سے حیات جاودانی نصیب ہوتی ہے جس پر ابد الابد تک موت ہرگز نہیں آسکتی اچھی طرح کمر بستہ ہو کر پورے استقلال سے اس صراطِ مستقیم کے راہ رو بنیں اور ہر قسم کی دنیاوی رکاوٹوں اور نفسانی خواہشات کی ذرہ پروا نہ کر کے اللہ تعالیٰ کے صادق مامور کی پوری معیت کریں تاکہ حکم **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** کی فرمانبرداری کا سنہری تمغہ آپ کو حاصل ہو۔

(الہدٰی جلد ۲ نمبر ۲۵ صفحہ ۳۵۲ تا ۳۵۴ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء۔ نیز الحکم جلد ۷ نمبر ۴۲، ۴۵، مورخہ ۳۰ نومبر تا ۱۰ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۷، ۸)۔

سال گزشتہ میں بمشورہ اکثر احباب یہ بات قرار پائی تھی کہ ہماری جماعت کے لوگ کم سے کم ایک مرتبہ سال میں بہ نیت استفادہ ضروریات دین و مشورہ اعلیٰ کلمہ اسلام و شرع متین اس عاجز سے ملاقات کریں اور اس مشورہ کے وقت یہ بھی قرین مصلحت سمجھ کر مقرر کیا گیا تھا کہ ۲۷ دسمبر کو اس غرض سے قادیان میں آنا نسب اور اولیٰ ہے کیونکہ یہ تعطیل کے دن ہیں اور ملازمت پیشہ لوگ ان دنوں میں فرصت اور فراغت رکھتے ہیں اور باعشایام سرمایہ دن سفر کے مناسب حال بھی ہیں..... جس حالت میں یہ عاجز اپنے صریح صریح اور ظاہر ظاہر الفاظ سے اشتہار میں لکھ چکا ہے کہ یہ سفر ہر ایک مخلص کا طلب علم کی نیت سے ہوگا۔ پھر یہ فتویٰ دینا کہ جو شخص اسلام میں ایسا امر پیدا کرے وہ مردود ہے کس قدر دیانت اور امانت اور انصاف اور تقویٰ اور طہارت سے دور ہے۔ رہی یہ بات کہ ایک تاریخ مقررہ پر تمام بھائیوں کا جمع ہونا تو یہ صرف انتظام ہے اور انتظام سے کوئی کام کرنا اسلام میں کوئی مذموم امر اور بدعت نہیں انما الاعمال بالنیات۔ بدظنی کے مادہ فاسدہ کو ذرا دور کر کے دیکھو کہ ایک تاریخ پر آنے میں کون سی بدعت ہے جبکہ ۲۷ دسمبر کو ہر ایک مخلص باسانی ہمیں مل سکتا ہے اور اس کے ضمن میں ان کی باہم ملاقات بھی ہو جاتی ہے تو اس سہل طریق سے فائدہ اٹھانا کیوں حرام ہے تعجب کہ مولوی صاحب نے اس عاجز کا نام مردود تو رکھ دیا مگر آپ کو وہ حدیثیں یاد نہ رہیں جن میں طلب علم کے لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی نسبت ترغیب دی ہے اور جن میں ایک بھائی مسلمان کی ملاقات کے لیے جانا موجب خوشنودی خدائے عزوجل قرار دیا ہے اور جن میں سفر کر کے زیارتِ صالحین کرنا موجب مغفرت اور کفارہ گناہاں لکھا ہے.....

مسلمانوں کو مختلف اغراض کے لیے سفر کرنے پڑتے ہیں کبھی سفر طلب علم ہی کے لیے ہوتا ہے اور کبھی سفر ایک رشتہ دار یا بھائی یا بہن یا بیوی کی ملاقات کے لیے..... کبھی سفر عجائبات دنیا کے دیکھنے کے لیے بھی ہوتا ہے جس کی طرف آیت کریمہ: **قُلْ سَیِّرُوْا فِی الْاَرْضِ اِثَارَتِ فِرْعٰوْنَ** ہے۔ کبھی سفر صادقین کی صحبت

میں رہنے کی غرض سے جس کی طرف آیت کریمہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ہدایت فرماتی ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۶۰۵ تا ۶۰۷)

زیارتِ صالحین کے لیے سفر کرنا قدیم سے سنتِ سلفِ صالحِ چلی آئی ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ جب قیامت کے دن ایک شخص اپنی بد اعمالی کی وجہ سے سخت مواخذہ میں ہوگا تو اللہ جل شانہ اس سے پوچھے گا کہ فلاں صالح آدمی کی ملاقات کے لیے کبھی تو گیا تھا تو وہ کہے گا بالارادہ تو کبھی نہیں گیا مگر ایک دفعہ ایک راہ میں اس کی ملاقات ہو گئی تھی تب خدا تعالیٰ کہے گا کہ جا بہشت میں داخل ہو میں نے اسی ملاقات کی وجہ سے تجھے بخش دیا۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۶۰۸)

انسان ایسا جاندار ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے تربیتِ ایمانی کے لیے فیوض و برکات نہ ہوں وہ خود بخود پاک صاف نہیں ہو سکتا اور حقیقت میں پاک صاف ہونا اور تقویٰ پر قدم مارنا آسان امر نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل اور تائید سے یہ نعمت ملتی ہے اور سچی تقویٰ جس سے خدا تعالیٰ راضی ہو اس کے حاصل کرنے کے لیے بار بار اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ اور پھر یہ بھی کہا: إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ (النحل: ۱۲۹)۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۲ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۲، ۳)

صبر کی حقیقت میں سے یہ بھی ضروری بات ہے كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ صادقوں کی صحبت میں رہنا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو دوڑ بیٹھے رہتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ کبھی آئیں گے اس وقت فرصت نہیں ہے۔ بھلا تیرہ سو سال کے موعود سلسلہ کو جو لوگ پالیں اور اس کی نصرت میں شامل نہ ہوں اور خدا اور رسول کے موعود کے پاس نہ بیٹھیں وہ فلاح پاسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیا ئے دوں ایں خیال ہست و مجال ست و جنوں

دین تو چاہتا ہے کہ مصاحبت ہو۔ پھر مصاحبت سے گریز ہو تو دینداری کے حصول کی امید کیوں رکھتا ہے۔ ہم نے بارہا اپنے دوستوں کو نصیحت کی ہے اور پھر کہتے کہ وہ بار بار یہاں آ کر رہیں اور فائدہ اٹھائیں۔ مگر بہت کم توجہ کی جاتی ہے لوگ ہاتھ میں ہاتھ دے کر تو دین کو دنیا پر مقدم کر لیتے ہیں۔ مگر اس کی پروا کچھ نہیں کرتے..... وہ لوگ جو یہاں آ کر میرے پاس کثرت سے نہیں رہتے اور ان باتوں سے جو خدا تعالیٰ ہر روز اپنے سلسلہ کی تائید میں ظاہر کرتا ہے نہیں سنتے اور دیکھتے۔ وہ اپنی جگہ پر کیسے ہی نیک اور متقی اور پرہیزگار ہوں مگر میں یہی کہوں گا کہ جیسا چاہیے انہوں نے قدر نہیں کی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تکمیلِ علمی کے بعد

تکمیل عملی کی ضرورت ہے پس تکمیل عملی بدوں تکمیل علمی کے محال ہے اور جب تک یہاں آکر نہیں رہتے تکمیل علمی مشکل ہے۔ بار بار خطوط آتے ہیں کہ فلاں شخص نے اعتراض کیا اور ہم جواب نہ دے سکے اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ وہ لوگ یہاں نہیں آتے اور ان باتوں کو نہیں سنتے جو خدا تعالیٰ اپنے سلسلہ کی تائید میں علمی طور پر ظاہر کر رہا ہے پس اگر تم واقعی اس سلسلہ کو شناخت کرتے ہو اور خدا پر ایمان لاتے ہو اور دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا سچا وعدہ کرتے ہو تو میں پوچھتا ہوں کہ اس پر عمل کیا ہوتا ہے کیا **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اگر تم واقعی ایمان لاتے ہو اور سچی خوش قسمتی یہی ہے تو اللہ تعالیٰ کو مقدم کر لو۔ اگر ان باتوں کو ردی اور فضول سمجھو گے تو یاد رکھو خدا تعالیٰ سے ہنسی کرنے والے ٹھہرو گے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

صدق ایسی شے ہے جو انسان کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی نجات دیتا ہے۔ سعدیؒ نے سچ کہا ہے کہ کس نذیم کہ گم شد از رہ راست۔ پس جس قدر انسان صدق کو اختیار کرتا ہے اور صدق سے محبت کرتا ہے اسی قدر اس کے دل میں خدا تعالیٰ کے کلام اور نبیوں کی محبت اور معرفت پیدا ہوتی ہے کیونکہ وہ تمام راست بازوں کے نمونے اور چشمہ ہوتے ہیں۔ **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** کا ارشاد اسی اصول پر ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی مُردوں کے پاس جانے کی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** کا حکم دے کر زندوں کی صحبت میں رہنے کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے دوستوں کو بار بار یہاں آنے اور رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور ہم جو کسی دوست کو یہاں رہنے کے واسطے کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ محض اس کی حالت پر رحم کر کے ہمدردی اور خیر خواہی سے کہتے ہیں۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ ایمان درست نہیں ہوتا جب تک انسان صاحب ایمان کی صحبت میں نہ رہے اور یہ اس لیے کہ چونکہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک ہی وقت میں ہر قسم کی طبیعت کے موافق حال تقریر ناصح کے منہ سے نہیں نکلا کرتی۔ کوئی وقت ایسا آجاتا ہے کہ اس کی سمجھ اور فہم کے مطابق اس کے مذاق پر گفتگو ہو جاتی ہے جس سے اس کو فائدہ پہنچ جاتا ہے اور اگر آدمی بار بار نہ آئے اور زیادہ دنوں تک نہ رہے تو ممکن ہے کہ ایک وقت ایسی تقریر جو اس کے مذاق کے موافق نہیں ہے اور اس سے اس کو بددلی پیدا ہو اور وہ حسن ظن کی راہ سے دور جا پڑے اور ہلاک ہو جاوے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اول خدا تعالیٰ مدد دیتا ہے پھر دوسرے درجہ پر مامور من اللہ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں جوش ڈالا ہے اور وہ اسی جوش اور تقاضائے فطرت کے ساتھ مخلوق کی بہتری میں ہر ایک قسم کی کوشش کرتے ہیں جیسے ماں اپنے بچے کو دودھ دیتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اس لیے کہ والدہ کا نفس مزکی نہیں ہے اور یہ مزکی النفس لوگ ہوتے ہیں انہیں کو صادقین اس آیت **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** میں فرمایا گیا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

یاد رکھو۔ میں جو اصلاح خلق کے لیے آیا ہوں جو میرے پاس آتا ہے وہ اپنی استعداد کے موافق ایک فضل کا وارث بنتا ہے لیکن میں صاف طور پر کہتا ہوں کہ وہ جو سرسری طور پر بیعت کر کے چلا جاتا ہے اور پھر اس کا پتہ بھی نہیں ملتا کہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے اس کے لیے کچھ نہیں ہے وہ جیسا تہی دست آیا تھا۔ تہید دست جاتا ہے۔

یہ فضل اور برکت صحبت میں رہنے سے ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صحابہ بیٹھے آخر نتیجہ یہ ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اللہ فی اصحابی گو یا صحابہ خدا کا روپ ہو گئے۔ یہ درجہ ممکن نہ تھا کہ ان کو ملتا اگر دور رہی بیٹھے رہتے۔ یہ بہت ضروری مسئلہ ہے۔ خدا تعالیٰ کا قرب بندگان خدا کا قرب ہے اور خدا تعالیٰ کا ارشاد **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** اس پر شاہد ہے یہ ایک سر ہے جس کو تھوڑے ہیں جو سمجھتے ہیں۔ مامور من اللہ ایک ہی وقت میں ساری باتیں کبھی بیان نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنے دوستوں کے امراض کی تشخیص کر کے حسب موقع ان کی اصلاح بذریعہ وعظ و نصیحت کرتا رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً وہ ان کے امراض کا ازالہ کرتا رہتا ہے۔ اب جیسے آج میں ساری باتیں بیان نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض آدمی ایسے ہوں جو آج ہی کی تقریر سن کر چلے جاویں اور بعض باتیں ان میں ان کے مذاق اور مرضی کے خلاف ہوں تو وہ محروم گئے لیکن جو متواتر یہاں رہتا ہے وہ ساتھ ساتھ ایک تبدیلی کرتا جاتا ہے اور آخر اپنے مقصد کو پالیتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

دل کی پاکیزگی کا حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ حاصل نہیں ہو سکتی جب تک منہاج نبوت پر آئے ہوئے پاک انسان کی صحبت میں نہ بیٹھے اس کی صحبت کی توفیق نہیں مل سکتی جب تک اولاً انسان یہ یقین نہ کر لے کہ وہ ایک مرنے والی ہستی ہے یہی ایک بات ہے جو اس کو صادق کی صحبت کی توفیق عطا فرماوے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے لیے نیکی کا ارادہ کرتا ہے فرماتا ہے تو اس کے دل میں ایک واعظ پیدا

کردیتا ہے۔ سب سے بڑھ کر واعظ یہ ہے کہ وہ **كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** کی حقیقت کو سمجھ لے۔ صحابہ کرام کی حالت کو دیکھو کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ جو کچھ انہوں نے کیا اسی طرح پر ہماری جماعت کو لازم ہے کہ وہی رنگ اپنے اندر پیدا کریں۔ بدوں اس کے کہ وہ اس اصلی مطلب کو جس کے لیے میں بھیجا گیا ہوں پانہیں سکتے کیا ہماری جماعت کو زیادہ حاجتیں اور ضرورتیں لگی ہوئی ہیں جو صحابہ کو نہ تھیں؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے اور آپ کی باتیں سننے کے واسطے کیسے حریص تھے۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

صادق سے صرف یہی مراد نہیں کہ انسان زبان سے جھوٹ نہ بولے۔ یہ بات تو بہت سے ہندوؤں اور دہریوں میں بھی ہو سکتی ہے بلکہ صادق سے مراد وہ شخص ہے جس کی ہر بات صداقت اور راستی ہونے کے علاوہ اس کے ہر حرکات و سکنات و قول سب صدق سے بھرے ہوئے ہوں۔ گویا یہ کہو کہ اس کا وجود ہی صدق ہو گیا ہو اور اس کے اس صدق پر بہت سے تائیدی نشان اور آسمانی خوارق گواہ ہوں۔ چونکہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے اس لیے جو شخص ایسے آدمی کے پاس جو حرکات و سکنات، افعال و اقوال میں خدائی نمونہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ صحت نیت اور پاک ارادہ اور مستقیم جستجو سے ایک مدت تک رہے گا تو یقین کامل ہے کہ وہ اگر دہریہ بھی ہو تو آخر خدا تعالیٰ کے وجود پر ایمان لے آئے گا کیونکہ صادق کا وجود خدا نما وجود ہوتا ہے۔

انسان اصل میں انسان ہے یعنی دو محبتوں کا مجموعہ ہے۔ ایک اُنس وہ خدا سے کرتا ہے دوسرا اُس انسان سے چونکہ انسان کو تو اپنے قریب پاتا اور دیکھتا ہے اور اپنی ہی نوع کی وجہ سے اس سے جھٹ پٹ متاثر ہو جاتا ہے اس لیے کامل انسان کی صحبت اور صادق کی معیت اسے وہ نور عطا کرتی ہے جس سے خدا کو دیکھ لیتا ہے اور گناہوں سے بچ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے **كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** کہ صادقوں کے ساتھ رہو، یہ معیت چاہتی ہے کہ کسی وقت تک صحبت میں رہے کیونکہ جب تک ایک حد تک صحبت میں نہ رہے وہ اسرار اور حقائق کھل نہیں سکتے وہ اجنبی کا اجنبی رہے گا اور بیگانہ ہی رہتا ہے اور کوئی رائے قائم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

سادہ سنگت بھی ایک ضرب المثل ہے پس یہ ضروری بات ہے کہ انسان باوجود علم کے اور باوجود

قوت و شوکت کے امام کے پاس ایک سادہ لوح کی طرح پڑا ہے تا اس پر عمدہ رنگت آوے۔ سفید کپڑا اچھا رنگا جاتا ہے اور جس میں اپنی خودی اور علم کا پہلے سے کوئی میل کچیل ہوتا ہے اس پر عمدہ رنگ نہیں چڑھتا۔ صادق کی معیت میں انسان کی عقدہ کشائی ہوتی ہے اور اسے نشانات دیئے جاتے ہیں جن سے اس کا جسم منور اور روح تازہ ہوتی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

اعمال نیک کے واسطے صحبت صادقین کا نصیب ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ خدا کی سنت ہے ورنہ اگر چاہتا تو آسمان سے قرآن شریف یونہی بھیج دیتا اور کوئی رسول نہ آتا۔ مگر انسان کو عمل درآمد کے لیے نمونہ کی ضرورت ہے پس اگر وہ نمونہ نہ بھیجتا رہتا تو حق مشتتبہ ہو جاتا۔ (البدرد جلد ۲ نمبر ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶۰)

كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ یعنی صادق لوگوں کے ساتھ معیت اختیار کرو۔ ان کی صحبت میں مدت ہائے دراز تک رہو کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی شخص چند روزان کے پاس رہ جاوے اور ان ایام میں حکمت الہی سے کوئی ایسا امر واقع نہ کیونکہ ان لوگوں کے اپنے اختیار میں تو نہیں کہ جب چاہیں کوئی نشان دکھائیں۔ اسی واسطے ضروری ہے کہ ان کی صحبت میں لمبا عرصہ اور دراز مدت گزر جاوے۔ بلکہ نشان دکھانا تو درکنار یہ لوگ تو اپنے خدا کے ساتھ کے تعلقات کا اظہار بھی گناہ جانتے ہیں۔ لکھا ہے کہ اگر کوئی ولی خلوت میں اپنے خدا کے ساتھ خاص حالت اور تعلق کے جوش میں ہو اور اس پر وہ حالت طاری ہو تو ایسے وقت میں اگر کوئی شخص اس کے اس حال سے آگاہ ہو جائے تو وہ ولی شخص ایسا شرمندہ اور پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے جیسے کوئی زانی عین زنا کی حالت میں پکڑا جاوے کیونکہ یہ لوگ اپنے راز کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔

چونکہ طبعاً ایسا معاملہ تھا خدا نے اسی واسطے کہا كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کفار نے جو یہ کہا تھا کہ مَا لِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَسْبِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (الفرقان: ۸) تو انہوں نے بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حالت دیکھ کر ہی یہ کلمہ منہ سے نکالا تھا کہ کیا ہے جی۔ یہ تو ہمارے جیسا آدمی ہی ہے۔ کھاتا، پیتا، بازاروں میں پھرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا فیض نہ تھا کہ ان کو کوئی رسالت کا امر نظر آتا۔ وہ معذور تھے۔ انہوں نے جو دیکھا تھا۔ اسی کے مطابق رائے زنی کر دی۔ پس اس واسطے ضروری ہے کہ مامور من اللہ کی صحبت میں دیر تک رہا جاوے۔ ممکن ہے کہ کوئی جس نے نشان کوئی نہ دیکھا ہو کہہ دے کہ اجدی ہماری طرح نماز روزہ کرتا ہے اور کیا ہے۔

دیکھو حج کے واسطے جانا خلوص اور محبت سے آسان ہے۔ مگر واپسی ایسی حالت میں مشکل بہت ہیں۔ جو

وہاں سے نامراد اور سخت دل ہو کر آتے ہیں اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ وہاں کی حقیقت ان کو نہیں ملتی۔ قشر کو دیکھ کر رائے زنی کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہاں کے فیوض سے محروم ہوتے ہیں اپنی بدکاریوں کی وجہ سے، اور پھر الزام دوسروں پر دھرتے ہیں اس واسطے ضروری ہے کہ مامور کی خدمت میں صدق اور استقلال سے کچھ عرصہ رہا جاوے تاکہ اس کے اندرونی حالات سے بھی آگاہی ہو اور صدق پورے طور پر نورانی ہو جاوے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

دو چیزیں ہیں؛ ایک تو دعا کرنی چاہیے، دوسرا طریق یہ ہے کہ **كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** راست بازوں کی صحبت میں رہو تاکہ ان کی صحبت میں رہ کر کے تم کو پتہ لگ جاوے کہ تمہارا خدا قادر ہے، مینا ہے، سننے والا ہے، دعائیں قبول کرتا ہے اور اپنی رحمت سے بندوں کو صد ہا نعمتیں دیتا ہے

(الہد جلد ۲ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۷)

اصلاح نفس کی ایک راہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے **كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** یعنی جو لوگ توبی، فعلی، عملی اور حالی رنگ میں سچائی پر قائم ہیں ان کے ساتھ رہو۔ اس سے پہلے فرمایا: **يٰۤاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ** یعنی اے ایمان والو! تقویٰ اللہ اختیار کرو، اس سے مراد یہ ہے کہ پہلے ایمان ہو پھر سنت کے طور پر بدی کی جگہ کو چھوڑ دے اور صادقوں کی صحبت میں رہے۔ صحبت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے جو اندر ہی اندر ہوتا چلا جاتا ہے اگر کوئی شخص ہر روز کنجریوں کے ہاں جاتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ کیا میں زنا کرتا ہوں۔ اس سے کہنا چاہیے کہ ہاں تو کرے گا اور وہ ایک نہ ایک دن اس میں مبتلا ہو جاوے گا کیونکہ صحبت میں تاثیر ہوتی ہے اسی طرح پر جو شخص شراب خانہ میں جاتا ہے خواہ وہ کتنا ہی پرہیز کرے اور کہے کہ میں نہیں پیتا ہوں لیکن ایک دن آئے گا کہ وہ ضرور پئے گا۔

پس اس سے کبھی بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ صحبت میں بہت بڑی تاثیر ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصلاح نفس کے لیے **كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** کا حکم دیا ہے۔ جو شخص نیک صحبت میں جاتا ہے خواہ وہ مخالفت ہی کے رنگ میں ہو لیکن وہ صحبت اپنا اثر کیے بغیر نہ رہے گی اور ایک نہ ایک دن وہ اس مخالفت سے باز آ جائے گا۔

ہم افسوس سے کہتے کہ ہمارے مخالف اسی صحبت کے نہ ہونے کی وجہ سے محروم رہ گئے۔ اگر وہ ہمارے پاس آ کر رہتے۔ ہماری باتیں سنتے تو ایک وقت آجاتا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کر دیتا اور وہ حق

کو پا لیتے لیکن اب چونکہ اس صحبت سے محروم ہیں اور انہوں نے ہماری باتیں سننے کا موقع کھو دیا ہے اس لیے کبھی کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ یہ دہریے ہیں۔ شراب پیتے ہیں، زانی ہیں اور کبھی یہ اتہام لگاتے ہیں کہ نعوذ باللہ! پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ صحبت نہیں اور یہ قہرا الہی ہے کہ صحبت نہ ہو۔

لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صلح حدیبیہ کی ہے تو صلح حدیبیہ کی مبارک ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کو آپ کے پاس آنے کا موقع ملا اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں تو ان میں سے صد ہا مسلمان ہو گئے۔ جب تک انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں نہ سنی تھیں۔ ان میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک دیوار حائل تھی جو آپ کے حسن و جمال پر ان کو اطلاع نہ پانے دیتی تھی۔ اور جیسا دوسرے لوگ کذاب کہتے تھے (معاذ اللہ) وہ بھی کہہ دیتے تھے اور ان فیوض و برکات سے بے نصیب تھے جو آپ لے کر آئے تھے اس لیے کہ دور تھے لیکن جب حجاب اُٹھ گیا اور پاس آ کر دیکھا اور سنا تو وہ محرومی نہ رہی اور سعیدوں کے گروہ میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح پر بہتوں کی بد نصیبی کا اب بھی یہی باعث ہے جب ان سے پوچھا جاوے کہ تم نے ان کے دعویٰ اور دلائل کو کہاں تک سمجھا ہے تو بجز چند بہتانوں اور افتراؤں کے کچھ نہیں کہتے جو بعض مفتری سنا دیتے ہیں اور وہ ان کو سچ مان لیتے ہیں اور خود کوشش نہیں کرتے کہ یہاں خود تحقیق کریں اور ہماری صحبت میں رہ کر دیکھیں۔ اس سے ان کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں اور وہ حق کو نہیں پاسکتے لیکن اگر وہ تقویٰ سے کام لیتے تو کوئی گناہ نہ تھا کہ وہ آ کر ہم سے ملتے جلتے رہتے اور ہماری باتیں سنتے رہتے حالانکہ عیسائیوں اور ہندوؤں سے بھی ملتے ہیں اور ان کی باتیں سنتے ہیں ان کی مجلسوں میں جاتے ہیں پھر کون سا امر مانع تھا جو ہمارے پاس آنے سے انہوں نے پرہیز کیا۔

غرض یہ بڑی ہی بد نصیبی ہے اور انسان اس کے سبب سے محروم ہو جاتا ہے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا: **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ**۔ اس میں بڑا نکتہ معرفت یہی ہے کہ چونکہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے اس لیے ایک راست باز کی صحبت میں رہ کر انسان راست بازی سیکھتا ہے اور اس کے پاک انفاس کا اندر ہی اندر اثر ہونے لگتا ہے جو اس کو خدا تعالیٰ پر ایک سچا یقین اور بصیرت عطا کرتا ہے اس کی صحبت میں صدق دل سے رہ کر وہ خدا تعالیٰ کی آیات اور نشانات کو دیکھتا ہے جو ایمان کے بڑھانے کے ذریعے ہیں۔

جب انسان ایک راستباز اور صادق کے پاس بیٹھتا ہے تو صدق اس میں کام کرتا ہے لیکن جو راستبازوں کی صحبت چھوڑ کر بدوں اور شریروں کی صحبت کو اختیار کرتا ہے تو ان میں بدی اثر کرتی جاتی ہے۔ اسی لیے احادیث اور قرآن شریف میں صحبت بد سے پرہیز کرنے کی تاکید اور تہدید پائی جاتی ہے اور لکھا ہے کہ جہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت ہوتی ہو اس مجلس سے فی الفور اٹھ جاؤ ورنہ جو اہانت سن کر نہیں اٹھتا اس کا شمار بھی ان میں ہی ہوگا۔

صادقوں اور راست بازوں کے پاس رہنے والا بھی ان میں ہی شریک ہوتا ہے۔ اس لیے کس قدر ضرورت ہے اس امر کی کہ انسان کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کے پاک ارشاد پر عمل کرے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ وہ پاک لوگوں کی مجلس میں آتے ہیں اور جب واپس جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے کیا دیکھا وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک مجلس دیکھی ہے جس میں تیرا ذکر کر رہے تھے مگر ایک شخص ان میں سے نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہیں وہ بھی ان میں ہی سے ہے کیونکہ انہم قوم لا یشقی جلیسہم اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صادقوں کی صحبت سے کس قدر فائدے ہیں۔ سخت بدنصیب ہے وہ شخص جو صحبت سے دور ہے۔

غرض نفس مطمئنہ کی تاثیروں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اطمینان یافتہ لوگوں کی صحبت میں اطمینان پاتے ہیں۔ امارہ والے میں نفس امارہ کی تاثیریں ہوتی ہیں اور لوامہ والے میں لوامہ کی تاثیریں ہوتی ہیں۔ اور جو شخص نفس مطمئنہ والے کی صحبت میں بیٹھتا ہے اس پر بھی اطمینان اور سکینت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اندر ہی اندر اسے تسلی ملنے لگتی ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

نفس اور اخلاق کی پاکیزگی حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ صحبت صادقین بھی ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے کہ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی تم خدا تعالیٰ کے صادق اور راست باز لوگوں کی صحبت اختیار کرو تاکہ ان کے صدق کے انوار سے تم کو بھی حصہ ملے جو مذہب کہ تفرقہ پسند کرتے ہیں اور الگ الگ رہنے کی تعلیم دیتے ہیں وہ یقیناً وحدت جمہوری کی برکات سے محروم رہتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا کہ ایک نبی ہو جو کہ جماعت بناوے اور اخلاق کے ذریعہ آپس میں تعارف اور وحدت پیدا کرے۔

(الہد جلد ۳ نمبر ۳۳ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

(حقیقی پاکیزگی کے حاصل کرنے اور خاتمہ بالخیر کے لیے) تیسرا پہلو جو قرآن سے ثابت ہے وہ صحبت

صادقین ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** یعنی صادقوں کے ساتھ رہو۔ صادقوں کی صحبت میں ایک خاص اثر ہوتا ہے ان کا نور صدق و استقلال دوسروں پر اثر ڈالتا ہے اور ان کی کمزوریوں کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔

تیسرا پہلو حصول نجات اور تقویٰ کا صادقوں کی معیت ہے جس کا حکم قرآن شریف میں ہے: **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** یعنی اکیلے نہ رہو کہ اس حالت میں شیطان کا داؤا انسان پر ہوتا ہے بلکہ صادقوں کی معیت اختیار کرو ان کی جمعیت میں رہو کہ ان کے انوار و برکات کا پرتو تم پر پڑتا رہے اور خانہء قلب کے ہر ایک خس و خاشاک کو محبت الہی کی آگ سے جلا کر نور الہی سے بھر دے۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۲ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

متقی کے ساتھ چونکہ اللہ تعالیٰ کی معیت ہوتی ہے اس لیے دشمن پر بھی متقی کا رعب ہوتا ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کا قابل ہے کہ سچا تقویٰ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان صادقوں اور مردانِ خدا کی صحبت اختیار نہیں کرتا اور خدا تعالیٰ کے فرستادوں کی اطاعت میں ایک فنا اپنے اوپر طاری نہیں کر لیتا۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يٰۤاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ**۔ ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اور صادقوں کے ساتھ رہو۔ ان کی معیت سے قوت پکڑو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی پوری حقیقت متقی ہونے کے بعد کھلتی ہے اور تقویٰ اللہ کی حقیقت اس وقت تک متحقق نہیں ہو سکتی جب تک ایک فانی مرد کی پاک صحبت میں رہ کر فائدہ نہ اٹھایا جائے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ صرف صحبت میں رہنا ہی چنداں مفید اور کارگر نہیں ہوتا بلکہ صادقوں کی صحبت کے اختیار کرنے میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی اطاعت اختیار کی جائے۔

صادقوں کے ساتھ ہونے سے وہ تاثیرات اور انوار دل پر پڑتے ہیں جو پاکیزگی بخش اور نجات کے چشمہ تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ دنیا میں یہی قاعدہ ہے کہ صادقوں کی کشش اپنا اثر کرتی ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود کیسا بابرکت تھا کہ صحابہ میں آپ کی تاثیر ہوئی۔ اسی طرح سے اب بھی خدا نے تاثیر کا ایک سلسلہ رکھا ہے یہ قانون قدرت ہے حصول فضل کا جو نجات کا موجب ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

صحبت میں بڑا شرف ہے۔ اس کی تاثیر کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا ہی دیتی ہے۔ کسی کے پاس اگر خوشبو ہو تو

پاس والے کو بھی پہنچ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح پر صادقوں کی صحبت ایک روح صدق کی نفع کر دیتی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ گہری صحبت نبی اور صاحب نبی کو ایک کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن شریف میں کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ فرمایا ہے اور اسلام کی خوبیوں میں سے یہ ایک بے نظیر خوبی ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے صادق موجود رہتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)  
صادق کی صحبت میں رہو تو خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت سے امور میں مشکلات آسان ہو جاتے ہیں۔  
(بدر جلد ۲ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

اگرچہ یہ علوم لدنیہ و کشف صادقہ و تائیدات خاصہ الہیہ و توجہات جلیلہ صمدیہ غیر فانی کو ذاتی طور پر حاصل نہیں ہو سکتے لیکن بتوسط صحبت شیخ فانی بھی حاصل ہو سکتے ہیں یعنی اگرچہ براہ راست نہیں لیکن سالک اپنے شیخ کامل میں ان تمام تائیدات سماویہ کو معائنہ و مشاہدہ کرتا ہے۔ پس یہی مشاہدہ اس کے یقین کی کمالیت کا موجب ہو جاتا ہے۔ اگر جلدی نہیں تو ایک زمانہ دراز کی صحبت سے ضرور شکوک و شبہات کی تاریکی دل پر سے اُٹھ جاتی ہے۔ اسی جہت سے فانیوں کی معیت کے لیے قرآن شریف میں سخت تاکید ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ اَجِیْ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الصّٰدِقُوْنَ هُمْ الْفٰئِدُونَ لَا غَیْبَ لَهُمْ اَوْ جُوْ شَخْصٍ نَهْ فٰنِیْ هُوَ اَوْ نَهْ فٰنِیُوْنَ سَے اس کا کچھ تعلق اور محبت ہے وہ معرض ہلاکت میں ہے اور اس کے سوء خاتمہ کا سخت اندیشہ ہے۔

یہ کہنا کہ ہمارے لیے قرآن اور احادیث کافی ہیں اور صحبت صادقین کی ضرورت نہیں یہ خود مخالفت تعلیم قرآن ہے کیونکہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ اور صادق وہ ہیں جنہوں نے صدق کو علی وجہ البصیرت شناخت کیا اور پھر اس پر دل و جان سے قائم ہو گئے اور یہ علیٰ درجہ بصیرت کا بجز اس کے ممکن نہیں کہ سماوی تائید شامل حال ہو کر علیٰ مرتبہ حق یقین تک پہنچا دیوے۔ پس ان معنوں کر کے صادق حقیقی انبیاء اور رسل اور محدث اور اولیاء کا ملین مکملین ہیں۔ جن پر آسمانی روشنی پڑی اور جنہوں نے خدا تعالیٰ کو اسی جہان میں یقین کی آنکھوں سے دیکھ لیا اور آیت موصوفہ بالا بطور اشارت ظاہر کر رہی ہے کہ دنیا صادقوں کے وجود سے کبھی خالی نہیں ہوتی کیونکہ دوام حکم کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ دوام وجود صادقین کو مستلزم ہے علاوہ اس کے مشاہدہ صاف بتلا رہا ہے کہ جو لوگ صادقوں کی صحبت سے لاپرواہ ہو کر عمر گزارتے ہیں ان کے علوم و فنون جسمانی جذبات سے ان کو ہرگز صاف نہیں کر سکتے اور کم سے کم اتنا ہی مرتبہ اسلام کا کہ دلی یقین اس بات پر ہو کہ خدا

ہے ان کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا اور جس طرح وہ اپنی اس دولت پر یقین رکھتے ہیں جو ان کے صندوقوں میں بند ہو یا اپنے ان مکانات پر جو ان کے قبضہ میں ہو ہرگز ان کو ایسا یقین خدا تعالیٰ پر نہیں ہوتا۔ وہ سم الفار کھانے سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ وہ ایک زہر مہلک ہے لیکن گناہوں کی زہر سے نہیں ڈرتے۔ (شہادت القرآن، روحانی خزائن جلد صفحہ ۷۳۷)

جاننا چاہیے کہ انبیاء کی ضرورتوں میں سے ایک یہ بھی ضرورت ہے کہ انسان طبعاً کامل نمونہ کا محتاج ہے اور کامل نمونہ شوق کو زیادہ کرتا ہے اور ہمت کو بڑھاتا ہے اور جو نمونہ کا پیر نہیں وہ سست ہو جاتا ہے اور بہک جاتا ہے اسی کی طرف اللہ جل شانہ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے: **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ**... تم ان لوگوں کی صحبت اختیار کرو جو راست باز ہیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۱، ۴۲۲) اگر خدا سے ملنا چاہتے ہو تو دعا بھی کرو اور کوشش بھی کرو اور صادقوں کی صحبت میں بھی رہو کیونکہ اس راہ میں صحبت بھی شرط ہے۔ (لیکچر لاہور، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰)

خدا کو خدا کی جگہ، رسول کو رسول کی جگہ سمجھو اور خدا کے کلام کو دستور العمل ٹھہرا لو۔ اس سے چونکہ زیادہ قرآن شریف میں اور کچھ نہیں کہ **كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** پس صادقوں اور فانی فی اللہ کی صحبت تو ضروری ہے اور یہ کہیں نہ کہا گیا کہ تم اسے ہی سب کچھ سمجھو۔ اور یا قرآن شریف میں یہ حکم ہے: **اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحِبِّکُمْ اللّٰهُ** (ال عمران: ۳۲) اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ مجھے خدا سمجھ لو، بلکہ یہ فرمایا کہ اگر خدا کے محبوب بننا چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی راہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو۔ اتباع کا حکم تو دیا ہے، مگر تصور شیخ کا حکم قرآن میں پایا نہیں جاتا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۲۲۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْبَدِیْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَرْعَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ۗ ذٰلِكَ بِاَنْهُمْ لَا یُصِیْبُهُمْ ظَمًا وَ لَا نَصَبٌ وَ لَا مَحْصَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَطُوْنَ مَوْطِئًا یَغِیْظُ الْکُفَّارَ وَ لَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوِّ نَبِیٍّ اِلَّا کُنْتَبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صٰلِحٌ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْحٰسِنِیْنَ ﴿۱۰﴾

(رپورٹ جلسہ سالانہ، ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۶۱)

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔

یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ چنانچہ فرمایا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔ اخیراً اور ابرار کا نام ابدالآباد تک زندہ رہتا ہے۔ گذشتہ زمانے کے بادشاہوں یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ برخلاف اس کے خدا تعالیٰ کے راست بازوں اور برگزیدوں کی دنیا مداح ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۴ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

اگرچہ یہ سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا: إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ مگر نیکی کرنے والے کو اجر مد نظر نہیں رکھنا چاہیے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۱)

دنیا تماشا گاہ ہے۔ کبھی انسان عروج میں گویا افلاک تک پہنچتا ہے اور کبھی خاک میں مگر جو لوگ خدا کی طرف اور خدا کے بندوں کی طرف جھکتے ہیں وہ ضائع نہیں کیے جاتے إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔

(مکتوبات احمد جلد دوم صفحہ ۳۷۶)

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً ۗ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَ لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۳۷﴾

یعنی ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو تفقہ فی الدین کریں یعنی جو دین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے اس میں تفقہ کر سکیں۔ یہ نہیں کہ طوطے کی طرح یاد ہو اور اس میں غور و فکر کی مطلق عادت اور مذاق ہی نہ ہو۔ اس سے وہ غرض حاصل نہیں ہو سکتی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے..... لیکن چونکہ سب کے سب ایسے نہیں ہو سکتے اس لیے یہ نہیں فرمایا کہ سب کے سب ایسے ہو جائیں بلکہ یہ فرمایا کہ ہر جماعت اور گروہ میں سے ایک ایک آدمی ہو اور گویا ایک جماعت ایسے لوگوں کی ہونی چاہیے جو تبلیغ اور اشاعت کا کام کر سکیں۔ اس لیے بھی ہر شخص ایسی طبیعت اور مذاق کا نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۳۸﴾

جذب اور عقد ہمت ایک انسان کو اس وقت دیا جاتا ہے جبکہ وہ خدا تعالیٰ کی چادر کے نیچے آ جاتا ہے



رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ كُلِّهِمْ وَلِتَنُوعِ الْإِنْسَانِ  
وَالْحَيَوَانَ. وَأَهْلِي الْكُفْرِ وَالْإِيمَانِ. ثُمَّ  
قَالَ ”بِالْمُؤْمِنِينَ رَوْوُفٌ رَّحِيمٌ“ -  
فَجَعَلَهُ رَحْمَةً لِّرَحْمَاتِنَا وَرَحِيمًا  
(اعجاز المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

ہیں کیونکہ آپ کا وجود مبارک سب جہانوں کے لیے رحمت  
ہے۔ بنی نوع انسان حیوانات، کافروں، مومنوں سبھی کے  
لیے۔ پھر فرمایا بِالْمُؤْمِنِينَ رَوْوُفٌ رَّحِيمٌ۔ اور اس میں  
آپ کو رحمان اور رحیم کے نام دیئے۔ (ترجمہ از مرتب)

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ

الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾

ہم لوگ جو خدا تعالیٰ کو رب العرش کہتے ہیں تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ جسمانی اور جسم ہے اور عرش کا  
محتاج ہے بلکہ عرش سے مراد وہ مقدس بلندی کی جگہ ہے جو اس جہان اور آنے والے جہان سے برابر نسبت  
رکھتی ہے اور خدا تعالیٰ کو عرش پر کہنا درحقیقت ان معنوں سے مترادف ہے کہ وہ مالک الکونین ہے اور جیسا کہ  
ایک شخص اونچی جگہ بیٹھ کر یا کسی نہایت اونچے محل پر چڑھ کر یہیں ویسا نظر رکھتا ہے۔ ایسا ہی استعارہ کے طور  
پر خدا تعالیٰ بلند سے بلند تخت پر تسلیم کیا گیا ہے جس کی نظر سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں نہ اس عالم کی اور نہ اس  
دوسرے عالم کی، ہاں! اس مقام کو عام سمجھوں کے لئے اوپر کی طرف بیان کیا جاتا ہے۔

(ست پن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۰)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

## تفسیر سورۃ یونس

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرَّ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱

یہ اس کتاب کی آیتیں ہیں کہ جو جامع علوم حکمیہ ہے۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۴۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

قرآن حکیم ہے یعنی حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ (کرامات الصادقین، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۵۲)

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ يُبَشِّرَ  
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ لَهُمْ قَدٰمٌ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ  
مُّبِيْنٌ ۝۲

کیا لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ جو ہم نے ان میں سے ایک کی طرف یہ وحی بھیجی کہ تو لوگوں کو  
ڈرا اور ان کو جو ایمان لائے یہ خوشخبری دے کہ ان کے لئے ان کے رب کے نزدیک قدم صدق ہے۔  
کافروں نے اس رسول کی نسبت کہا کہ یہ تو صریح جادوگر ہے۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۴۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

جو لوگ ارادت سے رجوع کرتے ہیں ان کا عمل مقبول ہے اور ان کے لئے قدم صدق ہے۔

(مکتوبات جلد ۵ نمبر ۵ صفحہ ۱۰ مکتوب بنام حضرت منشی احمد جان صاحب)

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى  
الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۗ مَا مِنْ شَيْعٍ إِلَّا مِنْ عِندِهِ ۗ ذَٰلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ  
فَاعْبُدُوهُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۰﴾

اس جگہ کے متعلق ایک اور اعتراض ہے جو بعض ناواقف آریہ پیش کیا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ یعنی خدا نے جو تمہارا رب ہے زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں بنایا اور پھر عرش پر ٹھہرا۔ یہ چھ دن کی کیوں تخصیص ہے یہ تو تسلیم کیا کہ خدا تعالیٰ کے کام اکثر تدریجی ہیں جیسا کہ اب بھی اس کی خالقیت جو جمادات اور نباتات اور حیوانات میں اپنا کام کر رہی ہے تدریجی طور پر ہی ہر ایک چیز کو اس کی خلقت کاملہ تک پہنچاتی ہے لیکن چھ دن کی تخصیص کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

اما الجواب پس واضح ہو کہ یہ چھ دن کا ذکر درحقیقت مراتب تکوینی کی طرف اشارہ ہے یعنی ہر ایک چیز جو بطور خلق صادر ہوئی ہے اور جسم اور جسمانی ہے خواہ وہ مجموعہ عالم ہے اور خواہ ایک فرد از افراد عالم اور خواہ وہ عالم کبیر ہے جو زمین و آسمان و ما فیہما سے مراد ہے اور خواہ وہ عالم صغیر جو انسان سے مراد ہے وہ بحکمت و قدرت باری تعالیٰ پیدائش کے چھ مرتبے طے کر کے اپنے کمال خلقت کو پہنچتی ہے اور یہ عام قانون قدرت ہے کچھ ابتدائی زمانہ سے خاص نہیں چنانچہ اللہ جل شانہ ہر ایک انسان کی پیدائش کی نسبت بھی انہیں مراتب ستہ کا ذکر فرماتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کے اٹھارویں سیرارے سورۃ المؤمنون میں یہ آیت ہے: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلْطَانٍ مِّنْ طِينٍ - ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً ۗ فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ - ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۗ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ - (المؤمنون: ۱۳ تا ۱۵) یعنی پہلے تو ہم نے انسان کو اس مٹی سے پیدا کیا جو زمین کے تمام انواع اور اقسام کا لب لباب تھا اور اس کی تمام قوتیں اپنے اندر رکھتا تھا تا وہ باعتبار جسم بھی عالم صغیر ٹھہرے اور زمین کی تمام چیزوں کی اس میں قوت اور خاصیت ہو جیسا کہ وہ برطبق آیت: فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَ

كَفَحْتُ فِيهِ مِنْ دُوْحَى (الحجر: ۳۰) باعتبار روح عالم صغیر ہے اور بلحاظ شیون و صفات کاملہ و ظلیت تام روح الہی کا مظہر تام ہے۔ پھر بعد اس کے انسان کو ہم نے دوسرے طور پر پیدا کرنے کے لئے یہ طریق جاری کیا جو انسان کے اندر نطفہ پیدا کیا اور اس نطفہ کو ہم نے ایک مضبوط تھیلی میں جو ساتھ ہی رحم میں بنتے جاتے ہی جگہ دی۔ (قرائین کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا کہ تارحم اور تھیلی دونوں پر اطلاق پاسکے) اور پھر ہم نے نطفہ سے علقہ بنایا اور علقہ سے مضغہ اور مضغہ کے بعض حصوں میں سے ہڈیاں اور ہڈیوں پر پوست پیدا کیا پھر اس کو ایک اور پیدائش دی یعنی روح اس میں ڈال دی۔ پس کیا ہی مبارک ہے وہ خدا جو اپنی صنعت کاری میں تمام صناعتوں سے بلحاظ حسن صنعت و کمال عجائبات خلقت بڑھا ہوا ہے۔

اب دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے اس جگہ بھی اپنا قانون قدرت یہی بیان فرمایا کہ انسان چھ طور کے خلقت کے مدارج طے کر کے اپنے کمال انسانیت کو پہنچتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ عالم صغیر اور عالم کبیر میں نہایت شدید تشابہ ہے اور قرآن سے انسان کا عالم صغیر ہونا ثابت ہے اور آیت: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (الننن: ۵) اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ تقویم عالم کی متفرق خوبیوں اور حسنوں کا ایک ایک حصہ انسان کو دے کر بوجہ جامعیت جمیع شائل و شیون عالم اس کو احسن ٹھہرایا گیا ہے پس اب بوجہ تشابہ عالمین اور نیز بوجہ ضرورت تناسب افعال صانع واحد ماننا پڑتا ہے کہ جو عالم صغیر میں مراتب تکوین موجود ہیں وہی مراتب تکوین عالم کبیر میں بھی ملحوظ ہوں اور ہم صریح اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ عالم عالم کبیر کے کوائف مخفیہ کی شناخت کے لئے ایک آئینہ کاحکم رکھتا ہے پس جب کہ اس کی پیدائش کے چھ مرتبے ثابت ہوئے تو قطعی طور پر یہ حکم دے سکتے ہیں کہ عالم کبیر کے بھی مراتب تکوین چھ ہی ہیں جو بلحاظ موثرات سے یعنی تجلیات سے جن کے آثار باقیہ نجوم ستہ میں محفوظ رہ گئے ہیں معقولی طور پر متحقق ہوتے ہیں۔ اور نجوم ستہ کا اب بھی علوم حکمیہ میں جنین کی تکمیل کے لئے تعلق مانا جاتا ہے چنانچہ سدید میں اس کے متعلق ایک مبسوط بحث لکھی ہے۔ بعض نادان اس جگہ اس آیت کی نسبت یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ حال کی طبی تحقیقاتوں کی رو سے یہ طرز بچہ کے بننے کی جو رحم عورت میں بنتا ہے ثابت نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اس کے ثابت ہوتا ہے لیکن یہ اعتراض سخت درجہ کی کم فہمی یا صریح تعصب پر مبنی ہے اس بات کے تجربہ کے لئے کسی ڈاکٹر یا طبیب کی حاجت نہیں خود ہر ایک انسان اس آزمائش کے لئے وقت خرچ کر کے اور ان بچوں کو دیکھ کر جو تام خلقت یا نام تمام خلقت کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں یا مستقوط

حمل کے طور پر گرتے ہیں۔ حقیقت واقعہ تک پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ ہم اپنے ذاتی مشاہدہ سے جانتے ہیں بلاشبہ یہ بات صحیح ہے کہ جب خدا تعالیٰ انسانی نطفہ سے کسی بچہ کو رحم میں بنانے کے لئے ارادہ فرماتا ہے تو پہلے مرد اور عورت کا نطفہ رحم میں ٹھہرتا ہے اور صرف چند روز تک ان دونوں مینیوں کے امتزاج سے کچھ تغیر طاری ہو کر جنم ہوئے خون کی طرح ایک چیز ہو جاتی ہے جس پر ایک نرم سی جھلی ہوتی ہے یہ جھلی جیسے جیسے بچہ بڑھتا ہے بڑھتی جاتی ہے یاں تک کہ خاکی رنگ کی ایک تھیلی سی ہو جاتی ہے جو گھڑی کی طرح نظر آتی ہے اور اپنی تکمیل خلقت کے دنوں تک بچہ اسی میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے اور حال کی تحقیقاتیں بھی اس کی مصدق ہیں کہ عالم کبیر بھی اپنے کمال خلقت کے وقت تک ایک گھڑی کی طرح تھا جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: **أَوَلَمْ يَرِ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۗ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** (الانبیاء: ۳۱) الجز ونمبر ۷ یعنی فرماتا ہے کہ کیا کافروں نے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا کہ گھڑی کی طرح آپس میں بندھے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو کھول دیا۔ سو کافروں نے تو آسمان اور زمین بنتا نہیں دیکھا اور نہ ان کی گھڑی دیکھی لیکن اس جگہ روحانی آسمان اور روحانی زمین کی طرف اشارہ ہے جس کی گھڑی کفار عرب کے رو برو کھل گئی اور فیضان سماوی زمین پر جاری ہو گئے۔ اب پھر ہم اپنے پہلے کلام کی طرف عود کر کے کہتے ہیں کہ نطفتین مرد اور عورت کے جو آپس میں مل جاتے ہیں وہ اول مرتبہ تکوین کا ہے۔ اور پھر ان میں ایک جوش آ کر وہ مجموعہ نطفتین جو قوت عاقدہ اور منعقدہ اپنے اندر رکھتا ہے سرخی کی طرف مائل ہو جاتا ہے گویا وہ منی جو پہلے خون سے بنی تھی پھر اپنے اصلی رنگ کی طرف جو خون ہی ہے عود کر آتی ہے یہ دوسرا درجہ ہے پھر وہ خون جما ہوا جس کا نام علقہ ہے ایک گوشت کا مضغہ ہو جاتا ہے جو انسانی شکل کا کچھ خا کہ نہایت دقیق طور پر اپنے اندر رکھتا ہے یہ تیسرا درجہ ہے اور اس درجہ پر اگر بچہ ساقط ہو جائے تو اس کے دیکھنے سے غور کی نظر سے کچھ خطوط انسان بننے کے اس میں دکھائی دیتے ہیں چنانچہ اکثر بچے اس حالت میں بھی ساقط ہو جاتے ہیں جن عورتوں کو کبھی یہ اتفاق پیش آیا ہے یا وہ دایہ کا کام کرتی ہیں وہ اس حال سے خوب واقف ہیں پھر چوتھا درجہ وہ ہے جب مضغہ سے ہڈیاں بنائی جاتی ہیں جیسا کہ آیت: **فَخَلَقْنَا الْمُهْضَغَةَ عِظْمًا** (المؤمنون: ۱۵) بیان فرما رہی ہے۔ مگر المہضغۃ پر جو الف لام ہے وہ تخصیص کے لئے ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تمام مضغہ ہڈی نہیں بن جاتا بلکہ جہاں جہاں ہڈیاں درکار ہیں باذنہ تعالیٰ وہی نرم گوشت کسی قدر صلب ہو کر ہڈی کی صورت بن جاتا ہے اور کسی قدر بدستور نرم گوشت رہتا ہے۔ اور اس درجہ

پر انسانی شکل کا کھلا کھلا خاکہ طیار ہو جاتا ہے جس کے دیکھنے کے لئے کسی خوردبین کی ضرورت نہیں اس خاکہ میں انسان کا اصل وجود جو کچھ بنا چاہئے تھا بن چکتا ہے لیکن وہ ابھی اس لحم سے خالی ہوتا ہے جو انسان کے لئے بطور ایک موٹے اور شاندار اور چمکیلے لباس کے لئے ہے۔ جس سے انسان کے تمام خط و خال ظاہر ہوتے ہیں اور بدن پر تازگی آتی ہے اور خوبصورتی نمایاں ہو جاتی ہے اور تناسب اعضا پیدا ہوتا ہے پھر بعد اس کے پانچواں درجہ وہ ہے کہ جب اس خاکہ پر لحم یعنی موٹا گوشت بر عایت مواضع مناسبہ چڑھایا جاتا ہے یہ وہی گوشت ہے کہ جب انسان تپ وغیرہ سے بیمار رہتا ہے تو فاقہ اور بیماری کی تکالیف شاقہ سے وہ گوشت تحلیل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات انسان ایسی لاغری کی حالت پر پہنچ جاتا ہے جو وہی پانچویں درجہ کا خاکہ یعنی مشمت استخوان رہ جاتا ہے جیسے مدقوقوں اور مسلولوں اور اصحاب ذیابیطس میں مرض کے انتہائی درجہ میں یہ صورت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی کی حیات مقدر ہوتی ہے تو پھر خدا تعالیٰ اس کے بدن پر گوشت چڑھاتا ہے غرض یہ وہی گوشت ہے جس سے خوبصورتی اور تناسب اعضا اور رونق بدن پیدا ہوتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ گوشت خاکہ طیار ہونے کے بعد آہستہ آہستہ جنین پر چڑھتا رہتا ہے اور جب جنین ایک کافی حصہ اس کا لیتا ہے تب باذنہ تعالیٰ اس میں جان پڑ جاتی ہے تب وہ نباتی حالت سے جو صرف نشوونما ہے منتقل ہو کر حیوانی حالت کی خاصیت پیدا کر لیتا ہے اور پیٹ میں حرکت کرنے لگتا ہے غرض یہ ثابت شدہ بات ہے کہ بچہ اپنی نباتی صورت سے حیوانی صورت کو کامل طور پر اس وقت قبول کرتا ہے کہ جب کہ عام طور پر موٹا گوشت اس کے بدن پر مناسب کمی بیشی کے ساتھ چڑھ جاتا ہے یہی بات ہے جس کو آج تک انسان کے مسلسل تجارب اور مشاہدات نے ثابت کیا ہے یہ وہی تمام صورت ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اور مشاہدات کے ذریعہ سے بتواتر ثابت ہے پھر اس پر اعتراض کرنا اگر نادانوں کا کام نہیں تو اور کس کا ہے؟

اب پھر ہم اپنے کلام کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ چونکہ عالم صغیر میں جو انسان ہے سنت اللہ بھی ثابت ہوئی ہے کہ اس کے وجود کی تکمیل چھ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے تو اسی قانون قدرت کی رہبری سے ہمیں معقولی طور پر یہ راہ ملتی ہے کہ دنیا کی ابتدا میں جو اللہ جل شانہ نے عالم کبیر کو پیدا کیا تو اس کی طرز پیدائش میں بھی یہی مراتب ستہ ملحوظ رکھے ہوں گے اور ہر ایک مرتبہ کو تفریق اور تقسیم کی غرض سے ایک دن یا ایک وقت سے مخصوص کیا ہوگا جیسا کہ انسان کی پیدائش کے مراتب ستہ چھ وقتوں سے خاص ہیں اور دنیا کی تمام قوموں کا سات دنوں پر اتفاق ہونا اور ایک دن تعطیل کا نکال کر چھ دنوں کو کاموں کے لئے خاص کرنا

اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چھ دن ان چھ دنوں کی یادگار چلے آتے ہیں کہ جن میں زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے بنایا گیا تھا۔

اور اگر کوئی اب بھی تسلیم نہ کرے اور انکار سے باز نہ آوے تو ہم کہتے ہیں کہ ہم نے تو عالم کبیر کے لئے عالم صغیر کی پیدائش کے مراتب سہ کا ثبوت دے دیا اور جو کام کرنے کے دن بالاتفاق ہر ایک قوم میں مسلم ہیں ان کا چھ ہونا بھی ظاہر کر دیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا تعالیٰ کے تمام پیدائشی کام اس دنیا میں تدریجی ہیں تو پھر اگر منکر کی نظر میں یہ دلیل کافی نہیں تو اس پر واجب ہوگا کہ وہ بھی تو اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل پیش کرے کہ خدا تعالیٰ نے یہ عالم جسمانی صرف ایک دم میں پیدا کر دیا تھا تدریجی طور پر پیدا نہیں کیا تھا۔ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ وہی خدا اب بھی ہے جو پہلے تھا اور وہی خالقیت کا سلسلہ اب بھی جاری ہے جو پہلے جاری تھا۔ اور صاف بدیہی طور پر نظر آ رہا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر ایک مخلوق کو تدریجی طور پر اپنے کمال و جود تک پہنچاتا ہے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ پہلے وہ قوی تھا اور جلد کام کر لیتا تھا اور اب ضعیف ہے اور دیر سے کرتا ہے بلکہ یہی کہیں گے کہ اس کا قانون قدرت ہی ابتدا سے یہی ہے کہ وہ ہر ایک مخلوق کو بتدریج پیدا کرتا ہے سو حال کے افعال الہی ہمیں بتلا رہے ہیں کہ گزشتہ اور ابتدائی زمانہ میں بھی یہی تدریج ملحوظ تھی جو اب ہے۔ ہم سخت نادان ہوں گے اگر ہم حال کے آئینہ میں گزشتہ کی صورت نہ دیکھ لیں اور حال کی طرز خالقیت پر نظر ڈال کر صرف اتنا ہی ثابت نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ اپنی پیدائش کے سلسلہ کو تدریج سے کمال و جود تک پہنچاتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک مخلوق کی پیدائش میں چھ ہی مرتبے رکھے ہیں اور حکمت الہی نے ہر ایک مخلوق کی پیدائش میں یہی تقاضا کیا کہ اس کے پیدا ہونے کے چھ مرتبے ہوں جو چھ وقتوں میں انجام پذیر ہوں کسی مخلوق پر نظر ڈال کر دیکھ لو یہی چھ مراتب اس میں متحقق ہوں گے یعنی بنظر تحقیق یہ ثابت ہوگا کہ ہر ایک جسمانی مخلوق کے وجود کی تکمیل چھ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے اور انسان پر کچھ موقوف نہیں زمین پر جو ہزار ہا حیوانات ہیں ان کے وجود کی تکمیل بھی انہیں مراتب سہ پر موقوف پاؤ گے۔

پھر ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ مراتب سہ تکوین کا صرف جسمانی مخلوق میں ہی محدود نہیں بلکہ روحانی امور میں بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے مثلاً تھوڑے سے غور سے معلوم ہوگا کہ انسان کی روحانی پیدائش کے مراتب بھی چھ ہی ہیں پہلے وہ نطفہ کی صورت پر صرف حق کے قبول کرنے کی ایک استعداد بعیدہ اپنے اندر رکھتا ہے اور پھر جب اس استعداد کے ساتھ ایک قطرہ رحمت الہی مل جاتا ہے اسی طرز کے موافق کہ جب

عورت کے نطفہ میں مرد کا نطفہ پڑتا ہے تو تب انسان کی باطنی حالت نطفہ کی صورت سے علقہ کی صورت میں آجاتی ہے اور کچھ رشتہ باری تعالیٰ سے پیدا ہونے لگتا ہے جیسا کہ علقہ کے لفظ سے تعلق کا لفظ مفہوم ہوتا ہے اور پھر وہ علقہ اعمال صالحہ کے خون کی مدد سے مضغہ بنتا ہے اسی طرز سے کہ جیسے خون حیض کی مدد سے علقہ مضغہ بن جاتا ہے اور مضغہ کی طرح ابھی اس کے اعضا نام تمام ہوتے ہیں جیسا کہ مضغہ میں ہڈی والے اعضا ابھی ناپدید ہوتے ہیں ایسا ہی اس میں بھی شدتِ یلہ اور ثباتِ یلہ اور استقامتِ یلہ کے اعضا ابھی کما حقہ پیدا نہیں ہوتے گو تواضع اور نرمی موجود ہو جاتی ہے۔ اور اگرچہ پوری شدت اور صلابت اس مرتبہ میں پیدا نہیں ہوتی مگر مضغہ کی طرح کسی قدر قضا و قدر کی مضغ کے لائق ہو جاتا ہے یعنی کسی قدر اس لائق ہو جاتا ہے کہ قضا و قدر کا دانت اس پر چلے اور وہ اس کے نیچے ٹھہر سکے کیونکہ علقہ جو ایک سیال رطوبت کے قریب قریب ہے وہ تو اس لائق ہی نہیں کہ دانتوں کے نیچے پیسا جاوے اور ٹھہر رہے لیکن مضغہ مضغ کے لائق ہے اسی لئے اس کا نام مضغہ ہے سو مضغہ ہونے کی وہ حالت ہے کہ جب کچھ چاشنی محبت الہی کی دل میں پڑ جاتی ہے اور تجلی جلالی توجہ فرماتی ہے کہ بلاؤں کے ساتھ اس کی آزمائش کرے تب وہ مضغہ کی طرح قضا و قدر کے دانتوں میں پیسا جاتا ہے اور خوب قیمہ کیا جاتا ہے غرض تیسرا درجہ سالک کے وجود کا مضغہ ہونے کی حالت ہے اور پھر چوتھا درجہ وہ ہے کہ جب انسان استقامت اور بلاؤں کی برداشت کی برکت سے آزمائے جانے کے بعد نقوش انسانی کا پورے طور پر انعام پاتا ہے یعنی روحانی طور پر اس کے لئے ایک صورت انسانی عطا ہوتی ہے اور انسان کی طرح اس کو دو آنکھیں، دو کان اور دل اور دماغ اور تمام ضروری قوی اور اعضا عطا کئے جاتے ہیں اور بمقتضائے آیت: **أَشَدَّ آءُ عَلَى الْكَفَّارِ رَحْمَاءً بَيْنَهُمْ (الفتح: ۳۰)** سختی اور نرمی مواضع مناسبہ میں ظاہر ہو جاتی ہے یعنی ہر ایک خلق اس کا اپنے اپنے محل پر صادر ہوتا ہے اور آداب طریقت تمام محفوظ ہوتے ہیں اور ہر ایک کام اور کلام حفظ حدود کے لحاظ سے بجالاتا ہے یعنی نرمی کی جگہ پر نرمی اور سختی کی جگہ پر سختی اور تواضع کی جگہ پر تواضع اور ترفع کی جگہ پر ترفع ایسا ہی تمام قوی سے اپنے اپنے محل پر کام لیتا ہے یہ درجہ جنین کے اس درجہ سے مشابہت رکھتا ہے کہ جب وہ مضغہ کی حالت سے ترقی کر کے انسان کی صورت کا ایک پورا خاکہ حاصل کر لیتا ہے اور ہڈی کی جگہ پر ہڈی نمودار ہو جاتی ہے اور گوشت کی جگہ پر گوشت باقی رہتا ہے ہڈی نہیں بنتی اور تمام اعضا میں باہم تیز کل پیسا ہو جاتی ہے لیکن ابھی خوبصورتی اور تازگی اور تناسب اعضا نہیں ہوتا صرف خاکہ ہوتا ہے جو نظر دقیق سے دکھائی دیتا ہے پھر بعد اس کے

عنایت الہی تو فیقات متواترہ سے موفق کر کے اور تزکیہ نفس کے کمال تک پہنچا کر اور فنا فی اللہ کے انتہائی نقطہ تک کھینچ کر اس کے خاکہ کے بدن پر انواع اقسام کی برکات کا گوشت بھر دیتی ہے اور اس گوشت سے اس کی شکل کو چمکیلی اور اس کی تمام ہیکل کو آبدار کر دیتی ہے تب اس کے چہرہ پر کاسمیت کا نور برستا ہے اور اس کے بدن پر کمال تام کی آب و تاب نظر آتی ہے اور یہ درجہ پیدائش کا جسمانی پیدائش کے اس درجہ سے مشابہ ہوتا ہے کہ جب جنین کے خاکہ کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے اور خوبصورتی اور تناسب اعضا ظاہر کیا جاتا ہے۔ پھر بعد اس کے روحانی پیدائش کا چھٹا درجہ ہے جو مصداق: ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (المؤمنون: ۱۵) کا ہے۔ وہ مرتبہ بقا ہے جو فنا کے بعد ملتا ہے جس میں روح القدس کامل طور پر عطا کیا جاتا ہے اور ایک روحانی زندگی کی روح انسان کے اندر پھونک دی جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ چھ مراتب خدا تعالیٰ کی پاک کلام میں بھی جمع ہیں۔ اول حروف کا مرتبہ جو حامل کلام الہی اور کلمات کتاب اللہ کے لئے بطور تخم کے ہیں جن کو معانی مقصودہ سے کچھ بھی حصہ نہیں ہاں ان کے حصول کے لئے ایک استعداد بعیدہ رکھتے ہیں دوم کلمات کا مرتبہ جو اس تخم کے ذریعہ سے ظہور خارجی کے رنگ میں آئے جن کو معانی مقصودہ سے کچھ حصہ نہیں مگر ان کے حصول کے لئے ایک ذریعہ فریبہ ہیں سوم ان فقرات نام تمام کا مرتبہ جو ابھی کلام مقصودہ کے پورے درجہ تک نہیں پہنچے تھے کیونکہ ہنوز تنزیل کا سلسلہ نام تمام تھا اور خدا تعالیٰ کے کلام نے ابھی اپنا کامل چہرہ نہیں دکھلایا تھا مگر ان فقرات کو معانی مقصودہ سے ایک وافر حصہ تھا اس لئے وہ کلام تام الہی کے لئے بطور بعض اعضا کے ٹھہرے جن کا نام بلحاظ قلت و کثرت آیتیں اور سورتیں رکھا گیا چہارم اس کلام جامع تام مفصل ممیز کا مرتبہ جو سب نازل ہو چکا اور جمیع مضامین مقصودہ اور علوم حکمیہ و فصوص و اخبار و احکام و قوانین و ضوابط و حدود و مواعید و انذارات و تبشیرات اور درستی اور نرمی اور شدت اور رحم اور حقائق و نکات پر بالاستیفا مشتمل ہے پنجم بلاغت و فصاحت کا مرتبہ جو زینت اور آرائش کے لئے اس کلام پر ازل سے چڑھائی گئی ششم برکت اور تاثیر اور کشش کی روح کا مرتبہ جو اس پاک کلام میں موجود ہے جس نے تمام کلام پر اپنی روشنی ڈالی اور اس کو زندہ اور منور کلام ثابت کیا۔ اسی طرح ہر ایک عاقل اور فصیح منشی کے کلام میں یہی چھ مراتب جمع ہو سکتے ہیں گو وہ کلام اعجازی حد تک نہیں پہنچتا کیونکہ جن حروف میں کوئی کلام لکھا جائے گا خواہ وہ عربی ہوں یا انگریزی یا ہندی پہلے ان کا وجود ضروری ہے سو یہ تو پہلا مرتبہ ہوا جو مضامین مقصودہ کے اظہار کے لئے ایک ذریعہ بعیدہ ہے مگر ان سے کچھ حصہ نہیں رکھتا پھر بعد اس کے دوسرا مرتبہ کلمات کا ہے جو حروف قرار دادہ سے پیدا ہوں گے جن کو معانی و

مضامین مقصودہ سے ابھی کچھ حصہ نہیں مگر ان کے حصول کے لئے ایک ذریعہ تقریبہ ہیں۔ پھر اس کے بعد تیسرا مرتبہ فقرات کا ہے جو ابھی معانی مقصودہ کے پورے جامع تو نہیں مگر ان میں سے کچھ حصہ رکھتے ہیں اور اس مضمون کے لئے جو شئی کے ذہن میں ہے بطور بعض اعضا کے ہیں۔ پھر چوتھا مرتبہ کلام جامع تام کا ہے جو شئی کے دل میں سے نکل کر بہ تمام و کمال کاغذ پر اندراج پا گیا ہے اور تمام معانی اور مضامین مقصودہ کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے پھر پانچواں مرتبہ یہ ہے کہ ان سادہ فقرات اور عبارتوں پر بلاغت اور فصاحت کا رنگ چڑھایا جائے اور خوش بیانی کے نمک سے ملیج کیا جائے پھر چھٹا مرتبہ جو بلا توقف اس مرتبہ کے تابع ہے یہ ہے کہ کلام میں اثر اندازی کی ایک جان پیدا ہو جائے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیوے اور طبیعتوں میں گھر کر لیوے۔ اب غور کر کے دیکھ لو کہ یہ مراتب ستہ بلکی ان مراتب ستہ کی مانند اور ان کی مثیل ہیں جن کا قرآن کریم میں نطفہ، علقہ، مضغہ اور کچھ مضغہ اور کچھ عظام یعنی انسان کی شکل کا خاکہ اور انسان کی پوری شکل اور جاندار انسان نام رکھا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۲۱۷ تا ۲۱۸ حاشیہ در حاشیہ)

تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور پھر عرش پر قرار پکڑا یعنی اوّل اس نے اس دُنیا کے تمام اجرام سماوی اور ارضی کو پیدا کیا اور چھ دن میں سب کو بنایا (چھ دن سے مراد ایک بڑا زمانہ ہے) اور پھر عرش پر قرار پکڑا یعنی تنزّہ کے مقام کو اختیار کیا۔ یاد رہے کہ استوا کے لفظ کا جب علی صلہ آتا ہے تو اُس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ایک چیز کا اس مکان پر قرار پکڑنا جو اس کے مناسب حال ہو جیسا کہ قرآن شریف میں یہ بھی آیت ہے: **وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ** (ہود: ۴۵) یعنی نوح کی کشتی نے طوفان کے بعد ایسی جگہ پر قرار پکڑا جو اُس کے مناسب حال تھا یعنی اُس جگہ زمین پر اترنے کے لئے بہت آسانی تھی سو اسی لحاظ سے خدا تعالیٰ کے لئے استوا کا لفظ اختیار کیا یعنی خدا نے ایسی وراء الوراہ جگہ پر قرار پکڑا جو اس کی تنزّہ اور تقدس کے مناسب حال تھی۔ چونکہ تنزّہ اور تقدس کا مقام ماسوی اللہ کے فنا کو چاہتا ہے سو یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جیسے خدا بعض اوقات اپنی خالقیت کے اسم کے تقاضا سے مخلوقات کو پیدا کرتا ہے پھر دوسری مرتبہ اپنی تنزّہ اور وحدتِ ذاتی کے تقاضا سے اُن سب کا نقش ہستی مٹا دیتا ہے۔ غرض عرش پر قرار پکڑنا مقام تنزّہ کی طرف اشارہ ہے تا ایسا نہ ہو کہ خدا اور مخلوق کو باہم مخلوط سمجھا جائے۔ پس کہاں سے معلوم ہوا کہ خدا عرش پر یعنی اُس وراء الوراہ مقام پر مقید کی طرح ہے اور محدود ہے۔ قرآن شریف میں تو جا بجا بیان فرمایا گیا ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۱۹)

قرآن شریف اسی وجہ سے ہر ایک دھوکہ دہی کی بات سے محفوظ ہے کہ اُس نے خدا تعالیٰ کے ایسے طور سے صفات بیان کئے ہیں جن سے توحید باری تعالیٰ شرک کی آلائش سے بگلی پاک رہتی ہے کیونکہ اول اُس نے خدا تعالیٰ کے وہ صفات بیان کئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کیوں کروہ انسان سے قریب ہے اور کیوں کر اُس کے اخلاق سے انسان حصہ لیتا ہے ان صفات کا نام تو تشبیہی صفات ہیں۔ پھر کیونکہ تشبیہی صفات سے یہ اندیشہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو محدود خیال نہ کیا جائے یا مخلوق چیزوں سے مشابہ خیال نہ کیا جائے اس لئے ان اوہام کے دُور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنی ایک دوسری صفت بیان کر دی یعنی عرش پر قرار پکڑنے کی صفت جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا سب مصنوعات سے برتر و اعلیٰ مقام پر ہے کوئی چیز اُس کی شبیہ اور شریک نہیں اور اس طرح پر خدا تعالیٰ کی توحید کامل طور پر ثابت ہوگئی۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۲۱، ۱۲۲)

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَا نَا لِجَنبَيْهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ  
ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرِّ مَسَّهُ ۗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا  
يَعْمَلُونَ ﴿۱۲﴾

یہ مسلم اور مشہود امر ہے کہ جب ہیبت الہی اپنا جلوہ دکھاتی ہے تو اس وقت فاسق انسان کی اور صورت ہوتی ہے اور جب ہیبت کا وقت نکل جاتا ہے تو پھر اپنی شقاوت فطرتی سے اصلی صورت کی طرف عود کر آتا ہے۔ ایسے لوگ بہتیرے تم نے دیکھے ہوں گے کہ جب ان پر کوئی مقدمہ دائر ہو جس سے سخت قید یا پھانسی یا سزائے موت کا خطرہ ہو گو یہ بھی گمان ہو کہ شاید رہا ہو جائیں تو وہ ایسی ہیبت کو مشاہدہ کر کے اپنی فاسقانہ چال چلن کو بدلا لیتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور توبہ کرتے اور لمبی لمبی دعائیں کرتے ہیں اور پھر جب ان کی اس تضرع کی حالت پر خدا تعالیٰ رحم کر کے ان کو اس بلا سے خلاصی دیتا ہے تو فی الفور ان کے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ یہ رہائی خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں اتفاقی امر ہے تب وہ اپنے فسق میں پہلے سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں اور چند روز میں ہی اپنی پہلی عادات کی طرف رجوع کر آتے ہیں۔ اس کی اور بھی مثالیں ہیں مگر اس جگہ کلام الہی کافی ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: وَ إِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَا نَا لِجَنبَيْهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرِّ مَسَّهُ ۗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

سورۃ یونس یعنی جب انسان کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو ہماری جناب میں دعائیں کرنے لگتا ہے کروٹ کی حالت میں اور بیٹھ کر اور کھڑے ہو کر اور جب ہم اس دکھ کو اس سے دفع کر دیتے ہیں تو ایسا چلا جاتا ہے کہ گویا نہ کبھی اس کو دکھ پہنچا اور نہ کبھی دعا کی۔ (انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۴۲، ۴۳)

### ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾

قرآن شریف کی رو سے سلسلہ محمدیہ سلسلہ موسویہ سے ہر ایک نیکی اور بدی میں مشابہت رکھتا ہے۔ اسی کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے کہ ایک جگہ یہود کے حق میں لکھا ہے: فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (الاعراف: ۱۳۰) دوسری جگہ مسلمانوں کے حق میں لکھا ہے: لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔ ان دونوں آیتوں کے یہ معنی ہیں کہ خدا تمہیں خلافت اور حکومت عطا کر کے پھر دیکھے گا کہ تم راستبازی پر قائم رہتے ہو یا نہیں۔ ان آیتوں میں جو الفاظ یہود کے لئے استعمال کئے ہیں وہی مسلمانوں کے لئے۔ یعنی ایک ہی آیت کے نیچے ان دونوں کو رکھا ہے۔ پس ان آیتوں سے بڑھ کر اس بات کے لئے اور کون سا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خدا نے بعض مسلمانوں کو یہود قرار دے دیا ہے اور صاف اشارہ کر دیا ہے کہ جن بدیوں کے یہود مرتکب ہوئے تھے یعنی علماء اُن کے۔ اس اُمت کے علماء بھی انہیں بدیوں کے مرتکب ہوں گے۔ اور اسی مفہوم کی طرف آیت: غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ میں بھی اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں باتفاق کل مفسرین مَغْضُوبٍ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ یہود ہیں جن پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کی وجہ سے غضب نازل ہوا تھا۔ اور احادیث صحیحہ میں مَغْضُوبٍ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ یہود ہیں جو موردِ غضبِ الہی دنیا میں ہی ہوئے تھے۔ اور قرآن شریف یہ بھی گواہی دیتا ہے کہ یہود کو مَغْضُوبٍ عَلَيْهِمْ ٹھہرانے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر لعنت جاری ہوئی تھی۔ پس یقینی اور قطعی طور پر مَغْضُوبٍ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ یہود ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صولی پر ہلاک کرنا چاہا تھا۔ اب خدا تعالیٰ کا یہ دُعا سکھانا کہ خدا یا ایسا کر کہ ہم وہی یہودی نہ بن جائیں جنہوں نے عیسیٰ کو قتل کرنا چاہا تھا صاف بتلا رہا ہے کہ اُمتِ محمدیہ میں بھی ایک عیسیٰ پیدا ہونے والا ہے۔ ورنہ اس دُعا کی کیا ضرورت تھی؟

قرآن شریف کے رُوسے کئی انسانوں کا بروزی طور پر آنا مقدر تھا۔۔۔۔۔ یہودیوں کے بادشاہوں کے اُن مٹیوں کا جو اسلام میں پیدا ہوئے جیسا کہ ان دو بالمقابل آیتوں سے جن کے الفاظ باہم ملتے ہیں سمجھا جاتا

ہے اور وہ یہ ہیں:

### اسلام کے بادشاہوں کی نسبت

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ  
بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (یونس: ۱۵)

الجزء نمبر ۱۱ سورۃ یونس صفحہ ۳۳۵

### یہودیوں کے بادشاہوں کی نسبت

قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ  
يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ -

(الاعراف: ۱۳۰) الجزء نمبر ۹ سورۃ الاعراف صفحہ ۱۶۵

یہ دونوں فقرے یعنی: فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ جو یہودیوں کے بادشاہوں کے حق میں ہے اور اُس کے مقابلہ پر دوسرا فقرہ یعنی: لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ جو مسلمانوں کے بادشاہوں کے حق میں ہے صاف بتلا رہے ہیں کہ ان دونوں قوموں کے بادشاہوں کے واقعات بھی باہم متشابہ ہوں گے۔ سوا ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اور جس طرح یہودی بادشاہوں سے قابل شرم خانہ جنگیاں ظہور میں آئیں اور اکثر کے چال چلن بھی خراب ہو گئے یہاں تک کہ بعض اُن میں سے بدکاری، شراب نوشی، خونریزی اور سخت بے رحمی میں ضرب المثل ہو گئے۔ یہی طریق اکثر مسلمانوں کے بادشاہوں نے اختیار کئے۔ ہاں بعض یہودیوں کے نیک اور عادل بادشاہوں کی طرح نیک اور عادل بادشاہ بھی بنے جیسا کہ عمر بن عبدالعزیز۔

(تحفہ گوٹزویہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۳۰۶، ۳۰۷)

(بروز کے متعلق سائل کے جواب میں فرمایا) جیسے شیشہ میں انسان کی شکل نظر آتی ہے حالانکہ وہ شکل بذاتِ خود الگ قائم ہوتی ہے اس کا نام بروز ہے۔۔۔۔۔ یہ آیتیں بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ایک ان میں سے اہل اسلام کی نسبت ہے اور ایک یہود کی نسبت۔ پس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر طرح کا انعام کروں گا اور پھر دیکھو گا کہ کس طرح شکر کرتے ہو۔

اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اہل یہود کو کون سی بڑی مصیبت تھی۔ تو وہ دو بڑی مصیبتیں ہیں ایک یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر کیا گیا اور ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا گیا۔ پس مماثلت کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے بھی وہی دو انکار لکھے تھے مگر وہاں شمار میں الگ الگ دو وجود تھے اور یہاں نام الگ الگ ہیں مگر وہ دو وجود جس میں ان دونوں کا بروز ہوا ایک ہی ہے۔ ایک بروز عیسوی اور ایک محمدی۔ اور صرف نام کے لحاظ سے اہل اسلام یہود کے بروز اسی طرح سے قرار پائے کہ انہوں نے مسیح اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا اور وہ مماثلت پوری ہو گئی اور آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس اُمت میں بروزی طور پر وہی کثرت

یہودیوں والی پوری ہوتی تھی اور یہ اس طرف اشارہ کرتی تھیں کہ آنے والا دورنگ لے کر آوے گا (اسی لئے مہدی اور مسیح کے زمانہ کی علامات ایک ہی ہیں اور ان دونوں کا فعل بھی ایک ہی)۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۵۸، ۳۵۹)

وَ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۚ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّا بُرْهَانَ غَيْرِ  
هَذَا أَوْ بَدَّلْهُ ۗ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تَلْقَائِي نَفْسِي ۚ إِنِّي أَخَافُ ۚ  
إِن يُؤَخِّرْ إِلَيَّ ۚ إِنِّي أَخَافُ ۚ إِن عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰﴾

جب مکہ کے بعض نادانوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ قرآن کی توحید ہمیں پسند نہیں آتی کوئی ایسا قرآن لاؤ جس میں بتوں کی تعظیم اور پرستش کا ذکر ہو یا اسی میں کچھ تبدل تغیر کر کے بجائے توحید کے شرک بھردو تب ہم قبول کر لیں گے اور ایمان لے آئیں گے۔ تو خدا نے ان کے سوال کا جواب اپنے نبی کو وہ تعلیم کیا جو آنحضرت کے واقعات عمری پر نظر کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے: قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا... الخ وہ لوگ جو ہماری ملاقات سے ناامید ہیں یعنی ہماری طرف سے ہلکی علاقہ توڑ چکے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے برخلاف کوئی اور قرآن لاجس کی تعظیم اس کی تعلیم سے مغایر اور منافی ہو یا اسی میں تبدیل کر۔ ان کو جواب دے کہ مجھے یہ قدرت نہیں اور نہ روا ہے کہ میں خدا کے کلام میں اپنی طرف سے کچھ تبدیل کروں۔ میں تو صرف اُس وحی کا تابع ہوں جو میرے پر نازل ہوتی ہے اور اپنے خداوند کی نافرمانی سے ڈرتا ہوں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۷۲، ۵۷۵)

قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَكُونُوا عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرِكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا  
مِّن قَبْلِهِ ۗ فَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۱﴾

اگر خدا چاہتا تو میں تم کو یہ کلام نہ سناتا اور خدا تم کو اس پر مطلع بھی نہ کرتا پہلے اس سے اتنی عمر یعنی چالیس برس تک تم میں ہی رہتا رہا ہوں پھر کیا تم کو عقل نہیں یعنی کیا تم کو بخوبی معلوم نہیں کہ افترا کرنا میرا کام نہیں اور جھوٹ بولنا میری عادت میں نہیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۷۵)

اور میں ایک عمر تک تم میں ہی رہتا رہا ہوں کیا تم کو عقل نہیں؟

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۱۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

انبیاء وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی کامل راستبازی کی قوی حجت پیش کر کے اپنے دشمنوں کو بھی الزام دیا جیسا کہ یہ الزام قرآن شریف میں ہے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موجود ہے جہاں فرمایا ہے: فَقَدْ كَيْدْتُمْ فِيكُمْ عَمْرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (سورۃ یونس الجزوا ۱۱) یعنی میں ایسا نہیں کہ جھوٹ بولوں اور افتراء کروں۔ دیکھو میں چالیس برس اس سے پہلے تم میں ہی رہتا رہا ہوں کیا کبھی تم نے میرا کوئی جھوٹ یا افتراء ثابت کیا پھر کیا تم کو اتنی سمجھ نہیں یعنی یہ سمجھ کہ جس نے کبھی آج تک کسی قسم کا جھوٹ نہیں بولا۔ وہ اب خدا پر کیوں جھوٹ بولنے لگا۔ غرض انبیاء کے واقعات عمری اور ان کی سلامت روشی ایسی بدیہی اور ثابت ہے کہ اگر سب باتوں کو چھوڑ کر ان کے واقعات کو ہی دیکھا جائے تو ان کی صداقت ان کے واقعات سے ہی روشن ہو رہی ہے مثلاً اگر کوئی منصف اور عاقل ان تمام براہین اور دلائل صدق نبوت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم... قطع نظر کر کے محض ان کے حالات پر ہی غور کرے تو بلاشبہ انہیں حالات پر غور کرنے سے ان کے نبی صادق ہونے پر دل سے یقین کرے گا اور کیوں کر یقین نہ کرے وہ واقعات ہی ایسے کمال سچائی اور صفائی سے معطر ہیں کہ حق کے طالبوں کے دل بلا اختیار ان کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔ خیال کرنا چاہئے کہ کس استقلال سے آنحضرت اپنے دعویٰ نبوت پر باوجود پیدا ہو جانے ہزاروں خطرات اور کھڑے ہو جانے لاکھوں معاندوں اور مزاحموں اور ڈرانے والوں کے اول سے اخیر دم تک ثابت اور قائم رہے برسوں تک وہ مصیبتیں دیکھیں اور وہ دکھ اٹھانے پڑے جو کامیابی سے بگلی مایوس کرتے تھے اور روز بروز بڑھتے جاتے تھے کہ جن پر صبر کرنے سے کسی دنیوی مقصد کا حاصل ہو جانا وہ ہم بھی نہیں گزرتا تھا بلکہ نبوت کا دعویٰ کرنے سے از دست اپنی پہلی جمعیت کو بھی کھو بیٹھے اور ایک بات کہہ کر لاکھ تفرقہ خرید لیا اور ہزاروں بلاؤں کو اپنے سر پر بلا لیا، وطن سے نکالے گئے، قتل کے لئے تعاقب کئے گئے، گھر اور اسباب تباہ اور برباد ہو گیا، بارہا زہر دی گئی اور جو خیر خواہ تھے وہ بدخواہ بن گئے اور جو دوست تھے وہ دشمنی کرنے لگے اور ایک زمانہ دراز تک وہ تلخیاں اٹھانی پڑیں کہ جن پر ثابت قدمی سے ٹھہرے رہنا کسی فریبی اور مکار کا کام نہیں اور پھر جب مدت مدید کے بعد غلبہ اسلام کا ہوا تو ان دولت اور اقبال کے دنوں میں کوئی خزانہ اکٹھا نہ کیا، کوئی عمارت نہ بنائی، کوئی بارگاہ طیار نہ ہوئی، کوئی سامان شاہانہ عیش و عشرت کا تجویز نہ کیا گیا، کوئی اور ذاتی نفع نہ اٹھایا بلکہ جو کچھ آیا وہ سب یتیموں اور مسکینوں اور بیوہ عورتوں اور مقررہ وضوں کی خبر گیری میں خرچ ہوتا رہا اور کبھی ایک وقت بھی سیر ہو کر نہ کھایا اور پھر صاف گوئی اس قدر کہ توحید کا وعظ کر کے سب قوموں اور سارے

فروق اور تمام جہان کے لوگوں کو جو شرک میں ڈوبے ہوئے تھے مخالف بنا لیا۔ جو اپنے اور خویش تھے ان کو بت پرستی سے منع کر کے سب سے پہلے دشمن بنا لیا۔ یہودیوں سے بھی بات بگاڑ لی کیونکہ ان کو طرح طرح کی مخلوق پرستی اور پیر پرستی اور بد اعمالیوں سے روکا۔ حضرت مسیح کی تکذیب اور توہین سے منع کیا جس سے ان کا نہایت دل جل گیا اور سخت عداوت پر آمادہ ہو گئے اور ہر دم قتل کر دینے کی گھات میں رہنے لگے۔ اسی طرح عیسائیوں کو بھی خفا کر دیا گیا کیونکہ جیسا کہ ان کا اعتقاد تھا۔ حضرت عیسیٰ کو نہ خدا کا بیٹا قرار دیا اور نہ ان کو پھانسی مل کر دوسروں کو بچانے والا تسلیم کیا۔ آتش پرست اور ستارہ پرست بھی ناراض ہو گئے کیونکہ ان کو بھی ان کے دیوتوں کی پرستش سے ممانعت کی گئی اور مدارجات کا صرف توحید ٹھہرائی گئی۔ اب جائے انصاف ہے کہ کیا دنیا حاصل کرنے کی یہی تدبیر تھی کہ ہر ایک فرقہ کو ایسی ایسی صاف اور دلا آزار باتیں سنائی گئیں کہ جس سے سب نے مخالفت پر کمر باندھ لی اور سب کے دل ٹوٹ گئے اور قبل اس کے کہ اپنی کچھ ذرہ بھی جمعیت بنی ہوتی یا کسی کا حملہ روکنے کے لئے کچھ طاقت بہم پہنچ جاتی سب کی طبیعت کو ایسا اشتعال دے دیا کہ جس سے وہ خون کرنے کے پیاسے ہو گئے۔ زمانہ سازی کی تدبیر تو یہ تھی کہ جیسا بعضوں کو جھوٹا کہا تھا ویسا ہی بعضوں کو سچا بھی کہا جاتا تا اگر بعض مخالف ہوتے تو بعض موافق بھی رہتے۔ بلکہ اگر عربوں کو کہا جاتا کہ تمہارے ہی لات و عجزی سچے ہیں تو وہ تو اسی دم قدموں پر گر پڑتے اور جو چاہتے ان سے کراتے کیونکہ وہ سب خویش اور اقارب اور حمیت قومی میں بے مثل تھے اور ساری بات مانی منائی تھی صرف تعلیم بت پرستی سے خوش ہو جاتے اور بدل و جان اطاعت اختیار کرتے۔ لیکن سوچنا چاہیے کہ آنحضرت کا یلخت ہر ایک خویش و بیگانہ سے بگاڑ لینا اور صرف توحید کو جو ان دنوں میں اس سے زیادہ دنیا کے لئے کوئی نفرتی چیز نہ تھی اور جس کے باعث سے صد ہا مشکلیں پڑتی جاتی تھیں بلکہ جان سے مارے جانا نظر آتا تھا مضبوط پکڑ لینا یہ کس مصلحت دنیوی کا تقاضا تھا اور جبکہ پہلے اسی کے باعث سے اپنی تمام دنیا اور جمعیت برباد کر چکے تھے تو پھر اسی بلا انگیز اعتقاد پر اصرار کرنے سے کہ جس کو ظاہر کرتے ہی نو مسلمانوں کو قید اور زنجیر اور سخت سخت ماریں نصیب ہوئیں کس مقصد کا حاصل کرنا مراد تھا۔ کیا دنیا کمانے کے لئے یہی ڈھنگ تھا کہ ہر ایک کو کلمہ تلخ جو اس کی طبع اور عادت اور مرضی اور اعتقاد کے برخلاف تھا۔ سنا کر سب کو ایک دم کے دم میں جانی دشمن بنا دیا اور کسی ایک آدھ قوم سے بھی پیوند نہ رکھا۔ جو لوگ طامع اور مکار ہوتے ہیں۔ کیا وہ ایسی ہی تدبیریں کیا کرتے ہیں کہ جس سے دوست بھی دشمن ہو جائیں۔ جو لوگ کسی مکر سے دنیا کو کمانا چاہتے ہیں کیا ان کا یہی اصول ہوا

کرتا ہے کہ بیکبارگی ساری دنیا کو عداوت کرنے کا جوش دلاویں اور اپنی جان کو ہر وقت کی فکر میں ڈال لیں۔ وہ تو اپنا مطلب سادہ ہونے کے لئے سب سے صلح کاری اختیار کرتے ہیں اور ہر ایک فرقہ کو سچائی کا ہی سرٹیفکیٹ دیتے ہیں۔ خدا کے لئے یک رنگ ہو جانا ان کی عادت کہاں ہوا کرتی ہے خدا کی وحدانیت اور عظمت کا کب وہ کچھ دھیان رکھا کرتے ہیں۔ ان کو اس سے غرض کیا ہوتی ہے کہ ناحق خدا کے لئے دکھا اٹھاتے پھریں۔ وہ تو صیاد کی طرح وہیں دام بچھاتے ہیں کہ جوشکار مارنے کا بہت آسان راستہ ہوتا ہے اور وہی طریق اختیار کرتے ہیں کہ جس میں محنت کم اور فائدہ دنیا کا بہت زیادہ ہو۔ نفاق ان کا پیشہ اور خوشامدان کی سیرت ہوتی ہے۔ سب سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا اور ہر ایک چور اور سادھ سے برابر رابطہ رکھنا ان کا ایک خاص اصول ہوتا ہے۔ مسلمانوں سے اللہ اللہ اور ہندوؤں سے رام رام کہنے کو ہر وقت مستعد رہتے ہیں اور ہر ایک مجلس میں ہاں سے ہاں اور نہیں سے نہیں ملاتے رہتے ہیں اور اگر کوئی میر مجلس دن کو رات کہے تو چاند اور گپٹیاں دکھلانے کو بھی طیار ہو جاتے ہیں۔ ان کو خدا سے کیا تعلق اور اس کے ساتھ وفاداری کرنے سے کیا واسطہ اور اپنی خوش باش جان کو مفت میں ادھر ادھر کا غم لگا لینا انہیں کیا ضرورت۔ استاد نے ان کو سبق ہی ایک پڑھایا ہوا ہوتا ہے کہ ہر ایک کو یہی بات کہنا چاہئے کہ جو تیرا راستہ ہے وہی سیدھا ہے اور جو تیری رائے ہے وہی درست ہے اور جو تو نے سمجھا ہے وہی ٹھیک ہے غرض ان کی راست اور ناراست اور حق اور باطل اور نیک اور بد پر کچھ نظر ہی نہیں ہوتی بلکہ جس کے ہاتھ سے ان کا کچھ منہ میٹھا ہو جائے وہی ان کے حساب میں بھگت اور سدھ اور جنٹلمین ہوتا ہے اور جس کی تعریف سے کچھ پیٹ کا دوزخ بھرتا نظر آوے اسی کو کٹی پانے والا اور سرگ کا وارث اور حیات ابدی کا مالک بنا دیتے ہیں۔ لیکن واقعات حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر کرنے سے یہ بات نہایت واضح اور نمایاں اور روشن ہے کہ آنحضرت اعلیٰ درجہ کے یک رنگ اور صاف باطن اور خدا کے لئے جان باز اور خلقت کے بیم و امید سے بالکل منہ پھیرنے والے اور محض خدا پر توکل کرنے والے تھے کہ جنہوں نے خدا کی خواہش اور مرضی میں محو اور فنا ہو کر اس بات کی کچھ بھی پروا نہ کی کہ تو حید کی منادی کرنے سے کیا کیا بلا میرے سر پر آوے گی اور مشرکوں کے ہاتھ سے کیا کچھ دکھ اور درد اٹھانا ہوگا بلکہ تمام شدتوں اور سختیوں اور مشکلوں کو اپنے نفس پر گوارا کر کے اپنے مولیٰ کا حکم بجالائے۔ اور جو جو شرط مجاہدہ اور وعظ اور نصیحت کی ہوتی ہے وہ سب پوری کی اور کسی ڈرانے والے کو کچھ حقیقت نہ سمجھا۔ ہم سچ سچ کہتے ہیں کہ تمام نبیوں کے واقعات میں ایسے مواضع خطر اور پھر کوئی ایسا خدا پر توکل کر کے کھلا کھلے شرک اور مخلوق پرستی سے منع کرنے والا

اور اس قدر دشمن اور پھر کوئی ایسا ثابت قدم اور استقلال کرنے والا ایک بھی ثابت نہیں۔ پس ذرہ ایمانداری سے سوچنا چاہئے کہ یہ سب حالات کیسے آنحضرتؐ کے اندرونی صداقت پر دلالت کر رہے ہیں۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۲)

دوسری خوبی جو شرط کے طور پر مامورین کے لئے ضروری ہے وہ نیک چال چلن ہے کیونکہ بد چال چلن سے بھی دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ خوبی بھی بدیہی طور پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ قرآن شریف میں فرماتا ہے: فَقَدْ كَيْفُتُ فِيكُمْ عُمْرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ یعنی ان کفار کو کہہ دے کہ اس سے پہلے میں نے ایک عمر تم میں ہی بسر کی ہے پس کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں کس درجہ کا امین اور راستباز ہوں۔ اب دیکھو کہ یہ دونوں صفتیں جو مرتبہ نبوت اور ماموریت کے لئے ضروری ہیں یعنی بزرگ خاندان میں سے ہونا اور اپنی ذات میں امین اور راستباز اور خدا ترس اور نیک چلن ہونا۔ قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کمال درجہ پر ثابت کی ہیں اور آپ کی اعلیٰ چال چلن اور اعلیٰ خاندان پر خود گواہی دی ہے۔ اور اس جگہ میں اس شکر کے ادا کرنے سے رہ نہیں سکتا کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں اپنی وحی کے ذریعہ سے کفار کو ملزم کیا اور فرمایا کہ یہ میرا نبی اس اعلیٰ درجہ کا نیک چال چلن رکھتا ہے کہ تمہیں طاقت نہیں کہ اس کی گذشتہ چالیس برس کی زندگی میں کوئی عیب اور نقص نکال سکو۔ باوجود اس کے کہ وہ چالیس برس تک دن رات تمہارے درمیان ہی رہا ہے۔ اور نہ تمہیں یہ طاقت ہے کہ اس کے اعلیٰ خاندان میں جو شرافت اور طہارت اور ریاست اور امارت کا خاندان ہے ایک ذرہ عیب گیری کر سکو۔ پھر تم سوچو کہ جو شخص ایسے اعلیٰ اور اطہر اور انفس خاندان میں سے ہے اور اس کی چالیس برس کی زندگی جو تمہارے روبرو گزری گواہی دے رہی ہے جو اتر اور دروغ بانی اس کا کام نہیں ہے تو پھر ان خوبیوں کے ساتھ جبکہ آسمانی نشان وہ دکھلا رہا ہے اور خدا تعالیٰ کی تائیدیں اس کے شامل حال ہو رہی ہیں اور تعلیم وہ لایا ہے جس کے مقابل پر تمہارے عقائد سراسر گندے اور ناپاک اور شرک سے بھرے ہوئے ہیں تو پھر اس کے بعد تمہیں اس نبی کے صادق ہونے میں کون سا شک باقی ہے۔ اسی طور سے خدا تعالیٰ نے میرے مخالفین اور مکذّبین کو ملزم کیا ہے۔ چنانچہ براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۱۲ میں میری نسبت یہ الہام ہے جس کے شائع کرنے پر بیس برس گزر گئے اور وہ یہ ہے: وَ لَقَدْ كَيْفُتُ فِيكُمْ عُمْرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ یعنی ان مخالفین کو کہہ دے کہ میں چالیس برس تک تم میں ہی رہتا رہا ہوں اور اس مدت دراز تک تم مجھے دیکھتے

رہے ہو کہ میرا کام افترا اور دروغ نہیں ہے اور خدا نے ناپاکی کی زندگی سے مجھے محفوظ رکھا ہے تو پھر جو شخص اس قدر مدت دراز تک یعنی چالیس برس تک ہر ایک افترا اور شرارت اور کمر اور خباثت سے محفوظ رہا اور کبھی اس نے خلقت پر جھوٹ نہ بولا تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ برخلاف اپنی عادت قدیم کے اب وہ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے لگا۔

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ

الْمُجْرِمُونَ ﴿۷۸﴾

اس شخص سے زیادہ تو اور کون ظالم ہوگا جو خدا پر افترا باندھے یا خدا کے کلام کو کہے کہ یہ انسان کا افترا ہے بلاشبہ مجرم نجات نہیں پائیں گے۔ (براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۷۵)

یقیناً یاد رکھو کہ انسان کمزوریوں کا مجموعہ ہے... اس کے لئے امن اور عافیت کی یہی سبیل ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ صاف ہو اور وہ اس کا سچا اور مخلص بندہ بنے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صدق کو اختیار کرے۔ جسمانی نظام کی کل بھی صدق ہی ہے جو شخص صدق کو چھوڑتے ہیں اور خیانت کر کے جرائم کو پناہ میں لانے والی سپر کذب کو خیال کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں آئی اور عارضی طور پر شاید کوئی فائدہ انسان سمجھ لے لیکن فی الحقیقت کذب اختیار کرنے سے انسان کا دل تاریک ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر اسے ایک دیمک لگ جاتی ہے۔ ایک جھوٹ کے لئے پھر اسے بہت سے جھوٹ تراشنے پڑتے ہیں کیونکہ اس جھوٹ کو سچائی کا رنگ دینا ہوتا ہے پس اسی طرح اندر ہی اندر اس کے اخلاقی اور روحانی قومی زائل ہو جاتے ہیں اور پھر اسے یہاں تک جرأت اور دلیری ہو جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر بھی افترا کر لیتا اور خدا کے مرسلوں اور ماموروں کی تکذیب بھی کر دیتا ہے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ اظلم ٹھیرتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے: مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ یعنی اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور افترا باندھے یا اس کی آیات کی تکذیب کرے۔ یقیناً یاد رکھو کہ یہ جھوٹ بہت ہی بری بلا ہے انسان کو ہلاک کر دیتا ہے اس سے بڑھ کر جھوٹ کا خطرناک نتیجہ کیا ہوگا کہ انسان خدا تعالیٰ کے مرسلوں اور اس کی آیات کی تکذیب کر کے سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ پس صدق اختیار کرو... جس قدر انسان صدق کو اختیار کرتا ہے اور صدق سے محبت کرتا ہے اسی قدر اس کے دل میں خدا کے کلام اور

نبیوں کی محبت اور معرفت پیدا ہوتی ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِيَلَهُ فَانتظِرُوا  
إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿۱۱﴾

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشان تا سید دین کا نازل نہ ہوا۔ سو ان کو کہہ کہ علم غیب خدا کا خاصہ ہے پس تم نشان کے منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

هُوَ الَّذِي يُسَبِّحُكُمْ فِي اللَّيْلِ وَالْبَحْرِ ط حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَينَ  
بِهِمْ بِرِيحٍ كَاطِبَّةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ  
مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۖ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ لَئِن لَّا أَنْجَيْتَنَا  
مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۲﴾

جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتی کے سواروں کو ایک خوش ہوا کے ساتھ لے کر کشتیاں چلتی ہیں اور وہ ان کشتیوں کے چلنے سے بہت خوش ہوتے ہیں کہ یک دفعہ ایک تند ہوا چلنی شروع ہوتی ہے اور ہر طرف سے ان پر موج آتی ہے اور ظن غالب یہ ہو جاتا ہے کہ بس اب ہم گھیرے گئے یعنی مارے گئے تب اس وقت اخلاص سے خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کہ اے خدائے قادر! اگر اب ہمیں نجات دے تو ہم شکر گزار ہوں گے۔

(انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۴۳)

ان آیات کا حاصل مطلب یہی ہے کہ جب بعض گنہ گاروں کو ہلاک کرنے کے لئے خدا تعالیٰ اپنے قہری ارادہ سے اس دریا میں صورت طوفان پیدا کرتا ہے جس میں ان لوگوں کی کشتی ہو تو پھر ان کی تضرع اور رجوع پر ان کو بچا لیتا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ پھر وہ مفسدانہ حرکات میں مشغول ہوں گے۔

(انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْعُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا

بُعِثَكُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ ۗ لَمَّا تَعْلَمُونَ ۚ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۷﴾

پھر جب خدا تعالیٰ ان کو نجات دے دیتا ہے تو پھر اسی ظلم اور فساد کی طرف رجوع کرتے ہیں جس پر پہلے جئے ہوئے تھے۔  
(انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۴۳)

إِنَّمَا مِثْلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا ۖ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ ۗ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَدِرُونَ عَلَيْهَا ۗ لَاتَهَا أَمْرًا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَعْنِ بِالْأَمْسِ ۗ كَذَلِكَ نَقُصُّ الْأَيَّاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۳۸﴾

اس زندگی دنیا کی مثال یہ ہے کہ جیسے اس پانی کی مثال ہے جس کو ہم آسمان سے اتارتے ہیں پھر زمین کی روئیدگی اس سے مل جاتی ہے پھر وہ روئیدگی بڑھتی اور پھولتی ہے اور آخر کاٹی جاتی ہے۔ یعنی کھیتی کی طرح انسان پیدا ہوتا ہے اول کمال کی طرف رخ کرتا ہے پھر اس کا زوال ہوتا جاتا ہے۔ کیا اس قانون قدرت سے مسیح باہر رکھا گیا ہے۔  
(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۳۰)

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَ زِيَادَةٌ ۗ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۹﴾

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ یعنی ان نیکیوں کو بھی سنوار سنوار کر کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۳ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۗ وَ تَرَهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۗ مَا لَهُمْ مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۗ كَانَتْهَا أَغْشِيَّتْ وُجُوهَهُمْ قِطْعًا مِّنَ الْإِيبِلِ مُظْلِمًا ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۴۰﴾

بدی کی جزا اسی قدر بدی ہے اور ان کو ذلت پہنچے گی یعنی اسی قسم کی ذلت اور اسی مقدار کی ذلت جس کے

پہنچانے کا انہوں نے ارادہ کیا ان کو پہنچ جائے گی۔ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۳۳۷)

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۗ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ  
بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿۳۷﴾

جو شخص محض ظن کو پہنچا رہا ہے وہ مقام بلند حق سے بہت نیچے گرا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا یعنی محض ظن حق الیقین کے مقابلہ پر کچھ چیز نہیں ہے۔

(ریویو بر مباحثہ ثالوی وچپٹر الوی، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۰۸)

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾ قُلْ لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا  
نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۗ إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً  
وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿۳۹﴾

اور کافر کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتلاؤ کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا۔ کہہ مجھے تو اپنے نفس کے نفع و ضرر کا بھی اختیار نہیں مگر جو خدا چاہے وہی ہوتا ہے۔ ہر ایک گروہ کے لئے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت مقررہ ان کا پہنچتا ہے تو پھر نہ اس سے ایک ساعت پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ ایک ساعت آگے ہو سکتے ہیں۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

کافر کہتے ہیں کہ وہ نشان کب ظاہر ہوں گے اور یہ وعدہ کب پورا ہوگا سوان کو کہہ دے کہ مجھے ان باتوں میں دخل نہیں۔ نہ میں اپنے نفس کے لئے ضرر کا مالک ہوں نہ نفع کا مگر جو خدا چاہے۔ ہر ایک گروہ کے لئے ایک وقت مقرر ہے جو ٹل نہیں سکتا۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۳۳۳)

خدا چاہتا ہے کہ نیکوں کو بچائے اور بدوں کو ہلاک کرے۔ اگر وقت اور تاریخ بتلائی جائے تو ہر ایک شریک سے شریک اپنے واسطے بچاؤ کا سامان کر سکتا ہے اگر وقت کے نہ بتلانے سے پیشگوئی قابل اعتراض ہو جاتی ہے تو پھر تو قرآن شریف کی پیشگوئیوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں بھی اس قسم کے لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ یہ وعدہ کب پورا ہوگا۔ ہمیں وقت اور تاریخ بتلاؤ۔ مگر بات یہ ہے کہ وعید کی پیشگوئیوں میں تعین نہیں ہوتا ورنہ کافر بھی بھاگ کر بچ جائے۔

(بدر جلد ۱۰ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ جون ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جب اجل بلا آجاتی ہے تو پھر آگے پیچھے نہیں ہوا کرتی۔ انسان کو چاہئے کہ پہلے ہی سے خدا کے ساتھ تعلق رکھے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

موت جب آتی ہے تو ناگہانی طور پر آجاتی ہے۔ انسان کہیں اور تدبیروں اور دھندوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے کہ یہ کام اس طرح ہو جاوے۔ یہ ایسے ہو جاوے اور اوپر سے موت آجاتی ہے اور پھر: لَا يَسْتَأْذِنُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَنْقِذُونَ وَاللَّامِعَاتُ مَوْنًا وَاللَّامِعَاتُ مَوْنًا۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

جب عذاب الہی نازل ہو جاتا ہے تو پھر اس کا ٹلنا محال ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنا کام کر کے ہی جاتا ہے اور اس آیت سے یہ بھی استنباط ہوتا ہے کہ قبل از نزول عذاب توبہ و استغفار سے وہ عذاب ٹل بھی جایا کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

وَيَسْتَنْقِذُونَكَ أَحَقُّ هُوَ قَوْلُ إِيَّيَّ وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۳۵﴾

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سچ بات ہے؟ کہہ، ہاں! مجھے قسم ہے اپنے رب کی کہ یہ سچ ہے اور تم خدائے تعالیٰ کو اس کے وعدوں سے روک نہیں سکتے۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۴۳)

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے؟ کہہ، ہاں! مجھے اپنے رب کی قسم ہے کہ یہ سچ ہے اور تم اس بات کو وقوع میں آنے سے روک نہیں سکتے۔ (آسمانی فیصلہ، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۳۵۰)

یہ امر بالکل غلط ہے کہ اسلام میں قسم کھانا منع ہے۔ تمام نیک انسان مسلمانوں میں سے ضرورتوں کے وقت قسم کھاتے آئے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ضرورتوں کے وقت قسم کھائی۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بارہا قسمیں کھائی۔ خود خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں قسمیں کھائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں مجرموں کو قسمیں دلانی گئیں۔ قسموں کا قرآن شریف میں صریح ذکر ہے۔ شریعت اسلام میں جب کسی اور ثبوت کا دروازہ بند ہو یا پیچیدہ ہو تو قسم پر مدار رکھا جاتا ہے اور صحیح البخاری<sup>۱</sup> جو بعد کتاب اللہ اصح الکتب ہے اس میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کر کے قسم کھا کر فرمایا کہ مسیح موعود جو آنے والا ہے جو تمہارا امام ہوگا وہ تم میں سے ہی ہوگا یعنی اسی امت میں سے ہوگا، آسمان

سے نہیں آئے گا۔ پھر صحیح بخاری جلد نمبر ۴ صفحہ ۱۰۶ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قسموں کا ایک باب باندھا ہے۔ اس باب میں بہت سی قسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھی ہیں جو دس سے کم نہیں۔ ایسا ہی صحیح نسائی جلد ثانی صفحہ ۱۳۸ کتاب الایمان والندور میں صفحہ ۱۳۹ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قسموں کا ذکر ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **بِسْمَتِكَ أَحَقُّ هُوَ قَلْبِي وَرَبِّي إِنَّكَ لَحَقٌّ** یعنی تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ حق ہے کہ مجھے خدا کی قسم ہے کہ یہ حق ہے۔ ایسا ہی قرن شریف میں یہ آیت ہے: **وَاحْفَظُوا أَيْهَانَكُمْ** (المائدہ: ۹۰) یعنی جب تم قسم کھاؤ تو جھوٹ اور بد عہدی اور بد نیتی سے اپنی قسم کو بچاؤ۔ ایسا ہی قرآن شریف میں یہ آیت بھی ہے: **أَذْبَعُ شَهَدَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّكَ لَمِنَ الصَّادِقِينَ** ○ وَالْخَامِسَةُ **أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ** (النور: ۷، ۸) یعنی شخص ملزم چار قسمیں خدا کی کھائے کہ وہ سچا ہے اور پانچویں قسم میں یہ کہے کہ اس پر خدا کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہے۔

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۶۲۵ حاشیہ)

اور تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے۔ کہہ ہاں مجھے اپنے رب کی قسم ہے کہ یہ سچ ہے اور تم اس بات کو وقوع میں آنے سے روک نہیں سکتے۔

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ حق ہے۔ کہہ مجھے خدا کی قسم ہے کہ یہ حق ہے۔  
(الحکم جلد ۸ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

**يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ ۗ وَ هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰﴾**

قرآن میں دلوں کو روشن کرنے کے لئے ایک روحانی خاصیت بھی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے: **شِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ** یعنی قرآن اپنی خاصیت سے تمام بیماریوں کو دور کرتا ہے اس لئے اس کو منقولی کتاب نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ اعلیٰ درجہ کے معقول دلائل اپنے ساتھ رکھتا ہے اور ایک چمکتا ہوا نور اس میں پایا جاتا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۳۳)

یہ قرآن ظلمت سے نور کی طرف نکالتا ہے۔ اور اس میں تمام بیماریوں کی شفاء ہے اور طرح طرح کی برکتیں یعنی معارف اور انسانوں کو فائدہ پہنچانے والے امور اس میں بھرے ہوئے ہیں۔

(کرامات الصادقین، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۵۹)

قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۵۹﴾

خیر کثیر سے مراد اسلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ قرآن کریم میں فرماتا ہے: هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۸۶)

ان کو کہہ دے کہ خدائے تعالیٰ کے فضل و رحمت سے یہ قرآن ایک بیش قیمت مال ہے سو اس کو تم خوشی سے قبول کرو۔ یہ ان مالوں سے اچھا ہے جو تم جمع کرتے ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم اور حکمت کی مانند کوئی مال نہیں۔ یہ وہی مال ہے جس کی نسبت پیشگوئی کے طور پر لکھا تھا کہ مسیح دنیا میں آکر اس مال کو اس قدر تقسیم کرے گا کہ لوگ لیتے لیتے تھک جائیں گے۔ یہ نہیں کہ مسیح درم و دینار کو جو مصداق آیت: اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (التغابن: ۱۶) ہے جمع کرے گا اور دانستہ ہر ایک کو مال کثیر دے کر فتنہ میں ڈال دے گا۔ مسیح کی پہلی فطرت کو بھی ایسے مال سے مناسبت نہیں۔ وہ خود انجیل میں بیان کر چکا ہے کہ مومن کا مال درم و دینار نہیں بلکہ جو اہر حقائق و معارف اس کا مال ہیں۔ یہی مال انبیاء خدائے تعالیٰ سے پاتے ہیں اور اسی کو تقسیم کرتے ہیں۔ اسی مال کی طرف اشارہ ہے کہ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللَّهُ هُوَ الْمُعْطِي۔

(ازالہ وادہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۵۴، ۴۵۵)

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۰﴾

خبردار ہو! تحقیق وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے دوست ہیں ان پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۳۵)

جو لوگ خدا کے ہوتے ہیں ان کو کسی کا خوف باقی نہیں رہتا اور وہ غم نہیں کرتے۔

(ست پچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۹)

خبردار ہو! یہ تحقیق جو لوگ مقربان الہی ہوتے ہیں ان پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ کچھ غم کرتے ہیں۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۲۱)

جو اللہ کے ولی ہیں ان کو کوئی غم نہیں۔ جس کا خدا متکفل ہو اس کو کوئی تکلیف نہیں۔ کوئی مقابلہ کرنے والا

ضرر نہیں دے سکتا اگر خدا ولی ہو جاوے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۶)

خدا تعالیٰ نے ان کو اپنا ولی کہا ہے حالانکہ وہ بے نیاز ہے اس کو کسی کی حاجت نہیں اس لئے استثنا ایک شرط

کے ساتھ ہے: وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ وِليٌّ مِّنَ الدُّنْيَا (بنی اسرائیل: ۱۱۲) یہ بالکل سچی بات ہے کہ خدا تعالیٰ تھرک کر کسی کو ولی نہیں بناتا بلکہ محض اپنے فضل اور عنایت سے اپنا مقرب بنا لیتا ہے اس کو کسی کی کوئی حاجت نہیں ہے اس ولایت اور قرب کا فائدہ بھی اسی کو پہنچتا ہے.... یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا اجتناب اور اصطفاء فطرتی جوہر سے ہوتا ہے۔ ممکن ہے گذشتہ زندگی میں وہ کوئی صغائر یا کبار رکھتا ہو لیکن جب اللہ تعالیٰ سے اس کا سچا تعلق ہو جاوے تو وہ کل خطائیں بخش دیتا ہے اور پھر اس کو کبھی شرمندہ نہیں کرتا نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ یہ کس قدر احسان اللہ تعالیٰ کا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ درگزر کرتا اور عفو فرماتا ہے پھر اس کا کبھی ذکر ہی نہیں کرتا اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے پھر باوجود ایسے احسانوں اور فضلوں کے بھی اگر وہ منافقانہ زندگی بسر کرے تو پھر سخت بد قسمتی اور شامت ہے۔

برکات اور فیوض الہی کے حصول کے واسطے دل کی صفائی کی بھی بہت بڑی ضرورت ہے جب تک دل صاف نہ ہو کچھ نہیں چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ دل پر نظر ڈالے تو اس کے کسی حصہ یا کسی گوشہ میں کوئی شعبہ نفاق کا نہ ہو۔ جب یہ حالت ہو تو پھر الہی نظر کے ساتھ تجلیات آتی ہیں اور معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے ایسا وفادار اور صادق ہونا چاہیے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنا صدق دکھایا یا جس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمونہ دکھایا۔ جب انسان اس نمونہ پر قدم مارتا ہے تو وہ بابرکت آدمی ہو جاتا ہے پھر دنیا کی زندگی میں کوئی ذلت نہیں اٹھاتا اور نہ تنگی رزق کی مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ اس پر خدا تعالیٰ کے فضل و احسان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کو لعنتی زندگی سے ہلاک نہیں کرتا بلکہ اس کا خاتمہ بالخیر کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ جو خدا تعالیٰ سے سچا اور کامل تعلق رکھتا ہو تو خدا تعالیٰ اس کی ساری مرادیں پوری کر دیتا ہے اسے نامراد نہیں رکھتا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

توبہ کرتے رہو، استغفار کرو، دعا سے ہر وقت کام لو۔ ولی کیا ہوتے ہیں؟ یہ صفات تو اولیا کے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھ، ہاتھ، پاؤں غرض کوئی عضو ہو، منشاء الہی کے خلاف حرکت نہیں کرتے۔ خدا کی عظمت کا بوجھ ان پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی زیارت کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جاسکتے۔ پس تم بھی کوشش کرو۔ خدا بخیل نہیں۔

ہر کہ عارف تر است ترساں تر

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

خبردار ہو یعنی یقیناً سمجھ کہ جو لوگ اللہ (جل شانہ) کے دوست ہیں۔ یعنی جو لوگ خدائے تعالیٰ سے سچی محبت رکھتے ہیں اور خدائے تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے تو ان کی یہ نشانیاں ہیں کہ نہ ان پر خوف مستولی ہوتا ہے کہ کیا کھائیں گے یا کیا پیئیں گے یا فلاں بلا سے کیوں کر نجات ہوگی کیونکہ وہ تسلی دیئے جاتے ہیں اور نہ گذشتہ کے متعلق کوئی حزن و اندوہ انہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ صبر دیئے جاتے ہیں۔ دوسری یہ نشانی ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہیں یعنی ایمان میں کامل ہوتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں یعنی خلاف ایمان و خلاف فرماں برداری جو باتیں ہیں ان سے بہت دور رہتے ہیں۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۷۹-۸۰)

الَّذِينَ آمَنُوا وَ كَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۱۷﴾ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ ﴿۱۸﴾  
لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۹﴾

وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے یعنی اللہ رسول کے تابع ہو گئے اور پھر پرہیزگاری اختیار کی۔ ان کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس دنیا کی زندگی اور نیز آخرت میں بشری ہے یعنی خدا تعالیٰ خواب اور الہام کے ذریعہ سے اور نیز مکاشفات سے ان کو بشارتیں دیتا رہے گا۔ خدا تعالیٰ کے وعدوں میں تخلف نہیں اور یہ بڑی کامیابی ہے جو ان کے لئے مقرر ہوگی یعنی اس کامیابی کے ذریعہ سے ان میں اور غیروں میں فرق ہو جائے گا اور جو سچے نجات یافتہ نہیں ان کے مقابل میں دم نہیں مار سکیں گے۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۳۵)

ان کو اسی زندگی میں بشارتیں ملیں گی یعنی وہ خدا سے نور الہام کا پائیں گے اور بشارتیں سنیں گے جن میں ان کی بہتری اور مدح اور ثنا ہوگی اور خدا ان کی سچائیوں کو روشن کرے گا۔ خدا نے جو وعدہ کیا ہے وہ سب پورا ہوگا اور کسی نوع کی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ یہی سعادت عظمیٰ ہے کہ جو ان لوگوں کو ملتی ہے کہ جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۶۳، ۲۶۵، ۲۶۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

مسلمانوں کو سچی خوابیں کثرت سے آتی ہیں جیسا ان کی نسبت خدا تعالیٰ نے آپ وعدہ دے رکھا ہے اور فرمایا ہے: لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لیکن کفار اور منکرین اسلام کو اس کثرت سے سچی خوابیں ہرگز

نصیب نہیں ہوتیں بلکہ ان کا ہزارم حصہ بھی نصیب نہیں ہوتا چنانچہ اس کا ثبوت ہماری ان ہزار ہا سچی خوابوں کے ثبوت سے ہو سکتا ہے جن کو ہم نے قبل از وقوع صد ہا مسلمانوں اور ہندوؤں کو بتلا دیا ہے اور جن کے مقابلہ سے غیر قوموں کا عاجز ہونا ہم ابتدا سے دعویٰ کر رہے ہیں۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۸۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۱)

یہ مومنوں کا ایک خاصہ ہے کہ بہ نسبت دوسروں کے ان کی خوابیں سچی نکلتی ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۲۹۳)

چونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سفر کرنا ایک نہایت دقیق در دقیق راہ ہے اور اس کے ساتھ طرح طرح کے مصائب اور دکھ لگے ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ انسان اس نادیدہ راہ میں بھول جاوے یا ناامیدی طاری ہو اور آگے قدم بڑھانا چھوڑ دے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی رحمت نے چاہا کہ اپنی طرف سے اس سفر میں ساتھ ساتھ اس کو تسلی دیتی رہے اور اس کی دلہی کرتی رہے اور اس کی کمر ہمت باندھتی رہے اور اس کے شوق کو زیادہ کرے۔ سو اس کی سنت اس راہ کے مسافروں کے ساتھ اس طرح پر واقع ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے کلام اور الہام سے ان کو تسلی دیتا اور ان پر ظاہر کرتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تب وہ قوت پا کر بڑے زور سے اس سفر کو طے کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں وہ فرماتا ہے: **لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ**۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۲)

لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ یعنی خدا کے دوستوں کو الہام اور خدا کے مکالمہ کے ذریعہ سے اس دنیا میں خوشخبری ملتی ہے اور آئندہ زندگی میں بھی ملے گی۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۷۳۷)

یعنی دنیا کی زندگی میں مومنین کو یہ نعمت ملے گی کہ اکثر سچی خوابیں انہیں آیا کریں گی یا سچے الہام ان کو ہوا کریں گے۔

(ضرورت الامام، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۷۱)

اگر بعض جاہل اور نادان جو نام کے مسلمان ہیں یہ عقیدہ رکھیں کہ اسلام میں بھی مکالمہ مخاطبہ الہیہ کا سلسلہ بند ہے تو یہ ان کی اپنی جہالت ہے کیونکہ قرآن شریف مکالمہ مخاطبہ الہیہ کے سلسلہ کو بند نہیں کرتا جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے.... یعنی مومنوں کے لئے ہمیشہ الہام باقی رہ گئے ہیں گو شریعت ختم ہو گئی ہے کیونکہ عمر دنیا ختم ہونے کو ہے پس خدا کا کلام بشارتوں کے رنگ میں قیامت تک باقی ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۸۸ حاشیہ)

ایماندار لوگ دنیوی زندگی اور آخرت میں بھی تبشیر کے نشان پاتے رہیں گے جن کے ذریعے سے وہ دنیا اور آخرت میں معرفت اور محبت کے میدانوں میں ناپیدا کنار ترقیاں کرتے جائیں گے۔ یہ خدا کی باتیں ہیں جو کبھی نہیں ٹلیں گی اور تبشیر کے نشانوں کو پالینا یہی فوز عظیم ہے (یعنی یہی ایک امر ہے جو محبت اور معرفت کے منتهی مقام تک پہنچا دیتا ہے)۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۳۳۸)

تیسری ان (اللہ اور رسول کے تابع لوگوں) کی یہ نشانی ہے کہ انہیں (بذریعہ مکالمہ الہیہ و رویائے صالحہ) بشارتیں ملتی رہتی ہیں اس جہاں میں بھی اور دوسرے جہاں میں بھی خدائے تعالیٰ کا ان کی نسبت یہ عہد ہے جو ٹل نہیں سکتا اور یہی پیارا درجہ ہے جو انہیں ملا ہوا ہے یعنی مکالمہ الہیہ اور رویائے صالحہ سے خدائے تعالیٰ کے مخصوص بندوں کو جو اس کے ولی ہیں ضرور حصہ ملتا ہے اور ان کی ولایت کا بھاری نشان یہی ہے کہ مکالمات و مخطبات الہیہ سے مشرف ہوں (یہی قانون قدرت اللہ جل شانہ کا ہے)۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۷۹، ۸۰، ۸۱ حاشیہ)

جو متقی ہوتے ہیں ان کو اسی دنیا میں بشارتیں سچے خوابوں کے ذریعے ملتی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ صاحب مکاشفات و الہامات ہو جاتے ہیں۔ مکالمہ اللہ کا شرف حاصل کرتے ہی وہ بشریت کے لباس میں ہی ملائکہ کو دیکھ لیتے ہیں۔

لاہور میں ایک مولوی عبدالحکیم صاحب سے مباحثہ ہوا تھا تو ہم نے اس کو یہی پیش کیا کہ تم خدا تعالیٰ کے مکالمات سے کیوں ناراض ہوتے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تو محمدؐؑ تھے تو اس نے صاف طور پر انکار کیا اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرضی طور پر کہا تھا۔ حضرت عمرؓ بھی محمدؐؑ نہ تھے۔ یہ مجال ہے کہ آئندہ کسی کو الہام ہو ان کو اس پر بالکل ایمان نہیں ہے، وہ مکالمات کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کئے بیٹھے ہیں اور خدا تعالیٰ کو انہوں نے گونگا خدا مان لیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن شریف میں جو یہ آیا ہے: **كَهُمُ الْبَشَرِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** اس کا ان کے نزدیک کیا مطلب ہے اور جب ملائکہ ایسے مومنوں پر نازل ہوتے ہیں اور ان کو بشارتیں دیتے ہیں تو وہ بشارتیں کس کی طرف سے دیتے ہیں۔ اس اعتقاد سے پھر قرآن شریف کا ان کو انکار کرنا پڑے گا کیونکہ سارا قرآن شریف اس بات سے بھرا پڑا ہے کہ خدا تعالیٰ کے مکالمہ کا شرف عطا ہوتا ہے اگر یہ شرف ہی کسی کو نہیں ملتا تو پھر قرآن شریف کی تاثیرات کا ثبوت کہاں سے ہوگا؟ اگر آفتاب دھندلا اور تاریک ہے تو اس کی روشنی پر کوئی کیا فرق کر سکے گا اور کیا یہ کہہ کر فخر کرے گا کہ

اس میں روشنی نہیں بلکہ تاریکی ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

ان کے واسطے اسی دنیوی زندگی میں بشارتیں نازل ہوتی ہیں اور قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں کہ وہی ہمارا رب ہے اور پھر اس ایمان پر استقامت دکھلاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر فرشتے نازل کرتا ہے جو ان کو تشفی دیتے ہیں کہ تم کو کوئی غم اور حزن نہیں پہنچے گا خدا تعالیٰ کی شناخت کے واسطے یہ ایک بڑا طریق ہے کہ نشانات کا مشاہدہ کرایا جاوے۔ جب ایک سلسلہ نشانات اور کرامات کو مدت دراز گزر جاتی ہے تو لوگ دہریہ مزاج ہو جاتے ہیں اور یہودہ باتیں بناتے ہیں۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۳ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

اگر قرآن کے خطابات صحابہ تک ہی محدود ہوتے تو صحابہ کے فوت ہو جانے کے ساتھ قرآن باطل ہو جاتا اور آیت متنازعہ فیہا جو خلافت کے متعلق ہے درحقیقت اس آیت سے مشابہ ہے: كَهْمُ الْبَشَرِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ کیا یہ بشری صحابہ سے ہی خاص تھا یا کسی اور کو بھی اس سے حصہ ہے۔

(شہادت القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۳۵)

ان کے واسطے اسی دنیوی زندگی میں بشارتیں نازل ہوتی ہیں۔

(کلمہ طیبہ صفحہ ۲۸)

یہ مومنوں کا ایک خاصہ ہے کہ بہ نسبت دوسروں کے ان کی خواہیں سچی نکلتی ہیں۔

(مکتوبات احمد جلد اول صفحہ ۳۴۰)

جو لوگ قرآن شریف پر ایمان لائیں گے ان کو مبشر خواہیں اور الہام دیئے جائیں گے یعنی بکثرت دیئے جائیں گے ورنہ شاذ و نادر کے طور پر کسی دوسرے کو بھی کوئی سچی خواب آسکتی ہے مگر ایک قطرہ کو ایک دریا کے ساتھ کچھ نسبت نہیں اور ایک پیسہ کو ایک خزانہ سے کچھ مشابہت نہیں..... چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم سے خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوتا چلا آتا ہے اور اس زمانہ میں ہم خود اس کے شاہد رویت ہیں۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۱۰)

ایمانداروں کو خدا کی طرف سے بشارتیں ملتی رہتی ہیں۔ ایسا ہی وہ بھی اپنی ذات کے متعلق کئی قسم کی بشارتیں پاتا رہتا ہے اور جیسے جیسے بذریعہ ان بشارتوں کے اس کا ایمان قوی ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ گناہ سے پرہیز کرتا اور نیکیوں کی طرف حرکت کرتا ہے۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۲۴)

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ..... کوئی نہیں جو خدا کی باتوں کو نال سکے۔

(مجموعہ اشتہارات جلد اول صفحہ ۱۳)

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۗ هُوَ الْغَنِيُّ ۗ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ اِنْ  
عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلٰطِيْنٍ بِهٰذَا اٰتَقُوْنُوْنَ عَلٰى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰﴾

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا بیٹا رکھتا ہے حالانکہ بیٹے کا محتاج ہونا ایک نقصان ہے اور خدا ہر ایک نقصان سے پاک ہے۔ وہ توغنی اور بے نیاز ہے جس کو کسی کی حاجت نہیں جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ کیا تم خدا پر ایسا بہتان لگاتے ہو جس کی تائید میں تمہارے پاس کسی نوع کا علم نہیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۰ حاشیہ درحاشیہ نمبر ۳)

وَجُوْزَنًا بِنِيْٓ اِسْرٰٓءِيْلَ الْبَحْرَ فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗٓ بَغِيًّا وَعَدُوًّا حٰثِيًّا  
اِذَا اَدْرٰكُهٗ الْغَرْقُ قَالَ اٰمَنْتُ اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْ اٰمَنْتُ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرٰٓءِيْلَ  
وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۱﴾

یاد رکھو جو امن کی حالت میں ڈرتا ہے وہ خوف کی حالت میں بچا یا جاتا ہے اور جو خوف کی حالت میں ڈرتا ہے تو وہ کوئی خوبی کی بات نہیں۔ ایسے موقع پر تو کا فر مشرک بے دین بھی ڈرا کرتے ہیں۔ فرعون نے بھی ایسے موقع پر ڈر کر کہا تھا: اَمَنْتُ اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْ اٰمَنْتُ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرٰٓءِيْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۱۱/۱۳ اس سے صرف اتنا فائدہ اسے ہوا کہ خدا نے فرمایا کہ تیرا بدن تو ہم بچا لیں گے مگر تیری جان کو اب نہیں بچائیں گے آخر خدا نے اس کے بدن کو ایک کنارے پر لگا دیا۔ ایک چھوٹے سے قد کا وہ آدمی تھا۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

دیکھو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پہلے نرم نرم عذاب آئے کہ حشرات الارض نکل آئے، خون پھیل گیا، قحط پڑ گیا۔ بھلا فرعون قحط کو کیا جانتا تھا۔ وہ تماشا سمجھتا ہوگا کیونکہ قحط کا اثر تو غریبوں پر پڑتا ہے مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن بطش شدید کا آنے والا ہے جب اس کے منہ سے بے اختیار نکلے گا: اَمَنْتُ اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْ اٰمَنْتُ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرٰٓءِيْلَ اِبتدائی مندرجات سے ڈرو گے تو نجات پاؤ گے۔

(بدرد جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۱)

فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةً ۙ فَنَفَعَهَا اِيْمَانُهَا ۙ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۙ لَهٰٓ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا

## عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنَهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٩٩﴾

پس خلاصہ یہ ہے کہ خدائے قادر کے کلام میں یونس علیہ السلام کا قصہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ کا عذاب کسی ایسی شرط کے بغیر بھی جو تاخیر کے حکم کا موجب بن سکے تاخیر میں ڈال دیا جاتا ہے جیسا کہ یونس علیہ السلام کی پیشگوئی میں عذاب الہی کو باوجود تشہیر کے ڈال دیا گیا۔ (ترجمہ از مرتب)

فَالْحَاصِلُ أَنَّ قِصَّةَ يُونُسَ فِي كَلَامِ اللَّهِ الْقَدِيرِ، دَلِيلٌ عَلَىٰ أَنَّهُ قَدْ يُؤَخَّرُ عَذَابُ اللَّهِ مِنْ غَيْرِ شَرْطٍ يُوجِبُ حُكْمَ التَّأخِيرِ، كَمَا أُخِّرَ فِي نَبَأِ يُونُسَ بَعْدَ التَّشْهِيرِ (انجام آقہم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۲۲۶)

وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۗ أَفَأَنْتَ تُكذِرُ النَّاسَ

حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿١٠٠﴾

ہمیں خدا تعالیٰ نے قرآن میں یہ بھی تعلیم دی ہے کہ دین اسلام میں اکراہ اور جبر نہیں... جیسا کہ فرماتا

(کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۳۱۹)

ہے: أَفَأَنْتَ تُكذِرُ النَّاسَ -



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِیْمِ

## تفسیر سورۃ ہود

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرَّ كِتٰبٌ اٰحْكَمْتُ اٰیٰتُهُ ثُمَّ فُصِّلْتُ مِنْ لَدُنْ حَكِیْمٍ خَبِیْرٍ ①

الف سے مراد اللہ اور ل سے مراد جبرائیل اور راء سے مراد رسل ہیں چونکہ اس میں یہی قصہ ہے کہ کون سی چیزیں انسانوں کو ضروری ہیں اس لئے فرمایا کِتٰبٌ اٰحْكَمْتُ۔ الآیۃ۔ یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی آیات پکی اور استوار ہیں۔

قرآن کریم کی تعلیموں کو اللہ تعالیٰ نے کئی طرح پر مستحکم کیا تا کہ کسی قسم کا شک نہ رہے اور اسی لئے شروع میں ہی فرمایا لَا رَیْبَ فِیْهِ (البقرۃ: ۳) یہ استحکام کئی طور پر کیا گیا ہے۔

اولاً۔ قانون قدرت سے استواری اور استحکام قرآنی تعلیموں کا قانون قدرت سے کیا گیا۔ جو کچھ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے قانون قدرت اس کو پوری مدد دیتا ہے۔ گویا جو قرآن میں ہے وہی کتاب مکنون میں ہے۔ اس کا راز انبیاء علیہم السلام کی پیروی کے بدوں سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور یہی وہ سر ہے جو لَا یَمَسُّهُ اِلَّا الْمَطَهَّرُوْنَ (الواقعة: ۸۰) میں رکھا گیا ہے۔ غرض پہلے قرآنی تعلیم کو قانون قدرت سے مستحکم کیا ہے مثلاً قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفت وحدۃ لا شریک بتلائی۔ جب ہم قانون قدرت میں نظر کرتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ ضرور ایک ہی خالق و مالک ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ دل بھی اسے ہی مانتا ہے اور دلائل قدرت سے بھی اسی کا پتہ لگتا ہے کیونکہ ہر ایک چیز جو دنیا میں موجود ہے وہ اپنے اندر گرویت

رکھتی ہے جیسے پانی کا قطرہ اگر ہاتھ سے چھوڑیں تو وہ کرومی شکل کا ہوگا اور کرومی شکل توحید کو مستلزم ہے اور یہی وجہ ہے کہ پادریوں کو بھی ماننا پڑا کہ جہاں تثلیث کی تعلیم نہیں پہنچی وہاں کے رہنے والوں سے توحید کی پرش ہوگی چنانچہ پادری فنڈر نے اپنی تصنیفات میں اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر قرآن کریم دنیا میں نہ بھی ہوتا تب بھی ایک ہی خدا کی پرستش ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کا بیان صحیح ہے کیونکہ اس کا نقش انسانی فطرت اور دل میں موجود ہے اور دلائل قدرت سے اس کی شہادت ملتی ہے برخلاف اس کے انجیلی تثلیث کا نقش نہ دل میں ہے نہ قانون قدرت اس کا مؤید ہے۔

یعنی معنی ہیں الٰہیہ کے۔ یعنی قانون قدرت سے اس کی تعلیموں کو ایسا احکام اور استوار کیا گیا ہے کہ مشرک و عیسائی کو بھی ماننا پڑا کہ انسان کے مادہ فطرت سے توحید کی باز پرس ہوگی۔

دوسری وجہ استحکام کی خدا تعالیٰ کے نشانات ہیں کوئی نبی، کوئی مامور دنیا میں ایسا نہیں آتا جس کے ساتھ تائیدات الہی شامل نہ ہوں اور یہ تائیدات اور نشانات ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت پر شوکت اور پر قوت تھے۔ آپ کے حرکات سکنت میں کلام میں نشانات تھے۔ گویا آپ کا وجود از سر تا پا نشانات الہی کا پتلا تھا۔

تیسرا احکام نبی کا پاک چال چلن اور راست بازی ہے۔ یہ منجملہ ان باتوں کے ہے جو عقلمندوں کے نزدیک امین ہونا بھی ایک دلیل ہے جیسے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس سے دلیل پکڑی۔

چوتھا احکام جو ایک زبردست وجہ استواری اور استحکام کی ہے نبی کی قوت قدسیہ ہے جس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ جیسے طبیب خواہ کتنا ہی دعویٰ کرے کہ میں ایسا ہوں اور ویسا ہوں اور اس کو سدیدی خواہ نوک زبان ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر لوگوں کو اس سے فائدہ نہ پہنچے تو یہی کہیں گے کہ اس کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے۔ اسی طرح پر نبی کی قوت قدسی جس قدر زبردست ہو اسی قدر اس کی شان اعلیٰ اور بلند ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے استحکام کے لئے یہ پشتیان بھی سب سے بڑا پشتیان ہے۔۔۔۔۔ ان وجوہات احکام آیات کے علاوہ میرے نزدیک اور بھی بہت سے وجوہات ہیں منجملہ ان کے ایک الٰہ کے لفظ سے پتہ لگتا ہے یہ لفظ مجددوں اور مرسلوں کے سلسلہ جاریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو قیامت تک جاری ہے۔ اب اس سلسلہ میں آنے والے مجددوں کے خوارق۔ ان کی کامیابیوں، ان کی پاک تاثیروں وغیرہ وجوہات احکام آیات کو گن بھی نہیں سکتے۔ اور یہ سب خوارق اور کامیابیاں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے متبعین مجددوں

کے ذریعہ سے ہوئیں اور قیامت تک ہوں گی۔ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی کامیابیاں ہیں۔ غرض ہر صدی کے سر پر مجدد کا آنا صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ مردوں سے استمداد خدا تعالیٰ کی منشاء کے موافق نہیں اگر مردوں سے مدد کی ضرورت ہوتی تو زندوں کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہزاروں ہزار جو اولیاء اللہ پیدا ہوتے ہیں اس کا کیا مطلب تھا مجددین کا سلسلہ کیوں جاری کیا جاتا؟ اگر اسلام مردوں کے حوالے کیا جاتا تو یقیناً سمجھو کہ اس کا نام و نشان مٹ گیا ہوتا۔ یہودیوں کا مذہب مردوں کے حوالے کیا گیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ عیسائیوں نے مردہ پرستی سے بتلاؤ کیا پایا؟ مردوں کو پوجتے پوجتے خود مردہ ہو گئے۔ نہ مذہب میں زندگی کی روح رہی نہ ماننے والوں میں زندگی کے آثار باقی رہے۔ اول سے لے کر آخر تک مردوں ہی کا مجمع ہو گیا۔

اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔ اسلام کا خدائی و قیوم خدا ہے پھر وہ مردوں سے پیار کیوں کرنے لگا وہ سخی قیوم خدا تو بار بار مردوں کو جلاتا ہے یٰحٰی الْاَرْضُ بَعْدَ مَوْتِہَا (الروم: ۲۰) تو کیا مردوں کے ساتھ تعلق پیدا کرا کر جلاتا ہے نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اسلام کی حفاظت کا ذمہ اسی جی و قیوم خدا نے اِنَّا لَہٗ لٰخٰفِضُوْنَ (الحجر: ۱۰) کہہ کر اٹھایا ہوا ہے۔ پس ہر زمانہ میں یہ دین زندوں سے زندگی پاتا ہے اور مردوں کو جلاتا ہے یاد رکھو اس میں قدم قدم پر زندے آتے ہیں۔ پھر فرمایا اِنَّہٗ فُضِّلَتْ۔ ایک تو وہ تفصیل ہے جو قرآن کریم میں ہے دوسری یہ کہ قرآن کریم کے معارف و حقائق کے اظہار کا سلسلہ قیامت تک دراز کیا گیا ہے۔

ہر زمانے میں نئے معارف اور اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ فلسفی اپنے رنگ میں، طبیب اپنے مذاق پر، صوفی اپنے طرز پر بیان کرتے ہیں اور پھر یہ تفصیل بھی حکیم و خبیر خدا نے رکھی ہے۔ حکیم اس کو کہتے ہیں کہ جن چیزوں کا علم مطلوب ہو وہ کامل طور پر ہو اور پھر عمل بھی کامل ہو ایسا کہ ہر ایک چیز کو اپنے اپنے محل و موقع پر رکھ سکے۔ حکمت کے معنی وَصُحُّ الشَّیْءِ فِی مَحَلِّہٖ اور خبیر مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی ایسا وسیع علم کہ کوئی چیز اس کی خبر سے باہر نہیں چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مجید کو خاتم الکتب ٹھہرایا تھا اور اس کا زمانہ قیامت تک دراز تھا وہ خوب جانتا تھا کہ کس طرح پر یہ تعلیمیں ذہن نشین کرنی چاہئیں۔ چنانچہ اسی کے مطابق تفصیل کی ہیں۔ پھر اس کا سلسلہ جاری رکھا کہ جو مجدد و صالح اchiاء دین کے لئے آتے ہیں وہ خود مفصل آتے ہیں۔

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷ تا ۹)

اس کتاب میں دو خوبیاں ہیں ایک تو یہ کہ حکیم مطلق نے محکم اور مدلل طور پر یعنی علوم حکمیہ کی طرح اس کو

بیان کیا ہے بطور کتھا یا قصہ نہیں۔ دوسری یہ خوبی کہ اس میں تمام ضروریات علم معاد کی تفصیل کی گئی ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

### أَلَّا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۗ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ﴿۱۰﴾

ایک عجیب بات سوال مقدر کے جواب کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ یعنی اس قدر تفصیل جو بیان کی جاتی ہیں ان کا خلاصہ اور مغز کیا ہے؟ أَلَّا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ خدا تعالیٰ کے سوا ہرگز ہرگز کسی کی پرستش نہ کرو۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کی علت غائی یہی عبادت ہے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات: ۵۷)۔ عبادت اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ انسان ہر قسم کی قساوت، کجی کو دور کر کے دل کی زمین کو ایسا صاف بنا دے جیسے زمیندار زمین کو صاف کرتا ہے۔ عرب کہتے ہیں مَوْرٌ مَّعْبُودٌ جیسے سرمہ کو باریک کر کے آنکھوں میں ڈالنے کے قابل بنا لیتے ہیں اسی طرح جب دل کی زمین میں کوئی کنکر، پتھر، ناہمواری نہ رہے اور ایسی صاف ہو کہ گویا روح ہی روح ہو اس کا نام عبادت ہے۔ چنانچہ اگر یہ درستی اور صفائی آئینہ کی کی جاوے تو اس میں شکل نظر آ جاتی ہے اور اگر زمین کی کی جاوے تو اس میں انواع و اقسام کے پھل پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس انسان جو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اگر دل صاف کرے اور اس میں کسی قسم کی کجی اور ناہمواری کنکر پتھر نہ رہنے دے تو اس میں خدا نظر آئے گا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے درخت اس میں پیدا ہو کر نشوونما پائیں گے اور وہ اثمار شیریں و طیب ان میں لگیں گے جو اَكْلُهَا دَارِئٌ (الرعد: ۳۶) کے مصداق ہوں گے۔ یاد رکھو کہ یہ وہی مقام ہے جہاں صوفیوں کے سلوک کا خاتمہ ہے۔ جب سالک یہاں پہنچتا ہے تو خدا ہی خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اس کا دل عرش الہی بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر نزول فرماتا ہے۔ سلوک کی تمام منزلیں یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہیں کہ انسان کی حالت تعبد درست ہو جس میں روحانی باغ لگ جاتے ہیں اور آئینہ کی طرح خدا نظر آتا ہے اسی مقام پر پہنچ کر انسان دنیا میں جنت کا نمونہ پاتا ہے اور یہاں ہی هَذَا الَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ ۗ وَ اٰتٰوْا بِهٖ مُتَشٰبِهًا (البقرۃ: ۲۶) کہنے کا حظ اور لطف اٹھاتا ہے۔ غرض حالت تعبد کی درستی کا نام عبادت ہے۔ پھر فرمایا: إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ۔ چونکہ یہ تعبد تام کا عظیم الشان کام انسان بدوں کسی اسوۂ حسنہ اور نمونہ کاملہ کے اور کسی قوت قدسی کے کامل اثر کے بغیر نہیں کر سکتا تھا اس لئے رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ میں اسی خدا کی طرف سے نذیر اور بشیر

ہو کر آیا ہوں اور اگر میری اطاعت کرو گے اور مجھے قبول کرو گے تو تمہارے لئے بڑی بڑی بشارتیں ہیں کیونکہ میں بشیر ہوں اور اگر رد کرتے ہو تو یاد رکھو کہ میں نذیر ہو کر آیا ہوں۔ پھر تم کو بڑی بڑی عقوبتوں اور دکھوں کا سامنا ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ بہشتی زندگی اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے اور اسی طرح پرکورانہ زیست جو خدا تعالیٰ اور اس کے رسول سے بالکل الگ ہو کر بسر کی جاوے جہنمی زندگی کا نمونہ ہے اور وہ بہشت جو مرنے کے بعد ملے گا اسی بہشت کا اصل ہے اور اسی لئے تو بہشتی لوگ نعماء جنت کے حظ اٹھاتے وقت کہیں گے: هٰذَا الَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ دُنْيَا مِثْلِ مَا هٰذَا اَلَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ دُنْيَا مِثْلِ مَا هٰذَا انسان کو جو بہشت حاصل ہوتا ہے وہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ رَزَقَهَا (الشَّمْس: ۱۰) پر عمل کرنے سے ملتا ہے جب انسان عبادت کا اصل مفہوم اور مغز حاصل کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ کے انعام و اکرام کا پاک سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور جو نعمتیں آئندہ بعد مردن ظاہری مرئی اور محسوس طور پر ملیں گی وہ اب روحانی طور پر پاتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ جب تک بہشتی زندگی اسی جہان سے شروع نہ ہو اور اس عالم میں اس کا حظ نہ اٹھاؤ اس وقت تک سیر نہ ہو اور تسلی نہ پکڑو کیونکہ وہ جو اس دنیا میں کچھ نہیں پاتا اور آئندہ جنت کی امید کرتا ہے وہ طمع خام کرتا ہے اصل میں وَهْمٌ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَعْمٰی فِهٖمُ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (بنی اسرائیل: ۷۳) کا مصداق ہے اس لئے جب تک ماسوائے اللہ کے کنکر اور سنگریزے زمین دل سے دور نہ کر لو اور اسے آئینہ کی طرح مصفا اور سرمہ کی طرح باریک نہ بنا لو صبر نہ کرو۔ ہاں یہ سچ ہے کہ انسان کسی مزکی النفس کی امداد کے بغیر اس سلوک کی منزل کو طے نہیں کر سکتا اسی لئے اس کے انتظام و انصرام کے لئے اللہ تعالیٰ نے کامل نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھیجا اور پھر ہمیشہ کے لئے آپ کے سچے جانشینوں کا سلسلہ جاری فرمایا تاکہ ناعاقبت اندیش برہمنوں کا رد ہو جیسے یہ امر ایک ثابت شدہ صداقت ہے کہ جو کسان کا بچہ نہیں ہے نلائی (گوڈی دینے) کے وقت اصل درخت کو کاٹ دے گا اسی طرح پر یہ زمینداری جو روحانی زمینداری ہے کامل طور پر کوئی نہیں کر سکتا جب تک کسی کامل انسان کے ماتحت نہ ہو جو تخم ریزی، آبپاشی، نلائی کے تمام مرحلے طے کر چکا ہو۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ مرشد کامل کی ضرورت انسان کو ہے۔ مرشد کامل کے بغیر انسان کا عبادت کرنا اسی رنگ کا ہے جیسے ایک نادان و ناواقف بچہ ایک کھیت میں بیٹھا ہوا اصل پودوں کو کاٹ رہا ہے اور اپنے خیال میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ گوڈی کر رہا ہے۔ یہ گمان ہرگز نہ کرو کہ عبادت خود ہی آجاوے گی نہیں۔ جب تک رسول نہ سکھائے۔ انقطاع الی اللہ اور تبتل تام کی راہیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔

وَ أَنْ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُغْفِرْ لَكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ  
مُّسَمًّى وَ يُوْتِكُمْ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ ۗ وَ إِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ  
يَوْمٍ كَبِيرٍ ﴿۱۰﴾

طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مشکل کام کیوں کر حل ہو۔ اس کا علاج خود ہی بتلایا وَ أَنْ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ  
ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ یاد رکھو کہ دو چیزیں اس امت کو عطا فرمائی گئی ہیں ایک قوت حاصل کرنے کے واسطے۔  
دوسری حاصل کردہ قوت کو عملی طور پر دکھانے کے لئے۔ قوت حاصل کرنے کے واسطے استغفار ہے جس کو  
دوسرے لفظوں میں استمداد اور استعانت بھی کہتے ہیں۔ صوفیوں نے لکھا ہے کہ جیسے ورزش کرنے سے مثلاً  
مگدروں اور موگر یوں کے اٹھانے اور پھیرنے سے جسمانی قوت اور طاقت بڑھتی ہے اسی طرح پر روحانی  
مگدر استغفار ہے۔ اس کے ساتھ روح کو ایک قوت ملتی ہے اور دل میں استقامت پیدا ہوتی ہے جسے قوت  
یعنی مطلوب ہو وہ استغفار کرے۔ غفر ڈھانکنے اور دبانے کو کہتے ہیں۔ استغفار سے انسان ان جذبات اور  
خیالات کو ڈھانپنے اور دبانے کی کوشش کرتا ہے جو خدا تعالیٰ سے روکتے ہیں۔ پس استغفار کے یہی معنی  
ہیں کہ زہریلے مواد جو حملہ کر کے انسان کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں ان پر غالب آوے اور خدا تعالیٰ کے احکام کی  
بجا آوری کی راہ کی روکوں سے بچ کر انہیں عملی رنگ میں دکھائے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قسم کے مادے رکھے ہیں ایک سہمی مادہ ہے جس کا  
موکل شیطان ہے اور دوسرا تریاتی مادہ ہے۔ جب انسان تکبر کرتا ہے اور اپنے تئیں کچھ سمجھتا ہے اور تریاتی چشمہ  
سے مدد نہیں لیتا تو سہمی قوت غالب آجاتی ہے لیکن جب اپنے تئیں ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اور اپنے اندر اللہ تعالیٰ  
کی مدد کی ضرورت محسوس کرتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک چشمہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس کی  
روح گداز ہو کر بہہ نکلتی ہے اور یہی استغفار کے معنی ہیں یعنی یہ کہ اس قوت کو پا کر زہریلے مواد پر غالب  
آ جاوے۔

غرض اس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت پر یوں قائم رہو۔ اوّل رسول کی اطاعت کرو۔ دوسرے ہر وقت  
خدا سے مدد چاہو۔ ہاں پہلے اپنے رب سے مدد چاہو۔ جب قوت مل گئی تو تُوبُوا إِلَيْهِ یعنی خدا کی طرف  
رجوع کرو۔

استغفار اور توبہ دو چیزیں ہیں۔ ایک وجہ سے استغفار کو توبہ پر تقدم ہے کیونکہ استغفار مدد اور قوت ہے جو خدا سے حاصل کی جاتی ہے اور توبہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ہے۔ عادتہ اللہ یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے گا تو خدا تعالیٰ ایک قوت دے دے گا اور پھر اس قوت کے بعد انسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاوے گا اور نیکیوں کے کرنے کے لئے اس میں ایک قوت پیدا ہو جاوے گی جس کا نام تَوْبُوْا اِلَيْهِ ہے اس لئے طبعی طور پر بھی یہی ترتیب ہے غرض اس میں ایک طریق ہے جو سالکوں کے لئے رکھا ہے کہ سالک ہر حالت میں خدا سے استمداد چاہے۔ سالک جب تک اللہ تعالیٰ سے قوت نہ پائے گا کیا کر سکے گا۔ توبہ کی توفیق استغفار کے بعد ملتی ہے۔ اگر استغفار نہ ہو تو یقیناً یاد رکھو کہ توبہ کی قوت مرجاتی ہے۔ پھر اگر اس طرح پر استغفار کرو گے اور پھر توبہ کرو گے تو نتیجہ یہ ہوگا **يَمْتَعِكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى** سنت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ اگر استغفار اور توبہ کرو گے تو اپنے مراتب پا لو گے۔ ہر ایک شخص کے لئے ایک دائرہ ہے جس میں وہ مدارج ترقی کو حاصل کرتا ہے۔ ہر ایک آدمی نبی، رسول، صدیق، شہید نہیں ہو سکتا۔

غرض اس میں شک نہیں کہ تفاضل درجات امر حق ہے۔ اس کے آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان امور پر مواظبت کرنے سے ہر ایک سالک اپنی اپنی استعداد کے موافق درجات اور مراتب کو پالے گا۔ یہی مطلب ہے اس آیت **كُلٌّ فِيْ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهُ**۔ لیکن اگر زیادت لے کر آیا ہے تو خدا تعالیٰ اس مجاہدہ میں اس کو زیادت دے دے گا اور اپنے فضل کو پالے گا جو طبعی طور پر اس کا حق ہے۔ ذی الفضل کی اضافت ملکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا محروم نہ رکھے گا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقْرَّرًا وَمُسْتَوْدَعًا  
كُلٌّ فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾

زمین پر کوئی بھی ایسا چلنے والا نہیں جس کے رزق کا خدا آپ متکفل نہ ہو۔

(ست پنچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۳)

اگر خدا سے کوئی روٹی مانگے تو کیا نہ دے گا۔ اس کا وعدہ ہے: **وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا**۔ کتے بلی بھی تو اکثر پیٹ پالتے ہیں اور کیڑوں کوڑوں کو بھی رزق ملتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۸)

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتُمْ إِنَّكُمْ مَرْبِعُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۸﴾

كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ یہ بھی ایک تجلی تھی اور ماء کے معنی یہاں پانی بھی نہیں کر سکتے۔ خدا معلوم کہ اس کے نزدیک ماء کے کیا معنی ہیں۔ اس کی کنہ خدا کو معلوم ہے۔ جنت کے نعماء پر بھی ایسا ہی ایمان ہے۔ وہاں یہ تو نہ ہوگا کہ..... بہت سی گائے بھینسیں ہوں گی اور دودھ دودھ کر حوض میں ڈالا جاوے گا خدا فرماتا ہے کہ وہ اشیاء ہیں جو نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سنی اور نہ زبان نے چکھیں۔ نہ دل میں ان کے فہم کا مادہ ہے حالانکہ ان کو دودھ اور شہد وغیرہ ہی لکھا ہے جو کہ آنکھوں سے نظر آتا ہے اور ہم اسے پیتے ہیں۔ اسی طرح کئی باتیں جو کہ ہم خود دیکھتے ہیں مگر نہ تو الفاظ ملتے ہیں کہ ان کو بیان کر سکیں نہ اس کے بیان کرنے پر قادر ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر ان کو مادی دنیا پر قیاس کریں تو صد ہا اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى (بنی اسرائیل: ۷۳) سے ظاہر ہے کہ دیدار کا وعدہ یہاں بھی ہے مگر ہم اسے جسمانیات پر نہیں حمل کر سکتے۔ (الہد جلد ۲ نمبر ۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸)

فَالَّذِي يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۹﴾

منجملہ ان کے ایک وہ وجہ ہے جو ان نتائج متفاوتہ سے ماخوذ ہوتی ہے۔ جن کا مختلف طور پر بحالت عمل صادر ہونا ضروری ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر ایک عاقل کی نظر میں یہ بات نہایت بدیہی ہے کہ جب چند متکلمین انشا پر از اپنی اپنی علمی طاقت کے زور سے ایک ایسا مضمون لکھنا چاہیں کہ جو فضول اور کذب اور حشو اور لغو اور ہزل اور ہر ایک مہمل بیانی اور ژولیدہ زبانی اور دوسرے تمام امور مخل حکمت و بلاغت اور آفات منافی کمالیت و جامعیت سے بگلی منزہ اور پاک ہو۔ اور سراسر حق اور حکمت اور فصاحت اور بلاغت اور حقائق اور معارف سے بھرا ہوا ہو تو ایسے مضمون کے لکھنے میں وہی شخص سب سے اول درجہ پر رہے گا کہ جو علمی طاقتوں

اور وسعت معلومات اور عام واقفیت اور ملکہ علوم دقیقہ میں سب سے اعلیٰ اور مشق اور ورزش الملاء و انشاء میں سب سے زیادہ تر فرسودہ روزگار ہو اور ہرگز ممکن نہ ہوگا کہ جو شخص اس سے استعداد میں، علم میں، لیاقت میں، ملکہ میں، ذہن میں، عقل میں کہیں فروتر اور متزلزل ہے وہ اپنی تحریر میں من حیث الکمالات اُس سے برابر ہو جائے۔ مثلاً ایک طبیب حاذق جو علم ابدان میں مہارت تامہ رکھتا ہے جس کو زمانہ دراز کی مشق کے باعث سے تشخیص امراض اور تحقیق عوارض کی پوری پوری واقفیت حاصل ہے اور علاوہ اس کے فن سخن میں بھی یکتا ہے اور نظم اور نثر میں سرآمد روزگار ہے۔ جیسے وہ ایک مرض کے حدوث کی کیفیت اور اُس کی علامات اور اسباب فصیح اور وسیع تقریر میں کمال صحت و حقانیت اور بہ نہایت متانت و بلاغت بیان کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلے پر کوئی دوسرا شخص جس کو فن طبابت سے ایک ذرہ مس نہیں اور فن سخن کی نزاکتوں سے بھی نا آشنا محض ہے ممکن نہیں کہ مثل اس کے بیان کر سکے۔ یہ بات بہت ہی ظاہر اور عام فہم ہے کہ جاہل اور عاقل کی تقریر میں ضرور کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے اور جس قدر انسان کمالات علمیہ رکھتا ہے۔ وہ کمالات ضرور اس کی علمی تقریر میں اس طرح پر نظر آتے ہیں۔ جیسے ایک آئینہ صاف میں چہرہ نظر آتا ہے۔ اور حق اور حکمت کے بیان کرنے کے وقت وہ الفاظ کہ جو اس کے موبہ سے نکلتے ہیں۔ اس کی لیاقت علمی کا اندازہ معلوم کرنے کے لئے ایک پیمانہ تصور کئے جاتے ہیں اور جو بات وسعت علم اور کمال عقل کے چشمہ سے نکلتی ہے اور جو بات تنگ اور منقبض اور تاریک اور محدود خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں طور کی باتوں میں اس قدر فرق واضح ہوتا ہے کہ جیسے قوت شامہ کے آگے بشرطیکہ کسی فطرتی یا عارضی آفت سے ماؤف نہ ہو خوشبو اور بدبو میں فرق واضح ہے۔ جہاں تک تم چاہو فکر کر لو اور جس حد تک چاہو سوچ لو کوئی خامی اس صداقت میں نہیں پاؤ گے۔ اور کسی طرف سے کوئی رخنہ نہیں دیکھو گے۔ پس جبکہ من کل الوجوہ ثابت ہے کہ جو فرق علمی اور عقلی طاقتوں میں مخفی ہوتا ہے۔ وہ ضرور کلام میں ظاہر ہو جاتا ہے اور ہرگز ممکن ہی نہیں کہ جو لوگ من حیث العقل والعلم افضل اور اعلیٰ ہیں وہ فصاحت بیانی اور رفعت معانی میں یکساں ہو جائیں اور کچھ ماہہ الامتیاز باقی نہ رہے۔ تو اس صداقت کا ثابت ہونا اس دوسری صداقت کے ثبوت کو مستلزم ہے کہ جو کلام خدا کا کلام ہو اس کا انسانی کلام سے اپنے ظاہری اور باطنی کمالات میں برتر اور اعلیٰ اور عدیم المثال ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ خدا کے علم تام سے کسی کا علم برابر نہیں ہو سکتا۔ اور اسی کی طرف خدا نے بھی اشارہ فرما کر کہا ہے: **قَالَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّهُمْ أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ الْجَزُومُ** ۱۲۔ یعنی اگر کفار اس قرآن کی نظیر پیش نہ کر سکیں اور مقابلہ کرنے سے عاجز رہیں۔

تو تم جان لو کہ یہ کلام علم انسان سے نہیں بلکہ خدا کے علم سے نازل ہوا ہے۔ جس کے علم وسیع اور تام کے مقابلہ پر علوم انسانی بے حقیقت اور پتھ ہیں۔ اس آیت میں بُرہانِ اِنّی کی طرز پر اثر کے وجود کو مؤثر کے وجود کی دلیل ٹھہرائی ہے جس کا دوسرے لفظوں میں خلاصہ مطلب یہ ہے کہ علم الہی بوجہ اپنی کمالیت اور جامعیت کے ہرگز انسان کے ناقص علم سے متشابہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرور ہے کہ جو کلام اس کامل اور بے مثل علم سے نکلا ہے۔ وہ بھی کامل اور بے مثل ہی ہو۔ اور انسانی کلاموں سے بکلی امتیاز رکھتا ہو۔ سو یہی کمالیت قرآن شریف میں ثابت ہے۔ غرض خدا کے کلام کا انسان کے کلام سے ایسا فرق بین چاہئے۔ جیسا خدا اور انسان کے علم اور عقل اور قدرت میں فرق ہے۔ جس حالت میں افراد انسانی نوع واحد میں داخل ہو کر پھر بھی بوجہ تفاوت علم اور عقل اور تجربہ اور مشق کے متفاوت البیان پائی جاتی ہیں اور وسیع العلم اور قوی العقل کے فکر سرتک محدود العلم اور ضعیف العقل ہرگز نہیں پہنچ سکتا تو پھر خدا جو شرکت نوعی سے بکلی پاک اور بلاشبہ مستجمع کمالات تامہ اور اپنی جمیع صفات میں واحد لا شریک ہے اس سے مساوات کسی ذرۃ امکان کی کیوں کر جائز ہو اور کیوں کر کوئی مخلوق ہو کر خالق کے علوم غیر متناہیہ سے اپنے پتھ اور ناچیز علم کو برابر کر سکے۔ کیا اس صداقت کے ثابت ہونے میں ابھی کچھ کسر رہ گئی ہے کہ کلام کی تمام ظاہری باطنی شوکت و عظمت علمی طاقتوں اور عملی قدرتوں کے تابع ہے۔ کیا کوئی ایسا انسان بھی ہے جس نے اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے کسی جزئی میں اس سچائی کو دیکھ نہیں لیا؟ پس جبکہ یہ صداقت اس قدر قوی اور مستحکم اور شائع اور متعارف ہے کہ کسی درجہ کی عقل اس کے سمجھنے سے قاصر نہیں تو اس صورت میں نہایت درجہ کا نادان وہ شخص ہے کہ جو افراد ناقصہ انسانی میں تو اس صداقت کو مانتا ہے مگر اس ذات کامل کے کلام مقدس میں جس کا اپنے علوم تامہ میں یکتا اور بے نظیر ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے صداقت مذکورہ کے ماننے سے مونہہ پھیرتا ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۱۵ تا ۲۴۷)

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبُنِي فِي الْذِّينِ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ

مُغْرَقُونَ ﴿۳۷﴾

میری آنکھوں کے سامنے کشتی بنا اور ظالموں کی شفاعت کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کر کہ میں ان کو غرق کروں گا۔ خدا نے نوح کے زمانہ میں ظالموں کو قریباً ایک ہزار سال تک مہلت دی تھی اور اب بھی خیر القرون کی تین صدیوں کو علیحدہ رکھ کر ہزار برس ہی ہو جاتا ہے۔ اس حساب سے اب یہ زمانہ اس

وقت پر آ پہنچتا ہے جبکہ نوح کی قوم عذاب سے ہلاک کی گئی تھی۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۱۳)

اور ان لوگوں کے بارے میں جو ظالم ہیں میرے ساتھ مخاطبت مت کرو و غرق کئے جائیں گے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۰۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنا۔ (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ ٹائٹل پیج)

ایک طرف تو خدا نے کشتی کا حوالہ دیا ہے کہ جو اس میں چڑھے گا وہ نجات پاوے گا اور ایک طرف حکم دیا ہے: **وَلَا تَخَاطَبُنِي فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوا** یہاں بھی ظلم کی نسبت ہی فرمایا کہ جو لوگ ظالم ہیں تو ان کی نسبت بات ہی نہ کر۔ خوفِ الہی اور تقویٰ بڑی برکت والی شے ہے۔

(الہد جلد ۲ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۳)

یعنی ہمارے روبرو اور ہمارے حکم سے کشتی تیار کرو اور ان لوگوں کے بارے میں جو ظالم ہیں مجھ سے بات

نہ کر کہ میں ان سب کو غرق کروں گا۔ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۶۳۹)

**وَقَالَ اٰذْكُبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِبًا وَّ مَّرْسٰهًا ۗ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۱**

اس کشتی نوح پر سوار ہو جاؤ۔ خدا کے نام پر ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ٹائٹل پیج)

**قَالَ سَاوْحٰی اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۗ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ**

**اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۗ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمَغْرَقِيْنَ ۝۲۲**

آج خدا کے سوا اس کی تقدیر سے کوئی بچا نہیں سکتا وہی رحم کرے تو کرے۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ٹائٹل پیج)

**وَقِيْلَ يَا اَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكَ وَایْسَاءَ اَقْلَبِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءِ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَاَسْتَوَتْ عَلٰی الْجُوْدِیِّ وَقِيْلَ بَعْدَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۳**

نوح کی کشتی نے طوفان کے بعد ایسی جگہ پر فرار پکڑا جو اس کے مناسب حال تھا یعنی اس جگہ زمین پر

اترنے کے لئے بہت آسانی تھی۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۱۱۹)

بائبل اور سائنس کی آپس میں ایسی عداوت ہے جیسی کہ دو سونکین ہوتی ہیں۔ بائبل میں لکھا ہے کہ وہ طوفان ساری دنیا میں آیا اور کشتی تین سو ہاتھ لمبی اور پچاس ہاتھ چوڑی تھی اور اس میں حضرت نوح نے ہر قسم کے پاک جانوروں میں سے سات جوڑے اور ناپاک میں سے دو جوڑے ہر قسم کے کشتی میں چڑھائے حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اول تو اللہ تعالیٰ نے کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کیا جب تک پہلے رسول کے ذریعہ سے اس کو تبلیغ نہ کی ہو اور حضرت نوح کی تبلیغ ساری دنیا کی قوموں پر کہاں پہنچی تھی جو سب غرق ہو جاتے دوم اتنی چھوٹی سی کشتی میں جو صرف ۳۰۰ ہاتھ لمبی اور ۵۰ ہاتھ چوڑی ہو ساری دنیا کے جانور بہائم چرند پرند سات سات جوڑے یا دو دو جوڑے کیوں کر سما سکتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب میں تحریف ہے اور اس میں بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی ہیں۔ تعجب ہے کہ بعض سادہ لوح علماء اسلام نے بھی ان باتوں کو اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے مگر قرآن شریف ہی ان بے معنی باتوں سے پاک ہے۔ اس پر ایسے اعتراض وارد نہیں ہو سکتے۔ اس میں نہ تو کشتی کی لمبائی چوڑائی کا ذکر ہے اور نہ ساری دنیا پر طوفان آنے کا ذکر ہے بلکہ صرف الارض یعنی وہ زمین جس میں نوح نے تبلیغ کی صرف اس کا ذکر ہے۔ لفظ اراراث جس پر نوح کی کشتی ٹھہری اصل آری ریت ہے جس کے معنی ہیں میں پہاڑ کی چوٹی کو دیکھتا ہوں ریت پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے لفظ جو دی رکھا ہے جس کے معنی ہیں میرا جو دو کر م یعنی وہ کشتی میرے جو دو کر م پر ٹھہری۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

قَالَ يُؤْمِحُ إِنَّكَ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّكَ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلِنِ مَا

لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۗ إِنَِّّي أَعْظَمُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝

سید صاحب کا یہ قول ہے کہ گویا قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے تمام دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے حالانکہ تمام دعائیں قبول نہیں ہوتیں، یہ ان کی سخت غلط فہمی ہے اور یہ آیت اُدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المؤمن: ۶۱) ان کے مدعا کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ یہ دُعا جو آیت اُدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں بطور امر کے بجالانے کے لئے فرمائی گئی ہے۔ اس سے مراد معمولی دُعا نہیں ہیں۔ بلکہ وہ عبادت ہے جو انسان پر فرض کی گئی ہے کیونکہ امر کا صیغہ یہاں فرضیت پر دلالت کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ کل دُعا میں فرض میں داخل

نہیں ہیں بلکہ بعض جگہ اللہ جل شانہ نے صابرین کی تعریف کی ہے جو اِنَّا لِلّٰہِ پر ہی کفایت کرتے ہیں۔ اور اس دُعا کی فرضیت پر بڑا قرینہ یہ ہے کہ صرف امر پر ہی کفایت نہیں کی گئی بلکہ اس کو عبادت کے لفظ سے یاد کر کے بحالت نافرمانی عذابِ جہنم کی وعید اس کے ساتھ لگا دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ دوسری دُعاؤں میں یہ وعید نہیں بلکہ بعض اوقات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دُعا مانگنے پر زجر و توبیخ کی گئی ہے چنانچہ اِنِّیْ اَعْظَمُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَہِلِیْنَ اس پر شاہد ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہر دُعا عبادت ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام کو لَآ تَسْئَلُنْ كَا تَا زِیَا نَہ کیوں لگایا جاتا! اور بعض اوقات اولیا اور انبیاء دُعا کرنے کو سوء ادب سمجھتے رہے ہیں اور صلحاء نے ایسی دُعاؤں میں استفتاء قلب پر عمل کیا ہے یعنی اگر مصیبت کے وقت دل نے دُعا کرنے کا فتویٰ دیا تو دُعا کی طرف متوجہ ہوئے اور اگر صبر کے لئے فتویٰ دیا تو پھر صبر کیا اور دُعا سے مُنہ پھیر لیا۔ ماسوا اس کے اللہ تعالیٰ نے دوسری دُعاؤں میں قبول کرنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ صاف فرمادیا ہے کہ چاہوں تو قبول کروں اور چاہوں تو رد کروں۔ (برکات الدعا، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۲، ۱۳)

مِنْ دُونِہ فِکِیْدُوْنِیْ جَبِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظَرُوْنَ ﴿۵۷﴾

یعنی کوئی دقیقہ مگر باقی نہ رکھو۔ سارے فریب مگر استعمال کرو۔ قتل کے منصوبے کرو۔ اخراج اور قید کی تدبیریں کرو مگر یاد رکھو..... آخر فتح میری ہے تمہارے سارے منصوبے خاک میں مل جاویں گے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

قَالُوْا یٰشَعِیْبُ اَصْلُوْکَ تَأْمُرُکَ اَنْ تَتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا اَوْ اَنْ تَفْعَلَ فِیْ

اَمْوَالِنَا مَا نَشَآءُ ۗ اِنَّکَ لَآَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ﴿۵۸﴾

حلیم وہ ہے جو یَتَلُغُ الْحَلَمَ کا مصداق ہو اور جو علم کے زمانہ تک پہنچے۔ وہ جوان مضبوط ہی ہوتا ہے کیونکہ خورد سال کے کچے اعضا شدت اور صلابت کے ساتھ بدل جاتے ہیں، قاموس بھی ملاحظہ ہو اور کشاف وغیرہ بھی اور بالغ عاقل کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ (الحق مباحثہ دہلی، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۹۳)

و یَقُوْمُوْا عَمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۗ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۗ لَمَنْ یَّاتِیْہِ عَذَابٌ

يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ﴿٣٦﴾

اِعْمَلُوا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ کہ اگر تم لوگوں پر میرا سچا ہونا مشتبہ ہے تو تم بھی اپنی اپنی جگہ عمل کرو میں بھی کرتا ہوں انجام پر دیکھ لینا کہ خدا کی تائید اور نصرت کس کے شامل حال ہے۔ جو امر خدا کی طرف سے ہوگا وہ بہر حال غالب ہو کر رہے گا۔

تم اپنی جگہ اپنا کام کرو میں اپنا کام کرتا ہوں عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ سچا کون ہے۔

(الہد راجلہ ۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿٣٧﴾

ایسا شخص جو ربانی فیض کے رنگ سے کم حصہ رکھتا ہے اسی کو قرآنی اصطلاح میں شقی کہتے ہیں اور جس نے کافی حصہ لیا اس کا نام سعید ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی پاک کلام میں مخلوقات کو سعادت اور شقاوت کے دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے مگر ان کو حسن اور قبح کے دو حصوں پر تقسیم نہیں کیا۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جو خدا تعالیٰ سے صادر ہوا اس کو برا تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس نے جو کچھ بنایا وہ سب اچھا ہے۔ ہاں اچھوں میں مراتب ہیں۔ پس جو شخص اچھا ہونے کے رنگ میں نہایت ہی کم حصہ رکھتا ہے وہ حکمی طور پر برا ہے اور حقیقی طور پر کوئی بھی برا نہیں۔

(ست پنچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۱۳۸ حاشیہ)

جس شخص کو قسم ازل نے اولیاء اور اصفیاء کے ساتھ تھوڑی سی مناسبت بھی نہ دی ہو تو یہ وہ محرومی ہے جسے حضرت کبریا کے نزدیک شقوت اور شقاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کامل سعید وہ ہے جس نے محبوب کی عادات کا احاطہ کر لیا ہو یہاں تک کہ وہ الفاظ، کلمات اور اسالیب میں اپنے محبوب کے مشابہ ہو گیا ہو۔ اور اشیاء ایسے کمال کو نہیں سمجھ سکتے۔ جیسے شکرورنگوں اور شکلوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور شتی کو بجز عظمت الہی اور

فَالَّذِي لَمْ يُعْطِهِ الْقِسَامَ ذَرَّةً مُّتَنَاسِبَةً  
بِالْأَوْلِيَاءِ وَالْأَصْفِيَاءِ ، فَهَذَا الْجُرْمَانُ هُوَ  
الَّذِي يُعْبَرُ بِالشَّقْوَةِ وَالشَّقَاوَةِ عِنْدَ حَضْرَةِ  
الْكَبْرِيَاءِ . وَالسَّعِيدُ الْأَتَمُّ هُوَ  
الَّذِي أَحَاطَ عَادَاتِ الْحَبِيبِ حَتَّى ضَاهَاةً  
فِي الْأَلْفَاظِ وَالْكَلِمَاتِ وَالْأَسَالِيبِ .  
وَالْأَشْقِيَاءُ لَا يَفْهَمُونَ هَذَا الْكَمَالَ  
كَأَنَّ كَمَّهُ الَّذِي لَا يَرَى الْأَلْوَانَ وَالْأَشْكَالَ ،

ہیبت الہی کی تجلیات کے کوئی حصہ نہیں ملتا کیونکہ اس کی فطرت رحمت کے نشانوں کو نہیں دیکھ سکتی اور جذبات اور محبت کی خوشبو کو نہیں سونگھ سکتی اور نہیں جانتی کہ صفائی قلب، درستی اور صلاحیت اور انس و انشراح کیا ہیں کیونکہ وہ تاریکیوں سے بھر پور ہے۔ پس اس پر برکات کے انوار کیسے نازل ہو سکتے ہیں بلکہ شقی کے دل میں تندہوا کی طرح تحریکات پیدا ہوتی ہیں اور اس کے جذبات اسے حق اور حقیقت کی رویت سے غافل رکھتے ہیں۔ پس وہ اہل سعادت کی طرح مامور کے پاس معرفت کے حصول کی خاطر نہیں آتا۔ (ترجمہ از مرتب)

وَلَا حَظَّ لِلشَّقِيِّ إِلَّا مِنْ تَجَلِّيَاتِ الْعَظْمَوَاتِ وَالْهَيْبَةِ، فَإِنَّ فِطْرَتَهُ لَا تَرَى آيَاتِ الرَّحْمَةِ، وَلَا تَشْمُرُ رِيحَ الْجَذَبَاتِ وَالْمَحَبَّةِ، وَلَا تَدْرِي مَا الْبُصَافَاةُ وَالصَّلَاحُ، وَالْأُنْسُ وَالْإِنْشِرَاحُ، فَإِنَّهَا مُتَبَلِّغَةٌ بِظُلُمَاتٍ، فَكَيْفَ تَنْزُلُ بِهَا أَنْوَارُ بَرَكَاتٍ؛ بَلْ نَفْسُ الشَّقِيِّ تَتَمَوَّجُ تَمَوَّجَ الرِّيحِ الْعَاصِفَةِ، وَتَشْغَلُهُ جَذَبَاتُهَا عَنِ رُؤْيَاةِ الْحَقِّ وَالْحَقِيقَةِ، فَلَا يَجِيئُ كَأَهْلِ السَّعَادَةِ رَاغِبًا فِي الْمَعْرِفَةِ۔

(سِرِّ الخِلافة، روحانی خزائن جلد ۸ صفحہ ۳۵۶)

ایمان کی حقیقت کچھ نہ کچھ مخفی رہنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے وَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ یہ دونوں اسی سے بنتے ہیں۔ سعید جلد بازی نہیں کرتے بلکہ حُسن ظن اور صبر سے کام لے کر ایمان لاتے ہیں اور جو شقی ہوتے ہیں وہ جلد بازی سے کام لے کر اعتراض کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

فِيهِمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ یعنی انسان بلحاظ اپنی استعدادوں کے دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ گروہ جس کو ایسے سامانوں کے جمع کرنے میں اور ایسے اعمال بجالانے کی توفیق ہوتی ہے جو فیوض و برکات الہی کے انوار کے جاذب ہوتے ہیں اور وہ سعید کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے اعمال بد اور خجستہ باطن ان کی ترقیوں کے آگے روک ہو کر ان کو اعمال صالحات اور خدائی فیوض و برکات سے دور و مہجور کر دیتے ہیں۔ اب بھی دیکھ لو کہ خوب زور سے تائیدات سماوی اور نشانات کی ایک بارش ہو رہی ہے اور ایک سیلاب کی طرح ترقی ہو رہی ہے مگر اس میں بھی وہی داخل ہو سکتے ہیں جن کی روحوں میں سعادت کا حصہ ہے۔ شقی اور بد بخت لوگ باوجود ہزار ہا نشانات کے دیکھنے کے ان میں بھی وسوسہ شیطانی کو داخل کر کے سعادت اور قبول حق سے محروم رہ جاتے ہیں اور خدا کا بھی یہ منشا ہے کہ بعض سعادت کی وجہ سے سعید اور بعض شقاوت کی وجہ

سے شقی ہو کر یہ اختلاف قیامت تک برابر قائم رہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

خُلْدَيْنَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۗ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ

لِّمَا يُرِيدُ ﴿۱۰﴾

اگر تو یہ کہے کہ ان ناقص انسانوں کا کیا حال ہوگا جو ناقص حالت میں مر گئے اور اس دنیا سے گناہوں کے بوجھ لے کر گزر گئے۔ کیونکہ وہ اب دوبارہ دنیا میں واپس نہیں بھیجے جائیں گے تا تدارک مافات کر سکیں۔ پس وہ کس طرح کامل ہو کر نجات پائیں گے۔ یا انہیں جنت میں غیر مکمل حالت میں ہی داخل کیا جائے گا یا انہیں ہمیشہ عذاب میں چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کے جواب میں سنو! ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جہنم ناقصوں کو کامل کرنے کا ذریعہ ہے اور غافلوں کو متنبہ کرتی ہے اور جو سوئے ہوئے ہیں ان کو جگاتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہنم کا نام ”اُمّ الداخلین“ رکھا ہے کیونکہ وہ ان کی اسی طرح تربیت کرے گی جس طرح مائیں بیٹوں کی کرتی ہیں۔ اور ہم یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ ایک عرصہ کے بعد وہ وقت بھی آئے گا جب ہر آنکھ خوب دیکھنے والی ہوگی ہر شقی زمانہ کی چند صدیوں کے بعد نیک بخت ہو جائے گا اور وہ لوگ جہنم میں چند صدیاں ہی ٹھہریں گے ہاں جتنا عرصہ خدا چاہے گا۔ مگر ہمیں اس زمانہ کی حد بندی کی تصریح کا علم نہیں دیا گیا۔ پس انسان کی کمزوری کے پیش نظر وہ زمانہ ابدی ہی کہلائے گا اور اگر اللہ تعالیٰ کے احسانوں پر نظر کی جائے تو وہ زمانہ محدود قرار پائے گا اور دوزخیوں کو سچ مچ ہمیشہ کے لئے اندھا نہیں چھوڑا جائے گا

وَإِنْ قُلْتُمْ: فَمَا بَالُ النَّاقِصِينَ الَّذِينَ مَاتُوا عَلَىٰ حَالَةِ النُّقْصَانِ، وَانْتَقَلُوا مِنْ هَذِهِ الدُّنْيَا مَعَ أَثْقَالِ الْعِصْيَانِ، فَأَيُّهُمْ مَا يُرَدُّونَ إِلَى الدُّنْيَا لِيَتَدَارَكُوا مَا فَاتَ، فَكَيْفَ يُكْمَلُونَ وَيَجِدُونَ النَّجَاةَ، أَوْ يَدْخُلُونَ فِي الْجَنَّةِ غَيْرَ مُكْمَلِينَ، أَوْ يُنَزَّلُونَ إِلَى الْأَجْدَادِ مُعَذِّبِينَ؟ فَاسْمَعِ. إِنَّا نَعْتَقِدُ بِأَنَّ جَهَنَّمَ مُكْمِلَةٌ لِلنَّاقِصِينَ، وَمُعْتَبَةٌ لِلْغَافِلِينَ، وَمَوْقِفَةٌ لِلنَّائِمِينَ. وَسَمَّاهَا اللَّهُ أُمَّ الدَّاخِلِينَ، بِمَا تَرْبِيهِمْ كَالْأُمَّهَاتِ لِلْبَنِينَ. وَنَعْتَقِدُ أَنَّ كُلَّ بَصِيرٍ يَكُونُ يَوْمَئِذٍ حَيِّدًا بَعْدَ بُرْهَةِ مِنَ الزَّمَانِ، وَيَكُونُ كُلُّ شَقِيٍّ سَعِيدًا بَعْدَ حُقْبٍ مِنَ الدَّوَرَانِ، وَلَا يَلْبَثُونَ إِلَّا أَحْقَابًا فِي الْيَزِيرَانِ، إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ مِنْ طَوْلِ الزَّمَانِ، فَإِنَّمَا مَا أُعْطِينَا عِلْمَهُ تَحْدِيدِيَةً بِتَصَرُّحِ الْبَيَانِ، فَهُوَ زَمَانٌ أَبَدِيٌّ نَسَبَةٌ إِلَى ضَعْفِ الْإِنْسَانِ، وَتَحْدُودٌ نَظَرًا عَلَى مَنَنِ الْمَنَانِ، وَلَا

اور ان کے معاملہ کا انجام خدا کے رحم اور ہدایت اور خدائے واحد کی معرفت پر ہوگا بعد اس کے کہ وہ اندھے لوگ تھے۔ اور ہم یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ عذاب جہنم کا دوام رب الارباب کی ذات کے دوام کی طرح نہیں ہے بلکہ ہر عذاب کے لئے ایک حد مقرر ہے اور ہر ایک لعنت کے بعد رحمت اور پناہ دینا ہے اور اللہ تعالیٰ یقیناً سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ بایں ہمہ وہ لوگ نجات کے درجات میں برابر نہیں ہوں گے بلکہ خدا تعالیٰ نے (جہنم سے نکلنے والے) بعض لوگوں کو بعض پر ثواب اور درجہ میں فضیلت دی ہے۔ اور اس کے اس فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مالک الملک ہے۔ اس نے اپنے بعض بندوں کو کمالات کے اعلیٰ مراتب بخشے ہیں اور بعض کو ان سے کم درجہ کے فضل عطا کئے ہیں تا وہ ثابت کرے کہ وہ مالک ہے جو چاہے کر سکتا ہے اس میں مخلوق کے حقوق میں سے کسی قسم کی حق تلفی نہیں جب کہ خدا تعالیٰ کا وجود ہر علت کی علت اور ہر حرکت و سکون کا مبداء ہے اور وہ ہر ایک جان پر قائم اور نگران ہے۔ تو یہ بات درست نہ ہوگی کہ اس جناب کی طرف ہمیشہ عذاب دینا منسوب کیا جائے حالانکہ بندہ ہر ایک لحاظ سے مختار بھی نہیں ہے بلکہ وہ اللہ خالق المخلوقات اور قیوم الکائنات کی قضا کے نیچے ہے۔ اور انسان کی ہر ایک قوت اللہ کے ہاتھ اور اس کے ارادہ سے پیدا ہوتی ہے اور اسے انسان کے شقی اور سعید ہونے میں بڑا دخل ہے۔ پس کس طرح ممکن ہے کہ وہ ضعیف انسان کو دائمی عذاب

يُتْرَكُونَ كَالْأَعْمَى إِلَى الْآبِدِ عَلَى وَجْهِ الْحَقِيقَةِ. وَيَكُونُ مَالٌ أَمْرِهِمْ رُحْمَ اللَّهِ وَالرُّشْدَ وَمَعْرِفَةَ الْخِصْرَةِ الْأَحَدِيَّةِ. بَعْدَ مَا كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ. وَنَعْتَقِدُ أَنَّ خُلُودَ الْعَذَابِ لَيْسَ كَخُلُودِ ذَاتِ اللَّهِ رَبِّ الْأَرْبَابِ. بَلْ لِكُلِّ عَذَابٍ انْتِهَاءٌ. وَيَعْدُ كُلُّ لَعْنٍ رُحْمٌ وَإِيسَاءٌ، وَإِنَّ اللَّهَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ. وَمَعَ ذَلِكَ لَيْسُوا سَوَاءً فِي مَدَارِجِ النَّجَاةِ. بَلِ اللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الدَّرَجَاتِ وَالْمُنُوبَاتِ. وَمَا يَرُدُّ عَلَى فِعْلِهِ شَيْءٌ مِنَ الْإِيْرَادَاتِ، إِنَّهُ مَالِكُ الْمَلِكِ فَأَعْطَى بَعْضَ عِبَادِهِ أَعْلَى الْمَرَاتِبِ فِي الْكَمَالَاتِ. وَبَعْضَهُمْ دُونَ ذَلِكَ مِنَ التَّفَضُّلَاتِ، لِيُثَبِتَ أَنَّهُ هُوَ الْمَالِكُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ، لَيْسَ فِيهِ إِتْلَافٌ حَقٌّ مِنْ حُقُوقِ الْمَخْلُوقِينَ. وَلَمَّا كَانَ وُجُودُ اللَّهِ تَعَالَى عِلَّةً لِكُلِّ عِلَّةٍ. وَمَبْدَأً لِكُلِّ سُكُونٍ وَحَرَكَةٍ. وَهُوَ قَائِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ، فَلَيْسَ مِنَ الصَّوَابِ أَنْ يُعْزَى إِخْلَادُ الْعَذَابِ إِلَى هَذَا الْجَنَابِ. وَمَا كَانَ الْعَبْدُ مُخْتَارًا مِنْ بِجْمِيعِ الْجِهَاتِ، بَلْ كَانَ تَحْتَ قَضَاءِ اللَّهِ خَالِقِ الْمَخْلُوقَاتِ وَقَيُّومِ الْكَائِنَاتِ، وَكَانَ كُلُّ قُوَّتِهِ مَفْظُورَةً مِنْ يَدِهِ وَمِنْ إِرَادَتِهِ. فَلَمَّا دَخَلَ

میں چھوڑ دے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ ہر شئی وسعید کا پیدا کرنے والا وہ خود ہے۔ بے شک انسان بہت کام کرتا ہے لیکن سب سے پہلا فاعل خود اللہ ہے اور انسان اس کے ہاتھ کی صنعت ہے وہ سارے جہانوں کا صانع ہے۔ وہ رحیم، سخی اور کریم ہے۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر فائق ہے اور اس کی نرمی اس کی سختی پر سبقت لے گئی ہے اور کوئی رحم کرنے والا اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ پس وہ انسان کو کلی طور پر فنا نہیں کرے گا بلکہ آخر کار اور مصیبت کے انتہا کو پہنچنے پر وہ ضرور رحم کرے گا۔ وہ دکھ دے کر تشدد لوگوں کی طرح پورے طور پر پاؤں تلے نہیں روندتا بلکہ آخری ایام میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ہاتھ کو لمبا کرے گا اور جہنمیوں کو مٹھی میں لے گا۔ پس تم اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور اس کی مٹھی کا تصور کرو۔ کیا اس کا ہاتھ عذاب پانے والوں میں سے کسی کو جہنم میں چھوڑے گا۔

(ترجمہ از مرتب)

عَظِيمٍ فِي شِقَاوَتِهِ وَسَعَادَتِهِ. فَكَيْفَ يَتْرُكُ عَبْدًا ضَعِيفًا فِي عَذَابِ الْخُلُودِ. مَعَ أَنَّهُ يَعْلَمُ أَنَّهُ خَالِقُ الشَّقِيِّ وَالْمَسْعُودِ. وَالْعَبْدُ يَفْعَلُ أَفْعَالًا وَلَكِنَّهُ أَوْلُ الْفَاعِلِينَ، وَكُلُّ عَبْدٍ صُنِعَ يَدِهِ وَهُوَ صَانِعُ الْعَالَمِينَ. وَإِنَّهُ رَحِيمٌ وَجَوَادٌ وَكَرِيمٌ، سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ، وَرَفَقَهُ بِشِصْبَتِهِ. وَلَا يُسَاوِيهِ أَحَدٌ مِنَ الرَّاحِمِينَ. فَلَا يُفْنِي كُلَّ الْإِفْتَاءِ، وَيَرِّحُ فِي آخِرِ الْأَمْرِ وَإِنْبَهَاءِ الْبَلَاءِ، وَلَا يَدُوسُ كُلَّ الدَّوْسِ بِالْإِيْدَاءِ كَالْمُتَشَدِّدِينَ. بَلْ يَبْسُطُ فِي آخِرِ الْأَيَّامِ يَدَهُ رَافِعَةً وَيَأْخُذُ حُرْمَةً مِنَ النَّارِيِّينَ. فَانظُرْ إِلَى يَدِ اللَّهِ وَحُرْمَتِهِ، هَلْ تُعَادِرُ أَحَدًا مِنَ الْمُعَذَّبِينَ؟

(انجام آہم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۱ حاشیہ)

دوزخی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے لیکن نہ وہ ہمیشگی جو خدا کو ہے بلکہ دُور دراز مدت کے لحاظ سے۔ پھر خدا کی رحمت دستگیر ہوگی کیونکہ وہ قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور اس آیت کی تصریح میں ہمارے سید و مولیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی ہے اور وہ یہ ہے: يَا نَبِيُّ عَلَى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيهَا أَحَدٌ وَنَسِيمُ الصَّبَا نُحْرُكُ أَبُو أَبَتَا۔ یعنی جہنم پر ایک وہ زمانہ آئے گا کہ اُس میں کوئی بھی نہ ہوگا۔ اور نسیم صبا اُس کے کواڑوں کو ہلائے گی۔ لیکن افسوس کہ یہ تو میں خدا تعالیٰ کو ایک ایسا چڑچڑا اور کینہ ور قرار دیتی ہیں کہ کبھی بھی اُس کا غصہ فرو نہیں ہوتا اور بیشمار رابوں تک جنوں میں ڈال کر پھر بھی گناہ معاف نہیں کرتا۔

(لیچر لاہور، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۷۰، ۱۷۱)

خدا تعالیٰ.... یہ تعلیم دیتا ہے کہ کفار ایک مدت دراز تک عذاب میں رہ کر آخر وہ خدا تعالیٰ کے رحم سے

حصہ لیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں بھی ہے: **يَأْتِي عَلَى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيهَا أَحَدٌ وَنَسِيْمُ الصَّبَا نُحْرِكُكَ أَبْوَابَهَا** یعنی جہنم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں کوئی بھی نہیں ہوگا اور نسیم صبا اس کے کواڑ ہلائے گی۔ اسی کے مطابق قرآن شریف میں یہ آیت ہے: **إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۗ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ** یعنی دوزخی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے لیکن جب خدا چاہے گا تو ان کو دوزخ سے مخلصی دے گا کیونکہ تیرا رب جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ یہ تعلیم خدا تعالیٰ کی صفات کاملہ کے مطابق ہے کیونکہ اس کی صفات جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی اور وہی زخمی کرتا ہے اور وہی پھر مرہم لگا تا ہے اور یہ بات نہایت نامعقول اور خدائے عزوجل کے صفات کاملہ کے برخلاف ہے کہ دوزخ میں ڈالنے کے بعد ہمیشہ اس کے صفات قہر یہ ہی جلوہ گر ہوتی رہیں اور کبھی صفت رحم اور عفو کی جوش نہ مارے۔ اور صفات کرم اور رحم کے ہمیشہ کے لئے معطل کی طرح رہیں بلکہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت دراز تک جس کو انسانی کمزوری کے مناسب حال استعارہ کے رنگ میں ابد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے دوزخی دوزخ میں رہیں گے۔ اور پھر صفت رحم اور کرم تجلی فرمائے گی اور خدا اپنا ہاتھ دوزخ میں ڈالے گا اور جس قدر خدا کی مٹھی میں آجائیں گے سب دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ پس اس حدیث میں بھی آخر کار سب کی نجات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ خدا کی مٹھی خدا کی طرح غیر محدود ہے جس سے کوئی بھی باہر نہیں رہ سکتا۔

یاد رہے کہ جس طرح ستارے ہمیشہ نوبت بہ نوبت طلوع کرتے رہتے ہیں اسی طرح خدا کے صفات بھی طلوع کرتے رہتے ہیں۔ کبھی انسان خدا کے صفات جلالیہ اور استغناء ذاتی کے پرتوہ کے نیچے ہوتا ہے اور کبھی صفات جمالیہ کا پرتوہ اس پر پڑتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **يَوْمَ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن: ۳۰)**۔ پس یہ سخت نادانی کا خیال ہے کہ ایسا گمان کیا جائے کہ بعد اس کے کہ مجرم لوگ دوزخ میں ڈالے جائیں گے پھر صفات کرم اور رحم ہمیشہ کے لئے معطل ہو جائیں گی اور کبھی ان کی تجلی نہیں ہوگی۔ کیونکہ صفات الہیہ کا تعطل ممنوع ہے بلکہ حقیقی صفت خدا تعالیٰ کی محبت اور رحم ہے اور وہی اُمّ الصفات ہے اور وہی کبھی انسانی اصلاح کے لئے صفات جلالیہ اور غضبہ کے رنگ میں جوش مارتی ہے اور جب اصلاح ہو جاتی ہے تو محبت اپنے رنگ میں ظاہر ہو جاتی ہے اور پھر بطور موبہت ہمیشہ کے لئے رہتی ہے۔ خدا ایک چڑچڑے انسان کی طرح نہیں ہے جو خواہ نخواستہ عذاب دینے کا شائق ہو اور وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ اپنے پر آپ ظلم کرتے ہیں۔ اس کی محبت میں تمام نجات اور اس کو

چھوڑنے میں تمام عذاب ہے۔ (چشمہ مسیحی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۶۸ تا ۳۷۰)

یہ بات فی نفسہ غیر معقول ہے کہ انسان کو ایسی ابدی سزا دی جائے کہ جیسا خدا ہمیشہ کے لئے ہے ایسا ہی خدا کی ابدیت کے موافق ہمیشہ دوزخ میں رہیں۔ آخر ان کے قصوروں میں خدا کا بھی دخل ہے کیونکہ اسی نے ایسی قوتیں پیدا کیں جو کمزور تھیں۔ پس دوزخیوں کا حق ہے جو اس کمزوری سے فائدہ اٹھائیں جو ان کی فطرت کو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ (چشمہ مسیحی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۶۸، ۳۶۹ حاشیہ)

گناہ کی سزا ہوگی اور عذاب ہوگا مگر یہ ابدیت وہ نہیں جس طرح خدائی ابدیت ہے۔ ایک خاص وقت تک جہنم میں رکھ کر اصلاح ہو جانے پر رہائی ہو جاوے گی۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر خدا کے کلام سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں بہشت کا ذکر ہے وہاں عَطَاءٌ عَزِيزٌ مَّجْدُوذٍ کا لفظ ہے اور جہاں جہنم کا ذکر ہے وہاں یہ فرمایا کہ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۗ اِنَّ رَبَّكَ فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ ان آیات میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بہشتیوں کو خوف نہیں دلایا گیا مگر دوزخیوں کو مخلصی کی امید ضرور دلائی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر بہشت کے متعلق عَطَاءٌ عَزِيزٌ مَّجْدُوذٍ کا لفظ نہ ہوتا تو بہشت والوں کو بھی کھٹکا ہی رہتا مگر خدا نے عَطَاءٌ عَزِيزٌ مَّجْدُوذٍ کا لفظ بڑھا کر وہ کھٹکا ہی مٹا دیا کہ یہ خدا کی عطا ہے وہ واپس نہیں لی جاتی اور اس کی نسبت ہم نے ایک اور حدیث بھی دیکھی ہے جس میں لکھا کہ يَا نَبِيَّ عَلَىٰ جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَّيْسَ فِيهَا اَحَدٌ وَّ نَسِيْمُهُ الصَّبَا مُنْحَرِكٌ اَبْوَابُهَا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۵ مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

ہمارا یہ مذہب ہرگز نہیں ہے کہ گنہگاروں کو ایسی سزا ابدی ملے گی کہ اس سے پھر کبھی نجات ہی نہ ہوگی بلکہ ہمارا یہ مذہب ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم گنہگاروں کو بچالے گا اور اسی لئے قرآن شریف میں جہاں عذاب کا ذکر کیا ہے وہاں فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ فرمایا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲) میں بڑے زور سے اور پورے یقین اور بصیرت سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ دوسرے مذاہب کو مٹادے اور اسلام کو غلبہ اور قوت دے۔ اب کوئی ہاتھ اور طاقت نہیں جو خدا تعالیٰ کے اس ارادہ کا مقابلہ کرے۔ وہ فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۱ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ لیکن اگر تیرا رب چاہے کیونکہ جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کے کرنے پر وہ

قادر ہے لیکن بہشتیوں کے لئے ایسا نہیں فرمایا کیونکہ وہ وعدہ ہے وعید نہیں ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۹۶)

قرآن شریف میں کفار اور مشرکین کی سزا کے لئے بار بار ابدی جہنم کا ذکر ہے اور بار بار فرمایا ہے:

خُلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا (النساء: ۵۸) اور پھر باوجود اس کے قرآن شریف میں دوزخیوں کے حق میں: إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ بھی موجود ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ یَأْتِي عَلَى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَّيْسَ فِيهَا أَحَدٌ وَ نَسِيمُ الصَّبَا نُحْرِكُ أَبْوَابَهَا یعنی جہنم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں کوئی بھی نہ ہوگا و نسیم صبا اس کے کواڑوں کو ہلائے گی اور بعض کتب میں زبان پارسی میں یہ حدیث لکھی ہے: ایں مشت خاک را گر نہ بخشم چه کنم۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۹۶ حاشیہ)

قرآن شریف نے بہشت کے انعامات کا تذکرہ کر کے عَطَاءٌ غَيْرٌ مَجْدُودٍ کہہ دیا ہے اور ہونا بھی ایسے

ہی چاہیے تھا کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو امید نہ رہتی اور مایوسی پیدا ہوتی۔ بہشت کے انعامات کی بے انتہا درازی کو دیکھ کر مسرت بڑھتی ہے اور دوزخ کے ایک متعین عرصہ تک ہونے سے خدا تعالیٰ کے فضل پر امید پیدا ہوتی ہے۔ ایک شاعر نے اس کو یوں بیان کیا ہے۔

گویند کہ بخش جتجو خواہد بود

وال یار عزیز تندخو خواہد بود

از خیر محض شرے نیاید ہرگز

خوش باش کہ انجام بخیر خواہد بود

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا وَفِي الْجَنَّةِ خُلْدِيْنَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالأَرْضُ ۙ إِلَّا

مَا شَاءَ رَبُّكَ ۗ عَطَاءٌ غَيْرٌ مَجْدُودٍ ﴿۱۹﴾

سعید لوگ مرنے کے بعد بہشت میں داخل کئے جاتے ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ آسمان وزمین ہے اور اگر یہ آسمان اور زمین بدلانے بھی جائیں جیسا کہ قیامت کے آنے کے وقت ہوگا تب بھی سعید لوگ بہشت سے باہر نہیں ہو سکتے اور نہ ان چیزوں کے فساد سے بہشت میں کچھ فساد ہو سکتا ہے

کیونکہ بہشت ان کے لئے ایک ایسی عطا ہے جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے محروم نہیں رہ سکتے۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۸۰، ۲۸۱)

عَطَاءٌ غَيْرٌ مَّجْذُوزٍ... وہ بخشش جس کا کبھی انقطاع نہیں۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۱۰ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

یہ وہ عطا ہے جو واپس نہیں لی جائے گی۔

بہشت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عَطَاءٌ غَيْرٌ مَّجْذُوزٍ یہ ایک ایسی نعمت ہے جس کا انقطاع نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہشت کے درمیان بھی مومنوں کا کھٹکا رہتا کہ کہیں نکالے نہ جاویں لیکن برخلاف اس کے دوزخ کے متعلق ایسا نہیں بلکہ حدیث سے ثابت ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ سب دوزخ سے نکل چکے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ آخر انسان خدا کی مخلوق ہے۔ خدا تعالیٰ اس کی کمزوریوں کو دور کر دے گا اور اس کو رفتہ رفتہ دوزخ کے عذاب سے نجات بخشنے گا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

فَأَسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهَا بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرَةٌ ﴿۱۱﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو صرف اس ایک حکم نے کہ فَأَسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ نے ہی بوڑھا کر دیا۔ کس قدر احساس موت ہے، آپ کی یہ حالت کیوں ہوئی صرف اس لئے کہ تاہم اس سے سبق لیں ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور مقدس زندگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہادی کامل اور پھر قیامت تک کے لئے اور اس پر کل دنیا کے لئے مقرر فرمایا مگر آپ کی زندگی کے کل واقعات ایک عملی تعلیمات کا مجموعہ ہیں جس طرح پر قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی قوی کتاب ہے اور قانون قدرت اس کی فعلی کتاب ہے اسی طرح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی ایک فعلی کتاب ہے جو گویا قرآن کریم کی شرح اور تفسیر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَأَسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ یعنی سیدھا ہو جا۔ کسی قسم کی بد اعمالی کی کچی نہ رہے۔ پھر راضی ہوں گا۔ آپ بھی سیدھا ہو جا اور دوسروں کو بھی کر۔ عرب کے لئے سیدھا کرنا کس قدر مشکل تھا۔

(الحکم جلد ۵ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے پوچھنے پر فرمایا کہ مجھے سورۃ ہود نے بوڑھا کر دیا کیونکہ اس حکم

کے رو سے بڑی بھاری ذمہ داری میرے سپرد ہوئی ہے۔ اپنے آپ کو سیدھا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری فرماں برداری جہاں تک انسان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتی ہے ممکن ہے کہ وہ اس کو پورا کرے۔ لیکن دوسروں کو ویسا ہی بنانا آسان نہیں ہے اس سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند شان اور قوت قدسی کا پتہ لگتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس حکم کی کیسی تعمیل کی صحابہ کرام کی وہ پاک جماعت تیار کی کہ ان کو کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلْعَالَمِينَ (ال عمران: ۱۱۱) کہا گیا اور رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (البائدة: ۱۲۰) کی آواز ان کو آگئی۔ آپ کی زندگی میں کوئی بھی منافق مدینہ طیبہ میں نہ رہا۔ غرض ایسی کامیابی آپ کو ہوئی کہ اس کی نظیر کسی دوسرے نبی کے واقعات زندگی میں نہیں ملتی۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی غرض یہ تھی کہ قیل وقال ہی تک بات نہ رکھنی چاہیے کیونکہ اگر نرے قیل وقال اور ریاکاری تک ہی بات ہو تو دوسرے لوگوں اور ہم میں پھر امتیاز کیا ہوگا اور دوسروں پر کیا شرف؟

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

استقامت کے حصول کے لئے اولاً ابتدائی مدارج اور مراتب پر کسی قدر تکالیف اور مشکلات بھی پیش آتی ہیں لیکن اس کے حاصل ہو جانے پر ایک دائمی راحت اور خوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ ارشاد ہوا: فَاسْتَقِمْ كَمَا اُصِرْتَ تَوَلَّكَهَا بِهٖ كَمَا اُصِرْتَ تَوَلَّكَهَا بِهٖ كَمَا اُصِرْتَ تَوَلَّكَهَا بِهٖ لَگے تو آپ نے فرمایا مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا۔ غرض یہ ہے کہ جب تک انسان موتِ احساس نہ کرے وہ نیکیوں کی طرف جھک نہیں سکتا۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَ زُلْفَا مِّنَ اللَّيْلِ ۙ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذٰهِبْنَ السَّيِّئٰتِ ۗ

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلَّذِيْنَ كَرِهْنَ ۝۱۵

نجات کا مفت ملنا اور اعمال کو غیر ضروری ٹھہرانا جو عیسائیوں کا خیال ہے یہ ان کی سراسر غلطی ہے۔ ان کے فرضی خدا نے بھی چالیس روزے رکھے تھے اور موسیٰ نے کوہ سینا پر روزے رکھے۔ پس اگر اعمال کچھ چیز نہیں ہیں تو یہ دونوں بزرگ اس بے ہودہ کام میں کیوں پڑے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بدی سے سخت بیزار ہے تو ہمیں اس سے سمجھ آتا ہے کہ وہ نیکی کرنے سے نہایت درجہ خوش ہوتا ہے پس اس صورت میں نیکی بدی کا کفارہ ٹھہرتی ہے۔ اور جب ایک انسان بدی کرنے کے بعد ایسی نیکی بجالایا جس سے خدا تعالیٰ خوش ہوا تو ضرور ہے کہ پہلی بات موقوف ہو کر دوسری بات قائم ہو جائے ورنہ خلاف عدل ہوگا۔ اسی

کے مطابق اللہ جل شانہ قرآن شریف میں فرماتا ہے: إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ یعنی نیکیاں بدیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بدی میں ایک زہریلی خاصیت ہے کہ وہ ہلاکت تک پہنچاتی ہے۔ اسی طرح ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ نیکی میں ایک تریاقتی خاصیت ہے کہ وہ موت سے بچاتی ہے۔ مثلاً گھر کے تمام دروازوں کو بند کر دینا یہ ایک بدی ہے جس کی لازمی تاثیر یہ ہے کہ اندھیرا ہو جائے۔ پھر اس کے مقابل پر یہ ہے کہ گھر کا دروازہ جو آفتاب کی طرف ہے کھولا جائے اور یہ ایک نیکی ہے جس کی لازمی خاصیت یہ ہے کہ گھر کے اندر گرم شدہ روشنی واپس آجائے یا ہم بہ تبدیل الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ عذاب ایک سلبی چیز ہے کیونکہ راحت کی نفی کا نام عذاب ہے اور نجات ایک ایجابی چیز ہے یعنی راحت اور خوشحالی کے دوبارہ حاصل ہو جانے کا نام نجات ہے۔ پس جیسا کہ ظلمت عدم وجود روشنی کا نام ہے ایسا ہی عذاب عدم وجود خوشحالی کا نام ہے۔

(کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۸۰، ۸۱)

نماز کے متعلق جس زائد ہدایت کا وعدہ ہے وہ یہی ہے کہ اس قدر طبعی جوش اور ذاتی محبت اور خشوع اور کامل حضور میسر آجائے کہ انسان کی آنکھ اپنے محبوب حقیقی کے دیکھنے کے لئے کھل جائے اور ایک خارق عادت کیفیت مشاہدہ جمال باری کی میسر آجائے جو لذات روحانیہ سے سراسر معمور ہو اور دنیوی رذائل اور انواع و اقسام کے معاصی قولی اور فعلی اور بصری اور سماعی سے دل کو متنفر کر دے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۳۹)

میں دیکھتا ہوں کہ ایک شرابی اور نشہ باز انسان کو جب سرور نہیں آتا تو وہ پے در پے پیالے پیتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کو ایک قسم کا نشہ آ جاتا ہے۔ دانشمند اور بزرگ انسان اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور وہ یہ کہ نماز پر دوام کرے اور پڑھتا جاوے یہاں تک کہ اس کو سرور آ جاوے اور جیسے شرابی کے ذہن میں ایک لذت ہوتی ہے جس کا حاصل کرنا اس کا مقصود بالذات ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ذہن میں اور ساری طاقتوں کا رجحان نماز میں اسے سرور کا حاصل کرنا ہو اور پھر ایک خلوص اور جوش کے ساتھ کم از کم اس نشہ باز کے اضطراب اور قلق و کرب کی مانند ہی ایک دعا پیدا ہو کہ وہ لذت حاصل ہو تو میں کہتا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ یقیناً یقیناً وہ لذت حاصل ہو جاوے گی۔ پھر نماز پڑھتے وقت ان مفاد کا حاصل کرنا بھی ملحوظ ہو جو اس سے ہوتے ہیں اور احسان پیش نظر ہے۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲/۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۵)

نیکیاں بدیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ پس ان حسنات کو اور لذات کو دل میں رکھ کر دعا کرے کہ وہ نماز جو صدیقوں اور محسنوں کی ہے وہ نصیب کرے۔ یہ جو فرمایا ہے کہ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ یعنی نیکیاں یا نماز بدیوں کو دور کرتی ہے یا دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ نماز فواحش اور برائیوں سے بچاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ باوجود نماز پڑھنے کے پھر بدیاں کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں مگر نہ روح اور راستی کے ساتھ۔ وہ صرف رسم اور عادت کے طور پر ٹکریں مارتے ہیں ان کی روح مردہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام حسنات نہیں رکھا اور یہاں جو حسنات کا لفظ رکھا اور الصلوٰۃ کا لفظ نہیں رکھا باوجودیکہ معنی وہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تا نماز کی خوبی اور حسن و جمال کی طرف اشارہ کرے کہ وہ نماز بدیوں کو دور کرتی ہے جو اپنے اندر ایک سچائی کی روح رکھتی ہے اور فیض کی تاثیر اس میں موجود ہے۔ وہ نماز یقیناً یقیناً برائیوں کو دور کر دیتی ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۵)

روحانی نظام میں مرکز اصلی کی طرف بازگشت کرنا ہی راحت کا موجب ہو سکتا ہے اور اس دکھ درد سے بچاتا ہے جو اس مرکز کو چھوڑنے سے پیدا ہوا تھا اسی کا نام توبہ ہے اور یہی ظلمت جو اس طرح پر پیدا ہوتی ہے ضلالت اور جہنم کہلاتی ہے اور مرکز اصلی کی طرف رجوع کرنا جو راحت پیدا کرتا ہے جنت سے تعبیر ہوتا ہے اور گناہ سے ہٹ کر پھر نیکی کی طرف آنا جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو جاوے اس بدی کا کفارہ ہو کر اسے دور کر دیتا ہے اور اس کے نتائج کو بھی سبک کر دیتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ یعنی نیکیاں بدیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ چونکہ بدی میں ہلاکت کی زہر ہے اور نیکی میں زندگی کا تریاق۔ اسی لئے بدی کے زہر کو دور کرنے کا ذریعہ نیکی ہی ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۴، ۵)

نماز کل بدیوں کو دور کر دیتی ہے حسنات سے مراد نماز ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲)

نیکیاں بدیوں کو دور کرتی ہیں یہاں حسنات کے معنی نماز کے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰ تا ۱۷ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

وَأَصْدِرُ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۱﴾

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۳ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸۶)

اللہ تعالیٰ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۶۱، ۱۶۲)

إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ ۖ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَ تَنَتَّ كَلِمَةً رَبِّكَ لَا مَلَكْنَ جَهَنَّمَ  
مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ أَجْعَبِينَ ۝

یہ تو غیر ممکن ہے کہ تمام لوگ مان لیں کیونکہ بموجب آیت وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ اور بموجب آیت کریمہ  
وَ جَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (ال عمران ۵۶) سب کا ایمان لانا خلاف  
نص صریح ہے۔ پس اس جگہ سعید لوگ مراد ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۷۴ حاشیہ)

وَ لِلَّهِ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ إِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهَا فاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۗ  
وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

إِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهَا خدا تعالیٰ کی طرف ہی ہر ایک امر رجوع کرتا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس  
سے انسان کی مجبوری لازم آتی ہے غلط فہمی ہے۔ یوں تو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ بھی فرمایا ہے کہ میں  
میںہ برساتا ہوں اور برق و صاعقہ کو پیدا کرتا ہوں اور کھیتیاں اگاتا ہوں مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسباب  
طبعیہ میںہ برسنے اور عدد و برق کے پیدا ہونے کے جو ہیں اس سے اللہ تعالیٰ انکار کرتا ہے۔ بالکل فضول  
ہے۔ کیونکہ یہ مراتب بجائے خود بیان فرمائے گئے ہیں کہ یہ تمام چیزیں اسباب طبعیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔  
پس اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ایسے بیانات سے کہ میرے حکم سے بارشیں ہوتی ہیں اور میرے حکم  
سے کھیتیاں اُگتی ہیں اور برق و صاعقہ پیدا ہوتا ہے اور پھل لگتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور ہر ایک بات میرے  
ہی قبضہ اقتدار میں اور میرے ہی امر سے ہوتی ہے۔ یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ سلسلہ کائنات کا مجبور مطلق  
ہے بلکہ اپنی عظمت اور اپنا علت العلل ہونا اور اپنا مسبب الاسباب ہونا مقصود ہے کیونکہ تعلیم قرآنی کا  
اصل موضوع توحید خالص کو دنیا میں پھیلانا اور ہر ایک قسم کے شرک کو جو پھیل رہا تھا مٹانا ہے۔ اور چونکہ  
قرآن شریف کے نازل ہونے کے وقت عرب کے جزیرہ میں ایسے ایسے مشرکانہ عقائد پھیل رہے تھے کہ بعض  
بارشوں کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے تھے اور بعض دہریوں کی طرح تمام چیزوں کا ہونا اسباب طبعیہ تک

محدود رکھتے تھے۔ اور بعض دو خدا سمجھ کر اپنے ناملائم قضا و قدر کو اھرمن کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اس لئے یہ خدا تعالیٰ کی کتاب کا فرض تھا جس کے لئے وہ نازل ہوئی کہ اُن خیالات کو مٹادے اور ظاہر کرے کہ اصل علت العلل اور مسبب الاسباب وہی ہے اور بعض ایسے بھی تھے جو مادہ اور رُوح کو قدیم سمجھ کر خدا تعالیٰ کا علت العلل ہونا بطور ضعیف اور ناقص کے خیال کرتے تھے۔ پس یہ الفاظ قرآن کریم کے کہ میرے ہی امر سے سب کچھ پیدا ہوتا ہے۔ توحید محض کے قائم کرنے کے لئے تھے۔ ایسی آیات سے انسان کی مجبوری کا نتیجہ نکالنا تفسیر القول بما لا یرضی بہ قائلہ ہے۔

(جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۴۰، ۲۴۱)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

## تفسیر سورۃ یوسف

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ قَالَ الَّذِیْ اشْتَرٰهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهِ اَكْرِمِیْ مَثْوٰهُ عَسٰی اَنْ یَنْفَعَنَا اَوْ  
نَتَّخِذْهُ وَكِدَّا ۗ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لَیُوسُفَ فِی الْاَرْضِ ۗ وَ لِنُعَلِّمَهُۥ مِنْ تَاْوِیْلِ  
الْاَحَادِیْثِ ۗ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ ۗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ ۗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ اور خدا اپنے امر پر غالب ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

خدا اپنے ارادہ پر غالب ہے مگر اکثر لوگ خدا کے قہر اور جبروت سے بے خبر ہیں۔۔۔۔۔ زمین پر خدا مسلوب السلطنت لوگوں کی طرح بریکار نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت اور مجازات زمین پر جاری ہے اور وہ اپنے عابدوں کو مدد دینے کی طاقت رکھتا ہے اور مجرموں کو اپنے غضب سے ہلاک کر سکتا ہے۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۳۸)

خدا تعالیٰ۔۔۔۔۔ کسی کے منشا کے ماتحت نہیں ہے بلکہ وہ خدا ہے اور غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

ہمارا آخری حصہ عمر کا ہے اور ہمیشہ تجربہ ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ ہی غالب ہوتا ہے۔ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ وَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

## تفسیر سورۃ یوسف

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ قَالَ الَّذِیْ اشْتَرٰهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهِ اَكْرِمِیْ مَثْوٰهُ عَسٰی اَنْ یَنْفَعَنَا اَوْ  
نَتَّخِذْهُ وَكِدًّا ۗ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لَیُوسُفَ فِی الْاَرْضِ ۗ وَ لِنُعَلِّمَهُۥ مِنْ تَاْوِیْلِ  
الْاَحَادِیْثِ ۗ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ ۗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ ۗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ اور خدا اپنے امر پر غالب ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

خدا اپنے ارادہ پر غالب ہے مگر اکثر لوگ خدا کے قہر اور جبروت سے بے خبر ہیں۔۔۔۔ زمین پر خدا مسلوب السلطنت لوگوں کی طرح بریکار نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت اور مجازات زمین پر جاری ہے اور وہ اپنے عابدوں کو مدد دینے کی طاقت رکھتا ہے اور مجرموں کو اپنے غضب سے ہلاک کر سکتا ہے۔

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۳۸)

خدا تعالیٰ۔۔۔۔ کسی کے منشا کے ماتحت نہیں ہے بلکہ وہ خدا ہے اور غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

ہمارا آخری حصہ عمر کا ہے اور ہمیشہ تجربہ ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ ہی غالب ہوتا ہے۔ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ وَ

لَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

(البدردجلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹، مورخہ ۱۶ تا ۱۷ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۗ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۳﴾

اَشُدُّ سے مراد.... نبوت نہیں ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ جب ہوش میں آیا۔ اَشُدُّ بھی دو قسم کی ہوتی ہے ایک وحی کی اَشُدُّ اور دوسری جسمانی اَشُدُّ۔

(البدردجلد ۲ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲)

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۗ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ ۗ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۴﴾

فطرۃ انسان کو شہواتِ نفسانیہ کا تعلق بہ نسبت مال کے تعلق کے بہت پیارا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مال کو جو اس کے نزدیک مدارِ آسائش ہے بڑی خوشی سے شہواتِ نفسانیہ کی راہ میں فدا کر دیتا ہے اور اس حالت کے خوفناک جوش کی شہادت میں یہ آیت کافی ہے: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ یعنی یہ ایسا منہ زور جوش ہے جو اس کافر و ہونا کسی بُرہانِ قوی کا محتاج ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۷۷-۷۸)

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ..... ہم نے یوسف پر احسان کیا تاہم اس سے بدی اور فحش کو

روک دیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۶۱، ۶۶۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

قَالَ هِيَ رَاوَدْتَنِي عَنْ نَفْسِي ۖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اٰهْلِهَا ۗ اِنْ كَانَ قَبِيْضُهُ قَدْ

مِّنْ قَبْلِ فِصْدَقْتُمْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۵﴾

یاد رہے کہ جب یوسف بن یعقوب پر زلیخا نے بے جا الزام لگایا تھا تو اس موقع پر خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے: وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اٰهْلِهَا یعنی زلیخا کے قریبیوں میں سے ایک شخص نے یوسف کی بریت کی گواہی دی۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۹۸)

فَلَمَّا رَأَىٰ قَبِيصَهُ قَدْ مِّنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِن كَيْدِكُنَّ ۗ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ﴿١٦﴾

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ یعنی اے عورتو! تمہارے فریب بہت بڑے ہیں۔

(تزیاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۲۹۶)

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكًا وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا ۖ وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۗ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا بَشَرًا ۗ إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿١٧﴾

محبت اور شہود عظمت تامہ کی کمالت اسی حالت میں ثابت ہوگی کہ جب عاشق دلدادہ محض استیلاء عشق کی وجہ سے نہ کسی اور وجہ سے اپنے معدوم<sup>۱</sup> کے ماسوا کو معدوم سمجھے اور اپنے معشوق کے غیر کو کالعدم خیال کرے۔ گو عقل (و) شرع اس کو سمجھاتی ہوں کہ وہ چیزیں حقیقت میں معدوم نہیں ہیں جیسے ظاہر ہے کہ جب دن چڑھتا ہے اور لوگوں کی آنکھوں پر نور آفتاب کا استیلاء کرتا ہے تو باوجود اس کے کہ لوگ جانتے ہیں کہ ستارے اس وقت معدوم نہیں مگر پھر بھی بوجہ استیلاء اس نور کے کہ ستاروں کو دیکھ نہیں سکتے ایسا ہی استیلاء محبت اور عظمت اللہ کا محب صادق کی نظر میں ایسا ظاہر کرتا ہے کہ گویا تمام عالم بجز اس کے محبوب کے معدوم ہے اور اگرچہ عشق حقیقی میں یہ تمام انور کامل اور اتم طور پر ظاہر ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی عشق مجازی کا مبتلا بھی اس غایت درجہ عشق پر پہنچ جاتا ہے کہ اپنے معشوق کے غیر کو یہاں تک کہ خود اپنے نفس کو کالعدم سمجھنے لگتا ہے چنانچہ منقول ہے کہ مجنوں جس کا نام قیس ہے اپنے عشق کی آخری حالت میں ایسا دیوانہ ہو گیا کہ یہ کہنے لگا کہ میں آپ ہی لیلیٰ ہوں۔ سو یہ بات تو نہیں کہ فی الحقیقت وہ لیلیٰ ہی ہو گیا تھا بلکہ اس کا یہ باعث تھا کہ چونکہ وہ مدت تک تصور لیلیٰ میں غرق رہا اس لئے آہستہ آہستہ اس میں خود فراموشی کا اثر ہونے لگا۔ ہوتے ہوتے اس کا استغراق بہت ہی کمال کو پہنچ گیا اور محویت کی اس حد تک جا پہنچا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جنون عشق سے انا الیٰلیٰ کا دعویٰ کرنے لگا اور یہ خیال دل میں بندھ گیا کہ فی الحقیقت میں ہی لیلیٰ ہوں۔ غرض غیر معدوم سمجھنا لوازم کمال عشق میں سے ہے اور اگر غیر فی الحقیقت معدوم ہی ہے تو پھر وہ ایسا امر نہیں ہے کہ جس کو استیلاء محبت اور جنون عشق سے کچھ بھی تعلق ہو اور غلبہ عشق کی حالت میں محویت کے آثار پیدا ہو جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو انسان مشکل سے سمجھ سکے۔ شیخ مصلح الدین شیرازی نے خوب کہا ہے:

۱۔ نقل برطابق اصل۔ اگلی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں معدوم کا لفظ ہو کتا بت ہے۔ صحیح لفظ ”محبوب“ ہے۔ ناشر

نہ از چہنم حکایت کن نہ از روم کہ دارم دلستانے اندریں بوم  
چو روئے خوب او آید بیامم فراموشم شود موجود و معدوم  
اور پھر ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

با تو مشغول و با تو ہم اہم و از تو بخشایش تو میخواہم  
تا مرا از تو آگہی دادند بوجودت گر از کود آگاہم  
اور خود وہ محویت کا ہی اثر تھا جس سے زلیخا کی سہیلیوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔

(مکتوبات احمد جلد اول صفحہ ۵۹۳، ۵۹۴)

قَالَ رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۗ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ  
أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۳۷﴾

رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ یعنی اے میرے رب مجھے تو قید بہتر ہے ان باتوں سے کہ یہ عورتیں مجھ سے خواہش کرتی ہیں۔ خلاصہ مطلب یہ کہ اگر کوئی عورت ایسی خواہش کرے تو میں اپنے نفس کے لئے اس امر سے قید ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ یہ یوسف بن یعقوب علیہا السلام کی دعائی جس دعا کی وجہ سے وہ قید ہو گئے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۹۸، ۹۹)

نظارے سے مسائل بہت جلد حل ہو جاتے ہیں اگر گزشتہ زمانہ میں اس کی نظیر دیکھی جاوے تو پھر یوسف کا صدق ہے ایسا صدق دکھایا کہ یوسف صدیق کہلایا۔ ایک خوبصورت معزز اور جوان عورت جو بڑے بڑے دعوے کرتی ہے۔ عین تنہائی اور تخلیہ میں ارتکابِ فعل بد چاہتی ہے لیکن آفرین ہے اس صدیق پر کہ خدا تعالیٰ کے حدود کو توڑنا پسند نہ کیا اور اس کے بالمقابل ہر قسم کی آفت اور دکھ اٹھانے کو آمادہ ہو گیا یہاں تک کہ قیدی کی زندگی بسر کرنی منظور کر لی۔ چنانچہ کہا: رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ یعنی یوسف علیہ السلام نے دعا کی کہ اے رب مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف وہ مجھے بلاتی ہیں۔ اس سے حضرت یوسف کی پاک فطرت اور غیرت نبوت کا کیسا پتہ لگتا ہے کہ دوسرے امر کا ذکر تک نہیں کیا۔ کیا مطلب کہ اس کا نام نہیں لیا۔ یوسف اللہ تعالیٰ کے حسن و احسان کے گرویدہ اور عاشق زار تھے۔ ان کی نظر میں اپنے محبوب کے سوا دوسری کوئی بات بچ سکتی نہ تھی۔ وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے کہ حدود اللہ کو توڑیں۔

کہتے ہیں کہ ایک لمبا زمانہ جو بارہ برس کے قریب بتایا جاتا ہے وہ جیل میں رہے لیکن اس عرصہ میں کبھی حرف شکایت زبان پر نہ آیا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر پورے راضی رہے۔ اس عرصہ میں بادشاہ کو کوئی عرضی بھی نہیں دی کہ ان کے معاملہ کو سوچا جاوے یا انہیں رہائی دی جاوے بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس اہل غرض عورت نے تکالیف کا سلسلہ بڑھا دیا کہ کسی طرح پر وہ پھسل جاویں مگر اس صدیق نے اپنا صدق نہ چھوڑا۔ خدا نے ان کو صدیق ٹھہرایا یہ بھی صدیق کا ایک مقام ہے کہ دنیا کی کوئی آفت، کوئی تکلیف اور ذلت اسے حدود اللہ کے توڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی جس قدر اذیتیں اور بلائیں بڑھتی جاویں وہ اس کے مقام صدق کو زیادہ مضبوط اور لذبذباتی جاتی ہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۷۷ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سَبَانَ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعُ عِجَافٍ وَ  
سَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضِرٍ وَأَخْرَجْنَاهُ لِنُعَلِّمَهُ أَتِّجِعَ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۵۷﴾

مصر کے بادشاہ فرعون نے حضرت یوسف علیہ السلام کو صدیق کا خطاب دیا کیونکہ بادشاہ نے جب دیکھا کہ اس شخص نے صدق اور پاک باطنی اور پرہیزگاری کے محفوظ رکھنے کے لئے بارہ برس کا جیل خانہ اپنے لئے منظور کیا مگر بدکاری کی درخواست کو نہ مانا بلکہ ایک لحظہ کے لئے بھی دل پلید نہ ہوا تب بادشاہ نے اس راست باز کو صدیق کا خطاب دیا جیسا کہ قرآن شریف سورۃ یوسف میں ہے یُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی خطابوں میں سے پہلا خطاب وہی تھا جو حضرت یوسف کو ملا۔

(تزیان القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۵۰۳ حاشیہ)

وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۗ إِنَّ رَبِّي  
غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۵۷﴾

نفسِ امارہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو بدی کی طرف جو اس کے کمال کے مخالف اور اس کی اخلاقی حالتوں کے برعکس ہے جھکاتا ہے اور ناپسندیدہ اور بدراہوں پر چلانا چاہتا ہے۔ غرض بے اعتدالیوں اور بدیوں کی طرف جانا انسان کی ایک حالت ہے جو اخلاقی حالت سے پہلے اس پر طبعاً غالب ہوتی ہے اور یہ حالت اس وقت تک طبعی حالت کہلاتی ہے جب تک کہ انسان عقل اور معرفت کے زیر سایہ نہیں چلتا بلکہ

چار پایوں کی طرح کھانے پینے سونے جاگنے یا غصہ اور جوش دکھلانے وغیرہ امور میں طبعی جذبات کا پیرو رہتا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۱۶، ۳۱۷)

فَإِنَّ النَّفْسَ الْأَمَّارَةَ تُعْبَأَنَّ تَبْسُطُ  
شُرْكُكَ الْهَوَىٰ، وَيَهْلِكُ النَّاسُ كُلَّهُمْ إِلَّا  
مَنْ رَحِمَ رَبُّهُ وَبَسَطَ عَلَيْهِ جَنَاحَهُ  
بِالْطُّفِّ وَالْهُدَىٰ

نفس امارہ ایسا اژدھا ہے جو خواہشات نفسانیہ کے  
جال بچھاتا ہے اور تمام کے تمام لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں  
سوائے ان کے کہ جن پر ان کا رب رحم کرے اور ان پر  
اپنے بازو لطف اور ہدایت کے ساتھ پھیلا لے۔

(تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۸۴)

(ترجمہ از مرتب)

یہ طوفان جو نفسانی شہوات کے غلبہ سے پیدا ہوتا ہے یہ نہایت سخت اور دیر پا طوفان ہے جو کسی طرح بجز رحم خداوندی کے دور ہو ہی نہیں سکتا اور جس طرح جسمانی وجود کے تمام اعضاء میں سے ہڈی نہایت سخت ہے اور اس کی عمر بھی بہت لمبی ہے۔ اسی طرح اس طوفان کے دور کرنے والی قوت ایمانی نہایت سخت اور عمر بھی لمبی رکھتی ہے تا ایسے دشمن کا دیر تک مقابلہ کر کے پامال کر سکے اور وہ بھی خدا تعالیٰ کے رحم سے۔ کیونکہ شہوات نفسانیہ کا طوفان ایک ایسا ہولناک اور پُر آشوب طوفان ہے کہ بجز خاص رحم حضرت احدیت کے فرو نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے حضرت یوسف کو کہنا پڑا: وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا۔ نفس نہایت درجہ بدی کا حکم دینے والا ہے اور اس کے حملہ سے مخلصی غیر ممکن ہے مگر یہ کہ خود خدا تعالیٰ رحم فرماوے۔ اس آیت میں جیسا کہ فقرہ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ہے طوفان نوح کے ذکر کے وقت بھی اسی کے مشابہ الفاظ ہیں کیونکہ وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ طوفان شہوات نفسانیہ اپنی عظمت اور ہیبت میں نوح کے طوفان سے مشابہ ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۰۶)

نفس کی تین قسمیں ہیں امارہ، لوامہ، مطمئنہ۔ مطمئنہ کی ایک حالت نفس زکیہ کہلاتی ہے۔ نفس زکیہ بچوں کا نفس ہوتا ہے جس کو کوئی ہوا نہیں لگی ہوتی ہے اور وہ ہر قسم کے نشیب و فراز سے ناواقف ایک ہموار سطح پر چلتے ہیں۔ نفس امارہ وہ ہے جب کہ دنیا کی ہوا لگتی ہے۔ نفس لوامہ وہ نفس ہے جبکہ ہوش آتی ہے اور لغزشوں کو سوچتا ہے اور کوشش کرتا ہے اور بدیوں سے بچنے کے لئے دعا کرتا ہے۔ اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہوتا ہے اور نفس مطمئنہ وہ ہوتا ہے جبکہ ہر قسم کی بدیوں سے بچنے کی بفضل الہی قوت اور طاقت پاتا ہے اور ہر قسم کی آنفوں اور

مصیبتوں سے اپنے آپ کو امن میں پاتا ہے اور اس طرح پر ایک برودت اور اطمینان قلب کو حاصل ہوتا ہے کسی قسم کی گھبراہٹ اور اضطراب باقی نہ رہے۔ (الحکم جلد ۵، نمبر ۹، مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۱ء، صفحہ ۳)

انسان میں نفس بھی ہے اور اس کی تین قسم ہیں امارہ، لوامہ مطمئنہ۔ امارہ کی حالت میں انسان جذبات اور بے جا جوشوں کو سنبھال نہیں سکتا اور اندازہ سے نکل جاتا اور اخلاقی حالت سے گر جاتا ہے مگر حالت لوامہ میں سنبھال لیتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء، صفحہ ۹۹)

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس انسانی کی تین حالتیں ہیں ایک امارہ، دوسری لوامہ، تیسری مطمئنہ، نفس امارہ کی حالت میں انسان شیطان کے پنجے میں گویا گرفتار ہوتا ہے اور اس کی طرف بہت جھکتا ہے لیکن نفس لوامہ کی حالت میں وہ اپنی خطا کاریوں پر نادم ہوتا اور شرمسار ہو کر خدا کی طرف جھکتا ہے مگر اس حالت میں بھی ایک جنگ رہتی ہے۔ کبھی شیطان کی طرف جھکتا ہے اور کبھی رحمان کی طرف مگر نفس مطمئنہ کی حالت میں وہ عباد الرحمن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ گویا ارتقاعی نقطہ ہے جس کے بالمقابل نیچے کی طرف اتارہ ہے۔ اس میزان کے بیچ میں لوامہ ہے جو ترازو کی زبان کی طرح ہے۔ انحصاضی نقطہ کی طرف اگر زیادہ جھکتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر اور ارذل ہو جاتا ہے اور ارتقاعی نقطہ کی طرف جس قدر رجوع کرتا ہے اسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف قریب ہوتا جاتا ہے اور سفلی اور ارضی حالتوں سے نکل کر علوی اور سماوی فیضان سے حصہ لیتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء، صفحہ ۱۳۳)

نفس تین قسم کے ہوتے ہیں ایک نفس امارہ، ایک لوامہ اور تیسرا مطمئنہ۔ پہلی حالت میں تو صَوَّۃٌ بَکْرٌ ہوتا ہے کچھ معلوم اور محسوس نہیں ہوتا کہ کدھر جا رہا ہے۔ امارہ جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ کا فضل ہو تو معرفت کے ابتدائی حالت میں لوامہ کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور گناہ اور نیکی میں فرق کرنے لگتا ہے گناہ سے نفرت کرتا ہے مگر پوری قدرت اور طاقت عمل کی نہیں پاتا۔ نیکی اور شیطان سے ایک قسم کا جنگ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ کبھی یہ غالب ہوتا ہے اور کبھی مغلوب ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ حالت آ جاتی ہے کہ یہ مطمئنہ کے رنگ میں آ جاتا ہے اور پھر گناہوں سے نری نفرت ہی نہیں ہوتی بلکہ گناہ کی لڑائی میں یہ فتح پالیتا ہے اور ان سے بچتا ہے اور نیکیاں اس سے بلا تکلف صادر ہونے لگتی ہیں۔

(الحکم جلد ۷، نمبر ۷، مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء، صفحہ ۵)

جب انسان شرعی امور کو ادا کرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے اور بری اور

مگروہ باتوں سے اس کو بچا لیتا ہے اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي کے یہی معنی ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

نفس کو تین قسم پر تقسیم کیا ہے۔ نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ، ایک نفس زکیہ بھی ہوتا ہے مگروہ بچپن کی حالت ہے جب گناہ ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے اس نفس کو چھوڑ کر بلوغ کے بعد تین نفسوں ہی کی بحث کی ہے۔ نفس امارہ کی وہ حالت ہے جب انسان شیطان اور نفس کا بندہ ہوتا ہے اور نفسانی خواہشوں کا غلام اور اسیر ہو جاتا ہے۔ جو حکم نفس کرتا ہے اس کی تعمیل کے واسطے اس طرح طیار ہو جاتا ہے جیسے ایک غلام دست بستہ اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے لئے مستعد ہوتا ہے۔ اس وقت یہ نفس کا غلام ہو کر جو وہ کہے یہ کرتا ہے۔ وہ کہے خون کرتو یہ کرتا ہے۔ زنا کہے، چوری کہے، غرض جو کچھ بھی کہے سب کے لئے طیار ہوتا ہے۔ کوئی بدی کوئی برا کام ہو جو نفس کہے یہ غلاموں کی طرح کر دیتا ہے۔ یہ نفس اتارہ کی حالت ہے۔ اور یہ وہ شخص ہے جو نفس امارہ کا تابع ہے۔

اس کے بعد نفس لوامہ ہے۔ یہ ایسی حالت ہے کہ گناہ تو اس سے بھی سرزد ہوتے رہتے ہیں مگروہ نفس کو ملامت بھی کرتا رہتا ہے اور اس تدبیر اور کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اسے گناہ سے نجات مل جائے۔ جو لوگ نفس لوامہ کے ماتحت یا اس حالت میں ہوتے ہیں وہ ایک جنگ کی حالت میں ہوتے ہیں یعنی شیطان اور نفس سے جنگ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نفس غالب آ کر لغزش ہو جاتی ہے اور کبھی خود نفس پر غالب آجاتے اور اس کو دبا لیتے ہیں یہ لوگ نفس امارہ والوں سے ترقی کر جاتے ہیں۔ نفس امارہ والے انسان اور دوسرے بہائم میں کوئی فرق نہیں ہوتا جیسے کتا یا بلی جب کوئی برتن ننگا دیکھتے ہیں تو فوراً جا پڑتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ وہ چیز ان کا حق ہے یا نہیں۔ اسی طرح پر نفس امارہ کے غلام انسان کو جب کسی بدی کا موقع ملتا ہے تو فوراً اسے کر بیٹھتا ہے اور طیار رہتا ہے اگر راستہ میں دو چار روپے پڑے ہوں تو فی الفور ان کے اٹھانے کو طیار ہو جاوے گا اور نہیں سوچے گا کہ اس کو ان کے لینے کا حق ہے یا نہیں مگر لوامہ والے کی یہ حالت نہیں وہ حالت جنگ میں ہے جس میں کبھی نفس غالب کبھی وہ، ابھی کامل فتح نہیں ہوئی مگر تیسری حالت جو نفس مطمئنہ کی حالت ہے یہ وہ حالت ہے جب ساری لڑائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کامل فتح ہو جاتی ہے اسی لئے اس کا نام نفس مطمئنہ رکھا ہے یعنی اطمینان یافتہ، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر سچا ایمان لاتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ واقعی خدا ہے۔ نفس مطمئنہ کی انتہائی حد خدا پر ایمان ہوتا ہے کیونکہ کامل اطمینان اور تسلی اسی وقت ملتی

ہے جب اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان ہو۔

یقیناً سمجھو کہ ہر ایک پاکبازی اور نیکی کی اصلی جڑ خدا پر ایمان لانا ہے۔ جس قدر انسان کا ایمان باللہ کمزور ہوتا ہے اسی قدر اعمال صالحہ میں کمزوری اور سستی پائی جاتی ہے لیکن جب ایمان قوی ہو اور اللہ تعالیٰ کو اس کی تمام صفات کاملہ کے ساتھ یقین کر لیا جائے اسی قدر عجیب رنگ کی تبدیلی انسان کے اعمال میں پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا پر ایمان رکھنے والا گناہ پر قادر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ایمان اس کی نفسانی قوتوں اور گناہ کے اعضا کو کاٹ دیتا ہے۔ دیکھو اگر کسی کی آنکھیں نکال دی جاویں تو وہ آنکھوں سے بد نظری کیوں کر کر سکتا ہے اور آنکھوں کا گناہ کیسے کرے گا اور اگر ایسا ہی ہاتھ کاٹ دیئے جاویں یا شہوانی قوی کاٹ دیئے جاویں۔ پھر وہ گناہ جو ان اعضا سے متعلق ہیں کیسے کر سکتا ہے؟ ٹھیک اسی طرح پر جب ایک انسان نفس مطمئنہ کی حالت میں ہوتا ہے تو نفس مطمئنہ اسے اندھا کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں گناہ کی قوت نہیں رہتی۔ وہ دیکھتا ہے پھر نہیں دیکھتا کیونکہ آنکھوں کے گناہ کی نظر سلب ہو جاتی ہے وہ کان رکھتا ہے مگر بہرہ ہوتا ہے اور وہ باتیں جو گناہ کی ہیں نہیں سن سکتا۔ اسی طرح پر اس کی تمام نفسانی اور شہوانی قوتیں اور اندرونی اعضا کاٹ دیئے جاتے ہیں اس کی ان ساری طاقتوں پر جن سے گناہ صادر ہو سکتا تھا ایک موت واقع ہو جاتی ہے اور وہ بالکل ایک میت کی طرح ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ ہی کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ وہ اس کے سوا ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جب خدا تعالیٰ پر سچا ایمان ہو اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامل اطمینان اسے دیا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو انسان کا اصل مقصود ہونا چاہیے اور ہماری جماعت کو اسی کی ضرورت ہے اور اطمینان کامل کے حاصل کرنے کے واسطے ایمان کامل کی ضرورت ہے پس ہماری جماعت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان حاصل کریں۔ (الحکم جلد ۸، نمبر ۱۰ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ زمانہ جو شباب اور جوانی کا زمانہ ہے ایک ایسا زمانہ ہے کہ نفس امارہ نے اس کو ردی کیا ہوا ہے لیکن اگر کوئی کارآمد ایام ہیں تو یہی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی قرآن شریف میں درج ہے: وَمَا أُبْرِيْ نَفْسِيْ ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَكْذَابَةٌ ۖ بِالشُّوْرِۙ ۙ إِلَّا مَا رَجَعَهُ رَبِّيْۙ يَعْنِيْ فِيْ مِثْقَلِ ذَرَّةٍ مِّنْ عِلْمِيْۙ وَهُوَ بِغِيَابِ عَيْنِيَۙ عَلِيمٌ ۚ (سورۃ یوسف، آیت ۲۴) یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہرا سکتا کیونکہ نفس امارہ بدی کی طرف تحریک کرتا ہے۔ اس کی اس قسم کی تحریکوں سے وہی پاک ہو سکتا ہے جس پر میرا رب رحم کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی بدیوں اور جذبات سے بچنے کے واسطے زری کوشش ہی شرط نہیں بلکہ دعاؤں کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ نراز ہد ظاہری ہی (جو انسان اپنی

سعی اور کوشش سے کرتا ہے) کارآمد نہیں ہوتا جب تک خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم ساتھ نہ ہو اور اصل تو یہ ہے کہ اصل زہد اور تقویٰ تو ہے ہی وہی جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔ حقیقی پاکیزگی اور حقیقی تقویٰ اسی طرح ملتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

میں سچ کہتا ہوں کہ جب انسان نفس امارہ کے پنجہ میں گرفتار ہونے کے باوجود بھی تدبیروں میں لگا ہوا ہوتا ہے تو اس کا نفس امارہ خدا تعالیٰ کے نزدیک لوامہ ہو جاتا ہے اور ایسی قابل قدر تبدیلی پالیتا ہے کہ یا تو وہ امارہ تھا جو لعنت کے قابل تھا اور یا تدبیر اور تجویز کرنے سے وہی قابل لعنت نفس امارہ لوامہ ہو جاتا ہے جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ خدا تعالیٰ بھی اس کی قسم کھاتا ہے۔ یہ کوئی چھوٹا شرف نہیں ہے۔ پس حقیقی تقویٰ اور طہارت کے حاصل کرنے کے واسطے اول یہ ضروری شرط ہے کہ جہاں تک بس چلے اور ممکن ہو تدبیر کرو اور بدی سے بچنے کی کوشش کرو۔ بدعاتوں اور بد صحبتوں کو ترک کر دو۔ ان مقامات کو چھو دو جو اس قسم کی تحریکوں کا موجب ہو سکیں جس قدر دنیا میں تدبیر کی راہ کھلی ہے اس قدر کوشش کرو اور اس سے نہ تھکونہ ٹھو۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

نفس کے تین درجہ ہیں نفس امارہ، لوامہ، مطمئنہ۔ نفس امارہ وہ ہے جو فسق و فجور میں مبتلا ہے اور نافرمانی کا غلام ہے۔ ایسی حالت میں انسان نیکی کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ اس کے اندر ایک سرکشی اور بغاوت پائی جاتی ہے لیکن جب اس سے کچھ ترقی کرتا اور نکلتا ہے تو وہ وہ حالت ہے جو نفس لوامہ کہلاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اگر بدی کرتا ہے تو اس سے شرمندہ بھی ہوتا ہے اور اپنے نفس کو ملامت بھی کرتا ہے اور اس طرح پرنیکی کی طرف بھی توجہ کرتا ہے لیکن اس حالت میں وہ کامل طور پر اپنے نفس پر غالب نہیں آتا بلکہ اس کے اور نفس کے درمیان ایک جنگ جاری رہتی ہے جس میں کبھی وہ غالب آجاتا ہے اور کبھی نفس اسے مغلوب کر لیتا ہے۔ یہ سلسلہ لڑائی کا بدستور جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کی دستگیری کرتا ہے اور آخر اسے کامیاب اور بامراد کرتا ہے اور وہ اپنے نفس پر فتح پالیتا ہے پھر تیسری حالت میں پہنچ جاتا ہے جس کا نام نفس مطمئنہ ہے۔ اس وقت اس کے نفس کے تمام گند دور ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے فساد مٹ جاتے ہیں۔ نفس مطمئنہ کی آخری حالت ایسی حالت ہوتی ہے جیسے دو سلطنتوں کے درمیان ایک جنگ ہو کر ایک فتح پالے اور وہ تمام مفسدہ دور کر کے امن قائم کرے اور پہلا سارا نقشہ ہی بدل جاتا ہے..... جب روحانی سلطنت بدلتی ہے تو پہلی سلطنت پر تباہی آتی ہے۔ شیطان کے غلاموں کو قابو کیا جاتا ہے۔ وہ جذبات اور شہوات جو انسان کی

روحانی سلطنت میں مفسدہ پردازی کرتے ہیں ان کو کچل دیا جاتا ہے اور ذلیل کیا جاتا ہے اور روحانی طور پر ایک نیا سکہ بیٹھ جاتا ہے اور بالکل امن و امان کی حالت پیدا ہو جاتی ہے یہی وہ حالت اور درجہ ہے جو نفس مطمئنہ کہلاتا ہے اس لئے کہ اس وقت کسی قسم کی کشمکش اور کوئی فساد پایا نہیں جاتا بلکہ نفس ایک کامل سکون اور اطمینان کی حالت میں ہوتا ہے کیونکہ جنگ کا خاتمہ ہو کر نئی سلطنت قائم ہو جاتی ہے اور کوئی فساد اور مفسدہ باقی نہیں رہتا بلکہ دل پر خدا کی فتح کامل ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ خود اس کے عرشِ دل پر نزل فرماتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

نفسِ امارہ اس کو کہتے ہیں کہ سوائے بدی کے اور کچھ چاہتا ہی نہیں جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ یعنی نفسِ امارہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو بدی کی طرف جھکاتا ہے اور ناپسندیدہ اور بد راہوں پر چلانا چاہتا ہے۔ جتنے بدکار چور ڈاکو دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ سب اسی نفس کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ ایسا شخص جو نفسِ امارہ کے ماتحت ہو ہر ایک طرح کے بد کام کر لیتا ہے..... غرض جو انسان نفسِ امارہ کے تابع ہوتا ہے وہ ہر ایک بدی کو شیرِ مادر کی طرح سمجھتا ہے اور جب تک کہ وہ اسی حالت میں رہتا ہے بدیاں اس سے دور نہیں ہو سکتیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

انسان نفسِ امارہ کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے جب تک اللہ کا فضل اور توفیق اس کے شامل حال نہ ہو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ دعائیں کرتا رہے تاکہ خدا کی طرف اسے نیکی پر قدرت دی جاوے اور نفسِ امارہ کی قیدوں سے رہائی عطا کی جاوے۔ یہ انسان کا سخت دشمن ہے۔ اگر نفسِ امارہ نہ ہوتا تو شیطان بھی نہ ہوتا۔ یہ انسان کا اندرونی دشمن اور مارا آستین ہے اور شیطان بیرونی دشمن ہے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جب چور کسی کے مکان میں نقب زنی کرتا ہے تو کسی گھر کے بھیدی اور واقف کار سے پہلے سازش کرنی ضروری ہوتی ہے بیرونی چور بجز اندرونی بھیدی کی سازش کے کچھ کر ہی نہیں سکتا اور کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ پس یہی وجہ ہے کہ شیطان بیرونی دشمن، نفسِ امارہ اندرونی، اور گھر کے بھیدی سے سازش کر کے ہی انسان کے متاعِ ایمان میں نقب زنی کرتا ہے اور نورِ ایمان کو غارت کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا أُكْبِرُ بِحَيْثُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا اور اس کی طرف سے مطمئن نہیں کہ نفس پاک ہو گیا ہے بلکہ یہ تو شریر الحکومت ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳، ۴)

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں نفس انسان کے تین مرتبے بیان فرمائے ہیں امارہ، لوامہ، مطمئنہ۔ نفس امارہ تو ہر وقت انسان کو گناہ اور نافرمانی کی طرف کھینچتا رہتا ہے اور بہت خطرناک ہے۔ لوامہ وہ ہے کہ کبھی کوئی بدی ہو جاوے تو ملامت کرتا ہے مگر یہ بھی قابلِ اطمینان نہیں ہے قابلِ اطمینان صرف نفس کی وہ حالت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نفس مطمئنہ کے نام سے پکارا ہے اور وہی اچھا ہے۔ وہ اس حالت کا نام ہے کہ جب انسان خدا کے ساتھ ٹھہر جاتا ہے۔ اسی حالت میں آکر انسان گناہ کی آلائش سے پاک کیا جاتا ہے۔ یہی ایک گناہ سوز حالت ہے اور اسی درجہ کے انسانوں کے ساتھ برکات کے وعدے ہوئے ہیں۔ ملائکہ کا نزول ان پر ہوتا ہے اور حقیقی نیکی اور پاکی صرف انہیں کا حصہ ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

امارہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ امارہ کہتے ہیں بدی کی طرف لے جانے والا، بہت بدی کا حکم کرنے والا.... نفس امارہ انسان کا دشمن ہے اور وہ گھر کا پوشیدہ دشمن ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

امارہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ بدی کی طرف بار بار جانے والا۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

وَ قَالَ الْمَلِكُ اَنْتَوْنِي بِهٖ اَسْتَخْلِصُهٗ لِنَفْسِي ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهَا قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ  
لَدَيْنَا مَكِينٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۵﴾

اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ اَمِيْنٌ.... تو آج ہمارے نزدیک صاحب مرتبہ اور امانتدار.... ہے۔  
(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۶۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

آج تو میرے نزدیک بامرتبہ اور امین ہے۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۰۰ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلٰی اٰبِيْهِمْ قَالُوْا يَا اَبَانَا مُنِعْنَا الْكَيْلَ فَاَرْسَلْ مَعَنَا اَخَانَا نَكْتُلْ  
وَ اِنَّآ لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۵۶﴾

اِنَّآ لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ... ہم ہی محافظ ہیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۶۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

يٰۤاَيُّهَا اِذْ هَبُوْا فِتْحٰسُوْا مِنْ يُّوسُفَ وَ اٰخِيْهِ وَلَا تَايَسُوْا مِنْ رُّوْحِ اللّٰهِ ۗ اِنَّهٗ لَا  
يَايَسُ مِنْ رُّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿١١﴾

ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ خدا تعالیٰ کی تائید اور فضل کے بغیر ایک انگلی کا ہلانا بھی مشکل ہے ہاں یہ انسان کا فرض ہے کہ سعی اور مجاہدہ کرے جہاں تک اس سے ممکن ہے اور اس کی توفیق بھی خدا تعالیٰ سے ہی چاہے۔ کبھی اس سے مایوس نہ ہو کیونکہ مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے خود بھی فرمایا: لَا يٰۤاَيُّسُ مِنْ رُّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کافر نامید ہوتے ہیں نامیدی بہت ہی بری چیز ہے اصل میں نامید وہ ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ پر بدظنی کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

قَالُوْۤا عٰرِئٰتُكَ لَآنْتَ يُّوسُفُ ۗ قَالَ اَنَا يُّوسُفُ وَ هٰذَا اَخِيْ ۗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۗ  
اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١﴾

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی جو شخص صبر کرے گا اور ڈرے گا خدا اس کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔ یہ عام پیغمبری ہے جو تقویٰ اور صبر کے ساتھ مشروط ہے۔  
(ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۲۳۳ حاشیہ)

قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۗ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرَّحِيْمِيْنَ ﴿١٢﴾

حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں اور دوسرے لوگوں پر بکلی فتح پا کر اور ان کو اپنی تلوار کے نیچے دیکھ کر پھر ان کا گناہ بخش دیا اور صرف انہیں چند لوگوں کو سزا دی جن کو سزا دینے کے لئے حضرت احدیت کی طرف سے قطعی حکم وارد ہو چکا تھا اور بجز ان ازلی ملعونوں کے ہر ایک دشمن کا گناہ بخش دیا اور فتح پا کر سب کو لا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ کہا اور اسی عفو تقصیر کی وجہ سے کہ جو مخالفوں کی نظر میں ایک امر محال معلوم ہوتا تھا اور اپنی شرارتوں پر نظر کرنے سے وہ اپنے تئیں اپنے مخالف کے ہاتھ میں دیکھ کر مقتول خیال کرتے تھے ہزاروں انسانوں نے ایک ساعت میں دین اسلام قبول کر لیا۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۸۶، ۲۸۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

...حلم میں اپنی شان دکھاتے ہیں تو واجب القتل کو چھوڑ دیتے ہیں۔... اگر حکومت کارنگ نہ ہوتا تو یہ کیوں کر ثابت ہوتا کہ آپ واجب القتل کفار مکہ کو باوجود مقدرت انتقام بخش سکتے ہیں جنہوں نے صحابہ کرام اور خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مسلمان عورتوں کو سخت سے سخت اذیتیں اور تکلیفیں دی تھیں۔ جب وہ سامنے آئے تو آپ نے فرمایا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ میں نے آج تم کو بخش دیا۔ اگر ایسا موقع نہ ملتا تو ایسے اخلاق فاضلہ حضور کے کیوں کر ظاہر ہوتے؟ (رپوٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۲، ۱۵۳)

ابو جہل اور اس کے دوسرے رفیقوں نے کون سی تکلیف تھی جو آپ کو اور آپ کے جاں نثار خادموں کو نہیں دی۔ غریب مسلمان عورتوں کو اونٹوں سے باندھ کر مخالف جہات میں دوڑایا اور وہ چیری جاتی تھیں محض اس گناہ پر کہ وہ لا الہ الا اللہ پر کیوں قائل ہوئیں مگر آپ نے اس کے مقابل صبر برداشت سے کام لیا اور جبکہ مکہ فتح ہوا تو لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ کہہ کر معاف فرمایا۔ یہ کس قدر اخلاقی کمال ہے جو کس دوسرے نبی میں نہیں پایا جاتا۔ اللہم صل علی محمد و علی ال محمد۔ غرض بات یہ ہے کہ اخلاق فاضلہ حاصل کرو کہ نیکیوں کی کلید اخلاق ہی ہیں۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۲۵ مورخہ ۹ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۵)

پینمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کے دو پہلو دکھلائے ایک مکی زندگی جب کہ آپ کے ساتھ صرف چند آدمی تھے اور کچھ قوت نہ تھی۔ دوسرا مدنی زندگی میں جبکہ آپ فاتح ہوئے اور وہی کفار جو آپ کو تکلیف دیتے تھے اور آپ ان کی ایذا دہی پر صبر کرتے تھے اب آپ کے قابو میں آگئے ایسا کہ جو چاہتے آپ ان کو سزا دے سکتے تھے۔ مگر آپ نے لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ کہہ کر ان کو چھوڑ دیا اور کچھ سزا نہ دی۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۹)

مکہ میں جن لوگوں نے دکھ دیئے تھے جب آپ نے مکہ کو فتح کیا تو آپ چاہتے تو سب کو ذبح کر دیتے مگر آپ نے رحم کیا اور لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ کہہ دیا۔ آپ کا بخشنا تھا کہ سب مسلمان ہو گئے۔ اب اس قسم کے عظیم الشان اخلاق فاضلہ کیا کسی نبی میں پائے جاتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے آپ کی ذات خاص اور عزیزوں اور صحابہ کو سخت تکلیفیں دیں تھیں اور ناقابلِ عفو ایذا میں پہنچائی تھیں آپ نے سزا دینے کی قوت اور اقتدار کو پا کر فی الفور ان کو بخش دیا حالانکہ اگر ان کو سزا دی جاتی تو یہ بالکل انصاف اور عدل تھا مگر آپ نے اس وقت اپنے عفو اور کرم کا نمونہ دکھایا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ جب مکہ والوں نے آپ کو نکالا اور تیرہ برس تک ہر قسم کی

تکلیفیں آپ کو پہنچاتے رہے۔ آپ کے صحابہ کو سخت سخت تکلیفیں دیں جن کے تصور سے بھی دل کانپ جاتا ہے اس وقت جیسے صبر اور برداشت سے آپ نے کام لیا وہ ظاہر بات ہے لیکن جب خدا تعالیٰ کے حکم سے آپ نے ہجرت کی اور پھر فتح مکہ کا موقع ملا تو اس وقت ان تکالیف اور مصائب اور سختیوں کا خیال کر کے جو مکہ والوں نے تیرہ سال تک آپ پر اور آپ کی جماعت پر کی تھیں آپ کو حق پہنچتا تھا کہ قتل عام کر کے مکہ والوں کو تباہ کر دیتے اور اس قتل میں کوئی مخالف بھی آپ پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ان تکالیف کے لئے وہ واجب القتل ہو چکے تھے اس لئے اگر آپ میں قوت غضبی ہوتی تو وہ بڑا عجیب موقع انتقام کا تھا کہ وہ سب گرفتار ہو چکے تھے۔ مگر آپ نے کیا کیا؟ آپ نے ان سب کو چھوڑ دیا اور کہا لا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ۔ یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے مکہ کی مصائب اور تکالیف کے نظارہ کو دیکھو کہ قوت و طاقت کے ہوتے ہوئے کس طرح پر اپنے جانستان دشمنوں کو معاف کیا جاتا ہے یہ ہے نمونہ آپ کے اخلاق فاضلہ کا جس کی نظیر دنیا میں پائی نہیں جاتی... مکہ والے بھی اپنی شرارتوں اور مجرمانہ حرکات کے باعث اس قابل تھے کہ ان کو سخت سزائیں دی جاتیں اور ان کے وجود سے اس ارض مقدس اور اس کے گرد نواح کو صاف کر دیا جاتا مگر یہ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ اور اِنَّكَ لَعَلٰی خَلَقْتَ عَظِيْمًا كَامِصْدَاقِ اٰنِمْ وَ اٰنِمْ وَ اٰنِمْ كَوَيْحِيْ قُوْتِ اُوْر مَقْدَرْتِ كِے ہوتے ہوئے کہتا ہے: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر طرح سے اقتدار اور اختیار حاصل کر کے اپنے جانی دشمنوں اور خون

کے پیاسوں کو اپنے سامنے بلا کر کہہ دیا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعَيْرُ قَالَ أَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاجِدٌ رِّبْحٍ يُوسُفُ كُوْلَا اَنْ تُفْقِدُوْنَ ۝۶۰

ہرام کے فیصلہ کے لئے معیار قرآن ہے۔ دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کا پیارا بیٹا یوسف علیہ السلام جب بھائیوں کی شرارت سے ان سے الگ ہو گیا تو آپ چالیس برس تک اس کے لئے دعائیں کرتے رہے اگر وہ جلد باز ہوتے تو کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوتا۔ چالیس برس تک دعاؤں میں لگے رہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان رکھا۔ آخر چالیس برس کے بعد وہ دعائیں کھینچ کر یوسف (علیہ السلام) کو لے ہی آئیں۔

اس عرصہ دراز میں بعض ملامت کرنے والوں نے یہ بھی کہا کہ تو یوسف کو بے فائدہ یاد کرتا ہے مگر انہوں نے یہ کہا کہ میں خدا سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے بیشک ان کو کچھ خبر نہ تھی مگر یہ کہا: اِنِّیْ لَآکَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ۔ پہلے تو اتنا ہی معلوم تھا کہ دعاؤں کا سلسلہ لمبا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر دعاؤں میں محروم رکھنا ہوتا تو وہ جلد جواب دے دیتا مگر اس سلسلہ کا لمبا ہونا قبولیت کی دلیل ہے کیونکہ کریم سائل کو دیر تک بٹھا کر کبھی محروم نہیں کرتا بلکہ بخیل سے بخیل بھی ایسا نہیں کرتا وہ بھی سائل کو اگر زیادہ دیر تک دروازہ پر بٹھائے تو آخر اس کو کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دعاؤں کے زمانہ کی درازی پر وَابۡیَضَّتْ عَیۡنُهٗ قُرۡآن میں خود دلالت کر رہی ہیں غرض دعاؤں کے سلسلہ کے دراز ہونے سے کبھی گھبرانا نہیں چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہر نبی کی تکمیل بھی جدا جدا پیرایوں میں کرتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اسی غم میں رکھی تھی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

بہت سی باتیں پیشگوئیوں کے طور پر نبیوں کی معرفت لوگوں کو پہنچتی ہیں اور جب تک وہ اپنے وقت پر ظاہر نہ ہوں ان کی بابت کوئی یقینی رائے قائم نہیں کی جاسکتی لیکن جب ان کا ظہور ہوتا ہے اور حقیقت کھلتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پیشگوئی کا یہ مفہوم اور منشا تھا اور جو شخص اس کا مصداق ہو یا جس کے حق میں ہو اس کو اس کا علم دیا جاتا ہے... حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں چالیس سال تک روتے رہے آخر جا کر آپ کو خبر ملی تو کہا: اِنِّیْ لَآکَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ ورنہ اس سے پہلے آپ کا یہ حال ہوا کہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے: وَابۡیَضَّتْ عَیۡنُهٗ تَک نوبت پہنچی۔ اسی کے متعلق کیا اچھا کہا ہے۔

کسے پر سید زان گم کردہ فرزند کہ اے روشن گہر پیر خرد مند  
ز مصرش بوئے پیرا ہن شمیدی چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

(الحکم جلد ۷ نمبر ۵ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

جب سماع کے ذریعہ سے کوئی خبر دی جاتی ہے تو اسے وحی کہتے ہیں اور جب رویت کے ذریعہ سے کچھ بتلایا جاوے تو اسے کشف کہتے ہیں۔ اسی طرح میں نے دیکھا ہے کہ بعض وقت ایک ایسا امر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صرف قوتِ شامہ سے ہوتا ہے مگر اس کا نام نہیں رکھ سکتے جیسے یوسفؑ کی نسبت حضرت یعقوب کو خوشبو آئی تھی: اِنِّیْ لَآکَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوۡلَا اَنْ تُفۡنِدُوۡنَ۔ (البدرد جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۴)

کشف اسے کہتے ہیں کہ انسان پر بیداری کے عالم میں ایک ایسی ربودگی طاری ہو کہ وہ سب کچھ جانتا

بھی ہوا اور حواسِ خمسہ اس کے کام بھی کر رہے ہوں اور ایک ایسی ہوا چلے کہ نئے حواس اسے مل جاویں جن سے وہ عالمِ غیب کے نظارے دیکھ لے۔ وہ حواس مختلف طور سے ملتے ہیں کبھی بصر میں، کبھی شامہ (سونگھنے) میں، کبھی سَمِع میں۔ شامہ میں اس طرح جیسے کہ حضرت یوسف کے والد نے کہا: لَا جِدُّ رِيحِ يُوسُفَ كَوْ لَا أَنْ تُفْنِدُونَ (کہ مجھے یوسف کی خوشبو آتی ہے اگر تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا) اس سے مراد وہی نئے حواس ہیں جو کہ یعقوبؑ کو اس وقت حاصل ہوئے اور انہوں نے معلوم کیا کہ یوسفؑ زندہ موجود ہے اور ملنے والا ہے اس خوشبو کو دوسرے پاس والے نہ سونگھ سکے کیونکہ ان کو وہ حواس نہ ملے تھے جو کہ یعقوبؑ کو ملے۔

(الہدٰی جلد ۴ نمبر ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

### قَالُوا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۶﴾

ضال کے معنی گمراہ نہیں ہے بلکہ انتہائی درجہ کے عشق کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ حضرت یعقوب کی نسبت اسی کے مناسب یہ آیت ہے اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ۔ سو یہ دونوں لفظ ظلم اور ضلالت اگرچہ ان معنوں پر بھی آتے ہیں کہ کوئی شخص جاہِ اعتدال اور انصاف کو چھوڑ کر اپنے شہواتِ غضبیہ یا بہیمیہ کا تابع ہو جاوے لیکن قرآن کریم میں عشاق کے حق میں بھی آئے ہیں جو خدا تعالیٰ کے راہ میں عشق کی مستی میں اپنے نفس اور اس کے جذبات کو پیروں کے نیچے کچل دیتے ہیں۔ اسی کے مطابق حافظ شیرازی کا یہ شعر ہے۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اسی دیوانگی سے حافظ صاحب حالتِ تعشق اور شدتِ حرصِ اطاعت مراد لیتے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۷۳)

ضلالت کے یہ بھی معنی ہیں کہ افراطِ محبت سے ایک شخص کو ایسا اختیار کیا جائے کہ دوسرے کا عزت کے ساتھ نام سننے کی بھی برداشت نہ رہے جیسا کہ اس آیت میں بھی یہی معنی مراد ہیں کہ اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ۔

(تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۲۶۹ حاشیہ)

رَبِّ قَدْ اَتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِي مِمَّنْ تَاوِيلِ الْاَحَادِيثِ ۚ فَاطْرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۗ اَنْتَ وَ لِيْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوْقِنِيْ مُسْلِمًا ۗ وَ الْحَقِيْنِيْ

## بِالصَّالِحِينَ ﴿۱۲﴾

أَنْتَ وَرَبِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ تَوَقَّئِي مُسْلِمًا ۖ وَالْحَقِّنِي بِالصَّالِحِينَ یعنی اے میرے خدا تو دنیا اور آخرت میں میرا متولی ہے۔ مجھے اسلام پر وفات دے اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ ملا دے۔

(تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۱۲۷)

ایسی نظیریں مجھے تین سو سے بھی زیادہ احادیث میں سے ملیں جن سے ثابت ہوا کہ جہاں کہیں توفی کے لفظ کا خدا فاعل ہو اور وہ شخص مفعول ہے ہو جس کا نام لیا گیا ہے تو اس جگہ صرف ما دینے کے معنی ہیں نہ اور کچھ۔ مگر باوجود تمام تر تلاش کے ایک بھی ایسی حدیث مجھے نہ ملی جس میں توفی کے فعل کا خدا فاعل ہو اور مفعول پہ علم ہو یعنی نام لے کر کسی شخص کو مفعول پہ ٹھہرایا گیا ہو اور اس جگہ بجز مارنے کے کوئی اور معنی ہوں۔ اسی طرح جب قرآن شریف پر اول سے آخر تک نظر ڈالی گئی تو اس سے بھی یہی ثابت ہوا جیسا کہ آیت تَوَقَّئِي مُسْلِمًا ۖ وَالْحَقِّنِي بِالصَّالِحِينَ اور آیت: وَإِنْ مَا نُؤْيِكَ بَعْضَ الَّذِي لَعَدُّهُمْ أَوْ نَتَوَقَّيَنَّكَ وَغَيْرِ آيات سے ثابت ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۷۹)

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳﴾

کہہ کہ یہ میری راہ ہے۔ میں اللہ کی طرف بصیرت کاملہ کے ساتھ بلاتا ہوں۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۲۲۶)

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُنُّوْا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيْ مَنْ نَّشَاءُ ۗ وَلَا يَرُدُّ بِاسْتِنَاعِنَ الْقَوْمِ الْمَجْرِمِينَ ﴿۱۴﴾

بعض پیشگوئیاں باریک اسرار اپنے اندر رکھتی ہیں اور دقیق امور کی وجہ سے ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں جو دور بین آنکھیں نہیں رکھتے اور موٹی موٹی باتوں کو صرف سمجھ سکتے ہیں۔ ایسی ہی پیشگوئیوں پر عموماً تکذیب ہوتی ہے اور جلد باز اور شباب کار کہہ اٹھتے ہیں کہ وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُنُّوْا۔ ان پیشگوئیوں میں لوگ شہات پیدا کرتے ہیں مگر فی الحقیقت وہ پیشگوئیاں

خدا تعالیٰ کی سنن کے ماتحت پوری ہو جاتی ہیں تاہم اگر وہ سمجھ میں نہ بھی آئیں تو مومن اور خدا ترس انسان کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان پیشگوئیوں پر نظر کرے جس میں دقائق نہیں یعنی جو موٹی موٹی پیشگوئیاں ہیں۔ پھر دیکھے کہ وہ کس قدر تعداد میں پوری ہو چکی ہیں۔ یونہی منہ سے انکار کر دینا تقویٰ کے خلاف ہے۔ دیانت اور خدا ترسی سے ان پیشگوئیوں کو دیکھنا چاہیے جو پوری ہو چکی ہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۱﴾

قرآن ایسی کتاب نہیں کہ انسان اس کو بنا سکے بلکہ اس کے آثار صدق ظاہر ہیں کیونکہ وہ پہلی کتابوں کو سچا کرتا ہے یعنی کتب سابقہ انبیاء میں جو اس کے بارہ میں پیشین گوئیں موجود تھیں وہ اس کے ظہور سے بہ پایہ صداقت پہنچ گئیں اور جن عقائد حقہ کے بارہ میں ان کتابوں میں دلائل واضح موجود نہ تھیں ان کے قرآن نے دلائل بتلائے اور ان کی تعلیم کو مرتبہ کمال تک پہنچایا۔ اس طور پر ان کتابوں کو سچا کیا جس سے خود سچائی اس کی ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے نشان صدق یہ کہ ہر ایک صداقت دینی کو وہ بیان کرتا ہے اور تمام وہ امور بتلاتا ہے کہ جو ہدایت کامل پانے کے لئے ضروری ہیں اور یہ اس لئے نشان صدق ٹھہرا کہ انسان کی طاقت سے یہ بات باہر ہے کہ اس کا علم ایسا وسیع و محیط ہو جس سے کوئی دینی صداقت و حقائق دقیقہ باہر نہ رہیں۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۲۶ حاشیہ نمبر ۱۱)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِیْمِ

## تفسیر سورة الرعد

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَّرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ

السَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ۗ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ۗ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ

یَلْقَآءَ رَبِّكُمْ تَوْقِنُوْنَ ﴿۲۱﴾

تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اور پھر اس نے عرش پر قرار پکڑا۔ اس آیت کے ظاہری معنی کے رو سے اس جگہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے خدا کا عرش پر قرار نہ تھا اس کا یہی جواب ہے کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے بلکہ وراء الوراء ہونے کی ایک حالت ہے جو اس کی صفت ہے پس جب کہ خدا نے زمین و آسمان اور ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور ظلی طور پر اپنے نور سے سورج، چاند اور ستاروں کو نور بخشا اور انسان کو بھی استعارہ کے طور پر اپنی شکل پر پیدا کیا اور اپنے اخلاق کریمہ اس میں پھونک دیئے تو اس طور سے خدا نے اپنے لئے ایک تشبیہ قائم کی مگر چونکہ وہ ہر ایک تشبیہ سے پاک ہے اس لئے عرش پر قرار پکڑنے سے اپنے تنزہ کا ذکر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ سب کچھ پیدا کر کے پھر مخلوق کا عین نہیں ہے بلکہ سب سے الگ اور وراء الوراء مقام پر ہے۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۷۷)

خدا تعالیٰ نے تمام اجرام سماوی وارضی پیدا کر کے پھر اپنے وجود کو وراء الوراء مقام میں مخفی کیا جس کا نام

عرش ہے اور یہ ایسا نہاں در نہاں مقام ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی چار صفات ظہور پذیر نہ ہوتیں جو سورۃ فاتحہ کی پہلی آیات میں ہی درج ہیں تو اس کے وجود کا کچھ پتہ نہ لگتا یعنی ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالک یوم الجزاء ہونا سو یہ چاروں صفات استعارہ کے رنگ میں چار فرشتے خدا کی کلام میں قرار دیئے گئے ہیں جو اس کے عرش کو اٹھا رہے ہیں یعنی اس وراء الوراہ مقام میں جو خدا ہے اس مخفی مقام سے اس کو دکھلا رہے ہیں ورنہ خدا کی شناخت کے لئے کوئی ذریعہ نہ تھا۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۷۹-۲۸۰ حاشیہ)

استعارہ کے طور پر خدا کے صفات کے ظہور کو **ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ** سے بیان کیا ہے کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کے بعد صفات الہیہ کا ظہور ہوا۔ صفات اس کے ازلی ابدی ہیں مگر جب مخلوق ہو تو خالق کو شناخت کرے اور محتاج ہوں تو رازق کو پہنچائیں اسی طرح اس کے علم اور قادر مطلق ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ **ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ** خدا کی اس تجلی کی طرف اشارہ ہے جو **خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ** کے بعد ہوئی۔ (البدنبر ۵ جلد ۲ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸)

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوهُمَا بِأَنفُسِهِمْ ۗ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءَ أَفْلًا مَرَدَّدًا لَهُ ۗ وَمَا لَهُمْ فِي دُونِهِ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۷﴾

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ..... خدا تعالیٰ کی طرف سے چونکدار مقرر ہیں جو اس کے بندوں کی ہر طرف سے یعنی کیا ظاہری طور پر اور کیا باطنی طور پر حفاظت کرتے ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۷۹)

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوهُمَا بِأَنفُسِهِمْ... خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے ارادے کی اس وقت تبدیلی ہوگی جب دلوں کی تبدیلی ہوگی۔ پس خدا تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے قہر سے خوف کھاؤ۔ کوئی کسی کا ذمہ وار نہیں ہو سکتا۔ معمولی مقدمہ کسی پر ہو تو اکثر لوگ و فائز نہیں کر سکتے پھر آخرت میں کیا بھروسہ رکھ سکتے ہو۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۱ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

خدا تعالیٰ اس نیکی یا بدی کو جو کسی قوم کے شامل حال ہے دور نہیں کرتا جب تک وہ قوم ان باتوں کو اپنے سے دور نہ کرے جو اس کے دل میں ہیں۔ (ایام الصلح، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۴۱)

جب تک دلوں کی و باء معصیت دور نہ ہو تب تک ظاہری و باہمی دور نہ ہوگی۔

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ ۱۸۵)

میری رائے ہے جب تک کہ لوگ کامل طور پر رجوع نہ کریں تقدیر نہ بدلے گی۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمِهِ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

جب تک انسان مجاہدہ نہ کرے گا۔ دعا سے کام نہ لے گا وہ عمرہ جو دل پر پڑ جاتا ہے دور نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمِهِ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ یعنی خدا تعالیٰ ہر ایک قسم کی آفت اور بلا کو جو قوم پر آتی ہے دور نہیں کرتا ہے جب تک خود قوم اس کو دور کرنے کی کوشش نہ کرے، ہمت نہ کرے، شجاعت سے کام نہ لے تو کیوں کر تبدیلی ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک لاتبدیل سنت ہے جیسے فرمایا وَ كُنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (فاطر: ۴۴)۔ پس ہماری جماعت ہو یا کوئی ہو وہ تبدیل اخلاق اسی صورت میں کر سکتے ہیں جبکہ مجاہدہ اور دعا سے کام لیں ورنہ ممکن نہیں ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۶)

نیک سختی اور تقویٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور سعادت کی راہیں اختیار کرنی چاہئیں تب ہی کچھ ہوتا

ہے۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمِهِ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الایة س ۱۳) خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ خود قوم اپنی حالت کو تبدیل نہ کرے۔ خواہ نحوہ کے ظن کرنا اور بات کو انتہا تک پہنچانا بالکل بیہودہ بات ہے ضروری بات یہ ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، اتلاف حقوق اور بدکاریوں سے باز آئیں۔ (الانذار صفحہ ۱۶)

خدا تعالیٰ اپنا قانون کبھی نہیں بدلتا۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمِهِ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔ خدا تعالیٰ نے میرے الہام میں جو طاعون کے متعلق ہے یہ آیت رکھی ہے جو اس امر کی طرف رہبری کرتی ہے کہ تبدیلی کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ بڑی ہی خوفناک بات ہے کہ انسان سن کر کانوں تک ہی رہنے دے اور دل تک نہ پہنچے۔ بڑا ہی ظالم وہ شخص ہے جو ظاہری حالت پر خوش ہو جاتا ہے اور سچی اطاعت کی حالت نہیں دکھاتا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

انسان کو عذاب ہمیشہ گناہ کے باعث ہوتا ہے۔ خدا فرماتا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمِهِ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا

مَا بِأَنْفُسِهِمْ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۹)

خدا نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ باوجود گنہگار ہونے کے اللہ تعالیٰ بغیر عذاب کے چھوڑ دے۔ ایک طرف تو قرآن میں یہ لکھا ہے کہ طاعون سے کوئی بستی خالی نہیں رہے گی اور طاعون کی وجہ صرف یہی ہے جو إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ کے الہام سے ظاہر ہے یعنی جب لوگوں نے اپنے افعال اور اعمال سے غضبِ الہی کے جوش کو بھڑکایا اور بد عملیوں سے اپنی حالتوں کو ایسا بدل لیا کہ خوفِ خدا اور تقویٰ و طہارت کی ہر ایک راہ کو چھوڑ دیا اور بجائے اس کے طرح طرح کے فسق و فجور کو اختیار کر لیا اور خدا پر ایمان سے بالکل ہاتھ دھو دیا۔ دہریت اندھیری رات کی طرح دنیا پر محیط ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کے نورانی چہرے کو ظلمت کے نیچے دبا دیا تو خدا نے اس عذاب کو نازل کیا تا لوگ خدا کے چہرے کو دیکھ لیں اور اس کی طرف رجوع کریں۔

(البدرد جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جو شخص چاہتا ہے کہ آسمان میں اس کے لئے تبدیلی ہو یعنی وہ ان عذابوں اور دکھوں سے رہائی پائے جو شامتِ اعمال نے اس کے لئے طیار کئے ہیں۔ اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی کرے۔ جب وہ خود تبدیلی کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے موافق جو اس نے إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ میں کیا ہے اس کے عذاب اور دکھ کو بدلا دیتا ہے اور دکھ کو سکھ سے تبدیل کر دیتا ہے جب انسان اپنے اندر تبدیلی کرتا ہے تو اس کے لئے ضرور نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو بھی دکھاتا پھرے۔ وہ رحیم کریم خدا جو دلوں کا مالک ہے اس کی تبدیلی کو دیکھ لیتا ہے کہ یہ پہلا انسان نہیں ہے اس لئے وہ اس پر فضل کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ کبھی حالتِ قوم میں تبدیلی نہ کرے گا جب تک لوگ دلوں کی تبدیلی نہ کریں گے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۵ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو درست نہ کر لیں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۹ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

یاد رکھیں کہ اللہ اس حالت کو نہیں بدلے گا جب تک دلوں کی حالت میں یہ لوگ خود تبدیلی نہ کریں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

خدا نہیں چھوڑے گا اور ہرگز نہیں چھوڑے گا جب تک لوگ اپنے اخلاق، اعمال اور خیالات میں ایک

تبدیلی پیدا نہ کر لیں گے۔

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا

كَبَّاسِطٍ كَفَيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ ۗ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿٥﴾

تمام حاجتوں کو اس سے مانگنا چاہیے اور جو لوگ بجز اس کے اور اور چیزوں سے اپنی حاجت مانگتے ہیں وہ چیزیں ان کی دعاؤں کا کچھ جواب نہیں دیتیں۔ ایسے لوگوں کی یہ مثال ہے جیسے کوئی پانی کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر کہے کہ اے پانی میرے منہ میں آجا۔ سو ظاہر ہے کہ پانی میں یہ طاقت نہیں کہ کسی کی آواز سنے اور خود بخود اس کے منہ میں پہنچ جائے۔ اسی طرح مشرک لوگ بھی اپنے معبودوں سے عبث طور پر مدد طلب کرتے ہیں جس پر کوئی فائدہ مترتب نہیں ہو سکتا۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۲۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

دعا کرنے کے لائق وہی سچا خدا ہے جو ہر ایک بات پر قادر ہے اور جو لوگ اس کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں وہ کچھ بھی ان کو جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کوئی پانی کی طرف ہاتھ پھیلا دے کہ اے پانی میرے منہ میں آجا۔ تو کیا وہ اس کے منہ میں آجائے گا۔ ہرگز نہیں۔ سو جو لوگ سچے خدا سے بے خبر ہیں ان کی تمام دعائیں باطل ہیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۱۷)

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ قُلِ اللَّهُ ۗ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۗ أَمْ هَلْ تُسْتَوَىٰ الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ ۗ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۗ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۗ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٥﴾

کیا انہوں نے خدا تعالیٰ کے شریک ایسی صفات کے ٹھہرا رکھے ہیں کہ جیسے خدا تعالیٰ خالق ہے وہ بھی خالق ہیں تا اس دلیل سے انہوں نے ان کو خدا مان لیا۔ ان کو کہہ دے کہ ثابت شدہ یہی امر ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہر ایک چیز کا ہے اور وہی اکیلا ہر ایک چیز پر غالب اور قہار ہے۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۶۸)

یعنی خدا ہر ایک چیز کا خالق ہے کیونکہ وہ اپنی ذات اور صفات میں واحد ہے اور واحد بھی ایسا کہ قہار ہے

یعنے سب چیزوں کو اپنے ماتحت رکھتا ہے اور ان پر غالب ہے۔ یہ دلیل بذریعہ شکل اول کے جو بدیہی الامتاج ہے اس طرح پر قائم ہوتی ہے کہ صغریٰ اس کا یہ ہے جو خدا واحد اور قہار ہے اور کبریٰ یہ کہ ہر ایک جو واحد اور قہار ہو وہ تمام موجودات ماسوائے اپنے کا خالق ہے۔ نتیجہ یہ ہوا جو خدا تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ اثبات قضیہ اولیٰ یعنی صغریٰ کا اس طور سے ہے کہ واحد اور قہار ہونا خدائے تعالیٰ کا اصول مسئلہ فریق ثانی بلکہ دنیا کا اصول ہے۔ اور اثبات قضیہ ثانیہ یعنی مفہوم کبریٰ کا اس طرح پر ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ باوصف واحد اور قہار ہونے کے وجود ماسوائے اپنے کا خالق نہ ہو بلکہ وجود تمام موجودات کا مثل اس کے قدیم سے چلا آتا ہو تو اس صورت میں وہ واحد اور قہار بھی نہیں ہو سکتا۔ واحد اس باعث سے نہیں ہو سکتا کہ وحدانیت کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ شرکت غیر سے بکلی پاک ہو۔ اور جب خدائے تعالیٰ خالق ارواح نہ ہو تو اس سے دو طور کا شرکت لازم آیا۔ اول یہ کہ سب ارواح غیر مخلوق ہو کر مثل اس کے قدیم الوجود ہو گئے۔ دوم یہ کہ ان کے لئے بھی مثل پروردگار کے ہستی حقیقی ماننی پڑے جو مستفاض عن الغیر نہیں۔ پس اسی کا نام شرکت بالغیر ہے۔ اور شرک بالغیر ذات باری کا بہ بداہت عقل باطل ہے۔ کیونکہ اس سے شریک الباری پیدا ہوتا ہے اور شریک الباری ممنوع اور محال ہے۔ پس جو امر متلزم محال ہو وہ بھی محال ہے اور قہار اس باعث سے نہیں ہو سکتا کہ صفت قہاری کے یہ معنی ہیں کہ دوسروں کو اپنے ماتحت میں کر لینا اور ان پر قابض اور متصرف ہو جانا۔ سو غیر مخلوق اور روجوں کو خدا اپنے ماتحت نہیں کر سکتا کیونکہ جو چیزیں اپنی ذات میں قدیم اور غیر مصنوع ہیں وہ بالضرورت اپنی ذات میں واجب الوجود ہیں اس لئے کہ اپنے تحقیق وجود میں دوسرے کسی علت کے محتاج نہیں اور اسی کا نام واجب ہے جس کو فارسی میں خدا یعنی خود آئندہ کہتے ہیں۔ پس جب ارواح مثل ذات باری تعالیٰ کے خدا اور واجب الوجود ٹھہرے۔ تو ان کا باری تعالیٰ کے ماتحت رہنا عند العقل محال اور ممنوع ہوا۔ کیونکہ ایک واجب الوجود دوسرے واجب الوجود کے ماتحت نہیں ہو سکتا اس سے دور یا تسلسل لازم آتا ہے۔ لیکن حال واقعہ جو مسلم فریقین ہے یہ ہے کہ سب ارواح خدائے تعالیٰ کے ماتحت ہیں کوئی اس کے قبضہ قدرت سے باہر نہیں۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ وہ سب حادث اور مخلوق ہیں کوئی ان میں سے خدا اور واجب الوجود نہیں اور یہی مطلب تھا۔

(پرانی تحریریں، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۶ تا ۸)

هَلْ يَسْتَوِي الْعُلَى وَالْبَصِيرُ كَمَا نَدَهَا اور بینا مساوی ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۲۴)

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اُدْيَةً ۗ اَبْقَدِرَهَا فَاَحْتَمَلَ السَّبِيلُ ذَبْدًا رَّابِيًا ۗ وَ  
 مِمَّا يُوقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ ذَبْدٌ مِّثْلُهٗ ۗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ  
 اللّٰهُ الْحَقِّقَ وَالْبَاطِلَ ۗ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۗ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَبْقٰى  
 فِي الْاَرْضِ ۗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿١٥﴾

خدا نے آسمان سے پانی (اپنا کلام) اتارا سو اس پانی سے ہر ایک وادی اپنی قدر کے موافق بہ نکلا۔ یعنی ہر ایک کو اس میں سے اپنی طبیعت اور خیال اور لیاقت کے موافق حصہ ملا۔ طبائع عالیہ اسرارِ حکمیہ سے متمتع ہوئیں۔ اور جو ان سے بھی اعلیٰ تھے انہوں نے ایک عجیب روشنی پائی کہ جو حد تحریر و تقریر سے خارج ہے اور جو کم درجہ پر تھے انہوں نے مخبرِ صادق کی عظمت اور کمالیت ذاتی کو دیکھ کر دلی اعتقاد سے اس کی خبروں پر یقین کر لیا اور اس طرح پر وہ بھی یقین کی کشتی میں بیٹھ کر ساحلِ نجات تک جا پہنچے اور صرف وہی لوگ باہر رہ گئے جن کو خدا سے کچھ غرض نہ تھی اور فقط دنیا کے ہی کیڑے تھے۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۱۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

اسی نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہر ایک وادی اپنے اپنے اندازہ اور قدر کے موافق بہ نکلا یعنی ہر ایک شخص نے اپنی استعداد کے موافق فائدہ اٹھایا۔ (برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۳۳) اے غافلو! اس امت مرحومہ میں وحی کی نالیاں قیامت تک جاری ہیں مگر حسبِ مراتب۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۲۱)

آسمان سے پانی اتارا۔ پس ہر ایک وادی اپنے اپنے قدر میں بہ نکلا۔

(جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۸۶)

خدا تعالیٰ نے آسمان پر سے پانی اتارا پس اپنے اپنے قدر پر ہر ایک وادی بہ نکلی یعنی جس قدر دنیا میں طبائع انسانی ہیں قرآن کریم ان کے ہر ایک مرتبہ فہم اور عقل اور ادراک کی تربیت کرنے والا ہے۔ اور یہ امر مستلزم کمال تام ہے کیونکہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کریم اس قدر وسیع دریائے معارف ہے کہ محبتِ الہی کے تمام پیا سے اور معارفِ حقہ کے تمام تشنہ لب اسی سے پیتے ہیں۔

(کرامات الصادقین، روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۵۹)

ایسا پانی اتارا جس سے ہر ایک وادی بقدر اپنی وسعت کے بہہ نکلا ہے۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۳۰)

وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَبْذُرُهُ فِي الْاَرْضِ الْجَزْوِ نَمْر ۱۳ یعنی جو چیز انسانوں کو نفع پہنچاتی ہے وہ زمین پر باقی رہتی ہے اب ظاہر ہے کہ دنیا میں زیادہ تر انسانوں کو نفع پہنچانے والے گروہ انبیاء ہیں کہ جو خوارق سے، معجزات سے، پیشگوئیوں سے، حقائق سے، معارف سے، اپنی راستبازی کے نمونہ سے انسانوں کے ایمان کو قوی کرتے ہیں اور حق کے طالبوں کو دینی نفع پہنچاتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دنیا میں کچھ بہت مدت تک نہیں رہتے بلکہ تھوڑی سی زندگی بسر کر کے اس عالم سے اٹھائے جاتے ہیں لیکن آیت کے مضمون میں خلاف نہیں اور ممکن نہیں کہ خدا تعالیٰ کا کلام خلاف واقع ہو۔ پس انبیاء کی طرف نسبت دے کر معنی آیت کے یوں ہوں گے کہ انبیاء من حیث انظلل باقی رکھے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ ظلی طور پر ہر ایک ضرورت کے وقت میں کسی اپنے بندہ کو ان کی نظیر اور مثیل پیدا کر دیتا ہے جو انہیں کے رنگ میں ہو کر ان کی دائمی زندگی کا موجب ہوتا ہے

(شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۵۱، ۳۵۲)

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ دوسروں کو نفع پہنچاتے ہیں اور مفید وجود ہوتے ہیں ان کی عمر دراز ہوتی ہے جیسے کہ فرمایا: اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَبْذُرُهُ فِي الْاَرْضِ۔ اور دوسری قسم کی ہمدردیاں چونکہ محدود ہیں اس لئے خصوصیت کے ساتھ جو خیر جاری قرار دی جاسکتی ہے وہ یہی دعا کی خیر جاری ہے جب کہ خیر کا نفع کثرت سے ہے تو اس آیت کا فائدہ ہم سب سے زیادہ دعا کے ساتھ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ جو دنیا میں خیر کا موجب ہوتا ہے اس کی عمر دراز ہوتی ہے اور جو شر کا موجب ہوتا ہے وہ جلدی اٹھالیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں شیر سنگھ چڑیوں کو زندہ پکڑ کر آگ پر رکھا کرتا تھا وہ دو برس کے اندر ہی مارا گیا پس انسان کو لازم کہ وہ خیر الناس من ینفع الناس بننے کے واسطے سوچتا رہے اور مطالعہ کرتا رہے۔ جس طرح طبابت میں حیلہ کام آتا ہے اسی طرح نفع رسانی اور خیر میں بھی حیلہ ہی کام دیتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان ہر وقت اس تاک اور فکر میں لگا رہے کہ کس راہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۲۵ مورخہ ۹ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

ہر ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کی عمر دراز ہو لیکن بہت ہی کم ہیں وہ لوگ جنہوں نے کبھی اس اصول اور طریق پر غور کی ہو جس سے انسان کی عمر دراز ہو۔ قرآن شریف نے ایک اصول بتایا ہے: وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ

النَّاسِ فَيَبْذِكُهُ فِي الْأَرْضِ یعنی جو نفع رساں وجود ہوتے ہیں ان کی عمر دراز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو درازی عمر کا وعدہ فرمایا ہے جو دوسرے لوگوں کے لئے مفید ہیں حالانکہ شریعت کے دو پہلو ہیں؛ اول خدا تعالیٰ کی عبادت دوسرے بنی نوع سے ہمدردی۔ لیکن یہاں یہ پہلو اس لئے اختیار کیا ہے کہ کامل عابد وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے۔ پہلے پہلو میں اول مرتبہ خدا تعالیٰ کی محبت اور توحید کا ہے اس میں انسان کا فرض ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچائے اور اس کی صورت یہ ہے ان کو خدا کی محبت پیدا کرنے اور اس کی توحید پر قائم ہونے کی ہدایت کرے۔ جیسا کہ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (العصر: ۴) سے پایا جاتا ہے۔ انسان بعض وقت خود ایک امر کو سمجھ لیتا ہے لیکن دوسرے کو سمجھانے پر قادر نہیں ہوتا اس لئے اس کو چاہیے کہ محنت اور کوشش کر کے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا دے۔ ہمدردیِ خلاق یہی ہے کہ محنت کر کے دماغ خرچ کر کے ایسی راہ نکالے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے تاکہ عمر دراز ہو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے لئے نفع رساں ہو اس کی عمر دراز کی جاتی ہے۔ اس پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھوٹی تھی۔ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اول اس لئے کہ انسانی زندگی کا اصل منشا اور مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاصل کر لیا۔ آپ دنیا میں اس وقت آئے جبکہ دنیا کی حالت بالطبع مصلح کو چاہتی تھی اور پھر آپ اس وقت اُٹھے جب پوری کامیابی اپنی رسالت میں حاصل کر لی۔ اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ کی صدا کسی دوسرے آدمی کو نہیں آئی اور..... پوری کامیابی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اب جس حال میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے طور پر کامیاب ہو کر اُٹھے پھر یہ کہنا کہ آپ کی عمر تھوڑی تھی سخت غلطی ہے۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات اور فیوض ابدی ہیں اور ہر زمانہ میں آپ کے فیوض کا دروازہ کھلا ہوا ہے اس لئے آپ کو زندہ نبی کہا جاتا ہے اور حقیقی حیات آپ کو حاصل ہے۔ طولِ عمر کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا اور اس آیت کے موافق آپ ابد الآباد کے لئے زندہ رہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

خدا تعالیٰ جب اپنا فضل کرتا ہے تو کوئی تکلیف باقی نہیں رہتی مگر اس کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ انسان اپنے اندر تبدیلی کرے۔ پھر جس کو وہ دیکھتا ہے کہ یہ نافع وجود ہے تو اس کی زندگی میں ترقی دے دیتا ہے ہماری کتاب میں اس کی بابت صاف لکھا ہے: وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَبْذِكُهُ فِي الْأَرْضِ۔ ایسا ہی پہلی کتابوں سے بھی پایا جاتا ہے۔ حرقیہ نبی کی کتاب میں بھی درج ہے۔

انسان بہت بڑے کام کے لئے بھیجا گیا ہے لیکن جب وقت آتا ہے اور وہ اس کام کو پورا نہیں کرتا تو خدا اس کا تمام کام کر دیتا ہے۔ خادم کو ہی دیکھ لو کہ جب وہ ٹھیک کام نہیں کرتا تو آقا اس کو الگ کر دیتا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ اس وجود کو کیوں کر قائم رکھے جو اپنے فرض کو ادا نہیں کرتا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸، ۹)

یہ جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ بعض مخالف اسلام بھی لمبی عمر حاصل کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا وجود بھی بعض رنگ میں مفید ہی ہوتا ہے۔ دیکھو ابو جہل بدر کی جنگ تک زندہ رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر مخالف اعتراض نہ کرتے تو قرآن شریف کے ۳۰ سپارے کہاں سے آتے۔ جس کے وجود کو اللہ تعالیٰ مفید سمجھتا ہے اسے مہلت دیتا ہے۔ ہمارے مخالف بھی جو زندہ ہیں اور مخالفت کرتے ہیں ان کے وجود سے بھی یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ خدا تعالیٰ قرآن شریف کے حقائق و معارف عطا کرتا ہے۔ اب اگر مہر علی شاہ اتنا شور نہ مچاتا تو نزول مسیح کیسے لکھا جاتا۔

اس طرح پر جو دوسرے مذاہب باقی ہیں ان کے بقا کا بھی یہی باعث ہے تاکہ اسلام کے اصولوں کی خوبی اور حسن ظاہر ہو۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

جو لوگ دین کے لئے سچا جوش رکھتے ہیں ان کی عمر بڑھائی جاوے گی اور حدیثوں میں جو آیا ہے کہ مسیح موعود کے وقت عمریں بڑھادی جاویں گی۔ اس کے معنی یہی مجھے سمجھائے گئے ہیں کہ جو لوگ خادم دین ہوں گے ان کی عمریں بڑھائی جاویں گی۔ جو خادم نہیں ہو سکتا وہ بڑھے ٹیل کی مانند ہے کہ مالک جب چاہے اسے ذبح کر ڈالے اور جو سچے دل سے خادم ہے وہ خدا کا عزیز ٹھہرتا ہے اور اس کی جان لینے میں خدا تعالیٰ کو تردد ہوتا ہے اس لئے فرمایا: **وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَبْذُرُهُ فِي الْآرْضِ**۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

جو شخص اپنے وجود کو نافع الناس بنا دیں گے ان کی عمریں خدا زیادہ کرے گا۔ خدا تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت بہت کرو اور حقوق العباد کی بجا آوری پورے طور پر بجالانی چاہیے۔

(البدرد جلد ۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳۸)

احادیث میں جو آیا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں عمریں لمبی ہو جائیں گی اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ موت کا دروازہ بالکل بند ہو جائے گا اور کوئی شخص نہیں مرے گا بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مالی، جانی

نصرت میں اس کے مخلص احباب ہوں گے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہوں گے ان کی عمریں دراز کر دی جائیں گی اس واسطے کہ وہ لوگ نفع رساں وجود ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: **وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمُكِّتُ فِي الْأَرْضِ**۔ یہ امر قانونِ قدرت کے موافق ہے کہ عمریں دراز کر دی جائیں گی۔ اس زمانہ کو جو دراز کیا ہے یہ بھی اس کی رحمت ہے اور اس میں کوئی خاص مصلحت ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

جو کوئی اپنی زندگی بڑھانا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ نیک کاموں کی تبلیغ کرے اور مخلوق کو فائدہ پہنچا دے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی دل کو ایسا پاتا ہے کہ اس نے مخلوق کی نفع رسانی کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ اسے توفیق دیتا اور اس کی عمر دراز کرتا ہے۔ جس قدر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی مخلوق کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آتا ہے اسی قدر اس کی عمر دراز ہوتی اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوتا اس کی زندگی کی قدر کرتا ہے لیکن جس قدر وہ خدا تعالیٰ سے لاپرواہ اور لالابالی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی پروا نہیں کرتا... اس جگہ ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو نیک اور برگزیدہ ہوتے ہیں چھوٹی عمر میں بھی اس جہان سے رخصت ہوتے ہیں اور اس صورت میں گویا یہ قاعدہ اور اصل ٹوٹ جاتا ہے مگر یہ ایک غلطی اور دھوکا ہے۔ دراصل ایسا نہیں ہوتا۔ یہ قاعدہ کبھی نہیں ٹوٹتا مگر ایک اور صورت پر درازی عمر کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی کا اصل منشا اور درازی عمر کی غایت تو کامیابی اور بامراد ہونا ہے۔ پس جب کوئی شخص اپنے مقاصد میں کامیاب اور بامراد ہو جاوے اور اس کو کوئی حسرت اور آرزو باقی نہ رہے اور مرتے وقت نہایت اطمینان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو تو وہ گویا پوری عمر حاصل کر کے مرا ہے اور درازی عمر کے مقصد کو اس نے پایا ہے اس کو چھوٹی عمر میں مرنے والا کہنا سخت غلطی اور نادانی ہے۔ صحابہ میں بعض ایسے تھے جنہوں نے بیس بائیس برس کی عمر پائی مگر چونکہ ان کو مرتے وقت کوئی حسرت اور نامرادی باقی نہ رہی بلکہ کامیاب ہو کر اٹھے تھے اس لئے انہوں نے زندگی کا اصل منشا حاصل کر لیا تھا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲، ۳)

چاہیے کہ انسان پہلے اپنے آپ کو دکھ پہنچائے تا خدا تعالیٰ کو راضی کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی عمر بڑھا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں میں تخلف نہیں ہوتا اس نے جو وعدہ فرمایا ہے کہ **أَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمُكِّتُ فِي الْأَرْضِ**۔ یہ بالکل سچ ہے۔ عام طور پر بھی یہی قاعدہ ہے کہ جو چیز نفع رساں ہو

اس کو کوئی ضائع نہیں کرتا یہاں تک کہ کوئی گھوڑا بیل یا گائے بکری اگر مفید ہو اور اس سے فائدہ پہنچتا ہو، کون ہے جو اس کو ذبح کر ڈالے لیکن جب وہ ناکارہ ہو جاتا ہے اور کسی کام نہیں آسکتا تو پھر اس کا آخری علاج وہی ذبح ہے اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر اور نہیں تو دو چار روپیہ کو کھال ہی بک جائے گی اور گوشت بھی کام آجائے گا۔ اسی طرح پر جب انسان خدا تعالیٰ کی نظر میں کسی کام کا نہیں رہتا اور اس کے وجود سے کوئی فائدہ دوسرے لوگوں کو نہیں ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی پروا نہیں کرتا بلکہ خس کم جہاں پاک کے موافق اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

جو چاہتا ہے کہ عمر زیادہ ہو... اس کو لازم ہے کہ وہ کامل الایمان ہو اور اپنے وجود کو قابلِ قدر بناوے اور اس کی یہی صورت ہے کہ لوگوں کو نفع پہنچاوے اور دین کی خدمت کرے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَكْتُبُ فِي الْاَكْضِ**۔ یہ خوب یاد رکھو کہ عمر کھانے پینے سے لمبی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی اصل راہ وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

ہر قسم کی راحت صحت عمر و دولت یہ سب اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے۔ جب انسان کا وجود ایسا نافع اور سود مند ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں کرتا جیسے باغ میں کوئی درخت عمدہ پھل دینے والا ہو تو اسے باغبان کاٹ نہیں ڈالتا بلکہ اس کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح نافع اور مفید وجود کو اللہ تعالیٰ بھی محفوظ رکھتا ہے جیسا کہ اس نے فرمایا ہے: **وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَكْتُبُ فِي الْاَكْضِ** جو لوگ دنیا کے لئے نفع رسان لوگ بنتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی عمریں بڑھا دیتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں جو سچے ہیں اور کوئی ان کو جھٹلا نہیں سکتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سچے اور فرمانبردار بندے ایسی بلاؤں سے محفوظ رہتے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۴۳، ۴۴ مورخہ ۱۷ تا ۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

نافع چیز کو درازی عمر نصیب ہوتی ہے اور خدا دین سے غافلوں کو ہلاکت میں ڈالنے سے پروا نہیں کرتا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

شریعت میں ہر ایک امر جو: **مَا يَنْفَعُ النَّاسَ** کے نیچے آئے اس کو دیر پارکھا جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ان لوگوں کی ہمدردی کے لیے کس قدر میرے دل میں تڑپ اور جوش ہے اور میں

حیران ہوں کہ کس طرح ان لوگوں کو سمجھاؤں۔ یہ لوگ کسی طرح بھی مقابلہ میں نہیں آتے۔ تین ہی راہیں ہیں

یا گذشتہ نشانوں سے میرے اپنے نشانوں کا مقابلہ کر لیں یا آئندہ نشانوں میں مقابلہ کر لیں یا اور نہیں تو یہی دعا کریں کہ جس کا وجود نافع الناس ہے وہ بموجب وعدہ الہی: **وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَكْتُبُ فِي الْأَرْضِ** دراز زندگی پائے۔ پھر عیاں ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں کون مقبول و منظور ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۸۹۹ء صفحہ ۳، ۴)

**وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ**

**الْحِسَابِ ۝۲۱**

پیوند کرنے کی جگہ پیوند کرتے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۵۷)

**وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝۲۲**

وہ کبھی پوشیدہ خیرات کرتے ہیں اور کبھی ظاہر۔ پوشیدہ اس لئے کہ تار یا کاری سے بچیں اور ظاہر اس لئے کہ تادوسروں کو ترغیب دیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۵۷)

یعنی بہادر وہ ہیں کہ.... ان کا صبر لڑائی اور سختیوں کے وقت میں خدا کی رضا مندی کے لئے ہوتا ہے اور اس کے چہرہ کے طالب ہوتے ہیں نہ کہ بہادری دکھانے کے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۵۹)

**الَّذِينَ آمَنُوا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ**

**الْقُلُوبُ ۝۲۳**

یا درکھو کہ قرآن سے دل اطمینان پکڑتے ہیں۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۴۳۰ حاشیہ)

ایک بڑی لذت چھوٹی لذت سے غنی کر دیتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ**

**الْقُلُوبُ... وَ لِيَذْكُرَ اللَّهُ أَكْبَرَ** (برائین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر ذرا بھی غم پہنچتا تو آپ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور اس لئے فرمایا ہے:  
 اَلَا يَذْكُرُ اللّٰهُ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوْبُ - اطمینان، سکینتِ قلب کے لئے نماز سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ایسی شے ہے جو قلوب کو اطمینان عطا کرتا ہے جیسا کہ فرمایا: اَلَا يَذْكُرُ اللّٰهُ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ پس جہاں تک ممکن ہو ذکرِ الہی کرتا رہے اسی سے اطمینان حاصل ہوگا۔ ہاں اس کے واسطے صبر اور محنت درکار ہے۔ اگر گھبرا جاتا اور تھک جاتا ہے تو پھر یہ اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔

اَلَا يَذْكُرُ اللّٰهُ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوْبُ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے قلوب اطمینان پاتے ہیں لیکن اس کی حقیقت اور فلسفہ یہ ہے کہ جب انسان سچے اخلاص اور پوری وفاداری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور ہر وقت اپنے آپ کو اس کے سامنے یقین کرتا ہے اس سے اس کے دل پر ایک خوفِ عظمت الہی کا پیدا ہوتا ہے وہ خوف اس کو کمزوریاں اور منہیات سے بچاتا ہے اور انسان تقویٰ اور طہارت میں ترقی کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ملائکہ اس پر نازل ہوتے ہیں اور وہ اس کو بشارتیں دیتے ہیں اور الہام کا دروازہ اس پر کھولا جاتا ہے اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کو گویا دیکھ لیتا ہے اور اس کی وراء الوراہاتوں کو مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر اس کے دل پر کوئی ہم و غم نہیں آ سکتا اور طبیعت ہمیشہ ایک نشاط اور خوشی میں رہتی ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

وَلَوْ اَنَّ قُرٰنًا سُوِّرَتْ بِهٖ الْجِبَالُ اَوْ قُطِعَتْ بِهٖ الْاَرْضُ اَوْ كَلِمَةٌ بِهٖ الْمَوْتٰى ۙ  
 بَلْ لِلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيعًا ۗ اَفَلَمْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدٰى  
 النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا يُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْۤا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ  
 قَرِيْبًا مِّنْ دَاۤرِهِمْ حَتّٰى يٰۤاتٰى وَعَدُ اللّٰهُ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ﴿۳۱﴾

اگرچہ قرآنی معجزات ایسے دیکھتے جن سے پہاڑ جنبش میں آجاتے۔

(برائین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۹۲ حاشیہ نمبر ۳)

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا لٰخٍ اٰمِنُوْۤا ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَظٰلِمٌ لِّلْكَافِرِيْنَ

موعود آجائے گا جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔ خدا تخلف وعدہ نہیں کرے گا۔

(براہین احمدیہ چہار حصص، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۵۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

اور ہمیشہ کفار پر کسی قسم کی کوفتیں جسمانی ہوں یا روحانی پڑتی رہیں گی یا ان کے گھر سے نزدیک آجائیں گی یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ آپہنچے گا اور خدا تعالیٰ اپنے وعدوں میں تخلف نہیں کرتا۔

(شہادۃ القرآن، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۵۲، ۳۵۳)

وعدہ سے مراد وہ امر ہے جو علم الہی میں بطور وعدہ قرار پا چکا ہے نہ وہ امر جو انسان اپنے خیال کے مطابق اس کو قطعی وعدہ خیال کرتا ہو۔ اسی وجہ سے المبیعاد پر جو الف لام ہے وہ عہد ذہنی کی قسم میں سے ہے یعنی وہ امر جو ارادہ قدیمہ میں وعدہ کے نام سے موسوم ہے گو انسان کو اس کی تفصیل پر علم ہو یا نہ ہو وہ غیر متبدل ہے ورنہ ممکن ہے جو انسان جس بشارت کو وعدہ کی صورت میں سمجھتا ہے اس کے ساتھ کوئی ایسی شرط مخفی ہو جس کا عدم تحقق اس بشارت کے عدم تحقق کے لئے ضروری ہو کیونکہ شرائط کا ظاہر کرنا اللہ جل شانہ پر حق واجب نہیں ہے۔ چنانچہ اسی بحث کو شاہ ولی اللہ صاحب نے بسط سے لکھا ہے اور مولوی عبدالحق صاحب دہلوی نے بھی فتوح الغیب کی شرح میں اس میں بہت عمدہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بدر کی لڑائی میں تضرع اور دعا کرنا اسی خیال سے تھا کہ الہی مواعید اور بشارات میں احتمال شرط مخفی ہے اور یہ اس لیے سنت اللہ ہے کہ تا اس کے خاص بندوں پر بہت اور عظمت الہی مستولی رہیں۔ ما حصل کلام یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے وعدوں میں بیشک تخلف نہیں وہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے علم میں ہیں پورے ہو جاتے ہیں لیکن انسان ناقص العقل کبھی ان کو تخلف کی صورت میں سمجھ لیتا ہے کیونکہ بعض ایسی مخفی شرائط پر اطلاع نہیں پاتا جو پیشگوئی کو دوسرے رنگ میں لے آتے ہیں۔

وعید یعنی عذاب کی پیشگوئی ٹلنے کے بارہ میں تمام نبی متفق ہیں۔ رہی وعدہ کی پیشگوئی جس کی نسبت یہ حکم ہے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ اس کی نسبت بھی ہمارا یہ ایمان ہے کہ خدا اس وعدہ کا تخلف نہیں کرتا جو اس کے علم کے موافق ہے لیکن اگر انسان اپنی غلطی سے ایک بات کو خدا کا وعدہ سمجھ لے جیسا کہ حضرت نوح نے سمجھ لیا تھا ایسا تخلف وعدہ جائز ہے کیونکہ دراصل وہ خدا کا وعدہ نہیں بلکہ انسانی غلطی نے خواہ نہ خواہ اس کو وعدہ قرار دیا ہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۴)

اسلام میں یہ مسلم امر ہے کہ جو پیشگوئی وعید کے متعلق ہو اس کی نسبت ضروری نہیں کہ خدا اس کو پورا

کرے یعنی جس پیشگوئی کا یہ مضمون ہو کہ کسی شخص یا گروہ پر کوئی بلا پڑے گی اس میں یہ بھی ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اس بلا کو ٹال دے جیسا کہ یونس کی پیشگوئی کو جو چالیس دن تک محدود تھی ٹال دیا۔ لیکن جس پیشگوئی میں وعدہ ہو یعنی کسی انعام اکرام کی نسبت پیشگوئی ہو وہ کسی طرح ٹل نہیں سکتی۔ خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ لَكُم كَسِي جگہ یہ نہیں فرمایا کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ۔ پس اس میں راز یہی ہے کہ وعید کی پیشگوئی خوف اور دعا اور صدقہ خیرات سے ٹل سکتی ہے۔

(تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۴۴)

إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ خداتعالیٰ اپنے وعدوں کا خلاف نہیں کرتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ فرمایا ہے لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے وعید معلق ہوتے ہیں جو دعا اور صدقات سے بدل جاتے ہیں۔ اس کی بے انتہا نظیریں موجود ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی فطرت میں مصیبت اور بلا کے وقت دعا اور صدقات کی طرف رجوع کرنے کا جوش ہی نہ ہوتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْتُمْ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَاَمَلَيْتُمُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ اخَذْتُهُمْ

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۲۱﴾

پہلے بھی رسولوں پر ٹھٹھا کیا گیا پس ہم نے ان کافروں کو جو ٹھٹھا کرتے ہیں مہلت دی۔ پھر جب وہ اپنے ٹھٹھے میں کمال تک پہنچ گئے تب ہم نے ان کو پکڑ لیا اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ کیوں کر ہمارا عقاب ان پر وارد ہوا۔

اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ ۗ قُلْ سُبُوهُمْ ۗ  
اَمْ تَتَّبِعُوْنَهُمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ يَبْظَاهِرُ مِنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ رُيِّنَ لِلَّذِينَ  
كَفَرُوا مَكْرَهُمْ وَصَدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿۲۱﴾

ہریک جان پر وہ کھڑا ہے۔ اس کے عمل مشاہدہ کر رہا ہے۔

(ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۸)

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ ۚ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ أُكْلُهَا دَائِمٌ وَّ ظِلُّهَا ۖ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا ۖ وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ﴿۳۱﴾

قرآن شریف کی تعلیم ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ جیسا کہ یہ بات ٹھیک نہیں کہ بہشت کی لذات صرف روحانی ہیں اور دنیوی جسمانی لذات سے بالکل مخالف ہیں ایسا ہی یہ بھی درست نہیں کہ وہ لذات دنیوی جسمانی لذات سے بالکل مطابق ہے بلکہ عالم رویا کی طرح صورت میں مشابہت ہے اور حقیقت میں مغایرت ہے۔ عالم رویا کے پھل اور عالم رویا کی خوبصورت عورتیں ظاہر صورت میں وہی لذات بخشی ہیں جو عالم جسمانی میں ہیں مگر عالم رویا کی حقیقت اور اس عالم جسمانی کی حقیقت اور ہے۔

(کتاب البریہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۷۰ حاشیہ)

خدا نے بہشت کی خوبیاں اس پیرایہ میں بیان کی ہیں جو عرب کے لوگوں کو چیزیں دل پسند تھیں وہی بیان کر دی ہیں تا اس طرح پر ان کے دل اس طرف مائل ہو جائیں اور دراصل وہ چیزیں اور ہیں یہی چیزیں نہیں۔ مگر ضرور تھا کہ ایسا بیان کیا جاتا تاکہ دل مائل کئے جائیں۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۴)

یہ ایک مثال ہے نہ کہ حقیقت۔ قرآن شریف کے ان الفاظ سے صاف عیاں ہے کہ وہ جنت کوئی اور ہی چیز ہے اور حدیث میں صاف یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ان ظاہری جسمانی دنیوی امور پر نعماء جنت کا قیاس نہ کیا جاوے کیوں کہ وہ ایسی چیز ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی وغیرہ مگر وہ باتیں جن کی مثال دے کر جنت کی نعماء کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ تو ہم دیکھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

انسان جو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اگر دل صاف کرے اور اس میں کسی قسم کی کجی اور ناہمواری، کنکر، پتھر نہ رہنے دے تو اس میں خدا نظر آئے گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے درخت اس میں پیدا ہو کر نشوونما پائیں گے اور وہ اثمار شیریں و طیب ان میں لگیں گے جو: اُكْلُهَا دَائِمٌ کے مصداق ہوں گے۔ یاد رکھو کہ یہ وہی مقام ہے جہاں صوفیوں کے سلوک کا خاتمہ ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

## يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ۖ وَعِنْدَ أُمِّ الْكِتَابِ ۝

اللہ تعالیٰ کی شناخت کی یہ زبردست دلیل اور اس کی ہستی پر بڑی بھاری شہادت ہے کہ محو و اثبات اس کے ہاتھ میں ہے: يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ - (الحکم جلد ۶ نمبر ۶۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

ہمارا تو اعتقاد ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ عمر کو کم بھی کر سکتا ہے اور زیادہ بھی کر سکتا ہے: يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ.... عیسائیوں کا بھی یہی اعتقاد ہے ان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک شخص کی پندرہ دن کی عمر باقی رہ گئی تھی۔ دعا سے پندرہ سال ہو گئے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

ہمارا خدا قادر مطلق خدا ہے۔ جو کامل اختیارات رکھتا ہے۔ يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ۔ ہمارا ایمان ہے وہ جوتی کی طرح نہیں۔ وہ ایک حکم صبح دیتا ہے اور رات کو اس کے بدلنے کے کامل اختیارات رکھتا ہے۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ وَعَلَيْنَا

## الْحِسَابُ ۝

اگر ہمارے علماء اس جگہ بھی توفی کے معنی یہی لیتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں۔ تو ہمیں ان پر کچھ بھی افسوس نہ ہوتا مگر ان کی پیبا کی اور گستاخی تو دیکھو کہ توفی کا لفظ جہاں کہیں قرآن کریم میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے تو اس کے معنی وفات کے لیتے ہیں اور پھر جب وہی لفظ حضرت مسیح کے حق میں آتا ہے تو اس کے معنی زندہ اٹھائے جانے کے بیان کرتے ہیں اور کوئی ان میں سے نہیں دیکھتا کہ لفظ تو ایک ہی ہے۔ اندھے کی طرح ایک دوسرے کی بات کو مانتے جاتے ہیں جس لفظ کو خدا تعالیٰ نے پچیس مرتبہ اپنی کتاب قرآن کریم میں بیان کر کے صاف طور پر کھول دیا کہ اس کے معنی روح کا قبض کرنا ہے نہ اور کچھ۔ اب تک یہ لوگ اس لفظ کے معنی مسیح کے حق میں کچھ اور کے اور کر جاتے ہیں۔ گویا تمام جہان کے لئے توفی کے معنی تو قبض روح ہی ہیں مگر حضرت ابن مریم کے لئے زندہ اٹھالینا اس کے معنی ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۴۳)

أَوْ لَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۗ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقَّبَ

## لِحُكْمِهِ ۝ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝۳۱

سنت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ جب کوئی خدا کی طرف سے آتا ہے اور اس کی تکذیب کی جاتی ہے تو طرح طرح کی آفتیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں جن میں اکثر ایسے لوگ پکڑے جاتے ہیں جن کا اس تکذیب سے کچھ تعلق نہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ائمۃ الکفر پکڑے جاتے ہیں اور سب سے آخر بڑے شریروں کا وقت آتا ہے اسی کی طرف اللہ تعالیٰ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے: اَنَّا نَأْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا یعنی ہم آہستہ آہستہ زمین کی طرف آتے جاتے ہیں۔ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۶۶)

سنت اللہ یہی ہے کہ ائمۃ الکفر اخیر میں پکڑے جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے وقت جس قدر عذاب پہلے نازل ہوئے ان سب میں فرعون بچا رہا چنانچہ قرآن شریف میں بھی آیا کہ نَأْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا یعنی ابتداء عوام سے ہوتا ہے اور پھر خواص پکڑے جاتے ہیں اور بعض کے بچانے میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے آخر میں توبہ کرنی ہوتی ہے یا ان کی اولاد میں سے کسی نے اسلام قبول کرنا ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَوْ لَمْ يَرَوْا اَنَّا نَأْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ہم دور دور سے زمین کو گھٹاتے چلے آتے ہیں۔ یہ عادت اللہ ہے کہ اول عذاب ایسے لوگوں سے شروع ہوتا ہے جو دور دور ہوتے ہیں اور ضعیف اور کمزور ہوتے ہیں۔ بیوقوف یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ صرف انہیں کے لئے ہے ہمارے لئے نہیں مگر عذاب لپک کر ان تک پہنچتا ہے جن کو خبر نہیں ہوتی اور بے پرواہ ہوتے ہیں۔ خدا کی اس میں حکمتیں ہوتی ہیں۔ چاہتا ہے کہ یہ اور شوخی کر لیں۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۶، ۵ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۝ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۝۳۲

مَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ۝۳۳

یعنی جو لوگ کہتے ہیں کہ تو خدا کا رسول نہیں ان کو کہہ دے کہ تم میں اور مجھ میں خدا گواہ کافی ہے اور نیز وہ جس کو کتاب کا علم ہے۔

ان (پہلی) کتابوں سے اجتہاد کرنا حرام نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے: شَهِدَ شَاهِدًا مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ اٰوْر پھر فرمایا: كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۗ وَ مَن عِنْدَ كَاَعْلَمُ الْكِتٰبِ.... جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے لئے ان کو پیش کرتا ہے تو ہمارا ان سے اجتہاد کرنا کیوں حرام ہو گیا؟

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۱ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

دیکھو آنحضرت صلعم نے جو صاحب وحی ہونے کا دعویٰ کیا تھا تو وہ بے نشان نہیں تھا۔ کافروں نے جب ثبوت مانگا تھا کہ آپ کی وحی کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل کیا ہے؟ تو ان کو جواب دیا گیا تھا: قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۗ وَ مَن عِنْدَ كَاَعْلَمُ الْكِتٰبِ یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ تو خدا کا رسول نہیں۔ ان کو کہہ دے کہ میرے پاس دو گواہیاں ہیں ایک تو اللہ کی کہ اس کے تازہ تازہ نشانات میری تائید میں ہیں اور دوسرے وہ لوگ جن کو کتاب اللہ کا علم دیا گیا ہے وہ بتا سکتے ہیں کہ میں سچا ہوں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲، ۱۳)

یاد رکھو کہ قول بغیر فعل کے کچھ چیز نہیں اور یہ آیت کہ قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۗ وَ مَن عِنْدَ كَاَعْلَمُ الْكِتٰبِ اس میں ایک عجیب نکتہ ہے یعنی اگر خدا میری گواہی دیتا ہے تو مانو ورنہ نہ مانو۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳)